غلام الثقلین نقوی

کے پچیس ۲۵ منتخب افسانے

انتخاب و ترتیب

سجّاد نقوی

غلام الثقلین نقوی

کے پچیس ۲۵ منتخب افسانے

انتخاب و ترتیب

سجّاد نقوی

کاغذی پیرہن

غلام الثقلین نقوی کے پچیس منتخب افسانے

انتخاب و ترتیب: سجاد نقوی

وسیم جگنو نے ٹی جے پرنٹرز، رایل پارک، لاہور، سے چھپوا کر
کاغذی پیرہن، عظیم مینشن، رایل پارک، لاہور، سے شائع کی۔

اشاعت اوّل	:	اگست ۲۰۰۶ء
مشینی خطّاطی	:	ورڈ میکرز
سرورق	:	خواجہ افضل
قیمت:		۳۲۵ روپے
لائبریری قیمت	:	۵۰۰ روپے

25 Short Stories of
Ghulam us Saqlain Naqvi* edited by *Sajjad Naqvi
(Urdu Fiction)

Printed by: T. J. Printers, Royal Park, Lahore.

Price:
In Pakistan: Rs. 325.00 - For Libraries: Rs. 500.00
Abroad: US$.18.00 or Euro 15.00 or UK Pound. 10.00
Libraries Abroad: US$. 25.00 or Euro. 21.00 or UK Pound. 15.00

Published by:
Kaghadhi Paerahen
Azeem Mansion, Royal Park, Lahore, Pakistan.
Tel: +92.42.7122552 - Cell: +92.42.03214649684
Email: kaghadhipaerahen@hotmail.com

کاغذی پیرھن
KAGHADHI PAERAHEN

ISBN 969-8527-64-8

ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید

کے نام

ترتیب

عرضِ مرتّب

پیش لفظ

افسانے

☆☆☆

عرضِ مرتّب

جنوری ۲۰۰۶ء میں بھائی جان غلام الثقلین نقوی کے سب سے چھوٹے صاحب زادے مشیر عباس نقوی، چند دِنوں کے لیے لندن سے لاہور تشریف لائے تو اُنھوں نے میرے ساتھ، میرے کمرے میں رہنا پسند کیا۔ شادی کا ہنگامہ گزرا تو ایک روز معمول کی گفتگو میں اُنھوں نے اَپنے ابا جی کی برسی پر اُن کی کوئی نئی کتاب چھپوانے کی خواہش کا اِظہار کیا۔ فی الفور میرا خیال بھائی جان کے رابطے کے سلسلے کے خاکہ نُما مضامین کی طرف گیا مگر مشیر عباس کو اُن کے اَفسانے بہت پسند ہیں۔ اُنھوں نے مشورہ دیا کہ سرِدست اُن کے سات مجموعوں میں سے پچیس تیس اَفسانوں کا اِنتخاب کر کے اُنھیں ایک جلد میں چھپوا دیا جائے۔ مجھے یہ کام رابطے کے مضامین کی اشاعت کی نسبت بہت آسان لگا۔ عزیزی مشیر عباس نے کتاب کی اشاعت کے لیے اِدارہ کاغذی پیرہن کے اِنتخاب پر مجھ سے اِتفاق کیا۔

غلام الثقلین نقوی کے اَفسانوں کے سات مجموعے اُن کی زِندگی میں شائع ہُوئے، جن میں اُن کے ستاسی ۸۷ اَفسانے شامل ہیں۔ سچ کہوں تو اُن میں ایک اَفسانہ بھی اَیسا نہیں جو اِنتخاب میں نہ آئے۔ اَفسانے کی حد تک مَیں اِس بات کا گواہ ہُوں کہ جب تک اَفسانہ اُنھیں لکھنے پر مجبور نہیں کرتا تھا، وہ قلم نہیں اُٹھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے اَپنے تجرباتی دَور کے درجن کے قریب اَفسانے اَپنے کسی مجموعے میں شامل نہیں کیے۔ اُن کا آخری مجموعہ نقطے سے نقطے تک کمپوز ہو رہا تھا کہ میرے کہنے پر اُنھوں نے اَپنے تجرباتی دَور کے ایک اَفسانے نئی لیڈی ڈاکٹر پر نظرِ ثانی کی اَور مجھے ماہنامہ صریر کے سال نامے کے لیے دے دیا۔ اَفسانے کے ساتھ اُنھوں نے اَفسانے کے کرداروں کے نام تبدیل کرنے کی وجہ بھی الگ سے تحریر کی تھی۔ فہیم اعظمی نے اَپنے اِدارتی نوٹ کے ساتھ، جس میں غلام الثقلین نقوی کے اسلوب کی بہت تعریف کی گئی تھی، سال نامہ صریر میں اُسے شائع کیا۔ بعد میں یہ اَفسانہ، سال کے بہترین اَفسانوں کے ایک اِنتخاب میں بھی چھپا۔ دِل چسپ بات یہ کہ میری خواہش کے باوجود بھائی جان نے نقطے سے نقطے تک میں اُسے شامل نہیں کیا۔ وجہ درست تھی کہ نقطے سے نقطے تک میں مئی ۱۹۹۱ء سے جولائی ۲۰۰۱ء تک کے اَفسانے شامل تھے، نئی لیڈی ڈاکٹر کے سِنِ تصنیف کو بدلنا اُن کے کِردار کے مُنافی تھا۔

میں نے پہلے مرحلے میں ستاسی ۸۷ افسانوں میں سے تینتیس ۳۳ افسانے منتخب کیے۔ اِنتخاب میں اِس بات کا خیال رکھا کہ ساتوں مجموعوں کو برابر کی نمائندگی حاصل ہو۔ ضخامت کا اندازہ لگانے کے لیے، پہلے اُن کی نقلیں نکلوائیں۔ صفحات شمار کیے تو کتاب کی مجوّزہ ضخامت سے بہت بڑھ گئے۔ مجبوراً پانچ ۵ نسبتاً طویل افسانے چنبیلی، سیڈنگر کا چودھری الصمی، مَیلا بُرقع اَور لمحے کی موت اِس خیال سے اِنتخاب سے الگ کر لیے گئے کہ اگر کتاب کی ضخامت کم پڑی تو اِن میں سے ضرورت کے مطابق شامل کر لیے جائیں گے۔ اِس طرح اِنتخاب کے دُوسرے مرحلے میں پچیس ۲۵ افسانے رہ گئے۔ ہم نے جانا کہ مجوّزہ ضخامت کے اندر اندر کمپوز ہو جائیں گے مگر ایک روز شاہد شیدائی نے اِطلاع دی کہ اٹھارہ ۱۸ افسانوں میں کتاب کی ضخامت مکمل ہو گئی ہے۔ میں نے عزیزم نصیر عباس نقوی سے بات کی تو اُنھوں نے کہا، شاہد شیدائی سے کہیے کہ اِنتخاب میں باقی سات ۷ افسانوں کو بھی شامل رکھیں اَور ضخامت بڑھنے کی فکر نہ کریں!

اپریل ۲۰۰۶ء میں بھائی جان غلام الثقلین نقوی کی چوتھی برسی تھی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے اَپنے اَدبی مجلّے مخزن کے لیے ڈاکٹر انور سدید سے غلام الثقلین نقوی پر خاص طور پر مضمون لکھوایا جسے ڈاکٹر وحید قریشی اَور ڈاکٹر انور سدید کی اجازت سے، شکریے کے ساتھ، اِس اِنتخاب میں پیش لفظ کے طور پر شامل کیا جا رہا ہے۔

سجّاد نقوی

اگلے وقتوں کا آدمی...... غلام الثقلین نقوی

ڈاکٹر وحید قریشی نے رسالہ مخزن کے لیے غلام الثقلین نقوی کی شخصیت اور فن پر لکھنے کے لیے فرمایا تو مجھے اس لحاظ سے بڑی طمانیت محسوس ہوئی کہ نقوی صاحب کی چوتھی برسی پر (وفات: ۶/ اپریل ۲۰۰۲ء، لاہور) اُنھیں یاد کرنے کا ایک اچھا موقع فراہم کر دیا گیا تھا۔ اِس مرحلے پر مجھے یاد آیا کہ نقوی صاحب کے صاحب زادے ظہیر، نصیر، مشیر اور صغیر عباس نقوی، اِس برسی پر اُن کے افسانوں کا ایک انتخاب شائع کر رہے تھے؛ سپوتنک کے مدیر آغا امیر حسین اپنے اس رسالے میں نقوی صاحب کی وہ کالم نما تحریریں، کتابی صورت میں مجتمع کر رہے تھے جو اُن کی زندگی کے آخری مہینوں میں روزنامہ نوائے وقت کے ادارتی صفحات پر شائع ہوتی رہیں؛ اُن کے چھوٹے بھائی سجاد نقوی، جو زندگی بھر اُن کے ادبی مشیر رہے، اور جنھیں دکھائے بغیر وہ اپنا کوئی افسانہ کسی ادبی رسالے کو نہیں بھیجتے تھے، اُن کے تنقیدی مضامین، اہلِ خاندان اور دوستوں کے رابطوں پر مشتمل مضامین اور خود نوشت سوانح عمری کی تدوین کر رہے ہیں (جس کی ایک قسط تنکے تنکے کے عنوان سے مجلّہ اوراق، شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰۵ء میں چھپ چکی ہے)۔ اس دوران میں نقوی صاحب کو اُن کے دوستوں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر آغا سہیل، صابر لودھی، اے بی اشرف، آثم مرزا، شاہد شیدائی، سلیم آغا قزلباش، صبا اکرام، ضیا ساجد اور اظہر جاوید نے اُنھیں یاد رکھا اور اُن کے بارے میں اپنی یادداشتیں رقم کیں۔ نقوی صاحب کی اپنی تحریریں اوراق اور تخلیق میں چھپتی رہیں۔ اُن کی آخری کتاب نقطے سے نقطے تک پر تبصرے انھیں ایام میں شائع ہوئے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اپنی وفات کے چار سال بعد بھی وہ ادب سے غیر حاضر شمار نہیں ہوئے اور اُن کے افسانوں کا ذکر تنقیدی مضامین میں فراوانی سے نظر آیا۔ اگرچہ اُن کی زندگی کی ڈور کٹ گئی ہے اور وہ اِس مادّی دُنیا سے عقبیٰ کو سدھار گئے ہیں لیکن اہلِ ادب اُنھیں افسانوی ادب کا زندہ مصنف شمار کرتے ہیں اور اُن پر تحقیقی و تنقیدی کام بھی ہو رہا ہے: محترمہ تسلیم سعید نے غلام الثقلین کے افسانے کے موضوع پر مقالہ لکھ کر علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے ایم فل کی ڈگری اس برس کے اوائل میں حاصل کی ہے۔

افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی ۱۲/ مارچ ۱۹۲۳ء کو ریاست جموں کشمیر کے ایک گاؤں چوکی ہنڈن میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد سیّد امیر شاہ، پٹواری تھے۔ نقوی صاحب، ترقی پسند ادیب ہوتے تو اپنی خود نوشت میں اپنے والد صاحب کو پٹواری کے بجائے مال افسر لکھتے۔ اُن کا سرمایۂ افتخار یہ حقیقت تھی کہ اُس دور کا پٹواری

بھی دیانت دار ہوتا تھا؛ لیکن دِلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کے والد' پٹواری کے پیشے کے ساتھ عُمر بھر کی وابستگی اِختیار نہ کر سکے اَور جب نقوی صاحب تین ۳ سال کے تھے' وہ پٹوار چھوڑ کر اپنے آبائی گاؤں بھڑتھ آگئے جو سیال کوٹ شہر سے مرالہ ہیڈ ورکس کو جانے والی سڑک پر واقع ہے۔ یہاں اُنھوں نے پرائمری سکول میں غیر تربیت یافتہ مدرّس کی ملازمت اِختیار کر لی۔ غلام ُالثقلین نقوی لکھتے ہیں کہ اُن کا یہ فیصلہ اُن کی اَولاد کے لیے مفید ثابت ہوا کہ وہ پڑھ لکھ گئی۔

غلام ُالثقلین نقوی نے اِبتدائی تعلیم ٹاٹ سکولوں میں حاصل کی اَور اُستاد کے ڈنڈے کے مزے بھی چکھے۔ آٹھویں جماعت میں انگریزی کے اُستاد' ماسٹر اَمر سِنگھ' شام کو گھر پر بِلا معاوضہ ٹیوشن دیتے تھے۔ ایک روز وہ اِس اضافی جماعت میں دیر سے پہنچے تو اُستاد نے اُنھیں چار ۴ ڈنڈے ٹِکا دیے؛ اُن کے والدِ گرامی کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا جو اُسی سکول میں اورینٹل ٹیچر تھے۔ اگلے دِن سے اُنھوں نے اُس کلاس میں جانا ترک کر دیا۔ اُنھوں نے ورنیکلر فائنل کے اِمتحان میں اچھے نمبر لیے لیکن وظیفہ نہ آسکا۔ اِس پر ماسٹر اَمر سِنگھ نے کہا: ''بَرخوردار! اُستاد سے بغاوت کا یہی نتیجہ ہوتا ہے!'' نقوی صاحب اِس سرزنش کو عُمر بھر بھول نہ سکے' اَور پھر اُن کے جسم کی زمین میں بغاوت کا بیج کبھی پروان نہ چڑھ سکا۔ اُستاد ہی نہیں' اَپنے سینئرز کی عزّت کرنا بھی اُن کا مطمحِ نظر بن گیا۔ کہانیاں پڑھنے اَور لکھنے کا شوق اُن کے تخلیقی وُجود میں طلبِ علم ہی کے زمانے میں پرورِش پانے لگا تھا۔ اُن کے مضامین میں نیلے' پیلے' سُرخ اَور کاسنی آنچلوں کی تشبیہیں سماں باندھنے لگیں تو ایک اُستاد پنڈت چمن لال نے اُن کے والد سے شِکایت کی کہ: ''بَرخوردار ابھی سے مَیدہ وشہاب چہروں میں دِلچسپی لینے لگا ہے۔'' اُن کے والد کو کرشن چندر کے اَفسانے بہت پسند تھے کیوں کہ اُن میں اُنھیں جمّوں وکشمیر نظر آتا تھا' جہاں اُنھوں نے زندگی کے تیس ۳۰ برس بسَر کیے تھے لیکن جب معلوم ہُوا کہ اُن کے بڑے بیٹے کو کہانیاں لکھنے کا شوق ہے تو قدرے خائف ہوگئے اَور اُنھیں سمجھایا کہ: ''میں نے کسی افسانہ نگار کو بڑا آدمی بنتے نہیں دیکھا۔'' دِلچسپ بات یہ ہے کہ والد کے اِس پُرخلوص اِنتباہ نے نقوی صاحب کے دِل میں بڑا آدمی بننے کی تمنّا بیدار نہ کی لیکن بڑا اَفسانہ نگار بننے کی آرزو روز بہ روز پروان چڑھنے لگی' اَور جب فوت ہوئے تو اُنھیں بَرِصغیر پاک وہند کا صفِ اوّل کا افسانہ نگار تسلیم کیا جا چُکا تھا۔ افسانوں کے چھے ۶ مجموعوں بند گلی' شفق کے سائے' نغمہ اَور آگ' لمحے کی دیوار' دھوپ کا سایہ' سرگوشی' اَور نقطے سے نقطے تک کے علاوہ اُن کا ایک ناول میرا گاؤں اَور تین ناولٹوں کا مجموعہ (تین ناولٹ ...... چاند پُور کی نینا' شمیرا اَور شیر زمان) بھی چھپ چُکا تھا۔ اُن کے فن کی جہتیں سفرنامے' طنز ومزاح اَور فکری کالموں میں بھی ظاہر ہُوئیں۔ اُن کے چند افسانے نصاب میں شامِل کیے جا چکے تھے' اَور اُن کے فن پر متعدد نام ور نقادوں نے نہ صرف تنقیدی مضامین لکھے بلکہ اُنھیں پاکستان کا ایک سچّا دیہات نگار بھی تسلیم کیا کہ اُن کے افسانوں میں طبقاتی

آویزش تو موجود تھی لیکن بعض ترقی پسند دیہات نگاروں ایسی اشتراکیت، جذباتیت اور نعرہ بازی یک سر مفقود تھی۔ دوسری طرف اُن کی دُنیاوی ترقی کا گراف بھی ہمیشہ مائل بہ فراز رہا۔ اُنھوں نے مرے کالج سیال کوٹ سے ایف اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد ملٹری اکاؤنٹس میں پینتالیس ۴۵ روپے ماہوار پر، مقابلے کا امتحان پاس کر کے، ملازمت اختیار کر لی لیکن جلد ہی اُنھیں احساس ہُوا کہ اکاؤنٹس کا شعبہ اُن کے مزاج کے موافق نہیں تھا۔ والد صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوئے اور بڑے جذباتی انداز میں نوکری چھوڑ دینے کی اِستدعا کی۔ والد نے شفقتِ پدری کے تحت اُنھیں مایوس نہ کیا لیکن یہ بھی فرمایا: ''مجھے معلوم ہے کہ تم مدرس کیوں بننا چاہتے ہو...... افسانہ لکھنے کے لیے!'' دیپال پُور سکول میں اُنھیں چونتیس ۳۴ روپے ماہوار کی ملازمت ملی جب کہ ملٹری اکاؤنٹس میں اُنھیں مہنگائی الاؤنس مِلا کر اسّی ۸۰ روپے مِلتے تھے۔ اِس پر نقوی صاحب کا تاثر یہ تھا:

> اُس زمانے میں چھیالیس ۴۶ روپے ماہوار کی کمی بہت بڑا نقصان تھی، جسے مجھ سے زیادہ میرے باپ نے محسوس کیا۔ یہ اِیثار تھا یا خُودغرضی؟...... اگر یہ کہوں کہ میں نے افسانے کے لیے یہ اِیثار کیا تو اچھی خاصی منافقت کی بات ہوگی۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے معلّمی کا پیشہ اس لیے اِختیار کیا کہ یہ میری اُفتادِ طبع کے مطابق تھا، اِس میں سکونِ قلب تھا اور افسانہ پڑھنے اور لکھنے کے لیے وافر وقت بھی خوب مِلتا تھا۔ یُوں مَیں یہ بھی نہیں کہتا کہ مَیں معلم بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ آج سے پچاس ۵۰ سال پہلے کے ''ذہن'' میں جھانکتا ہُوں تو یہ خانہ بھی خالی نظر آتا ہے۔ میرے اس فیصلے میں بہر حال اِیثار سے زیادہ خُودغرضی کا پہلو نمایاں تھا...... (اوراق، شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۰۵ء، ص ۱۵۷)۔

نقوی صاحب نے بی اے پرائی ویٹ طالب علِم کی حیثیت میں پاس کیا۔ بی ٹی سنٹرل ٹریننگ کالج سے کر چکے تو نئی ملازمت کا آغاز منٹ گمری (نیا نام: ساہی وال) کے ایک دیہی سکول سے کیا جہاں اُن کے والد بھی پڑھاتے تھے۔ وہ اپنی معلّمانہ ملازمت کا آغاز اپنے والد کے زیرِ سایہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی نظر میں: ''ماں، نیم کا سایہ ہوتی ہے اور باپ برگد کا، لیکن برگد کے سایے تلے کوئی اور پودا پھَل پھُول نہیں سکتا۔''

دُوسری طرف زمینی حقیقت یہ تھی کہ عہدے کے لحاظ سے نقوی صاحب سیکنڈ ماسٹر تھے اور اُن کے والد اُن کے ماتحت تھے۔ لیکن جب تک والد ریٹائر نہ ہُوئے، اُنھوں نے اپنے آپ کو بھی محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ سیکنڈ ماسٹر ہیں۔ کھوٹہ، شرق پُور اور ڈسکے میں سکولوں کی معلّمی کے دوران میں اُنھوں نے ایم اے (اُردو) سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا لیکن اورینٹل کالج لاہور کے تعلیم یافتہ طلبا کے مقابلے میں ایک پرائی ویٹ طالبِ علِم کی حیثیت میں وہ پبلک سروس کمیشن میں جانب داری کا شکار ہوگئے اور جب اُس کمیشن سے منتخب ہونے کا وَلولہ سرد پڑ گیا تو ایک دِن اُنھیں گورنمنٹ کالج جھنگ میں تقرّری کا حکم نامہ مِلا جس پر اُن کی طبیعت یکایک گر گئی۔ اِس نوکری کے لیے درخواست پر اُن کے برادرِ خُرد سجاد نقوی نے زبردستی دستخط کرائے

تھے۔ ہیڈ ماسٹر میر عبدالرحمٰن حیران ہو گئے تو نقوی صاحب بولے: "جناب، اَب مَیں سکول ماسٹری کا اِتنا عادی ہو چُکا ہُوں کہ اِس میں کوئی تبدیلی میرے لیے خوشی کا باعث نہیں ہو سکتی۔"

اَحباب کے سمجھانے کے عِلاوہ ایک مجبوری یہ ہوئی کہ اُن کی جگہ جن کا تقرر ہوا وہ صاحب آن پہنچے اَور نقوی صاحب کو سکول کا چارج چھوڑ کر گورنمنٹ کالج جھنگ میں لیکچرار بننا پڑا۔ اَور عروج آدم خاکی دیکھئے کہ ۱۸ مئی ۱۹۸۳ء کو ریٹائر ہوئے تو وہ گورنمنٹ کالج میں لاہور پہنچ چکے تھے جو صُوبے کا سب سے بڑا کالج تھا اَور جہاں مولانا محمد حسین آزاد کبھی مسندنشیں رہ چکے تھے۔ نقوی صاحب کو بہت سی مثبت روایات اَپنے والدِ محترم سے وِرثے میں ملی تھیں اَور آپ اُنھیں مولانا آزاد کے زمانے کا اُستاد بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ وہ کالج میں صرف نصاب پڑھانے کے لیے نہیں آئے تھے اَور نہ ہی اُن کا مقصود اَپنے وجود کا تجمل تھا؛ وہ تو طلبا کے زنگ آلود باطن کو صاف کرنے اَور اُنھیں معاشرے کے فرض شناس اِنسان، ملک کے پُرامن شہری اَور بے لوث خدمت گزار بنانے کی سعی کرتے تھے۔ وہ کمرۂ جماعت میں ناموجود طلبا کو ہمیشہ غیر حاضر درج کرتے۔ پرندوں کی طرح بچّوں کی آوازیں بھی پہچانتے تھے۔ کوئی لڑکا پراکسی بولتا تو آنکھ اُلٹا کر دیکھتے اَور کہتے: "عزیز طلبا! میرے سامنے جُھوٹ نہ بولا کرو...... جھوٹ بولنے سے شخصیت کا کوئی نہ کوئی حصہ ضرور مجروح ہو جاتا ہے۔" اُن میں ایک یہ بُری عادت بھی تھی کہ اَپنا پیریڈ ضرور لیتے اَور پُورے پینتالیس ۴۵ منٹ تک پڑھاتے۔ طلبا اِصرار کرتے: "سر، نوٹ لکھوا دیجیے!" نقوی صاحب اَپنے مزاج کے تحت صاف اِنکار کر دیتے۔

اِمتحان کے قریب، طلبا ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے: "سر، ہمیں Guess بتائیے!" نقوی صاحب جواب دیتے: "آپ کو Guess کی ضرورت نہیں، آپ نے پُورا کورس پڑھا ہے۔" وہ جس روز گورنمنٹ کالج لاہور سے اَپنی ساٹھ ۶۰ برس کی عُمر پُوری ہو جانے پر رُخصت ہوئے، اُس روز کالج کا چنار رو رہا تھا کہ اگلے وقتوں کا آخری آدمی بھی اِس کالج سے رُخصت ہو رہا تھا۔ درس و تدریس، نقوی صاحب کا پیشہ نہیں، وِراثت میں مِلا ہُوا عِشق تھا۔ اِس عِشق میں اُنھوں نے شیریں تک رسائی حاصل کرنے کی آرزو نہیں کی تھی لیکن عمر بھر کوہِ بے سُتوں کو تیشۂ حرف سے کاٹتے رہے اَور طمانیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ قدروں کی قیمت پر اُنھوں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ اُن کے چھوٹے بھائی سجاد نقوی نے ایک واقعہ سُنایا:

> نقوی صاحب کے ایک طالبِ علم کو سالانہ اِمتحان میں پاس ہونا مقصود تھا۔ ایک روز اُن کی غیر موجودگی میں گھر آیا اَور آموں کی ایک ٹوکری چھوڑ گیا۔ نقوی صاحب گھر آئے تو بیگم صاحبہ نے بتایا کہ ایک لڑکا آیا تھا اَور یہ ٹوکری دے گیا ہے۔ اُنھوں نے کہا: "اِسے ہاتھ نہ لگایا جائے!" اُن کے اَندازے کے مطابق ایک روز چھوڑ کر وہ طالبِ علم پھر آیا۔ نقوی صاحب گھر پر موجود تھے۔ ابھی وہ حرفِ مدّعا لَب تک لانا ہی چاہتا تھا کہ بھائی جان لال پیلے ہو گئے۔ عزیزی صغیر سے ٹوکری منگوائی اَور اُس لڑکے کو کہا: "اِسے اُٹھاؤ، اَور میری نظروں سے دُور ہو جاؤ...... میں اُستاد ہُوں...... رزقِ حلال پر یقین رکھتا ہُوں!"

غلام الثقلین نقوی کا دُوسرا عشق افسانے سے تھا۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے اُن کے افسانے پڑھے تو بولے: ''اِن کے ہاں شیطانوں کا سخت کال ہے۔'' وزیر آغا کے خیال میں: ''غلام الثقلین نقوی اَور زمانے کے درمیان لمحہ، دیوار کی طرح اِستادہ ہے۔ اِس دیوار کے ایک طرف نقوی صاحب جراحتِ احساس لیے کھڑے ہیں، دُوسری طرف زندگی اَپنا کھیل کھیل رہی ہے۔''

جب مخلوط تعلیم کے کالج میں پڑھاتے تھے تو وہ لڑکیوں سے پردہ کرتے تھے۔ طالبات اُنھیں اَپنا رُوحانی راہ نما سمجھ کر آتیں لیکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ڈوپٹا دُرست کرلیتیں۔ نقوی صاحب کی آنکھیں میز پر مرکوز ہوجاتیں۔ نصابی سوال ختم ہوجاتا تو طالبات خود ہی اُٹھ کر چلی جاتیں۔ اُن کے بڑے بیٹے ظہیر الحسن نے ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن ڈیپارٹمنٹ میں ملازمت کرلی۔ عرصے تک نقوی صاحب کا سانس اکھڑا رہا اَور اُس وقت درست ہوا جب بیٹے نے اَپنے دادا کی وِراثت سنبھال لی اَور درس و تدریس کو اَپنے والد کی طرح اَپنا عشق بنالیا۔

غلام الثقلین نقوی نے زندگی جنُوں میں گزاری، لیکن اُن کا جنُوں ایک عام دُنیا دار کا جنُوں نہیں تھا۔ ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد جب ایک نیا محشر اُن کے سامنے آیا تو اُنھوں نے اِس جنُوں کو فارغ نہ بیٹھنے دیا۔ اُن کا بیٹا نصیر عباس، مکّہ مکرّمہ میں انجینئر تھا۔ نقوی صاحب نے جنُوں سامانی کے عالم میں دیکھا کہ مکّے کی جانب سے کوئی غیبی آواز اُنھیں بُلا رہی ہے۔ اُنھوں نے تاخیر نہ کی، قبا کندھے پر ڈالی، اَپنی بیوی کی اُنگلی پکڑی اَور اُس مقامِ مقدّس کی زیارت کے لیے چل کھڑے ہُوئے جہاں بی بی ہاجرہ کے پاؤں اَپنے بیٹے کی پیاس بُجھانے کے لیے سنگ زاروں میں زخمی ہوگئے تھے؛ جہاں حضرت ابراہیمؑ نے دُنیا کے بُت کدوں میں خدا کا پہلا گھر بنایا تھا۔ غلام الثقلین نقوی اَپنے آبا کی سرزمین کو چُوم کر واپس آئے تو اُنھوں نے اَپنے رُوحانی تجربے میں اَپنے افسانے کے قاری کو بھی شریک کیا اَور سفرنامہ اَرضِ تمنّا لکھا۔ اُردو کے معروف نقاد رشید نثار نے رائے دی کہ: ''اَرضِ تمنّا بے قیدِ زماں ایک خُوب صُورت تخلیق ہے۔''

غلام الثقلین نقوی کا اَپنے بارے میں تاثر یہ تھا کہ: ''میں تن آساں آدمی ہُوں، سفر کی صعوبتیں میرے بس کی چیز نہیں۔''، لیکن وہ اَرضِ حجاز سے لَوٹے تو اُنھیں احساس ہُوا کہ مقصد نیک ہو تو سفر کی صعوبت کو بھی پھول کی طرح قبول کیا جاسکتا ہے۔ خُدا کا گھر دیکھ چکے تو اُن کے بڑے بیٹے ظہیر الحسن نے، جو لندن میں بیالوجی میں پی ایچ ڈی کررہے تھے، اُنھیں یورپ کے اُس ملک کو دیکھنے کا موقع فراہم کردیا جس کے سفید فام حکم رانوں نے ایک سَو سال تک برِّصغیر پر حکومت کی تھی اَور خُوئے غلامی، ہماری رگ رگ میں، اِس طرح اُتار دی تھی کہ آزادی کے اُنسٹھ ۵۹ برس گزر جانے کے بعد بھی نکالی نہیں جاسکی۔ نقوی صاحب نے برطانیہ کو ایک سیاح کی نظر سے دیکھنے کا فیصلہ کیا تو اَپنے پاسبانِ عقل کو گھر پر چھوڑ گئے حالاں کہ اُنھیں یوسف خاں کمبل پوش بننے کا کوئی خطرہ نہیں تھا اَور بیگم مارگریٹ تھیچر کو بھی اُمورِ سلطنت سے فرصت نہیں تھی۔ نقوی صاحب لندن

میں تنہا گھومتے، اور لمحے لمحے کا حال اپنی ڈائری میں لکھتے رہے۔ اُنھوں نے لندن دیکھا، لندن والے دیکھے؛ لندن والوں نے نقوی صاحب کو دیکھا لیکن اُن کے اندر کے سچّے اور کھرے پاکستانی کو نظر انداز کر دیا جو صِرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ تثلیث کے فرزندوں نے ہمیں اوصافِ اسمٰعیل سے محرُوم کرنے کے لیے ایسٹ اِنڈیا کمپنی کی حکومت کے دَور میں کیا کیا حربے اِستعمال کیے تھے! اِس سفر کے دوران میں اُنھوں نے اُن پاکستانیوں کو بھی دیکھا جو لندن میں پاکستانی نظر نہیں آتے، محض لندنی دِکھائی دیتے ہیں اور کندھوں پر اپنے ایمانوں کی گٹھریاں اُٹھائے پھرتے ہیں اور دُنیا کے ساتھ عاقبت بھی خراب کر رہے ہیں۔ اُن کا سفرنامہ *چل بابا اگلے شہر* اُن کی سیّاحت کا خارجی اور داخلی منظرنامہ ہے۔ احمد زین الدین نے لکھا ہے:

> بابا جی (غلام الثقلین نقوی) کی آنکھ ایسا کیمرہ ہے جو ہر چیز کی جُزئیات کو اپنی گرفت میں لے کر اَمر کر دیتا ہے، اور ذہن اِتنا کُشادہ اور سریع الحس ہے کہ ہر منظر کے پیچھے چھپی ہُوئی حقیقت کو کبھی دردمندی سے اور کبھی ہلکی سی تنقید یا طنز کے ذریعے واشگاف الفاظ میں ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ بابا جی کے خیالات ہماری اپنی زبان بولتے ہیں۔ اُن کی تحریروں کے بین السطور میں سماجی قدروں کی اُتھل پتھل اور ہمارے آج کے معاشرے کی بے راہ روی کو ایک دِیدہ وَر کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے لفظوں کو بولنے کا ہُنر سِکھایا ہے جس سے اُن کی مشّاقی بھی ظاہر ہوتی ہے اور جو دِل پر اِس حد تک اثر انداز ہُوئے ہیں کہ احساس کے سارے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں، جیسے کسی نے دِل کو مٹھی میں بھینچ لیا ہو...... (روشنائی، شمارہ ۹، ص ۲۸۱)۔

معلم اُردو اور افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی سے میری پہلی ملاقات (ساٹھ۶ کی دہائی میں) سرگودھا کے فُٹ پاتھ پر ہُوئی تھی۔ میں شِملہ کلاتھ ہاؤس سے انور گوئندی کے رسالے *کامران* کے دفتر کی طرف جا رہا تھا۔ سجاد نقوی، ایک لمبے سے اچکن پوش شخص کے ساتھ دفتر *کامران* سے نکل کر وزیر آغا کی رہائش کی طرف جا رہے تھے جو ریلوے سٹیشن سرگودھا کی طرف سے شہر کی طرف آنے والے موڑ پر واقع تھی۔ میں نقوی صاحب کے متعدّد افسانے رسالہ *ماہِ نو* (ادارت: رفیق خاور) اور *اَدبِ لطیف* (ادارت: میرزا ادیب) میں پڑھ چُکا تھا۔ اُن کا ناولٹ *چاند پُور کی نینا* تاب اسلم کے رسالے *گجر* (سیال کوٹ) میں چھپا تھا اور مجھے بہت پسند تھا۔ میں اُن کی سچّی دیہات نگاری سے متاثّر تھا اور اُن کے افسانوں کو اپنے پاس ایک فائل میں محفوظ کرتا رہتا تھا۔ میں نے اُن کے چہرے مہاندرے سے اَندازہ لگا لیا کہ وہ سجاد نقوی کے بڑے بھائی، افسانہ نگار غلام الثقلین نقوی ہیں۔ چناں چہ اُنھیں تعارُف کرانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ پہلے معانقے ہی میں اُن کے سینے کی پُرخلوص حرارت کا سارا خزینہ میرے دِل میں اُتر چُکا تھا۔ یُوں لگا جیسے میری بھٹکی ہُوئی رُوح کو جس دوست کی تلاش تھی، وہ مجھے سرگودھا کے اِس فُٹ پاتھ پر مل گیا ہے، اور پھر ہم دونوں نے زندگی کا باقی ماندہ سفر اکٹھے کاٹا۔ میں لاہور منتقل ہُوا تو دائیں طرف رحمٰن مذنب کا گھر تھا، بائیں طرف نقوی صاحب کا مکان تھا، تنگ گلی کے درمیان میں فرخندہ صابر لودھی اور انور سدید کے

پانچ پانچ مرلے کے "محلات" تھے، جہاں اَدب کے اِن پانچ[۵] درویشوں کی محفل جمتی تو اَدب کے تمام موضوعات زیرِ بحث آ جاتے۔ لاہور میں عارف عبدالمتین، قیوم نظر، صلاح الدین ندیم، اعجاز فاروقی، تسلیم احمد تصور، سلمان بٹ اَور متعدد اَدیبوں سے ملاقات اِن کے وسیلے سے ہُوئی۔ وزیر آغا نے اوراق جاری کیا تو نقوی صاحب کو اِس مجلّے کا نام وَر افسانہ نگار تسلیم کیا گیا۔ میں نے اوراق سے تنقید کا آغاز کیا تھا، لیکن اُن کی افسانہ نگاری پر پہلا مضمون ماہِ نو میں لکھا جس کی فرمائش اِس رسالے کے مدیر ظفر قریشی نے کی تھی۔ غلام الثقلین نقوی نے سیال کوٹ کے گِرد وپیش میں پھیلے ہُوئے اُس دیہات کو اُردو افسانے میں زندگی کا تحرک اَور حرارت عطا کی تھی جس میں اُنھوں نے اَپنی زندگی کا اِبتدائی حِصّہ گزارا تھا۔ میرا مشاہدہ تھا کہ دیہات کے پس منظر میں اِنسانی فطرت کے جو جذبے بلونت سنگھ کے ہاں غیر تربیت یافتہ شکل میں اَور احمد ندیم قاسمی کے ہاں مرتّب صُورت میں مِلتے ہیں، اُن جذبوں کی تقدیس کا فریضہ غلام الثقلین نقوی نے اَدا کیا۔ بلونت سنگھ کے افسانوں میں محبت کا مُنہ زور جذبہ، جسم کا تقاضا بن کر اُبھرتا ہے۔ ترقی پسند اَفسانہ نگاروں نے اِسے ایسی بُھوک قرار دیا جسے روپے کی خُوش بُو سے بُجھایا جاسکتا ہے خواہ اس بدعملی میں معاشرے کی اَخلاقیات پامال ہو جائے۔ نقوی صاحب نے جنسی جذبے کو بھی بے لگام ہونے کی اجازت نہیں دی، اُن کے افسانوں کی لڑکی، باپ کی غیرت ہے، اَور بہن، اَپنے بھائی کا تقدس ہے۔ اُن کے نزدیک احترام کے رِشتوں کی تقدیس پر آنچ آتی ہے تو خُدا کی خُدائی ڈول جاتی ہے۔ اُن کے اِس نوع کے افسانے بند گلی، شفق کے سائے، لمحے کی دیوار اَور دھوپ کا سایہ ایسے مجموعوں میں شامل ہیں؛ اَور اِس وقت بھی مجھے سید نگر کا چوھری، تلوار کی دھار، جلی مٹی کی خُوش بُو، شبنم کی ایک بُوند، کاغذی پیرہن، شیرا نمبردار اَور گل بانو ایسے اَفسانے ذہن پر زور ڈالے بغیر یاد آرہے ہیں۔ اُن کا ناوِل میرا گاؤں، دیہات نگاری کا شاہ کار ہے جس میں دیہی زندگی کی اَن گنت قاشیں مِل کر ایک بڑا "کُل" تعمیر کرتی اَور شہر اَور دیہات کی داخلی آویزش کو سطح پر اُبھار دیتی ہیں۔ وزیر آغا نے لکھا ہے:

> غلام الثقلین نقوی، کسان کے بنیادی جذبات، اُس کے دُکھ سُکھ، خوف، اُمّید اَور صبر و توکّل کو اَپنا موضوع بناتے ہیں، مگر اِن سب کا رِشتہ اُس سبز دھرتی سے بھی جوڑتے ہیں جو بیک وقت کسان کی ماں بھی ہے اَور اُس کا اَن داتا بھی۔ اُنھوں نے دیہات کے کرداروں کے عقب میں اِستادہ بنیادی کرداروں مثلاً ہل، درانتی، پانی، ہوا، بیل اَور مٹّی وغیرہ کو موضوع بنایا ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ اُنھوں نے کرداروں کے اُن دونوں پرتوں کے باہمی رِشتے کو دریافت کر کے دیہات کو ایک نامیاتی کل کے طور پر پیش کیا ہے جہاں اِنسان اَور پرندے، مویشی اَور کیڑے مکوڑے ایک ہی برادری کے رُکن ہیں؛ وہ ایک ساتھ آسمان کے دُکھ اُٹھاتے ہیں اَور ایک ساتھ زمین سے مستفید ہوتے ہیں؛ جب تک زمین زرخیز رہتی ہے، وہ بھی زِندہ رہتے ہیں، زمین بانجھ ہو جاتی ہے تو ساتھ ہی وہ بھی مَر جاتے ہیں۔

صابر لودھی نے شاید اِسی تجزیے سے یہ عمومی نکتہ اَخذ کیا تھا کہ: "فن کار کی عظمت یہ ہے کہ وہ بڑے مقصد کے

حصول کے لیے لکھے، فن پارے سے لذّت کشید کرنے کی کوشش نہ کرے۔'' غلام الثقلین نقوی کے بارے میں اُن کی رائے ہے کہ اپنی محنت اور ریاضت سے اُنھوں نے فنی پختگی کا کمال حاصل کیا اور بات کہنے کا ڈھنگ نکالا تو موضوعات پر سنسر لگانے کا موسم آ گیا۔ افسانہ نگاری شروع کی تو والدِ محترم کا سنسر لگا؛ اُنھیں خوف رہتا، کہیں تحریر میں کوئی بے ہُودہ بات نہ نکل جائے؛ بچے بڑے ہُوئے تو اِس احساس نے سنسر لگا دیا کہ بچے یہ کہیں: ''ابّا جی ایسے شوخ جملے بھی لکھ سکتے ہیں!''...... اِسی لیے اُن کے ایک مہربان نے کہا تھا: ''نقوی صاحب باوضو ہو کر افسانہ لکھتے ہیں۔'' مشفق خواجہ سے اُن کے افسانوں کا ذکر چھڑا تو اُنھوں نے دریافت کیا: ''غلام الثقلین نقوی اپنی زندگی میں بھی ایسے ہی شریف ہیں جیسے وہ اپنے افسانوں میں نظر آتے ہیں۔'' میں نے اُنھیں بتایا: ''شرافت اُن کی فطرت کا حصّہ ہے اور اپنی عملی زندگی میں وہ اپنے افسانوں کے کرداروں سے بھی زیادہ شریف ہیں۔''

کہتے ہیں کہ ہر شخص اپنے حلقۂ احباب سے پہچانا جاتا ہے، اور اُس کے ظرف کا اندازہ اُن چیزوں سے لگایا جا سکتا ہے، جن سے وہ مسرّت کشید کرتا ہے۔ حُسنِ اتفاق دیکھیے کہ غلام الثقلین نقوی کی آخری تحریر جو اوراق (مئی ۲۰۰۲ء) میں چھپی، ایسی شخصیات کے بارے میں ہے جو زندگی کے گھمسان میں کسی کو نظر نہیں آتیں اور جنھیں غیر اہم قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن نقوی صاحب کے لیے یہ شخصیات اِتنی عظیم اور خوشیوں کا ماخذ تھیں کہ وہ اپنی زندگی میں اُنھیں کبھی فراموش نہ کر سکے اور حیاتِ مُستعار کے آخری لمحات میں بھی اُنھیں یاد کرتے رہے۔ اُناسی ۷۹ برس کی عُمر میں اُنھوں نے لکھا: ''میں جب اِن اچھے آدمیوں کو یاد کرتا ہُوں تو میرے چاروں طرف گُل و گلاب کی خُوش بُو پھیل جاتی ہے۔'' اور اُن کا تذکرہ پھُول کے قلم سے لکھا تو اُن کا مقصد یہ تھا کہ: ''شاید یہ خُوش بُو اُن لوگوں تک بھی پہنچ جائے جنھیں سڑاند سے بہت محبّت ہے۔'' اُن میں ایک بابا شریف شاہ تھے جن کے بارے میں نقوی صاحب نے لکھا:

جب مَیں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا، اُنھوں نے مجھے پہلا ''فونٹین پین'' عطا کیا تھا جس میں مَیں نے بابا سلطان شاہ مرحوم کی عطا کردہ نیلی ٹِکیوں کو کُوٹ کر روشنائی بھری اور انگریزی میں چند سطریں بڑی روانی سے لکھیں تو مجھے اِتنی خوشی ہُوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ آج اِس واقعے کی یاد سے میرے دِل میں میر تقی میر کے پائیں باغ کی کھڑکی کھل جاتی ہے جہاں سلطان باہُو کی چنبے کی بُوٹی نے مُشک مچا رکھا تھا۔

بابا سلطان شاہ سیال کوٹ چھاؤنی میں ایم ای ایس (ملٹری انجینئرنگ سروس) کے چیف انجینئر کے دفتری تھے۔ نقوی صاحب کے بقول، اُن کا چہرہ سراسر محبّت اور شفقت کا آئینہ دار تھا حالاں کہ برادری میں اُنھیں بڑے سخت طبع اور اکھل کھرے آدمی کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ اُن سے ہم کلام ہوئے تو بولے: ''ثقلین! پتا ہے، ہمارے بڑے افسر کا کیا نام ہے؟'' میرے جواب کا اِنتظار کیے بغیر بولے: ''لالہ پیڑا رام''۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

میں ہنسا تو وہ بھی ہنسے اور کہنے لگے ''تم بھی پڑھ لکھ کر پیڑا رام بننا!'' میرے والد صاحب کہتے: ''ثقلین! تم

پہلے آدمی ہو جس سے بھائی سلطان شاہ نے اِتنی بے تکلفی کا اِظہار کیا ہے اَور ہنسا بھی ہے۔" کہیں بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ایم ای ایس کے لالہ پیڑارام چیف انجینئر تھے۔ بابا سلطان شاہ کی تمنا کیا پوری ہوتی کہ میرے مزاج میں انجینئری کا کوئی جرثومہ نہیں تھا' اِس کی کمی' میرے بیٹے نصیر عباس اَور پوتے زہیر عباس نے پوری کر دی کہ چچا بھتیجا دونوں انجینئر ہیں۔

ایک اَور کردار منشی محمد شفیع' ہیڈ پوسٹ آفس سیالکوٹ چھاؤنی میں پوسٹ مین تھے۔ نقوی صاحب سے جب بھی ملتے' کوئی نہ کوئی اچھی خبر دیتے۔ دو تین بار اُن کے والد صاحب کی طرف سے پوسٹ کارڈ مرحمت فرماتے اَور مہینے میں ایک بار پچیس تیس روپے کا منی آرڈر جو مہینے بھر کی خوشیوں کا پیغام بر ہوتا۔ نقوی صاحب نے اُنھیں یاد کیا تو لکھا:

> بچپن میں مَیں نے کئی بار دیکھا کہ وہ (منشی محمد شفیع پوسٹ مین) گاؤں کی پہلی عمارت تک پہنچتے تو سائیکل سے اُتر پڑتے اَور سڑک سے اپنے گھر تک جو بچّہ بھی اُنھیں راستے میں مِلتا' اُس کے ہاتھ پر ایک پَیسا رکھ دیتے۔ ایک دو بار مجھے بھی اُنھوں نے پَیسا دیا۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ مرحوم تنخواہ ملنے پر ایک روپیہ بھنوا لیتے اور چونسٹھ ۶۴ پیسے بچّوں میں بانٹ دیتے۔ اُس زمانے میں' ایک روپیہ آج کل کے ایک پاؤنڈ کے برابر تو ضرور ہوگا۔

غلام الثقلین نقوی اِس بات میں یقین رکھتے تھے کہ آدمی دِن میں بھی خواب دیکھتا ہے اَور رات کو بھی' لیکن اکثر خوابوں کو وہ ایسے خواب ہائے پریشاں قرار دیتے جو آنکھ کھلتے ہی ذہن سے محو ہو جاتے ہیں۔ اُنھوں نے حیرت کا اِظہار کیا کہ عزیزِ مصر کے جس خواب کو اُس کے دربار کے دانش وَروں نے "خوابِ پریشاں" قرار دیا تھا' اُس میں حضرت یوسفؑ نے معنی تلاش کر لیے تھے اَور وہ "خواب" اگلے چودہ ۱۴ سالوں پر محیط تھا۔ دِلچسپ بات یہ ہے کہ بعض خواب نقوی صاحب کو بار بار آتے اَور ذہن پر مرتسم ہو جاتے لیکن جب وہ اُن پر افسانہ تعمیر کر لیتے تو اُنھیں پریشاں کرنے والا خواب ختم ہو جاتا۔ اِس قسم کے ایک واقعے کا اُنھوں نے یُوں ذِکر کیا ہے:

> آج سے پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے کہ مجھے ایک خواب میں اکثر محسوس ہوتا جیسے میں نے کسی قتل کا اِرتکاب کیا ہو؛ یہ خواب بھیس بدل بدل کر آتا...... اکثر ایک غیر مرئی سے خوف میں...... جاگنے کے بعد بھی چند لمحوں تک خوف کی کیفیت دماغ میں جاری و ساری رہتی۔ تب میں نے ایک افسانہ "الضحیٰ" کے عنوان سے لکھا اَور اِس کے بعد یہ خواب مَیں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

اِس افسانے میں نقوی صاحب نے اَپنے اُس بچے کو فنی سطح پر زندگی دے دی تھی جو مُردہ پیدا ہُوا تھا اَور جب وہ بہاول نگر سے چھٹی لے کر گھر آئے تو منوں مٹّی کے نیچے دفن تھا۔ نقوی صاحب کی بیگم کو بھی جی بھر کر اُس کا چہرہ دیکھنے کا موقع نصیب نہ ہُوا تھا کیوں کہ اُس نے زندگی اَور مَوت کے کِنارے کھڑے ہو کر شام کے جھٹ پُٹے میں اُسے دیکھا تھا اَور اُس کا چہرہ دُھندلایا ہُوا تھا۔ افسانے کا آغاز یوں سمت نمائی کرتا ہے:

میں اُسے اکثر خواب میں دیکھتا ہُوں۔ وہ میری طرف ہُمک کر آتا ہے۔ اُور میری گود اُس کے وجود سے بھر جاتی ہے۔ میری چھاتیوں میں دُودھ اُبل آتا ہے۔

نقوی صاحب نے ایسے خواب بھی دیکھے ہیں جن میں مستقبل کے کسی لمحے کی تجرید وتجسیم ہو جاتی ہے۔ اِس ضمن میں اُنھوں نے اَپنے دو[۲] افسانوں وہ اُور سرگوشی کا خصوصی ذِکر کیا ہے جن میں خواب کے اُن لمحات کا تذکرہ ہے جن سے وہ مستقبل میں آشنا ہُوئے اُور جن کے کچھ ہیُولے گزرے ہُوئے واقعات میں بھی تلاش کیے جا سکتے تھے۔ وفات سے چار پانچ سال قبل اُنھوں نے ایک خواب دیکھا تو محسوس کیا جیسے وہ اکیلے مسافر ہیں اُور پلیٹ فارم پر کھڑے ہیں؛ ایک گاڑی نکل گئی ہے اُور وہ دُوسری کا اِنتظار کر رہے ہیں؛ بے سروسامانی کی اِس کیفیت میں اُنھیں معلوم نہیں کہ کہاں بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ اَب یہ خواب نقوی صاحب کی زبانی سنیئے:

جھٹ پٹے کا وقت ہے، ایسے میں سفید کپڑوں میں ملبوس ایک ہیُولا میرا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ میں ہاتھ کے لمس ہی سے محسوس کر لیتا ہوں کہ میرے والد کا ہاتھ ہے۔ وہ مجھ سے نہیں پوچھتے کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ ایک عمارت کی طرف اِشارہ کرتے ہیں: جیسے کہہ رہے ہوں، وہ رہا سٹیشن جہاں سے ہم گاڑی پر سوار ہوں گے۔ اچانک گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اُس میں والد تو کیا، اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتا...... صرف اِتنا معلوم ہے کہ یہ کوئی فلیگ سٹیشن ہے جہاں سے تیز رفتار گاڑیاں دندناتے گزر جاتی ہیں...... احساس کہتا ہے کہ یہ ٹکٹ بابُو کی کھڑکی ہے۔ میرے والد مُنہ سے نہیں بولتے لیکن اَپنا ایک خیال میرے ذہن میں منتقل کر دیتے ہیں کہ تم پلیٹ فارم پر چلو، میں ٹکٹ لے کر آتا ہُوں......

نقوی صاحب نے اِس خواب پر اَپنی زندگی کا آخری اَفسانہ *پلیٹ فارم پر کھڑا اکیلا مُسافر* لکھا تھا اُور یہ تخلیق (فروری ۲۰۰۳ء) میں شائع ہُوا تھا۔ پھر وہ گاڑی آ گئی جس کا اُنھیں اِنتظار تھا۔ پلیٹ فارم پر کھڑے اکیلے آدمی نے پائیدان پر قدم رکھا تو گاڑی، عدم کے سفر پر روانہ ہو چکی تھی!

انور سدید
۱/۲۷ ستلج بلاک، اقبال ٹاؤن
لاہور، پاکستان

بند گلی

بند گلی کے نقطۂ اَنجام پر اُس کا مکان تھا!

اِس کونے پر کمیٹی کا گدلا سا لیمپ تھا جس کی روشنی چند گھڑیوں تک اندھیروں سے مصروفِ پیکار رہ کر آخر دم توڑ دیتی۔ یہ گھر تاریک اَور سَرد تھا۔ اِس میں سیلن تھی اَور اِس سیلن میں صدیوں سے رچی ہوئی سڑاند تھی۔ اِینٹیں بُھر بُھری ہو چکی تھیں۔ اُنھیں کلّر دِیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ چھت سے مٹی اَور دیواروں سے پھپھوندی لگا چُونا گِرتا رہتا تھا۔ دیواروں کی سفیدی کُملا کر اَپنا اصلی رنگ کھو چکی تھی۔ یہ گھر بہت تنگ تھا۔ صرف ایک کمرہ رہائش کے قابل تھا۔ باورچی خانے کی چھت کے ساتھ دُھوئیں اَور راکھ سے اَٹے ہُوئے جالوں کے فانوس لٹکے ہُوئے تھے۔

اِس گلی میں دُھوپ کبھی کبھار چند مریل ٹِھٹھری ہُوئی کرنوں کا دان دینے کے لیے آیا کرتی تھی۔ صبح سے لے کر شام تک صرف دو گھڑیاں ایسی آتیں جب اِس گلی کا اَزلی اَور اَبدی اندھیرا دُور ہوتا لیکن اِس گھر میں روشنی کو بہت کم دخل تھا۔ نہ جانے سُورج کب نکلتا اَور کب ڈوبتا لیکن اُس کی کوئی بُھولی بھٹکی کرن اِس گھر میں در آتی تو گھبرا کر یُوں لَوٹ جاتی جیسے وہ اِس کی تاریکی اَور ٹھنڈک سے ڈر گئی ہو۔

یہ مکان اُسے بڑی تگ و دَو کے بعد ملا تھا۔ اِس لیے نہیں کہ اِس مکان کو حاصل کرنے کے لیے بہت زبردست مقابلہ تھا' اِس لیے کہ یہ مکان پیچ در پیچ گلیوں میں کھو کر بند گلی کے اَنجام پر واقع تھا اَور ظلمات کی بُھول بُھلیّوں میں سے اِسے تلاش کر لینا بھی جُوئے شِیر لانے کے برابر تھا۔ مدّت سے کسی کرایہ دار نے اِس طرف کا رُخ نہ کیا تھا۔ آج تک اِس کے عین سامنے کا مکان خالی تھا۔ اِس کے بھدّے کِواڑوں پر تالا لگا ہُوا تھا اَور یہ تالا زنگ آلود تھا۔

وہ صبح صبح چائے تیار کرتا۔ آگ جلتی تو باورچی خانے کی چھت کے فانوس لہراتے۔ چائے کی دو پیالیاں پی کر اَور دو سُوکھے رس کھا کر وہ اَپنے کام پر چلا جاتا۔ گلیوں کے پیچ و خم سے نکل کر جب وہ سڑک پر آتا تو سُورج کِھلکِھلا کر قہقہہ لگاتا۔ روشنی اَور اُجالے کی اِس فراوانی پر اُس کی آنکھیں چُندھیا

جاتیں اور اُس کی کنپٹیاں دُھوپ اور روشنی کے اِس اچانک لمس سے تھرتھراتیں۔ بجھی ہوئی زندگی شعلے کی طرح بھڑکتی تو اُسے کرب اور لذّت کی ایک عجیب کیفیت کا اِحساس ہوتا!

سہ پہر کو جب اُسے چھُٹی مِلتی تو روشنی اور اُجالوں کی دُنیا کو چھوڑ کر ظلمات کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے اُسے ہچکچاہٹ محسوس ہوتی۔ پاؤں بار بار زمین سے چپکتے۔ گلی کے اندر پہنچتے ہی سہ پہر، شام میں بدل جاتی۔ گلی کے آغاز پر اُسے چند مَیلے کچیلے بچّے ملتے جو مٹّی سے کھیل رہے ہوتے اور ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے چند اِنسانی آوازیں بھی پس منظر سے اُبھرنے والے نغموں کی طرح تھرتھرا رہی ہوتیں۔ اِس میں کبھی کبھار قہقہوں کے مدھم چھناکے بھی ہوتے لیکن جُوں جُوں نقطۂ انجام قریب آتا، گلی کا ہر نغمہ بھی موت کی وادیوں سے آنے والی سرگم معلوم ہوتا۔

وہ تین ۳ مہینوں سے اِس گلی میں رہ رہا تھا۔

ابھی تک وہ اِس کی تاریک اور بدبُودار یکسانیت میں رچ نہیں سکا تھا۔ اِس گلی میں بسنے والے لوگ بھی اپنی طرز کے عجیب لوگ تھے کہ اُس کے پاس سے سایے کی طرح گزر جاتے۔ کوئی اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتا، جیسے اندھیروں اور سایوں کے اِس خلا میں ہر شخص اکیلا ہو۔ ہر ایک کی اِنفرادیت اِس گپھا میں گم ہو چکی تھی۔ یہ خلا آہستہ آہستہ اُس کی ''انا'' کو بھی ہڑپ کر رہا تھا۔

زندگی کے آغاز میں موت سے سابقہ پڑ گیا تھا!

وہ نوجواں تھا اور اِس گلی میں آنے سے پہلے، ایک پُرفضا گاؤں کا زندہ اور فعّال مَرد تھا۔ اُسے زندگی سے بے پناہ محبّت تھی۔ اُسے دُھوپ، روشنی، تازہ ہَوا اور ہَری بھَری دُنیا سے پیار تھا۔ اِس گلی میں اُس نے پہلی بار زِندگی کا تاریک رُخ دیکھا تھا۔

گاؤں چھوڑنے سے پہلے اُس نے بڑے سنہری خواب دیکھے تھے!

شہر کا تصوّر اِن خوابوں کی دُنیا میں لپٹا ہُوا، بڑا دِل کش معلوم ہوتا تھا۔ صاف اور شفّاف سڑکیں، ہجوم اور قہقہے، سینما اور تھیٹر، یاروں کی محفلیں، رنگین اور دِل نواز چہرے، ترچھی نظریں اور دِل میں اُتر جانے والی ادائیں، اور جب اُسے شہر میں ملازمت ملی تو وہ گاؤں کی گلیوں کو چھوڑ کر سرپٹ بھاگا، جیسے قفس میں بند پنچھی کو مدّتوں بعد آزاد اُڑان کی اِجازت ملی ہو اور اُس کے گاؤں کی گلی جب اِس بند گلی کے اینچ پیچ میں گم ہو گئی تو اُس کے سنہری خواب کے پُرزے اُڑ گئے۔ اَب صبح اور شام کے درمیان اِس سنہری خواب کا کوئی پُرزہ حائل ہو جاتا تو وہ حیران ہو کر اپنے گِرد و پیش پر نظر ڈالتا۔ کیا یہی وہ خوابوں کی دُنیا ہے جس

کے لیے وہ اِتنا بے قرار تھا؟

گاؤں میں وہ خاصا مقبول اَور ہر دِل عزیز تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ اُس کی شکل وصُورت بھی خاصی تھی۔ گٹھا ہُوا بدن، نکلتا ہُوا قد، روشن آنکھیں جن میں شبنم کی نمی اَور پُھولوں کی تازگی تھی۔ گاؤں کی مٹیاریں بھی اُس کے پیار کا دم بھرتی تھیں۔ اُن میں سے ایک تو گاؤں کی لاڈلی تھی کہ ہَرے بھَرے کھیتوں کی رانی لگتی تھی، سارے گاؤں کی آنکھ کا تارا تھی، نسیمِ صبح کا بھیگا ہُوا جھونکا بن کر گزرتی تو گاؤں کی گلیوں میں کچّی کلیوں کی خُوش بُو بکھر جاتی اَور نغموں کا طوفان اُٹھتا۔

اِس نغمے نے گلی کے ایک نکّڑ پر اُس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

اَور وہ ایک لے پر اُڑا۔ ایک طوفان نے اُسے شہر میں لا پھینکا تھا۔ اَب وہ حیران تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے! شہر تو جِھیل سیف المُلوک سے بھی زیادہ گہرا اَور پُراَسرار تھا کہ گل بکاوَلی کی تلاش بے سُود ثابت ہو رہی تھی۔ تین ماہ کے بعد اُسے دو تین دِن کی چھٹی ملی تھی۔ وہ گاؤں کو صِرف ہاتھ لگا کر چلا آیا تھا۔ گاؤں کی رانی کی ایک جھلک نصیب ہُوئی تھی۔ اُڑتے ہُوئے نغمے کو رُوح میں رچانے کا موقع بھی نہ ملا تھا اَور اُس اُڑتے ہُوئے نغمے نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ قسمت کی تلاش میں پھر شہر چلا آئے۔

کارخانے کے مینجر نے کہا تھا:

مسٹر رحیم! محنت سے کام کرو گے تو ترقی پاؤ گے۔ چھٹیوں کے پیچھے بھاگو گے تو محنتی لوگ تم سے آگے نکل جائیں گے۔ کام کرو کام!

اُس شام پھر اُس نے گوشۂ تنہائی میں پناہ لی تو سِیلن اَور سڑاند نے لپک کر اُس کا اِستقبال کیا۔ گاؤں کی رانی فانوسِ خیال سے آزاد ہو کر جلائے ہُوئے جالوں میں اُلجھ گئی اَور پھر دُھویں اَور اندھیرے نے اُس کی نزاکتِ خیال کو ہڑپ کر لیا۔ دُوسری صبح وہ پھر گلی سے گزر رہا تھا اَور گلی، حسبِ معمول سُونی اَور اُداس تھی۔ ابھی سُورج کی دُزدِیدہ کرن اِس گلی میں نہ آئی تھی۔

اِس طرح کئی صبحیں آئیں اَور گزر گئیں! سامنے کے مکان پر تالا پڑا رہا...... زنگ آلود تالا!

پھر ایک شام جب وہ اَپنے گھر کا تالا کھول رہا تھا، اُس کی نگاہ اچانک سامنے کے دروازے پر جا پڑی۔ اُس کی حیرت کی اِنتہا نہ رہی۔ کِواڑ بند تھے لیکن اُن پر ٹاٹ کا پَردہ لٹکا ہُوا تھا۔ چابی گھمانے والی اُنگلیاں رُک گئیں۔ کیا یہ گھر آباد ہو چکا تھا؟ ٹاٹ کا پَردہ جامِد اَور ساکِن تھا۔ بند گلی کا یہ بند مکان آباد نہیں ہو سکتا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ رُکی ہُوئی چابی نے گردِش کی اَور اُس کے مکان کا تالا کھٹ

سے کھُل گیا۔ اُس نے کنڈی کو کھولا تو کواڑ چرچرائے اَور پھر ٹاٹ کا پَردہ ذرا سا ہِلا۔ ایک لہر سی اُبھری۔ ایک کونا ننگا ہُوا اَور جھری میں سے کسی نے جھانک کر اُسے دیکھا۔ وہ جھانکنے والے کو نہ دیکھ سکا۔ وہ لہر جو کھردرے ٹاٹ پر اُبھری تھی، تھوڑے سے اِرتعاش کے بعد ساکِن ہو گئی۔

یہ گھر آباد ہو چکا ہے۔

اُس کے یقین نے بڑی جرأت سے کہا۔

پھر مجھے کیا؟......

اُس نے بڑبڑا کر کہا:

اَب تُو بند گلی کے آخری کونے پر تنہا اَور اُداس نہیں۔ وِیرانوں میں بستی کے پہلے آثار اُبھرے ہیں۔

کیا یہ وِیرانہ آباد ہو چکا ہے؟ سہ پہر سے لے کر اگلی صبح تک کے لیے وِیرانی کے تصوّر میں گُل وگُلزار اُبھرے، جیسے یک دم بہار آگئی ہو......وِیرانے میں بہار! ابھی ساتھ کے گھر سے دُھویں کی ایک نیلی لہر آسماں کا رُخ کرے گی، کوئی قہقہہ اُبھرے گا، اُس کا ماحول زِندگی سے لبریز ہو جائے گا۔

اَور آج اُس کا جی نہ چاہا کہ گھر کی سیلن اَور سڑاند کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے!

اُس نے باورچی خانے کا رُخ کیا۔ نیچی چھت سے جالوں کے گندے فانُوس جھاڑ دیے۔ فرش کو صاف کِیا اَور ایک لمحے کے لیے ٹھِٹھک کر پھر ٹاٹ کے پَردے کو دیکھا۔ ٹاٹ کا پَردہ کھِسکا۔ ایک چھوٹے سے بچّے نے سَر باہر نکالا اَور گلی کے ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک نگاہ دوڑائی اَور پھر اُس کی نگاہ اُس پر آکر ٹھہر گئی۔ بچے کی عُمر تین چار سال سے زائد نہ تھی۔ اُس کا رنگ زرد تھا لیکن آنکھیں سیاہ تھیں۔ چمک دار پُتلیوں میں حیرت کی شبنم تھی۔ یہ آنکھیں کبُوتر کی آنکھوں کی طرح معصُوم اَور اَپنے آپ میں کھوئی کھوئی سی تھیں۔ بچّہ صرف ایک گندی سی قمیص پہنے ہُوئے تھا۔ اُس کے ہاتھ اَور پاؤں مٹّی میں لتھڑے ہُوئے تھے۔ رحیم نے بچے کے گِرد یکایک زندگی کے ہر حُسن کو گردِش کرتے ہُوئے محسوس کِیا جیسے وہ پَرکارِ حیات کا محور ہو۔

اُس نے زندگی سے ایک چشمے کو اُبلتے ہُوئے سُنا!

بچہ پھر ٹاٹ کے پَردے کے پیچھے چُھپ گیا اَور شام کے اندھیرے لپک کر گلی میں چھا گئے۔

صبح کے اُجالے میں گلی جاگ اُٹھی!

گلی کے ہونٹوں پر دُھلی دُھلی، سوئی سوئی مسکراہٹ تھی۔ ٹاٹ کے پردے کے ساتھ ایک بُھولا بھٹکا جھونکا

کھیل رہا تھا۔ اُس نے مکان کو تالا لگایا۔ گلی میں قدم رکھا تو پردہ سَرکا اَور ایک دھان پان سے آدمی نے کہا:

سلام علیکم!

وعلیکم السّلام۔

رحیم نے جواب دیا۔

میں نے کہا' آپ میرے ہم سایے ہیں۔ سب سے پہلے آپ سے مِلوں۔

بڑی مہربانی ہے آپ کی۔

بزرگ کہا کرتے تھے: ہم سایۓ ماں جاۓ!

جی بزرگ سچ کہتے تھے۔

میں کپڑے کی پھیری کا کام کرتا ہوں۔ اکثر دیہات کو نکل جاتا ہوں۔ سُنا تھا اِس گلی کے لوگ بہت شریف ہیں۔

میں تو تین ۳ ماہ سے اِس گلی میں رہ رہا ہوں۔ آج تک کسی شریف آدمی سے واسطہ نہیں پڑا۔

رحیم نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا۔

جی!

اُس نے حیرت بھری آواز میں کہا:

میں نے سُنا تھا......

یہ گلی اِتنی سُونی اَور سُنسان ہے کہ تین ۳ ماہ میں مَیں نے کسی اِنسان کو نہیں دیکھا۔ ہاں! البتہ کچھ سایے پاس سے گزر جاتے رہے۔ اِس لیے مَیں کیا جانوں کہ اِس گلی کے لوگ کتنے شریف ہیں!

ہم سایہ مسکرایا۔ اُس کے دانت زرد تھے' اَور ناہموار۔ رحیم نے ہم سایے کے خدوخال' ذہن میں محفوظ کرنے کے لیے اُس کے چہرے کو ذرا غور سے دیکھا۔ اُس کی ڈاڑھی دو تین دِن سے مُنڈھی نہیں تھی۔ گالوں پر چیونٹیاں سی چِمٹی معلوم ہوتی تھیں اَور اُن کے نیچے جِلد کا رنگ سبزی مائل زرد تھا۔ اُوپر کے ہونٹ پر مُونچھیں بھی تھیں جنھیں مروڑ کر نوک دار بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہونٹ زرد تھے اَور اُن پر پپڑی جمی ہُوئی تھی۔ ٹھوڑی تو محض براۓ نام تھی اَور آنکھیں اَندر کو دھنسی ہُوئی تھیں۔ بے جان سی آنکھیں جو کسی نقطے پر مرکوز نہ ہو سکتی تھیں' جو بہ یک وقت اُسے دیکھ بھی رہی تھیں اَور اُس سے اِغماض بھی برت رہی تھیں۔ پھر اُن میں چمک بھی نہیں تھی۔ ایک عجیب سا دُھندلکا چھایا تھا۔ رحیم نے ایک لمحے کے لیے اُن گدلی گدلی آنکھوں میں جھانکا تو وہ خلا میں گھورنے لگیں۔

آپ اِس مکان میں اکیلے ہیں؟

ہم سایے نے بے رنگ سی آواز میں پوچھا۔

جی ہاں!

رحیم نے جواب دیا۔

میں تو بال بچوں والا آدمی ہوں اَور ...... اَور ...... میں نے سُنا تھا' اِس گلی میں شریف لوگ بستے ہیں ...... بال بچے دار۔

جی! میں بال بچے دار تو نہیں' میرا خیال ہے کہ شریف ضرور ہوں۔

نیا ہم سایہ مسکرایا' بڑی پراگندہ سی مسکراہٹ ...... اَور اِس ایک مسکراہٹ کے بعد تعارُف ختم ہوگیا۔ ہم سایہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے گم ہوگیا اَور رحیم' مکان کو تالا لگا کر اَپنے کام پر چلا گیا۔ کام کے دوران میں ہم سایہ' سایے کی طرح اُس کے تصوّر کے ساتھ چِمٹا رہا اَور پھر اُس کے تصوّر میں رَچ بس بھی نہ سکا ...... سایے کی طرح گریزاں کہ روشنی میں آتے ہی غائب ہو جاتا۔ ابھی بند گلی نے اُس کی اِنسانیت سے خلوص نہیں برتا تھا۔

بند گلی کے نقطۂ اَنجام تک پہنچتے پہنچتے سہ پہر' شام میں بدل چکی تھی!

اُس نے تالے کو چابی لگائی تو اُس کے دامن کو جھٹکا سا لگا۔ اُس نے گھوم کر دیکھا تو ہم سایے کا ننھا بچّہ اُس کے دامن کو کھینچ رہا تھا۔ رحیم نے ایک جُھرجُھری سی لی۔

بھا!

بچے نے کہا اَور رحیم نے بند گلی کے ہونٹوں کا پہلا نغمہ سُنا۔ اُس کی رُوح نے کانپ کر پوچھا:

ننھے! تُو نے مجھے پکارا؟

بھا!

ننھے نے واقعی اُسے پکارا تھا۔ رحیم حیران ہوگیا۔ بند گلی کے ہونٹ کُھلے تھے یا اُس کے کانوں کو دھوکا ہُوا تھا! ننھے نے گُڑ کی بنی ہُوئی خطائی کا ایک ٹکڑا اُس کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا:

بھا!

رحیم نے ٹکڑا ہاتھ میں لیا۔ یہ رال سے بھیگا ہُوا تھا۔ اِس پر مٹی کی گیلی تہ چڑھی ہُوئی تھی۔ اُس نے ننھے کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا:

میں کھاؤں اِسے؟

ہاں!

نہیں بھائی، مجھے بُھوک نہیں۔ تم کھاؤ!

ننھے نے ٹکڑا واپس لے لیا اَور منہ میں ڈال لیا۔ ٹاٹ کے پیچھے سے ایک آواز آئی:

شوکی!

شوکی نے اُس کا دامن چھوڑ دیا اَور وہ لپک کر ٹاٹ کے پَردے کے پیچھے گم ہوگیا۔

پھر نہ جانے بند گلی کی شام، سہ پہر میں کیوں بدل گئی!

ایک کرن نے روشنی کا ایک تیر پھینکا جو اُس کے سینے میں پیوست ہوگیا۔

آج اِنسانیت تین ۳ ماہ بعد اُس سے ہم کلام ہُوئی تھی۔ بند گلی کی مُہر بہ لَب خاموشی ایک نغمے میں ڈھل گئی تھی: بھا!

....

شوکی!

بھا!

شوکی نے زمین پر سے اُٹھ کر کہا، جہاں وہ گندی مٹّی سے مکان بنا رہا تھا۔ اُس کے کپڑے مٹّی سے بھرے ہوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مٹّی سے لِتھڑے ہوئے تھے۔ اُس نے چہرے پر مٹّی مَلی ہوئی تھی۔

دوست! دیکھ تو سہی، تیرے لیے کیا لایا ہُوں؟

شوکی نے اِشتیاق بھری نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ اِن میں کبوتر کی آنکھوں کی معصومیّت تھی۔

پہلے اَپنے ہاتھ صاف کرلو!

شوکی نے کُرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھ لیے۔ رحیم نے برفی کی ایک ڈَلی اُس کے ہاتھ میں تھما دی۔ شوکی نے ایک لمحے کے لیے برفی کو دیکھا...... پھر ڈَلی کو منہ میں رکھ لیا۔

میٹھی ہے نا!

رحیم نے پوچھا۔ شوکی نے محض سَر ہِلا دیا۔ رحیم نے لفافہ اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ شوکی، لفافہ ہاتھ میں لے کر، اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے پوچھا:

یہ میلا ہے؟

ہاں بھئی!

رحیم نے مسکرا کر کہا اَور شوکی لفافہ لے کر اَندر بھاگ گیا۔

....

دیکھو دوست، مٹی سے نہ کھیلا کرو!

بھا!

شوکی کی کالی کالی آنکھیں حیران تھیں۔

مٹی سے مت کھیلا کرو!

مٹی سے؟

شوکی نے اَور بھی حیران ہو کر پوچھا۔

مٹی سے کھیلو گے تو کپڑے مَیلے ہوں گے۔ اچھّے بچّے مٹّی سے نہیں کھیلتے۔

شوکی اُٹھ کھڑا ہُوا، پر وہ حیران تھا۔ رحیم نے سوچا، یہ بچہ حیران کیوں ہے اَور پھر اُسے یاد آیا کہ اُس کے چھوٹے بہن بھائی بھی مٹّی سے کھیلتے تھے۔ مٹّی سے گھوڑے، گدھے اَور بَیل بناتے تھے، چھکڑے بنا کر تنکوں سے بَیلوں کے گلے میں جوا ڈالتے تھے۔ بچوں کو مٹی سے پیار ہوتا ہے۔ یہ اُن کی فطرت ہے، یہ تو جذبۂ تخلیق کا اِظہار ہے کہ مٹی سے پروان چڑھتا ہے اَور مرمریں مجسموں میں ڈھل جاتا ہے؛ اُسے کیا حق حاصل ہے کہ اِرتقا کے راستے میں چٹان بن کر کھڑا ہو جائے! اُس نے بالآخر کہا:

دیکھو دوست! مٹی سے کھیلو لیکن نالی سے مٹی مت لینا۔ وہ بہت گندی ہے۔

لیکن دُوسری شام شوکی مٹی سے نہیں کھیل رہا تھا۔

اُس کے ہاتھ میں ردّی کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا جس کے ساتھ کوئی گز بھر ڈور بندھی تھی۔ شوکی، پتنگ اُڑانے کی مشق کر رہا تھا لیکن گز بھر ڈور سے پتنگ کیا خاک اُڑتی! شوکی اُسے دیکھ کر ہمہ تن اِنتظار بن گیا۔ اُس نے اِشتیاق بھری آواز میں کہا:

بھا!

ہاں بھئی!

دیکھو تو!

شوکی نے پتنگ کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

واہ! بڑی اچھی پتنگ ہے۔

رحیم نے شوکی کی مسرّت میں شریک ہونے کی کوشش کی لیکن دُوسرے ہی لمحے اُسے ایک عجیب بے بسی کا اِحساس ہُوا۔ ردّی کاغذ کے ٹکڑے اَور گز بھر لمبی ڈور نے گویا اُس کا منہ چِڑا دِیا۔ اُس کے گلے میں پھندے سے لگ گئے، تاہم اُس نے ڈور کا ایک سِرا شوکی کے ہاتھ میں تھما کر اُڑانے کی کوشش کی۔

بند گلی کی ہوا، بے حس و حرکت تھی۔ پتنگ پھڑپھڑا بھی نہ سکی۔ رحیم نے کہا:

شوکی دوست، کل ہی تمھیں نئی پتنگ لا دیں گے۔ یہ کاغذ کا ٹکڑا تو اُڑنے سے رہا۔

اگلی سہ پہر کو شوکی اُس کے اِنتظار میں بند گلی میں بہت آگے نکل آیا تھا!

رحیم نے دُور ہی سے اُسے پتنگ دِکھائی۔ سُرخ رنگ کی چھوٹی سی پتنگ بڑی خُوب صُورت تھی۔

شوکی بے تحاشا دوڑ کر آگے بڑھا۔ وہ رحیم سے ٹکرا گیا تو اُس نے کہا:

لے شوکی! تیرے لیے پتنگ لے آیا ہوں۔

یہ میلی ہے؟

شوکی کی کبوتر ایسی آنکھوں میں مسرّت کی روشنی بھی تھی اور شک شبہے کا ہلکا سا غبار بھی۔

ہاں بھئی، یہ تیری ہے!

رحیم نے پتنگ شوکی کے ہاتھ میں تھما دی۔ دو پیسے کی پتنگ پاکر شوکی نے دُنیا کی ساری خوشیاں سمیٹ لیں۔

بند گلی کی ہوا میں حرکت نہیں تھی؛ پھر بھی رحیم نے ڈور کا ایک سِرا شوکی کے ہاتھ میں تھمایا، پتنگ اَپنے ہاتھ میں لی، ذرا دُور جا کر اُس نے پتنگ کو ہوا میں اُچھالا۔ بند ہوا، پتنگ کا بوجھ نہ سہار سکی۔ پتنگ زمین پر گِر گئی اور اُس پر مٹّی لگ گئی۔ شوکی مایوس ہوگیا تو رحیم نے سوچا: "یہ بند گلی تو کنجوس کا ہاتھ ہے کہ کسی کو مسرّت کی ایک جھلک بھی نہیں دِکھا سکتا"۔ اور اُس نے دُعا کی کہ بند گلی کا کوئی دریچہ کُھل جائے اور ہوا کا وہ جھونکا جسے وہ پیچھے کُھلی سڑک پر چھوڑ آیا تھا، گلی میں در آئے اور پتنگ ایک بار پھڑپھڑا کر اُڑے تو وہ شوکی کی آنکھوں میں مسرّت کی ایک جھلک ہی دیکھ سکے!

اور معجزانہ طور پر اُس کی دُعا قبول ہوگئی۔

گلی نے ایک سانس لیا۔ ایک جھونکا لرزتا، کانپتا آیا۔ رحیم نے پتنگ کو اُڑایا۔ پتنگ پھڑپھڑائی۔ دو چار لمحوں کے لیے ہوا میں معلّق رہی۔ تھوڑا سا اُوپر اُٹھی اور جھونکا گزر گیا تو نیچے گر پڑی۔ شوکی کِھلکھلا کر ہنسا:

بھا! پتنگ اُلی؟

ہاں دوست!

رحیم کی آواز پتنگ کی طرح لرز رہی تھی۔ اور پھر اُس کے پیچھے سے ایک منحنی سی آواز نے کہا:

شوکی! تم ہر وقت کھیلتے رہتے ہو۔

رحیم نے مُڑ کر دیکھا۔ شوکی کا باپ، سائیکل لیے کھڑا تھا۔ ٹُوٹے پُھوٹے سائیکل کا اِنجر پنجر ڈِھیلا تھا۔

کیریر پر کپڑوں کا ایک گٹھڑ بندھا ہُوا تھا۔ وہ دیہات میں سے پھیری کر کے آیا تھا۔ اُس کی مُونچھیں مہین دُھول سے اَٹی ہُوئی تھیں۔

شوکی! چلو اندر۔

اُس نے تھکی تھکی، مضمحل آواز میں کہا۔

شوکی سہم گیا۔ ڈور کا سِرا اُس کے ہاتھ سے پھسل کر گلی میں جا پڑا۔ وہ گھر جانے کے لیے مُڑا تو رحیم نے کہا:

شوکی بھئی! یہ پتنگ تو لے جاؤ۔

نہیں جی!

شوکی کے باپ نے چِڑی ہُوئی آواز میں کہا۔

کیوں صاحب؟

رحیم نے پوچھا۔

نہیں جی۔ بچّہ ہے، اِسے ہر وقت کھیلتے رہنے کا خبط ہو جائے گا۔

یہی تو عُمر اِس کے کھیلنے کی ہے۔

رحیم نے کہا۔

یہ پتنگ آپ نے اِسے لا کر دی؟

شوکی کے باپ نے پوچھا۔

جی ہاں!

کیوں؟

کیوں؟

رحیم نے حیران ہو کر شوکی کے باپ کا سوال دُہرایا۔ پھر اُس نے شوکی کے باپ کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔ اُس نے نظریں چُرا لیں۔ رحیم نے اِن نگاہوں کا پیچھا کیا لیکن یہ چھپتی بھاگتی نظریں اُس کے قابُو میں نہ آ سکیں۔ البتہ اِن آنکھوں سے جو کسی نقطے پر مرکوز نہ ہو سکتی تھیں، اُس نے ایک ہلکا سا سایہ لپک کر جُدا ہوتے دیکھا۔ اِس سایے کی ایک لرزِش اُس کی معصوم خوشی کی ایک کِرن کو گرہن بن کر چاٹ گئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ سُنّ ہو کر رہ گیا۔ دُوسرے لمحے، اُس نے جرأت سے شوکی کے باپ کے بازُو پر ہاتھ رکھ دیا۔ بازو کی ایک نَس پھڑکی، جیسے اجنبی ہاتھ کے لمس سے گھبرا گئی ہو:

آپ نے پہلے دِن کہا تھا کہ ہم سایے ماں جائے ہوتے ہیں۔

جی ہاں!

تو پھر میرے دوست شوکی کو پتنگ لے جانے دیجیے!

رحیم نے مسکرا کر کہا۔

شوکی کے باپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ رحیم نے ڈور لپیٹ کر پتنگ شوکی کے ہاتھ میں تھما دی۔ شوکی نے باپ کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ خلا میں گھورتی ہُوئی آنکھوں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اندھیرے کنویں کی تہ سے نکلنے والی ٹھٹھری ہُوئی سَرد آواز نے کہا:

لے لو!

....

اگلی سہ پہر کو گلی پھر سُونی اور اُداس تھی!

ایک دریچہ کھُلا تھا۔ پھر کسی ظالم ہاتھ نے بند کر دیا۔

شوکی آج اُس کا اِنتظار نہیں کر رہا تھا!

اُس نے چپکے سے مکان کا دروازہ کھولا۔ اندھیرے گھر کی سیلن اور سڑاند نے لپک کر اُس کا اِستقبال کیا۔ اُس نے چولھے کی آگ سُلگائی۔ دروازے میں کھڑے ہو کر شوکی کے گھر کی طرف دیکھا۔ ٹاٹ کا پَردہ بے جاں تھا۔ شوکی کے گھر سے کالا دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ وہ پھر باورچی خانے میں چلا آیا۔ پر اُسے چین نہ آیا۔ وہ بار بار دروازے سے باہر جھانکتا لیکن اُس کی نظر ٹاٹ کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر کُند ہو جاتی۔

آہستہ آہستہ گلی کا اَزلی اور اَبدی اندھیرا گہرا ہو گیا۔

اُس کا سینہ پھر وِیران اور سُنسان ہو گیا۔

یہ گلی! بند گلی!

....

علی الصّبح رحیم، کارخانے جانے کے لیے گھر سے نکلا تو ٹاٹ کا پَردہ ہِلا اور دو کبوتر جیسی معصوم آنکھوں نے، جن میں ابھی تک نیند کا خمار تھا، اُس پر بڑی محبت بھری نظریں ڈالیں۔ رحیم نے دھیمے سے پکار کر کہا:

شوکی!

شوکی پہلے ہچکچایا۔ پھر چوروں کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھا۔ رحیم نے اُسے گود میں اُٹھا لیا۔

شوکی دوست! تم کل کہاں تھے؟

بھا! پتنگ جل گئی۔

وہ کیسے؟

رحیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

ابّا نے ......

شوکی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو گر پڑے۔

ابّا نے ......؟

رحیم نے کرب سے نچلا ہونٹ کاٹ لیا۔ غصّہ پُھنکار کر ہونٹوں پر آیا۔ اُس کا تن بدن کانپا لیکن اُس نے غصے کا کڑوا گھونٹ پی کر کہا:

ہم اپنے دوست شوکی کو اور پتنگ لا دیں گے۔

اُس سہ پہر کو دفتر سے لوٹتے وقت اُس کی نظر ایک دُکان پر پڑ گئی۔ ایک شیشہ لگی الماری میں رنگا رنگ کے کھلونے سجے ہُوئے تھے۔ اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چند سکّے کھنکھنائے۔ مہینے کے آخری دِن تھے۔ پھر بھی اُس نے الماری کا پٹ کھلوایا۔ اپنی پسند کے دو۲ کھلونے چُنے۔ ٹین کی بنی ہوئی ننھی سی کار جو چابی دینے سے گھُوں گھُوں چلتی۔ اُون کا بنا ہُوا رِیچھ جو بھینچ کر چھوڑ دینے سے جھُوم جھُوم کر چلتا اور اُس کا سَر ہلتا رہتا: "بھالُو میاں!" رحیم نے مسکرا کر کہا۔

اِن دو۲ کھلونوں کے پیسے ادا کر کے اُسے عجیب سا اطمینان نصیب ہُوا حالاں کہ اُس کی جیب کافی ہلکی ہو چکی تھی۔ بند گلی میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے ایک سِرے سے دُوسرے سِرے تک نگاہ دوڑائی۔ اُسے شوکی نظر نہ آیا۔ اُس کا جی بیٹھ گیا۔ وہ جی کڑا کر کے گلی میں داخل ہُوا۔ گلی کا فاصلہ بے خیالی کے عالم ہی میں طے ہو گیا۔ اُس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو شوکی چُپکے سے اپنے گھر سے نکل آیا۔ شوکی نے پیچھے سے اُس کا دامن کھینچ کر کہا:

بھا!

شوکی تم آ گئے؟ اندر آؤ! آج ہم اندر بیٹھ کر کھیلیں گے۔ دیکھو تو ......

شوکی اُس کے ساتھ اندر آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ٹوٹا ہُوا فرش کہیں کہیں سے سلامت تھا۔ رحیم نے کار کو چابی دی اور اُسے ٹوٹے ہوئے فرش پر چھوڑ دیا۔ گھُوں گھُوں کار دوڑی ...... شوکی کی آنکھیں حیران ہو کر پھیلیں۔ پھر کار فرش کی ایک درز کے ساتھ ٹکرا کر اُلٹ گئی۔ اُلٹی کار کے پہیے گھومتے رہے۔ رحیم، کار کے اُلٹنے اور پہیوں کے گھومنے پر کھلکھلا کر ہنسا۔ بند مکان گونجا۔ یہ گونج گلی میں بکھر گئی۔ شوکی بھی اُس

کے ساتھ قہقہے لگاتا رہا...... ننھے ننھے قہقہے جن سے زِندگی اَور معصومیت کا رس بکھر رہا تھا۔ رحیم نے اِن قہقہوں میں اَپنی زندگی کا زنگ دُھلتے دیکھا۔

کار کے بعد رِیچھ کی باری آئی۔ رِیچھ جُھوم جُھوم کر سَر ہِلا ہِلا کر چلا۔ شوکی کی حیرت بھالُو میاں کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ عجب منظر تھا۔ پھر بھالُو میاں ایک درز میں پھنس گئے۔ اُن کا سَر بہ دستور ہِلتا رہا جیسے وہ بے بس ہو کر اَپنی بے بسی پر حیران ہو گئے ہوں: ''بھالُو میاں! خوب پھنسے''۔ رحیم نے کہا اَور شوکی کی حیرت پھر قہقہوں کی صُورت میں اُبل پڑی۔ اِن معصُوم قہقہوں میں گانے والی چڑیوں کی موسیقی تھی اَور نُقرئی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ نہ جانے سہ پہر نے کب آخری کِرن کا دان دیا' اندھیرے کب لپکے' اَور کب گلی کے آخری کونے کا گدلا سا لیمپ روشن ہُوا! وقت چُٹکیوں میں گزر گیا۔ کار اَور بھالُو میاں کی دوڑ میں لمحے یُوں بیت گئے جیسے کبھی زندگی کے ڈائل پر آئے ہی نہ تھے۔

پھر یکایک اندھیرے میں ایک تاریک سَرد سایہ لرزا:

شوکی!

کنویں سے نکلی ہوئی آواز میں غصے کی تھرتھراہٹ تھی۔ شوکی کا رُواں رُواں کانپ گیا۔

شوکی میرے ساتھ کھیل رہا ہے۔

رحیم نے کہا۔

اِتنی دیر ہو گئی اُسے گھر سے نکلے ہُوئے۔ واہ! آپ بھی حَد کرتے ہیں۔

جی!

رحیم نے فرش پر سے اُٹھتے ہُوئے کہا:

شوکی میرا دوست ہے۔ دو گھڑی مِل بیٹھتے ہیں تو جی لگ جاتا ہے۔ کبھی کبھار دیر بھی ہو جاتی ہے۔

نہیں جی!......

شوکی کے باپ نے خشونت سے کہا:

مجھے یہ بات پسند نہیں۔

میرا گھر' شوکی کے گھر سے کون سا کالے کوسوں پہ ہے! آپ فکر کیوں کرتے ہیں؟ ہم سایے ماں جائے......

ہم سایے جائیں بھاڑ میں!......

شوکی کے باپ نے نفرت کا زَہر اُگلا:

میں نے تو اُن ہم سایوں کو ماں جائے کہا تھا جو شریف اَور خاندانی ہوں!

رحیم ایک لمحے کے لیے بُجھ کر رہ گیا۔ دُوسرے لمحے اُس نے قہقہہ لگا کر کہا:

تو بھائی جان! میرے شریف ہونے میں آپ کو شک ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مَیں شوکی میاں کو آپ سے چھین کر لے جاؤں گا؟ اجی! شوکی آپ کا بیٹا ہے اَور میرا جانی دوست۔

مجھے میٹھی میٹھی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ میں اِن کا مطلب خوب جانتا ہُوں۔

مطلب؟

رحیم نے حیران ہو کر کہا۔

بابُو! شوکی سے دوستی تو ایک بہانا ہے۔ میں تم لوگوں کو خوب جانتا ہُوں!

بہانا!......

رحیم نے لرز کر پوچھا:

کس بات کا بہانا؟

ہم سایے نے کوئی جواب نہ دیا تو رحیم نے اُسے بازُو سے پکڑ لیا۔ اَب اُس کی گرفت میں شفقت اَور ہم دردی جیتنے کی اَدائے پُرخلوص نہیں تھی ...... غُصّہ تھا۔ ہم سایے کا دُبلا پتلا بازُو سُوکھی لکڑی کی طرح کڑکڑایا۔ اُس نے اچانک خوف سے چیخ کر کہا:

چھوڑ دے مجھے ...... بدمعاش، لُچّا، لفنگا!

رحیم نے کہا:

دیکھ، کسی کی شرافت پر شک کرنا آسان بات نہیں ...... میں بچّوں کو چُراتا ہُوں کیا ...... تُو نے مجھے بردہ فروش سمجھا؟

بند گلی میں کچھ اَور سایے لپکے۔ یہ سایے اُس کے پاس سے چُپکے سے گزر جایا کرتے تھے۔ آج یکایک کایا پلٹ کر اِنسان بن گئے:

بابُو! جوانی کا خون جوش مار رہا ہے۔ تُو نے کم زور آدمی پر ہاتھ اُٹھایا۔ ہم تو شروع ہی سے جانتے تھے' تو منہ زور گھوڑے کی طرح کسی کو ضرور کچل ڈالے گا!

اِس نے مجھ پر خواہ مخواہ اِلزام لگایا۔ میں بچّوں کا چور ہُوں کیا؟ شوکی تو میرا دوست ہے!

شور و غُل میں اُس کی بات کسی نے نہ سنی۔ اُس نے ہم سایے کا بازُو چھوڑ دیا۔ ہم سایے نے شوکی کو بازُو سے پکڑ کر گھسیٹا تو رحیم نے کہا:

شوکی! یہ کھلونے تو لیتے جاؤ!

اُس نے اندھیرے میں فرش کو ٹٹولا اَور کھلونے ڈھونڈ کر شوکی کی طرف بڑھائے مگر اُس کا ہاتھ

اندھیرے خلا میں معلق ہو گیا۔ لوگ چلے گئے اَور اندھیرا ایک کرِ ویرانوں کا سُکوت بن گیا۔

پھر اُس نے ہم سایے کے گھر سے شوکی کے چیخنے کی آواز سُنی۔ اُس نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں۔ زخمی شیر کی مجروح وحشت چیخی۔ جوان خُون کھَول اُٹھا۔ کئی بار وہ گلی میں گیا اَور لَوٹ آیا۔ آخر اُس نے تالا لگایا اَور شہر کی سڑکوں پر پھرنے لگا۔ اُس کا جی نہ چاہا کہ وہ بند گلی کی طرف لَوٹ کر جائے۔ وہ اپنے کارخانے کی طرف چلا گیا۔ گیٹ کے باہر چوکی دار اُونگھ رہا تھا۔ رحیم نے کہا:

آج رات مَیں تیرے پاس رہوں گا۔

بابُو رحیم! کیا بات ہے؟

کچھ بھی نہیں۔

....

صبح اُس نے کارخانے کے چند دوستوں کے ساتھ بند گلی کی تنہائی کا ذِکر کیا۔ اُن میں سے دو کو حال ہی میں کوارٹر مل چُکا تھا۔ طے یہی پایا کہ تیسرا بھی کسی کونے میں سکڑ سمٹ کر گزارا کر سکتا ہے، مگر سہ پہر کو جب وہ اَپنی گلی میں گیا تو کچھ لوگوں نے اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے اُسے لال آنکھوں سے گھُورا۔ ایک نے مُونچھوں کو مروڑ کر بڑی نخوت سے کندھے جھٹکائے اَور اُسے غصہ آ گیا۔ اگر وہ اَب گلی چھوڑ کر چلا گیا تو لوگ سمجھیں گے...... ایک ہی دھمکی میں مَر گیا بُزدِل! اُس کی جوانی نے شکست قبول کرنے سے اِنکار کر دیا۔

دُوسرے دِن اُس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ وہ مہینہ ختم ہونے کے بعد مکان چھوڑ دے گا۔

مہینے کے ختم ہونے میں چند دِن باقی تھے، پر گلی کا اَزلی اَور اَبدی اندھیرا اَور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ بند مکان کی سِیلن اَور سڑاند اُس کا گلا گھُونٹنے لگیں۔

کمیٹی کا گدلا سا لیمپ اندھیروں کی آنکھ کا آنسُو لگتا تھا کہ ٹپک نہ سکتا اَور گلی کی تنہائی نے شوکی کو بھی نگل لیا تھا۔ متواتر تین۳ دِنوں سے وہ شوکی کی جھلک تو کیا اُس کی آواز بھی نہ سُن سکا تھا۔

ایک سہ پہر کو اُس نے شوکی کے باپ کو دیکھا۔ اُس کی آنکھیں حسبِ معمول کسی نقطے پر مرکوز نہ تھیں، گویا وہ ہر چیز کو دیکھ بھی رہی تھیں اَور اُس سے اِغماض بھی برت رہی تھیں۔ اُس کا منہ لٹکا ہُوا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک بوتل تھی جس میں گدلے رنگ کی دوائی بھری ہُوئی تھی۔ رحیم کا کلیجا منہ کو آ گیا۔ نہ جانے کیوں!

صبح جب وہ کارخانے جانے کے لیے اَپنے گھر سے نکل رہا تھا تو اُس نے شوکی کے باپ کو دیکھا کہ سائیکل کے کیریر پر کپڑوں کا گٹھڑ باندھے گلی سے نکل رہا ہے۔ اُس نے مکان کو تالا لگایا۔ شوکی کا

باپ گلی کے موڑ پر غائب ہو گیا۔

اُس نے دھیمی سی آواز میں کہا:

شوکی میاں!

اُس کی آواز ٹاٹ کے ساتھ ٹکرا کر چُور چُور ہو گئی۔ اُس نے دوبارہ شوکی کو پکارا‘ سہ بارہ...... اَور ...... پھر پردے کے پیچھے سے ایک غم زدہ آواز نے کہا:

بھائی جان! شوکی تو بیمار ہے۔

بیمار ہے؟

رحیم نے لرزتی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

اُس کے سینے میں جلن سی پیدا ہُوئی۔ درد کی ایک ٹِیس اُبھری۔ اُس نے گھبرا کر کہا:

مجھے اِجازت دیجیے‘ ذرا شوکی سے مِل لُوں!

نہیں جی۔

آنسوؤں میں اُلجھی ہُوئی آواز نے کہا۔

بہن! آپ جانتی ہیں‘ مجھے شوکی سے پیار ہے۔ وہ مجھے ”بھا“ کہہ کر پکارتا ہے!

لوگ کیا کہیں گے۔ شوکی کا ابّا بہت شکی ہے۔ نہیں جی!

رحیم کی ٹانگیں لڑکھڑائیں۔ اُس کے کانوں میں دِل دوز چیخوں کا شور اُٹھا۔ شوکی کے باپ نے اُس پر کتنا بڑا اِتّہام لگایا تھا۔ اُس کی جوانی کی کتنی تذلیل ہُوئی تھی! اَب اُسے پتا لگا کہ شوکی کا باپ اُس کی اَور شوکی کی محبّت کے درمیان کیوں حائل ہو گیا تھا! گویا شوکی کی محبّت ایک پُل تھی جس پر سے گزر کر وہ شوکی کی ماں تک پہنچنا چاہتا تھا۔

شوکی کی ماں ...... ماں! ...... بہن!

اُس کی جوانی کو اُبکائی سی آئی‘ جیسے کسی نے گلی کی ساری غِلاظت اُس کے مُنہ میں ٹھونس دی ہو!

ماں! ...... بہن!

بند گلی نے اُسے شکست دے دی تھی!

☆☆☆

گُل بانو

گُل بانو چھ٦ سال کی ایک ننھی مُنّی گُڑیا سی بچّی تھی۔ اُس کے رُخسار، دمیدہ پُھول تھے کہ جن کی شبنم آمیز سرخیوں میں ابھی آگ کا اِحساس نہیں ہوتا تھا۔ آنکھیں، بڑی بڑی تھیں اَور ہر دم حیران و محجوب سی نظر آتیں۔ بال، پیشانی پر سے کٹے ہوئے تھے۔ لباس میں پنجابیت اَور اَفغانیت کا بڑا دِل کش اِمتزاج تھا۔ شلوکا، گھٹنوں سے بھی نیچے تک پہنچتا تھا۔ گریبان پر سُرخ پُھول کڑھے ہوئے تھے۔ پنجابی طرز کی شلوار زیادہ گھیرے دار نہیں تھی۔ اُس کے لہجے میں بڑی مِٹھاس تھی۔ وہ میرے گھر کے آنگن میں آکر سعیدہ سے کھیلتی تو صحن میں بلبل کے چہچہوں کی معصُومیّت بکھر جاتی۔ میں اِن دونوں بچّیوں کو اکٹھے کھیلتے دیکھ کر ایک پُراَسرار رُوحانی بالیدگی محسوس کرتا تھا۔

گُل بانو کے باپ، خان صاحب میرے ہم سایے تھے بلکہ میرے اَور اُن کے گھر کے درمیان میں صرف ایک دیوار حائل تھی لیکن اُس دیوار میں کوئی اَیسا روزن نہیں تھا کہ اَجنبیّت کا اِحساس دُور ہو سکے۔ میری بیوی، خان صاحب کی بیگم کی کم آمیزی بلکہ عدم آمیزی کی ہمیشہ شاکی رہا کرتی تھیں۔ میں بذاتِ خود خان صاحب سے بے تکلّف ضرور تھا مگر اِس بے تکلفی کا ماحول بھی بڑا گُھٹا گھٹا سا تھا۔ صرف گل بانو کا وجود ایک نازک سا رِشتہ تھا جس نے پنجابی اَور سرحدی مزاج میں کچھ ہم آہنگی پیدا کر دی تھی۔

سردیوں کی لمبی راتوں کا پہلا حِصّہ اکثر خان صاحب کی بیٹھک میں گزرتا۔ اُن کی بیٹھک میں دری کا فرش ہوتا اَور فرش پر دو چار گاؤ تکیے لگے ہوتے۔ خان صاحب مغرب کی نماز کے بعد بیٹھک میں آبیٹھتے۔ سامنے پشاوری حُقّہ ہوتا، اُس پر ہر دس منٹ بعد سُلفا جمتا۔ خان صاحب ماچس سے آگ دِکھاتے اَور بھرپُور کَش لے کر دُھویں کا ایک سیاہ مرغولہ چھوڑتے۔ تمباکو بھک سے بھڑک اُٹھتا۔ چند کشوں کے بعد کمرہ دُھویں سے اِتنا بھر جاتا کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا۔

ابھی تاش کی بازی شروع نہ ہوتی کہ گل بانو نظریں جُھکائے اَندر سے سماوار لے آتی۔ یہ سماوار ایک ننھا سا حمام تھا کہ اِس کے اَندر ہی کوئلے سُلگ رہے ہوتے۔ دُوسری بار وہ ایک خُوب صُورت سینی میں

چائے کی سُبک سی پیالیاں اَور چائے دانی لے کر آتی ۔ وہ میری طرف کَن اکھیوں سے دیکھ کر ضرور مسکراتی ۔ میں کہتا:

بیٹی گل بانو! آج تم ہمارے گھر نہ آئیں؛ سعیدہ تمھارا اِنتظار کرتی رہی ۔ آج اُسے مَیں نے بڑی چھیل چھبیلی سی گڑیا لاکر دی ہے ۔

خان صاحب گل بانو کی طرف بڑے عجیب اَنداز میں دیکھتے ۔ گل بانو سہم کر پیچھے ہَٹ جاتی ۔ میں خان صاحب کی آنکھوں میں جھانکتا تو مجھے اُن میں ایک عجیب سی جھنجھلاہٹ کا احساس ہوتا' جیسے وہ گل بانو کے وجود کو طوعاً و کرہاً برداشت کر رہے ہوں ۔ مجھے سہمی ہُوئی گل بانو پر بڑا ترس آتا ۔ گل بانو پلٹ کر میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتی جیسے میری محبت آمیز بات کا شکریہ اَدا کر رہی ہو ۔ اُس وقت میرا سینہ درد اَور سوز سے سُلگ اُٹھتا ۔

خوچہ لودی! ......

خان صاحب میری توجّہ اپنی طرف مُنعَطِف کراتے ہُوئے کہتے :

یہ چودری صاحب نماز کے بعد اللہ کی بوت خوشامد کرتا ہے ۔ دیکھو! ابھی تک نہیں آیا ۔

میں خان صاحب کی بات کا جواب نہ دیتا لیکن مجھے محسوس ہو جاتا کہ میں نے بے تکلفی کی حدِ فاصل سے ایک قدم آگے بڑھا دیا ہے اَور خان صاحب میری اِس جسارت کا مجھے احساس دِلا رہے ہیں ۔

گئی رات تک تاش کھیلی جاتی ۔

خان صاحب چائے بناتے اَور بانٹتے رہتے ۔ میں اَور چودھری صاحب پارٹنر ہوتے ۔ خان صاحب اَور ملک صاحب ساتھی ہوتے ۔ جیت اکثر خان صاحب کی ہوتی ۔ اگر کبھی کبھار ہم بازی جیت لیتے تو خان صاحب جُز بُز ہو کر قہقہہ لگاتے :

خوچہ! چودری صاحب! آج آپ کا خوشامد اللہ کو اچھا لگا کہ آپ جیت گیا ۔

نہیں خان صاحب! میری دُعا کیا قبول ہوتی ۔ نماز پڑھنے کے دوران میں آپ کا جلالی چہرہ نگاہوں کے سامنے رہا اَور میں کانپ کانپ جاتا رہا ۔

میری نظر غیر شعوری طور پر خان صاحب کے چہرے پر جا ٹکتی ۔ گہرے سُرخ رنگ میں شُعلوں کی لپک محسوس ہوتی ۔ بڑے بڑے گل مچھوں کی نوکیں قطب صاحب کی لاٹ تھیں کہ رُعب سے جسم پر تھرتھری طاری ہو جاتی ۔ گھیر دار شلوار اَور زرتار صدری میں لپٹا ہُوا وَجِیہ جسم بذاتہ کوہ شکن نظر آتا اَور اُس پر خان صاحب کے اَفغانی لہجے کا آہنگ' گویا بجلیوں کی گھن گرج مسلسل ہو گئی تھی ۔

خان صاحب کے دادا سب سے پہلے اِس قصبے میں آئے۔

خان صاحب کی اپنی روایت کے مطابق وہ کسی "تربور" کو قتل کر کے اِس دُور اُفتادہ شہر میں پناہ گزیں ہوئے تھے اَور حفظِ ماتقدّم کے طور پر ہینگ، گرم مصالحے اَور سلاجیت کا ایک تھیلا بھی کندھے پر اُٹھالائے تھے۔ ایک بنیے کی دُکان کے تھڑے پر پھَڑ جما کر بیٹھے تو اُٹھنے کا نام نہیں لیا۔ بے چارے بنیے نے مجبور ہو کر اُنھیں بازار میں ایک چھوٹی سی دُکان لے دی۔ کچھ مدّت بعد مرحوم اپنے بیوی بچّوں کو بھی دُشمنوں کے نرغے سے نکال لائے۔ سارے بچّوں میں سے صرف خان صاحب کے والدِ محترم پروان چڑھ سکے۔ اُنھوں نے ہینگ اَور گرم مصالحے کی جگہ پشاوری لنگیوں، ٹوپیوں اَور کُلاہوں کی تجارت شروع کر دی۔ خان صاحب بھی اِکلوتے بیٹے تھے، جب جوان ہوئے تو تجارت عُروج پر تھی۔ اُن کے والد اُنھیں ساتھ لے کر وطن گئے اَور واپس آئے تو خان صاحب کے ساتھ خالِص اَفغانی نسل کی تن دُرُست اَور صحّت مند دلھن بھی تھی، لیکن اَب تک خان صاحب کے مزرعِ حیات میں صرف ایک پھُول کھِل سکا تھا اَور وہ گل بانو تھی۔

ایک رات چودھری صاحب اَور ملک صاحب خلافِ معمول دیر تک نہ آئے۔ خان صاحب جُز بُز ہوتے رہے۔ میں نے اُنھیں اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگائے رکھا۔ بیٹھک کا دروازہ اَندر کی طرف سے کھلا اَور حسبِ معمول گل بانو سماوار لے کر آئی۔ خان صاحب نے سماوار لے کر فرش پر رکھا اَور گل بانو میری طرف ایک بار دیکھ کر اَندر چلی گئی۔ خان صاحب بولے:

لودی صاحب! اَم نے سُنا ہے، آپ اپنی لڑکی کو مدرسے بھیج رہا ہے۔

کل داخل کروانے کا خیال ہے۔

لودی صاحب! یہ اچھا بات نہیں۔ اَم گل بانو کو مدرسے نہیں بھیجے گا۔

یہ آپ کی مرضی ہے لیکن گل بانو کے اَن پڑھ رہنے کا ذِمّے دار کون ہوگا؟

دیکھو لودی! اَمارا غیرت برداشت نہیں کرتا۔ اَم نے سنا ہے، عورت پڑھ لکھ کر مَردوں کو خط وَط لکھتا ہے۔

خان صاحب کی آواز میں غُصّہ تھا۔

خان صاحب! آپ نے پڑھ لکھ کر کتنی عورتوں کو خط لکھے؟

میرے لہجے میں دھیمی سی آنچ تھی۔

خوچہ! اَم شریف باپ کے بیٹے تھے۔

تو گل بانو بھی ایک شریف باپ کی بیٹی ہے۔

خان صاحب چُپ ہو گئے۔

اور دُوسرے دِن صبح صبح خان صاحب کی نوکرانی، گل بانو کو ساتھ لیے ہمارے گھر آئی۔ گل بانو نے نئے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں نیا سِلا ہُوا بستہ اور تختی تھی۔ میں حیران ہو گیا۔ گل بانو بے اِنتہا خوش تھی۔ اُس کے چہرے پر اُس پرندے کی سَرخُوشی اور بے یقینی تھی جسے پہلی بار اُڑنے کے لیے پَر ملے ہوں۔ گل بانو کی آنکھوں میں خوشی میرے دِل میں ایک سَرمدی کیف بن کر اُتر آئی۔ میں نے چاہا کہ میں دونوں بچّیوں کو خود سکول پہنچا کر آؤں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے بدلے۔ اِس عرصے میں میرا بڑا بیٹا شاہد بھی سکول جانے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ شاہد پانچویں جماعت کا طالب عِلم تھا۔ وہ نِیکر اور بُشرٹ میں بڑا سجیلا لگ رہا تھا۔ اُس کے کندھے سے کتابوں کا تھیلا لٹکا ہُوا تھا۔ چشمِ بد دُور! اور میں نے اپنی نظروں سے بھی پناہ مانگی۔

سعیدہ نے میرے دائیں ہاتھ کی اُنگلی پکڑ لی۔ گل بانو کچھ عرصہ میرے پہلو میں سُکڑی سِمٹی چلتی رہی اور پھر نہ جانے اُسے کیا خیال آیا کہ اُس نے میرے بائیں ہاتھ کی اُنگلی تھام لی۔ اِس لمس پر میری رگِ جاں کانپی۔ میں نے دُودھ سے لبریز ایک نہر کا تصوّر کیا جو کناروں سے چھلک رہی ہو۔ گل بانو کی آنکھوں کی ڈری سہمی معصوم سی بے تکلفی میرے دِل میں اُتر آئی۔ میری آنکھوں سے بے ساختہ دو آنسو ٹَپ ٹَپ گرے۔ نہ جانے کیوں؟

وقت پَر لگا کر اُڑا!

سعیدہ اور گل بانو، دونوں آٹھویں میں پاس ہوگئیں تو شاہد بھی بی اے کے پہلے سال میں پہنچ گیا۔ اُس کی مَسیں بھیگ چکی تھیں۔ وہ کالج کا درجۂ اوّل کا کِھلاڑی تھا۔ اُس کے جسم میں بلا کا توازن اور شبابِ نوخیز کا اِضطراب تھا۔ لیکن اُس کی رُوح میں بڑا حُسن اور وَقار تھا۔ وہ سنجیدہ اور متین تھا لیکن اِس کے باوجود، جب وہ گھر میں موجود ہوتا تو مجھے کونے کونے میں چاندنی اور دُھوپ کا مِلا جُلا نکھار نظر آتا اور ماحول کا ایک ایک ذرّہ مسکراتا ہُوا محسوس ہوتا۔ نہ جانے زندگی کے کون سے سوتے پُھوٹ بہتے کہ میں کوثر و تسنیم کی لہروں میں ڈوب جاتا۔ میں نے اُسے کبھی اُونچی آواز میں بات کرتے نہ سُنا لیکن اُس کی موجودگی میں چار کُھونٹ سے اُبلتے ہُوئے قہقہے بھی فردوسِ گوش بن جایا کرتے تھے۔

ایک دِن مَیں نے سعیدہ کو بُرقع میں ملبوس دیکھا تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ سعیدہ اپنی امّی کے ساتھ نویں جماعت میں داخلہ لینے جا رہی تھی؛ اُن کے ساتھ گل بانو نہیں تھی۔

میں نے پوچھا:

سعیدہ تمھاری سہیلی گل بانو کہاں ہے؟

وہ اَب اور آگے نہیں پڑھے گی ابّا جان!

کیوں؟

مجھے معلوم نہیں۔

اُس شام خان صاحب نے مجھے بیٹھک میں بُلایا اَور آنکھوں میں غَیظ وغضَب کی آگ بھر کر پوچھا:

خوچہ لودی! تم کیسا پٹان ہے؟

کیوں خان صاحب! میں نے کون سا غیر پٹھانی کام کیا ہے؟

تم نے اپنی لڑکی کو پھر سکول میں داخل کرا دیا ہے۔

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں نے کہا:

جی ہاں! اَور میں نے کوئی اَخلاقی اَور سماجی جُرم نہیں کیا۔

ہم اِس کو اچھا نہیں سمجھتا۔ جوان لڑکی کو...... خوچہ...... اَم......

لیکن ہم اِس کو اچھا سمجھتا ہے کیوں کہ ہم آپ کی طرح جاہِل نہیں۔ دیکھو خان صاحب! آپ تین پشتوں سے پنجاب میں رہ رہا ہے۔ آپ کو اِس معاشرت سے پیار نہیں ہُوا۔ آپ جان بُوجھ کر ہم میں رچتا بستا نہیں اَور پھر خان صاحب، ہم جانتا ہے کہ گل بانو کو آپ اس لیے نہیں پڑھاتا کہ وہ بدقسمتی سے لڑکا نہیں، لڑکی ہے اَور لڑکی پر کچھ خرچ کرنا آپ کے نزدیک روپیہ برباد کرنا ہے۔

لودی صاحب!

خان صاحب کے گل مُچھے پھڑپھڑائے اَور ہونٹ کانپے لیکن مَیں تن کر اُن کے سامنے کھڑا رہا۔ اُن کے انگ انگ سے شعلے نکل رہے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ آگ کا لپکا بن کر اَندر چلے گئے۔

گل بانو گویا پنجرے میں مقیّد ہو کر رہ گئی۔

وہ میری بیٹی کی سہیلی تھی۔ میں اُسے اَپنے گھر میں سعیدہ کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اُس کی تصویر ابھی تک میرے پردۂ ذہن پر مُرتسم تھی جب اُس نے جھجکتے جھجکتے میری اُنگلی تھام لی تھی۔ میں نے بعد اَزاں جب بھی اُسے دیکھا، بچپن کے آئینے میں دیکھا...... وُہی معصومیت، وُہی مِٹھاس، وُہی ڈری سہمی بے تکلفی جو ماں کا دُودھ بن کر میری آنکھوں سے ٹپک گئی تھی۔

گل بانو مجھے محبت سے آغا جان کہتی تھی اَور میں نے کئی بار دِل ہی دِل میں خواہش کی تھی کہ میری بیٹی سعیدہ بھی مجھے ابّا جان کے بجائے آغا جان کہہ کر پکارے اَور اَب کئی دِنوں سے گل بانو کو نہ دیکھ کر مجھے عجیب بے چینی کا اِحساس ہو رہا تھا جیسے میری زندگی سے کوئی فعّال رَمَق خارج ہو کر رہ گئی ہو!

اَور ایک دِن خلافِ توقّع صبح صبح گل بانو ہمارے ہاں آ گئی۔

میں دفتر جا رہا تھا۔ گل بانو نے مجھے دیکھ کر کہا:

سلام آغا جان!

کہو گل بانو! بڑے دِنوں بعد نظر آئی ہو؟

بڑے آغا گھر سے نکلنے ہی نہیں دیتے۔

کیوں؟ ہمارے ہاں آنے میں کیا ہرج ہے! سعیدہ تمھارے ہاں نہیں جایا کرتی؟

سعیدہ بہن آتی ہیں، پر بڑے آغا' میرا کسی سے مِلنا مُلنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں، سکولوں میں پڑھنے لکھنے والوں سے میل جول اچھا نہیں۔

میرے جسم و جاں پر ایک چنگاری سی گِری۔ میں نے تڑپ کر بڑی خشونت سے کہا:

سعیدہ کو منع کر دُوں گا۔ وہ آئندہ تمھارے ہاں نہیں جایا کرے گی۔ اَور بیٹی گل بانو! بہتر ہے تم بھی ہمارے ہاں نہ آیا کرو۔ کہیں خان صاحب کوئی ایسی وَیسی بات نہ کہہ دیں۔

میں نے آگے بڑھ جانا چاہا تو گل بانو نے میرا دامن تھام لیا:

آغا! آپ ناراض ہو گئے؟

ابّا جان!

سعیدہ نے مجھے متوجّہ کرنے کے لیے پکارا۔

میں نے پیچھے مُڑ کر دیکھا تو گل بانو رو رہی تھی۔ آنسو چھَم چھَم برس رہے تھے۔ میرے غصے کی آگ شُوں شُوں بُجھ گئی۔

میں نے کہا:

گل بانو' مجھے معاف کر دو!

معاً شاہد کالج جانے کے لیے تیار ہو کر نکلا۔

اُس نے گل بانو پر چھلکتی ہُوئی نگاہ ڈالی اَور قدم بڑھا لیے۔ اُس کے اَنداز میں مجھے ایک بڑے نرم خرام تغیر کا احساس ہُوا' جیسے کسی نے پُرسکوں پانی کی ایک گہری جھیل میں ایک ننھا سا کنکر پھینکا ہو اَور جو ایک غَیر مَرئی حلقہ بن کر فوراً ٹوٹ گیا ہو۔ ایک سَرد لہر آئی اَور میرا رُواں رُواں خنک ہو کر رہ گیا۔

میں نے ایک مدّت بعد نظر اُٹھائی تو سعیدہ گل بانو کو کوئی کتاب دے رہی تھی۔ وہ بُت بنے کھڑی تھی۔ اُس کی پلکوں پر ابھی تک آنسو لرز رہے تھے۔ اَور اُس کے شہاب رنگ چہرے پر شفق پھیل رہی تھی اَور سمٹ رہی تھی۔

میں کئی دِنوں تک خان صاحب کے ہاں نہیں گیا!

میں جانتا تھا کہ خان صاحب سُونی محفلوں کو زیادہ عرصہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ چناں چہ

ایک دِن چودھری اَور ملک صاحبان آئے اَور مجھے پکڑ کر خان صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ میں نے اَور خان صاحب نے ایک دُوسرے سے معافی مانگنے کا رسمی تکلف بھی نہ برتا۔ تاش کی بازی شروع ہوئی، گرم گرم چائے کا دَور چلا اَور سارے گِلے شکوے بھاپ بن کر اُڑ گئے۔

ایک رات جب ہم تاش کھیلنے کے لیے خان صاحب کی بیٹھک میں جمع ہُوئے تو ایک اجنبی کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکے۔ خان صاحب نے فوراً تعارف کروا دیا:

لودی صاحب! یہ خان محراب گل ہیں۔ خان، اِدھر جو نہر بنتا ہے، اُس کا ٹھیکے دار ہے۔

ہم نے باری باری ہاتھ مِلایا۔ خان کی گرفت میں فولاد کی سختی تھی لیکن محبّت کی گرم جوشی کا فقدان تھا۔ محراب گل، خالص سرحدی پٹھان تھا۔ بڑا وَجیہ نوجوان تھا۔ گھیر دار شلوار پر لمبا کُرتا پہنے ہوئے تھا، جس کے گریباں پر گُل بُوٹے تھے۔ ریشمیں صدری پر زرتار کا کام اِس فیاضی سے ہوا تھا کہ وہ مرصّع غزل محسوس ہوتی تھی اَور مقابلے میں ہمیں اَپنے لباس معرّا اَور سادہ نثر کے بے رنگ ٹکڑے نظر آئے۔ مُونچھوں پر بھی اِسی فیاضی بلکہ فضول خرچی کا اِحساس ہوتا تھا۔ بڑے بڑے گل مچھُوں میں سنہری رنگ کی جھلک تھی اَور اُن کے خم، فن کارانہ مستقل کاوِش کے شاہ کار تھے!

محراب گل بڑا خاموش طبع شخص تھا۔ وہ چِلَم پر چِلَم پیتا رہا اَور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر دُھویں کے بادل اُڑاتا رہا۔ کمرے میں ایک ناگوار سی بُو پھیلتی رہی۔ جب ہم رُخصت ہُوئے تو میرا سَر چکرا رہا تھا۔ چودھری کا خیال تھا کہ محراب گل چِلَم میں چرس مِلا کر پیتا رہا ہے۔

چند دِنوں بعد خان صاحب نے مجھے خاص طور پر بلایا۔

اُنھوں نے کہا:

لودی صاحب! اَم آپ سے ایک مشورہ مانگتا ہے۔

میں ہمہ تن متوجّہ ہو گیا کیوں کہ مجھے خان صاحب کو مشورہ دیتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ خان صاحب اُس وقت مشورہ طلب کرتے جب ایک فیصلہ اُن کے ذہن میں پرورِش پا کر آخری مرحلے پر پہنچ چکا ہوتا۔ مجھے بہت سوچنا پڑتا مبادا کہ میرا مشورہ اُن کی اَنانیت سے جا بِھڑے!

میں نے کہا:

فرمایئے خان صاحب!

خوچہ! محراب گل اَپنا وَطنی ہے۔ وہ اَم سے کہتا ہے، اَم اُس کے ساتھ ٹھیکے داری میں شرکت کرے۔

مجھے اِس کا تجربہ نہیں ہے خان صاحب!

اَم جانتا ہے۔ ٹھیکے داری بڑے منافع کا کام ہے۔
تو شرکت کر لیجیے۔ لیکن ذرا سوچ سمجھ کر!

میں نے خان صاحب کے دِل کی بات کہہ دی۔ اِس لیے وہ بڑے خوش ہُوئے۔
اَم نے سوچ لیا ہے۔

اِس کے بعد ہماری رات کی محفلیں درہم برہم ہوگئیں۔

خان صاحب نے دُکان بند کر دی۔ وہ کئی کئی دِن گھر نہ آتے۔ کبھی کبھار سَرِ راہے علیک سلیک ہو جاتی۔ محراب گل ہم زاد کی طرح اُن کے ساتھ رہتا۔ خان صاحب کہتے:
لودی صاحب! اَم کو اَب مالم ہُوا ہے' پیسہ کمانا ہو تو ٹھیکے داری کا کام کرو!

اَور اِس طرح دو۲ سال گزر گئے۔

خان صاحب کا ٹھیکا ختم ہو گیا۔ نہر میں پہلا ریلا آیا اَور اُس کی رَو میں خان صاحب کا سرمایہ بھی تنکے کی طرح بہ گیا۔ لیکن خان صاحب نے اَپنے نقصان کا کسی سے ذِکر نہ کیا' اُن کی دُکان خالی ہوگئی۔ بعض لوگ کہتے کہ خان صاحب نے اَپنا مکان بھی کسی کے پاس رہن رکھ دیا ہے۔ سبھی کہتے کہ اَب خان صاحب کے پاس پُھوٹی کوڑی تک نہیں۔ میں خان صاحب سے اِظہارِ ہم دردی کی جرأت بھی نہ کر سکا۔

تاہم خان صاحب اَب بھی اَپنی ظاہری وضع داری سے کنارہ کش نہ ہُوئے۔ مدّتوں بعد پھر اُن کی بیٹھک میں محفل جمی۔ تاش کی کئی بازیاں ہوئیں۔ معمول کے خلاف آج خان صاحب ہار پر ہار کھاتے چلے گئے۔ آخر اُنھوں نے تاش کی گڈّی فرش پر پھینک کر کہا:
اَماری قسمت کا ستارہ گردِش میں ہے۔

اُن کی مُونچھیں بڑے غم بھرے اَنداز میں تھرتھرائیں۔ مجھے خان صاحب پر بڑا رحم آیا لیکن میں نے نوکِ زباں پر آئے ہُوئے ہم دردی کے اَلفاظ کو یُوں پی لیا جیسے وہ زہر بھرا گھونٹ ہوں۔

سعیدہ نے میٹرک پاس کر لیا اَور مجھے اُس کی شادی کی فکر لاحق ہوگئی۔ شاہد نے بی اے پاس کیا تو مجھے اُس کے مستقبل کی سوچ لگ گئی اَور میں اپنے تفکرات میں گم' خان صاحب کی طرف سے بے نیاز ہو کر رہ گیا۔ پھر ایک دِن محراب گل کو خان صاحب کی بیٹھک میں دیکھ کر مَیں اَندر چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری وہاں ضرورت نہیں تھی۔ خان صاحب کچھ پریشان تھے۔ اُن کا چہرہ بُجھا بُجھا سا تھا۔ میں دو۲ منٹ بیٹھ کر اُٹھ آیا۔ فضا میں طوفان سے پہلے کا اِضطراب آمیز جمود تھا۔

اور دُوسرے دِن جب مَیں دفتر سے واپس آیا تو میں نے سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ میں

نے پوچھا:

سعیدہ! کیا بات ہے؟

سعیدہ نے کہا:

گل بانو چلی گئی۔

کہاں؟

اپنے وطن میں۔ لوگ کہتے ہیں، وہاں اُس کا بیاہ کر دیا جائے گا۔

بیاہ! کس کا؟

میرے پیچھے سے آواز آئی۔

میں نے مُڑ کر دیکھا تو یہ شاہد تھا۔

اُس نے پھر دُہرا کر پوچھا:

سعیدہ! کس کا بیاہ؟

گل بانو کا!

اَور وہ چلی گئی؟

ہاں، بھائی جان! ......

سعیدہ نے بھیگی بھیگی سی آواز میں کہا:

اَور جانے سے پہلے وہ ملنے بھی نہ آئی۔ عجیب طوطا چشم لوگ ہیں یہ!

شاہد لڑکھڑا گیا۔ اُس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ جلدی سے اَپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ میں نیم مدہوش سا خان صاحب کے گھر کی طرف جانے لگا تو شاہد کی آواز آئی:

سعیدہ، پانی کا ایک گلاس تو دے جاؤ مجھے!

خان صاحب کے گھر کو تالا لگا ہُوا تھا۔

شاہد پورا ہفتہ بخار میں جلتا بھنتا رہا۔ میری جان پر آ بنی تھی۔ جب وہ اچھا ہُوا تو محض ہڈّیوں کا ایک ڈھانچا رہ گیا تھا اَور جب میں اُسے پہلی بار سَیر کرانے کے لیے باہر لے گیا تو میرا دِل خود بیمار بیمار سا تھا جیسے اُسے کسی نے مَسَل دیا ہو۔ شاہد کو کھلی تازہ ہَوا، دُھوپ، کھیتوں کی وسعت اَور نیلے آسماں کی پہنائیوں سے بہت محبّت تھی۔ جب ہم لہلہاتے کھیتوں میں پہنچے تو شاہد مسکرا پڑا۔ اُس کی مسکراہٹ میں سَرما کی دُھوپ کی نرمی اَور ملائمت تھی اَور میں نے اُس مسکراہٹ میں شبنم کی دُھلی دُھلی نمی دیکھی۔ ایک چھینٹا میرے دِل پر پڑا اَور میں نے اَپنے دِل کو پھیلتے ہُوئے محسوس کیا جیسے پژمُردہ پتّیاں کِھل رہی ہوں۔

اُس نے پھر کھیل کُود میں دِلچسپی لینا شروع کر دی۔ اَور میرا مَسلا ہُوا دِل بھی تروتازہ ہوتا رہا۔ دھیرے دھیرے زندگی نرم خیز لہروں سے آشنا ہو رہی تھی کہ یکایک ایک اَور دھچکا لگا۔ اچانک خان صاحب کی بیٹھک کا دروازہ کُھل گیا۔ میں نے چاہا' بے نیاز ہو کر گزر جاؤں لیکن خان صاحب لپک کر باہر نکلے اَور ایک شکاری جانور کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑے۔ میرے گلے میں بازو حمائل کر کے کہنے لگے:

خو' لودی! یہ اَچا بات ہے؟

نہیں!

میرے مُنہ سے بے اِختیار نکل گیا:

امارا کوئی بات اچا نہیں' آپ کا ہر بات اچا ہے۔

لودی صاحب! اَم سے کیا خطا ہو گیا؟

کچھ بھی نہیں۔ برسوں کی ہم سایگی کے بعد یہ طوطا چشمی! آپ وطن جاتے ہُوئے مِل کر بھی نہ گئے؟

اَم مجبور تھا لودی صاحب!......

خان صاحب نے تلملا کر کہا:

تم کو خوش ہونا چاہیے! اَم نے وطن جا کر گل بانو کا شادی کر دیا۔

الحمدُللہ! اگر مجھے یاد کر لیتے تو کیا ہرج تھا؟ سعیدہ کی طرح گل بانو بھی میری بیٹی تھی۔

دیکھو لودی صاحب! اَم مجبور تھا۔

خان صاحب نے آنکھیں چُرا کر کہا۔

گلی میں ایک سائیکل کھڑکھڑائی۔

میں نے مُڑ کر دیکھا تو یہ شاہد تھا۔ خلافِ توقّع خان صاحب کی بیٹھک کو کُھلا دیکھ کر شاہد یُوں کھڑا ہو گیا جیسے گلی کے کسی پتھر نے اُس کا راستہ روک لیا ہو۔ خان صاحب نے بڑھ کر شاہد کی پیٹھ تھپکی اَور کہا:

خو چہ' تم بیمار رہا ہے!

میں نے کہا:

پورا ہفتہ۔

اوہ!

خان صاحب نے کہا۔

شاہد بُت بنا کھڑا رہا۔ ٹکٹکی باندھ کر دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے ایک ثانیے کے اَندر اَندر محسوس کیا جیسے شاہد کُھلے دروازے میں سے کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اُس نے ٹھنڈی آہ بھری اَور سائیکل

بڑھالیا۔ اِس ایک ثانیے میں مجھ پر آفاق کے دروازے کھُل گئے۔ میں نے شاہد کی کھوئی ہُوئی نگاہوں کا راز پالیا۔ اِس اچانک اِلہام سے میرے رَونگٹے کھڑے ہوگئے اَور میں نے خان صاحب کی طرف سے منہ پھیرلیا۔ میرے دِل میں خلا تھا۔ ابھی اِس میں نفرت کا زہر بھی نہیں بھرا تھا۔

میں گھر لَوٹ آیا۔

شاہد اَپنے پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ اُس کا چہرہ تھکا تھکا سا تھا۔

میں نے کہا:

شاہد بیٹا! ابھی سخت ورزش سے پرہیز کرو۔

بہت اچھا ابّا جان!

شاہد نے کھوئی کھوئی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو مجھے اَپنے گالوں پر سیّال آگ کے چلنے کا احساس ہُوا۔ میں نے جھنجلا کر گالوں کو رگڑ دیا اَور پھر میرا سینہ ایک بِس بھری نفرت سے پُر ہوگیا۔ خان صاحب اُس وقت میرے سامنے موجود ہوتے تو میں شاید اِس نفرت کی قے کر دیتا۔

ایک ہفتے کے اَندر اَندر خان صاحب کی دُکان کھُل گئی۔

لوگ دُکان کے آگے کھڑے تھے۔ خان صاحب دُکان کے سامنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ دروازوں اَور اَلماریوں پر نیا نیا روغن چمک رہا تھا۔ شفّاف شیشوں کے پیچھے رنگ برنگے ریشمیں صافے، زرد زرد کُلاہیں اَور قراقلی ٹوپیاں سجی ہُوئی تھیں۔ دُکان ایک شوکیس کا منظر پیش کر رہی تھی۔ خان صاحب نے اَپنی طویل غیر حاضری کا عملی جواز پیش کر دیا تھا جیسے وہ ظاہر کرنا چاہتے ہوں کہ وہ اَپنے وطن صرف اِس لیے گئے تھے کہ رنگ برنگ کا نیا مال خرید لائیں اَور ٹھیکے داری میں کمایا ہُوا سارا روپیہ دُکان پر صَرف کر دیں!

ایک رات پھر خان صاحب کی بیٹھک میں تاش کی محفل سجی۔

چوہدری اَور ملک صاحبان مجھے گھسیٹ کر لے گئے۔ میں بادلِ ناخواستہ تاش کھیلتا رہا۔ آج خان صاحب کی قسمت کا ستارہ بہت تیز تھا۔ وہ ہر بازی جیت رہے تھے اَور اَپنی روایتی مہمان نوازی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہے تھے۔ محفل برخاست ہُوئی تو خان صاحب نے آستین سے پکڑ کر مجھے روک لیا۔ وہ اَندر گئے اَور ایک سینی پر گرم گرم بھُنی ہُوئی ران رکھ کر لے آئے۔ اُنھوں نے ایک ٹکڑا کاٹ کر مجھے پیش کیا۔ میں نے منہ میں رکھا تو نوِالہ زہر بھرا لگا اَور میرے گلے میں پھنس گیا۔ مجھے اچھو لگ گیا۔

خان صاحب نے دُوسرا ٹکڑا پیش کیا تو میں نے کہا:

نہیں خان صاحب، میں نہیں کھاؤں گا۔

کیوں لودی صاحب! اچا نہیں پکا؟

بڑا اچھا پکا ہے، پر میرا جی نہیں چاہ رہا۔

خان صاحب نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔ میں نظریں چُرا گیا۔ تب نہ جانے کیوں اَیسا ہُوا کہ ننھی منی گل بانو کی وہ تصویر میری آنکھوں کے سامنے اُبھر آئی جب میری ذرا سی بے رُخی پر وہ رو پڑی تھی، اَور معاً بعد شاہد کی وہ نظر یاد آئی جو خان صاحب کے کُھلے دروازے سے ناکام و نامراد لَوٹ آئی تھی۔ میرے دِل پر آرے چل گئے ...... اَور یہ گوشت کے بُھنے ہُوئے ٹکڑے! اَور قریب تھا کہ میں درد سے کراہ اُٹھتا۔

لودی صاحب! ......

خان صاحب نے مُنہ تک پہنچا ہُوا گوشت کا ٹکڑا سینی میں رکھتے ہُوئے کہا:

محراب گل، اَمارا داماد، بڑا خاندانی آدمی ہے۔ اَمارا گل بانو اُس کے ساتھ بہت خوش رہے گا۔

اِنشاء اللہ!

میرے مُنہ سے بے اِختیار نکل گیا۔

اَم تباہ ہو چکا تھا۔ محراب گل اَمارے لیے رحمت کا فرشتہ بن گیا۔

الحمدُ لِللہ!

خو، لودی! اَم کیا کرتا۔ اَم بوت مجبور تھا۔

میں نے خان خان صاحب کی نگاہوں میں جھانک کر دیکھا۔ اُن میں کُچلا ہُوا غرور تلملا رہا تھا اَور دو جلتے بھنکتے ہُوئے آنسو تھے جو پلکوں پر تڑپ رہے تھے۔ خان صاحب نے ہاتھ کی پُشت سے اُن آنسوؤں کو مَسل ڈالا، پھر اُنھوں نے تکیے کے پیچھے سے ایک کتاب نکالی اَور میرے ہاتھ میں تھماتے ہُوئے کہا:

یہ آپ کی لڑکی کا کتاب ہے۔ گل بانو نے دیا تھا۔

میں نے کتاب سعیدہ کی میز پر پٹک دی۔

میں نے مُنہ سے کچھ نہ کہا۔ سعیدہ نے بے خیالی کے عالَم میں کتاب کی ورق گردانی کی تو ایک کاغذ کا پُرزہ فرش پر گِر پڑا۔ سعیدہ نے کاغذ اُٹھا کر جذبات سے رُندھی ہُوئی آواز میں کہا:

یہ گل بانو کا خط ہے۔

اُور میرے جواب کا اِنتظار کیے بغیر اُونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا:

پیاری بہن سعیدہ!

سلامِ محبت! یہ میرا پہلا اُور آخری خط ہے۔ مجھے معاف کر دینا بہن! میں بچھڑتے ہُوئے تم سے مِل نہ سکی۔ میں مجبور تھی۔ نہ جانے یہ خط بھی تم تک پہنچے یا شاید نہ پہنچ سکے۔ میری طرف سے اپنی امّی جان کو سلام کہیں۔ چھوٹے آغا کی خدمت میں آداب۔ شاہد بھائی کو خُدا حافظ کہہ دیں!...... تمھاری گل بانو۔

سعیدہ نے خط پڑھ کر میری طرف دیکھا۔

میں نے سوچا، آخر خان صاحب کی بات سچ ہو گئی، گل بانو نے ایک خط تو لکھ ہی دیا۔

☆☆☆

شیرا نمبردار

مغرب کی نماز پڑھ چکنے کے بعد جب بابا شیرا مسجد سے نکلا تو آسماں دُھل کر نکھر آیا تھا۔ مدھم تارے ڈھلک رہے تھے اَور بے داغ چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی۔ گیلی مٹّی سے ابھی تک سوندھی سوندھی خُوش بُو اُٹھ رہی تھی۔ ہَوا کے جھونکے، نمی سے بوجھل تھے اور اُن میں دُھلے ہُوئے پتّوں اَور جڑی بُوٹیوں کی تازہ باس بھی رچی ہُوئی تھی۔ یہ اساڑھ کے مہینے کی پہلی بارِش تھی اَور دُھوپ سے تپے ہُوئے کھیتوں کے سخت سینے، نرم پڑ چکے تھے اَور ہَل کا پھالا مٹّی کے نرم ہونے کا اِنتظار کر رہا تھا۔ کل ایک کھیت میں ہَل چلا کر "وتّر" دبانا اَور اُسے جوار کی کاشت کے لیے تیار کرنا ضروری تھا۔ اِس لیے ابھی جا کر بہادر کو اِس سنہری موقع سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھانے کے لیے تیار کرنا بھی لازمی تھا۔

دالان میں بھی چاندنی کا نکھار اَپنے پُورے جوبن پر تھا۔ بابا شیرے نے دالان میں قدم رکھا تو کھنکار کر، گویا بہُو رانی کو اَپنی طرف متوجّہ کیا۔ بہو چاٹی میں دُودھ ڈال کر کھٹّا لگا رہی تھی۔ اُس نے جلدی سے ڈوپٹّا سر پر کر لیا اَور کام کاج چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ دالان کے ایک کونے میں چارپائی بچھی ہُوئی تھی۔ بابا شیرے نے چارپائی پر بیٹھتے ہُوئے کہا:

بہو رانی!

جی!

بہادر کنویں سے آ چکا ہے؟

نہیں بابا۔ میرو دُودھ لے کر آیا تھا۔

بہادر کہاں گیا؟

میرو نے بتایا تھا کہ آج مبارک پُور کے چودھری کے بیٹے کی شادی تھی۔ وہاں کوئی لوہار گانے کے لیے آیا ہُوا ہے۔

اوہ! جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پُورے کھیت میں ہَل چلانا تھا۔ اَب وہ آدھی رات گزرنے پر آئے گا اَور پھر تھکے ہوئے بَیل کی طرح گر پڑے گا۔ خرّاٹے بھرتا رہے گا اَور کل سُورج نکلے، اُٹھے گا......

اَور بابا شیرے نے بڑبڑا کر بات ختم کر دی اَور اِتنے میں بہُو نے چنگیر اَور دُودھ کا لبالب بھرا ہُوا ایک پیالہ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلا لقمہ دُودھ میں بھگوتے ہُوئے بابا شیرے نے کہا:

ننھا ٹلّو سو گیا ہے کیا؟

شیماں جو دالان کے دُوسرے کونے میں بیٹھی ننھے کو سُلانے کے لیے تھپک رہی تھی، چہک کر بولی:

بابا! بس سونے ہی والا ہے۔

اچھا!

بابا شیرا مطمئن ہو گیا اَور روٹی دُودھ میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔

....

جوانی میں وہ صرف شیرا تھا۔ جب ڈاڑھی میں سفید بال آئے تو بھی شیرا ہی رہا۔ وہ اَپنے چھوٹے سے گاؤں کا نمبردار تھا اَور ایک علیٰحدہ کنویں کا مالک، جس کے ساتھ دس بارہ گھماؤں زمین تھی۔ اَب لوگوں نے اُس کے نام کے ساتھ "بابا" کا اِضافہ بھی کر لیا تھا۔ اکثر لوگ اُسے شیرا نمبردار کہہ کر پکارتے تھے۔

بابا شیرا جوانی میں بڑے کلّے ٹھلّے کا گبھرو تھا۔ اَب بھی اُس کی چال میں بانک پَن تھا۔ اَور آنکھوں میں چمک۔ چوں کہ عمر کے ساتھ ساتھ وَقار کا اِضافہ بھی ہو گیا تھا، اِس لیے اَب وہ اکڑ کر نہ چلتا۔ سَر پر بڑا سا پگڑ، لٹھّے کا دُھلا ہُوا سفید تہمد، سردیوں میں کھیس کی بُکّل، گرمیوں میں کندھے پر ململ کا صافہ، چہرے پر اِطمینان کی جھلک، گزری ہُوئی زندگی گویا طمانیت کی ایک مستقل مسکراہٹ بن کر انگ انگ میں رچ گئی تھی۔ سہ پہر کی نرم نرم دُھوپ اَور آنے والی شام کے خنک سایوں کا اِمتزاج، جیسے زندگی نے اُس کے ساتھ اَور اُس نے زندگی کے ساتھ سمجھوتا کر لیا ہو۔

زندگی کو اُس نے کبھی طوفانِ باد و باراں نہ سمجھا تھا کہ زنّاٹے کے چند تھپیڑوں کے ساتھ گزر جاتا ہے۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو طوفانوں سے کھیل کر تھک جاتے ہیں اَور پھر زندگی میں اُن کے لیے کسی دِل بستگی کا سامان باقی نہیں رہتا۔ زندگی پر اِس اعتماد نے صرف ایک بار شکست کھائی تھی جب موت کے سرد سایے نے اُس کے گھر قدم رکھا تھا۔ بہادر کی ماں نے تیسرا بچّہ جنا تو گویا تخلیق کا فرض تو اَدا ہو گیا لیکن موت کے بلاوے کے ساتھ! اُس وقت بہادر کی مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اَور شیماں تو ابھی سات آٹھ سال کی بچّی تھی۔ یہ صدمہ اِتنا اچانک، اِتنا شدید اَور غیر متوقّع تھا کہ شیرا دِنوں تک اُس منوں مٹّی کے نیچے دب کر رہ گیا جس کے نیچے بہادر کی ماں کا جسم تھا۔ کُھلے کھیت، لہلہاتی فصلیں، مٹّی کی مہک، شگوفوں

کی باس، کنویں کی رُوں رُوں اَور پرندوں کے چہچہے قبر کی تاریک گہرائیوں میں دفن ہو گئے تو زندگی رنگ و بُو سے محروم ہو گئی اَور اُس نے گھر کے آنگن میں پناہ لے لی۔ میرو اکیلا کھیتی باڑی کا کام کرتا رہا اَور میرو کی بیوی شیرے کے گھر آکر صبح شام سَرد چُولھے میں آگ روشن کرتی رہی۔ بہادر کبھی کبھار کنویں پر چلا جاتا اَور شیماں باپ کے گھٹنے سے لگ کر روتی رہتی اَور ماں کو یاد کرتی رہتی۔

پھر ایک دِن میرو نے کہا:

نمبر دارا! مرنے والوں کے ساتھ لوگ مَر تو نہیں جایا کرتے۔ میں تیرے گھر کا پُرانا نمک خوار ہُوں، پر کھیتی سائیں سِیتی۔ کبھی کبھی تو کنویں پر آجایا کر! دیکھ تو سہی، آج کل کیا رنگ ہیں کھیتوں کے!

میرو!......

نمبر دار نے بُجھی بُجھی آواز میں کہا:

جس سے زندگی کی بہار تھی، وہ ہی نہ رہی تو جینے کا کیا مزہ؟

واہ نمبر دارا! جس کے گھر میں دو ہیرے ہوں، وہ بے آس کیوں ہو۔ دیکھ تیرا بہادر، اب جوان ہو چکا ہے۔ کل اُس نے دو پہر تک میرے ساتھ ہل چلایا۔ مجال ہے، تھکنے کا نام بھی لیا ہو، اَور پھر چینے اَور تیلے نے کل بہادر کے سامنے وہ وہ چُنگیاں بھریں کہ گورے اَور لاکھے کے پسینے چُھوٹ گئے۔

سچ؟

شیرے نمبر دار نے گھٹنوں پر سے سَر اُٹھاتے ہُوئے کہا۔

تو میں جُھوٹ بول رہا ہوں نمبر دارا؟

میرو نے چمک کر کہا۔

بہادر!

شیرے نے اُونچی آواز میں پکارا۔

بابا کیا بات ہے؟

اِدھر تو آ!

بہادر سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔ شیرے نے نظر اُٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ بہادرے کی ماں کے مرنے کے بعد اُس نے آج تک کبھی اُسے اِس نگاہ سے نہیں دیکھا تھا جو اُس کے سارے سراپا کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ نگاہ جو بہادر کے پٹھوں اَور مچھلیوں پر سے تیرتے ہُوئے جا رہی تھی۔ بہادر کا جسم ابھی محنت کی کٹھالی میں ڈھل کر لوہے اَور فولاد کا نہیں بنا تھا لیکن مچھلیاں اُبھر رہی تھیں اَور پٹھے تن رہے تھے اَور اُوپر کے ہونٹ پر رُوئیں سیاہ پڑ رہے تھے۔

اُس نے چارپائی سے اُٹھتے ہُوئے کہا:

او بہادرے! تُو تو جوان ہو گیا ہے۔ واہ بھئی وا! میں بھی کتنا نادان تھا کہ مرنے والی کے ساتھ مر گیا!

اَور شیرے کا جسم تن گیا۔ وہ بڑھاپا جو موت کے سایوں کے ساتھ رینگ کر آیا تھا ایک دم لَوٹ گیا۔

اَور اُس کی آنکھوں میں جوانی کی قوّتوں نے پھر جنم لے لیا۔ اُس نے جذبات سے گلوگیر آواز میں کہا:

میرو! چل ہم کھیتوں کی بہار دیکھ آئیں۔

کنویں کے ساتھ کے کھیتوں میں دُور دُور تک گندم کے شگوفے پُھوٹ رہے تھے اَور وہ کھیت جو آج سے پندرہ ۱۵ دِن پہلے خالی میدان تھے، مخمل کے فرش سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان پگ ڈنڈیاں چمک رہی تھیں اَور ننھے ننھے پَودوں پر اوس کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلک رہے تھے۔ نرم نرم دُھوپ میں پگھلا ہُوا سونا تھا اَور درختوں کے سبز پتّوں کی اوٹ میں پرندے تھے جو چہچہا رہے تھے اَور چہچہا کر اُڑ رہے تھے۔ زندگی، ہَوا کے نرم ہلکوروں کے ساتھ بیدار ہوئی اَور ایک اُڑان لے کر اُس کے جسم اَور رُوح میں رچ گئی۔ اُس نے پھر مٹّی کے پیار میں اَپنے دُکھ کا مداوا ڈھونڈ لیا، مٹّی جو ماں ہے اَور جس کی کوکھ سے اِنسان نے جنم لیا اَور جس کی گود میں پروان چڑھا، کبھی لہلہاتی فصلوں کا رُوپ دھار لیتی ہے، کبھی چٹیل میدانوں کا، کبھی اِس پر چلچلاتی دُھوپ گرد و غُبار کے بادل اُڑاتی ہے اَور کبھی اَبرِ رحمت کے چند چھینٹے سوندھی سوندھی خُوش بُو اُڑاتے ہیں جو مٹّی کے ساتھ مخصوص ہے۔

اِس کے باوجود جب سارے دِن کے کام کاج سے تھک کر شیرا نمبردار گھر لَوٹتا تو اُجڑا اُجڑا گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ وہ ایک ٹھنڈی آہ بھر کر ڈیوڑھی میں قدم رکھتا۔ آنگن مُردہ اَور بے حِس نظر آتا، بہادر حقّہ بھر کر لاتا، میرو کی بیوی دُودھ بڑھاتی اَور کھٹّا لگا کر چلی جاتی تو شیرا کہتا:

بہادر بیٹا! شیماں ذرا سِیانی ہوتی تو گھر کا سارا کام خود سنبھال لیتی۔ گھر، عورت کے بغیر کہاں سنورتا ہے؛ تیری ماں زندہ تھی تو گھر میں کتنی چہل پہل تھی، پر تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے! اچھا۔

اَور یہ کمی جلد پُوری ہو گئی۔ دو۲ سال بعد بہادر کی مُونچھیں کالی ہوئیں تو شیرے نمبردار نے اُس کا بیاہ رچا دیا۔ بہُو بھی الھڑ مٹیار تھی ...... پندرہ سولہ سال کی نادان لڑکی لیکن وہ عورت تھی اَور اُس کے آنے پر شیرے نمبردار کے گھر میں سَرِ شام دِیا جلنے لگا اَور آہستہ آہستہ یہ نادان لڑکی عورت بن کر گھر کا اُجالا بن گئی اَور شیرا زندگی سے پھر مطمئن ہو گیا۔

....

صبح سویرے شیرا کنویں پر پہنچ گیا۔

میرو نے بیلوں کی گردنوں میں جوا ڈالا اور ہل کے پھالے دھرتی کا سینہ پھاڑنے لگے۔ زمین، نرم اور گیلی تھی، اِس لیے ہل گویا تیرتے ہوئے، چلے جا رہے تھے اور صبح، اوس سے بھیگی ہوئی تھی اور ہوا کے ہلکوروں میں امرت رس تھا۔ سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو آدھے کھیت میں سیدھی لکیریں اُبھری ہوئی نظر آئیں۔ گیلی مٹی کے بُھر بُھرے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے، آسماں دُھلا ہُوا تھا اور سورج کی کِرنوں نے بہت جلد گرم اور تیز ہونا شروع کر دیا، جب ہل کا رُخ سورج کی طرف ہوتا تو کرنوں کی تیز چمک آنکھوں کو چُندھیا دیتی۔ شیرا ایک ہاتھ ہل کی ہتّھی پر اور دُوسرا آنکھوں پر رکھ لیتا۔ پھر کسی نے ہتّھی پر ہاتھ رکھ دیا۔ شیرے نے کہا:

بہادرے تُو آ گیا؟

ہاں بابا!

اور شیرے کا جی چاہا کہ بہادر کو تھوڑی سی گرما گرم نصیحت کر دے، ہلکی سی سرزنش، لیکن دُوسرے لمحے شیرے کو یاد آ گیا کہ آدھی رات کے بعد آنگن کا دروازہ کُھلا تھا اور بہادر چوروں کی طرح اندر آیا تھا۔ بہو نے اُس کا بستر پہلے سے لگا رکھا تھا۔ بہادر چپکے سے لیٹ گیا اور بابا شیرے نے ابھی کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ جوانی مستِ خواب ہو گئی تھی۔ ''آہ جوانی کی نیند'' اور شیرے کا دِل پگھل گیا۔ اُس نے کہا:

بہادر بیٹا! جا بیلوں کے لیے چارا کاٹ، تھوڑا سا کام باقی رہ گیا ہے۔

اور پُورے بیگھے میں سے صرف دو چار مرلوں میں ہل چلانا باقی تھا کہ بہو ''چھاہ ویلا'' لے کر آ گئی۔ کھیت کی مینڈھ پر کیکر کی چھدری چھاؤں میں بہو لسّی کا مٹکا اور روٹیوں کا ''چھابا'' سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ میرو نے چنبے اور تیلے اور شیرے نے لاکھے اور گورے کو چھیڑا تو دیکھتے دیکھتے پُورا کھیت جُت گیا۔ بہادر نے بیلوں کے گلے سے جوئے اُتارے اور اُنھیں ہانک کر کنویں کی طرف لے گیا۔ شیرا اور میرو کیکر کی چھاؤں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ بہو نے مٹی کے پیالوں میں لسّی اُنڈیلی، نمک کا ڈلا پھیرا اور چھابا، اُن کے سامنے بڑھا دیا۔

شیرے نمبردار نے چُپڑی ہُوئی روٹی کا پہلا ٹکڑا مُنہ میں رکھا اور ٹھنڈی چھاچھ کا ایک گھونٹ بھرا تو گویا سینے سے لے کر پیٹ تک نرم نرم خنکی بھر گئی۔ تھکا ہُوا جسم راحت کے احساس میں ڈوب ڈوب گیا تو شیرے کو محسوس ہُوا کہ زندگی بڑی میٹھی شے ہے: اِس کا ایک لمحہ بھی بیکار گیا تو سمجھو زندگی نے اپنی مٹھاس کھو دی!

ناشتہ کر کے شیرے نے اپنے اِرد گرد دیکھا۔ کنویں کے عین برابر والے کھیت میں شفتل کی سرسبز سبزیاں چمکیلی دُھوپ میں زمرّد کا تختہ لگ رہی تھیں اور نظروں کو ٹھنڈک اور راحت پہنچ رہی تھی اور دُور دُور تک خالی کھیت تھے جن میں گندم کے ٹھنٹھ قطار در قطار اُفق کی چمکیلی گولائیوں سے جا ملے تھے۔ اُن پر تیز دُھوپ

کے پیچ در پیچ ہیولے تیر رہے تھے۔ کہیں کہیں ننھے ننھے بگولے اُٹھ رہے تھے جو مہین دُھول اَور تنکوں کو ایک چکّر دے کر دُھوپ میں گم ہو رہے تھے اَور درخت، سبز عمامے پہنے سَر نہوڑائے، کسی گہری سوچ میں غرق تھے۔ بگولوں کی تکونیں اُن کی پھننگوں کو چھُوتیں تو شاخیں جھُومتیں اَور پتّے لرز جاتے اَور جب بگولا گزر جاتا تو یہ لرزشیں پھر سکون کے گہرے سینے میں دفن ہو جاتیں۔

....

اِسی کیکر کی چھدری چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے نمکین اَور ٹھنڈی چھاچھ کے گھونٹوں کے ساتھ زندگی بنتی اَور بیتتی رہی۔ کھیتوں میں ہَل چلتے رہے اَور پھالے دھرتی کا سینہ چیر کر اُسے بیجوں سے بھرتے رہے۔ کنویں کی رُوں رُوں کے ساتھ چمکیلے پانی کی ایک نُقرئی لکیر نغمۂ مسلسل کی طرح دھرتی کے سینے میں زندگی کا اِرتعاش بنتی رہی۔ شگوفے پھوٹتے اَور پروان چڑھ کر لہلہاتے کھیتوں کا رُوپ دھارتے رہے۔ بادل آتے رہے اَور پیاسے کھیتوں کو سیراب کر کے فضاؤں میں تحلیل ہوتے رہے۔ سبزے کی چادریں بچھتیں اَور سنہری خوشوں سے دامن بھرتی رہیں۔ پھر یہی سنہری خوشے کھلیانوں میں جمع ہوتے رہے اَور چلچلاتی دُھوپ میں سونا، بھُوسے سے جُدا ہوتا رہا۔ شیرے نمبردار کے گھر میں اناج کے اَنبار لگتے رہے اَور بہادر کا جسم محنت کی کُٹھالی میں ڈھل کر لوہے اَور فولاد کا بن گیا، مچھلیاں اُبھر آئیں، ہاتھ کھردرے اَور اُنگلیاں لوہے کی سُلاخوں کی طرح مضبوط ہو گئیں۔ مَسیں سیاہ ہوئیں اَور ننھی ننھی مُونچھوں کی نوکیں نکل آئیں۔ کبھی یہ مُونچھیں پسینے سے بھیگ کر مہین دُھول سے اَٹ جاتیں، کبھی اِنھیں تیل سے چُپڑا جاتا تو اِن کی سیاہی کوّے کے پَروں کی طرح چمک اُٹھتی۔ بہُو تین[۳] بچّوں کی ماں بن گئی تھی۔ اب وہ بھرے گھر کی رانی تھی۔ اُس کی ہر اَدا میں وقار تھا اَور ایک ایک بات، دانا عورتوں کی طرح جچی تُلی تھی۔

اِنھیں لہلہاتے کھیتوں کے ساتھ شیماں کا بچپن بھی گزر گیا۔ شگوفہ پروان چڑھا اَور شاداب پَودا بن گیا تو شیرے کی آنکھ نے پہلی بار اُسے شعور کی نگاہ سے دیکھا اَور اُس کا رُواں رُواں کانپ گیا۔ اُس نے زیرِلب کہا: "اِس کی ماں کا سایہ سر پر ہوتا تو مجھے کس بات کا ڈر تھا؟" اَور سوتے جاگتے شیماں کی الھڑ جوانی شیرے کے خوابوں کا بھُوت بن گئی۔ وہ کھیتوں میں کام کرتا تو دھیان شیماں کی طرف لگا رہتا۔ شیماں ذرا مٹک مٹک کر چلتی تو شیرا بول اُٹھتا:

شیماں بیٹی! شریف گھروں کی لڑکیوں کی چال میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ وہ چلتی ہیں تو نظریں نیچی رکھتی ہیں، اُن کے پاؤں کی چاپ بھی نہیں آتی، وہ بولتی ہیں تو اُن کی آواز دُوسرے کے کان تک نہیں پہنچ پاتی۔

اَور شیماں کا ڈوپٹا ذرا سرک جاتا تو شیرا کھنکار کر کہتا:

شیماں بیٹی!

اَور شیماں سراسیمہ ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتی اَور سمجھ نہ پاتی تو شیرا دھیمی آواز میں کہتا:

شیماں بیٹی! مجھے باپ ہو کر وہ فرض اَدا کرنا پڑتا ہے جو تیری ماں کا تھا۔ مرنے والی آج زندہ ہوتی تو مجھے کیا پرواتھی؟ دیکھ تیری اوڑھنی کا پلّو ڈھلک گیا ہے!

چند دِن تک شیماں اِس روک ٹوک کو لاشعوری طور پر برداشت کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ اُس کے نسائی غرور نے جاگ کر کہا: "شیماں، بابا کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ ہر بات پر تجھے ٹوکتا ہے"۔ اَور اِس کے بعد ناسمجھ جوانی سراسیمہ ہو کر پھر کوئی ننھی سی غلطی کر گئی تو شیرے کی ٹوک زہر میں بُجھی ہُوئی محسوس ہُوئی اَور جوانی کے حسّاس دِل میں نشتر کی طرح اُتر گئی اَور شیماں کی آنکھوں میں خود بہ خود آنسو آ گئے۔ یہ آنسو اُس کے گالوں پر گِر کر جلتے ہوئے پانی کی بہتی ہُوئی دھار بن گئے اَور شیماں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا:

بھابی! ایک بات پوچھوں؟

کہو شیماں!

بابا کچھ دِنوں سے مجھے زہر بھری نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟

تو جوان ہو چکی ہے نا!

بھابی نے دانا عورت کا رُوپ بھرتے ہُوئے کہا۔

لڑکیاں جوان ہو جائیں تو باپ اُن سے نفرت کرنے لگ جاتے ہیں؟

نفرت......نہیں......ہاں......

بھابی نے دانا تجربہ کار عورت کا چولا اُتار دیا اَور جوان لڑکی کا رُوپ دھارتے ہُوئے کہا:

کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں جوان ہوئی تھی تو میرے بابا بھی کچھ اِسی قسم کی باتیں کرتے تھے اَور ایک دِن پگ ڈنڈی کے دونوں طرف اُونچی گندم کے کھیت لہلہا رہے تھے اور میں اکیلی اُن میں سے گزر رہی تھی اَور سماں بڑا پیارا تھا تو میرے ہونٹوں پر ڈھولک گیت کے دو بول آ گئے۔ اور میں گنگناتی رہی اَور بھول گئی کہ میں کس کے سامنے کھڑی ہُوں اَور بابا نے کہا تھا: "نادان لڑکی! تو اکیلی کنویں پر کیوں آئی؟ تیری ماں کو اِتنا بھی نہ یاد رہا کہ تُو جوان ہو چکی ہے اور تجھے اکیلے بھیج دیا!" اَور میں نے چمک کر کہا تھا: "کیوں بابا؟ راستے میں کوئی جن بھُوت ہیں کہ مجھے کھا جائیں گے۔ میں تو ہر روز کنویں پر اِنھیں کھیتوں میں سے گزر کر آتی ہوں!" اَور بابا نے بجھی بجھی آواز میں کہا تھا: "نہیں بیٹی جن بھُوت تو نہیں، پر اَب تُو جوان ہو چکی ہے!" اَور بڑی دیر بعد میری سمجھ میں آیا تھا کہ بابا کیا کہتے تھے اَور جوان لڑکیوں سے باپ نفرت کیوں کرتے ہیں۔

شیماں کے آنسو پھر بَہ نکلے۔ اَور وہ چند دِن تک جوانی کی الھّڑ آگ کو بُجھاتی رہی، گلیوں میں سے دبے پاؤں گزرتی رہی اَور اُس کے پاؤں کی چاپ بھی نہ آتی۔ اُس کی نظریں خطِ مستقیم سے اِدھر اُدھر نہ ہوتیں۔ ایک دِن جب وہ گلی میں سے گزر رہی تھی اَور اُس کے سَر پر اوڑھنی کا پلّو اِس طرح جما ہُوا تھا

کہ اُس کے کانوں کی لَویں تک بھی ننگی نہ تھیں اَور اُس کی پیشانی ڈھکی ہوئی تھی اَور آنکھیں بھی اوڑھنی کے پیچھے چُھپ کر رہ گئی تھیں، اُس کے کانوں نے کچھ سُنا کیوں کہ زبان پر تالے ہوں اَور آنکھیں بھی نہ دیکھتی ہوں تو کان پھر بھی کچھ نہ کچھ سُن لیتے ہیں:

شیماں!

وہ تڑپ گئی۔ اُس نے اوڑھنی کی اوٹ سے جھانکا اَور اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پکارنے والے کو اُس نے پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا۔ یہ اُسی کی برادری کے ایک چودھری کا بیٹا تھا لیکن آج اُس کی پکار میں ایک عجیب اَسرار تھا اَور یہ اَسرار اُس کے کانوں کے راستے بجلی کی رَو بن کر آیا، اُس کے اعصاب جھنجھنا اُٹھے اَور اُس کی پیشانی پسینے سے تَرہوگئی۔ اُس نے تیز تیز قدم بڑھائے لیکن یہ آواز، یہ پکار نغموں کا مسلسل دھارا بن کر اُس کی رُوح کو تھرتھراتی رہی اَور جب اُس نے آنگن میں قدم رکھا تو وہ خود ایک تھرتھراتا ہُوا نغمہ بن گئی تھی ...... برسات میں گھنے پتّوں میں چھپی ہُوئی کویل کی کوک، جس میں آگ بھی ہوتی ہے اَور چھما چھم برستی ہُوئی بُوندوں کا اِرتعاش بھی!

بھابی نے کہا:

شیماں آج گھبرائی گھبرائی سی ہو؟

بھابی! آج گلی کے نکڑ پر اُس نے میرا نام۔ لے کر پکارا۔

کس نے؟

بھابی کا منہ غنچے کی طرح سکڑ گیا۔

وہی......حیدر......

اَور بھابی نے قہقہہ لگا کر کہا:

اِسی لیے تو بابا تجھے ٹوکتے تھے کہ یہ آواز تیرے کانوں میں نہ پڑے۔

اَب کیا ہوگا؟

شیماں نے گھبرا کر کہا۔

میں کیا جانوں؟......

بھابی نے چمک کر کہا:

پر اَب تُو باہر نہ جایا کر! میں تجھ پر کڑا پہرا رکھوں گی۔

اَور شیماں کے حواس پر مُردنی چھاگئی، نغمہ مَرگیا۔ کویل کی کوک پاتال میں اُتر گئی اَور شیماں کے

پاؤں لڑکھڑا گئے۔ تب بھابی اچانک کھلکھلا کر ہنسی جیسے کالے اَور گہرے بادلوں میں چاند نکل آیا ہو۔

بھابی!

شیماں نے گویا دوبارہ زِندہ ہو کر کہا۔ پر بھابی نے کوئی جواب نہ دیا اَور کام کاج میں لگ گئی۔

اَور ایک دِن شیماں کے آنگن میں برادری کے سَرکردہ لوگ جمع ہُوئے۔ بابا شیرا اُس دِن بڑا متفکر تھا۔ بہادر بھی کچھ کم سنجیدہ نہیں تھا اَور بھابی بڑی مصروف تھی۔ شیماں کوٹھری میں دبکی پڑی تھی اَور باہر محفل میں باتیں ہو رہی تھیں، پر شیماں کے پلے کچھ نہ پڑا۔ جب لوگ ایک ایک کر کے چلے گئے تو شیماں ڈرتے ڈرتے باہر آئی۔ اُس نے بھابی سے پوچھا:

بھابی! آج اِتنے سارے لوگ اکٹھے کیوں ہُوئے تھے؟

میں کیا جانوں؟

بھابی نے بے تعلق بنتے ہُوئے کہا۔

نہیں بھابی!......

شیماں نے ٹھنک کر کہا:

بتاؤ بھی!

اَور بھابی نے اُٹھ کر شیماں کے سَر پر ہاتھ رکھا اَور کہا:

ضرور پوچھوگی؟

ہاں!

شیماں نے جواب دیا۔

تو پھر کلیجا تھام لو!

شیماں ڈر گئی۔ بھابی کچھ لمحے چُپ رہی۔ پھر شیماں نے دُور بہت دُور سے آنے والی یہ آواز سُنی:

پگلی! یہ اُس پکار کا جواب تھا جو تُو نے گلی کے نکڑ پر سُنی تھی۔

ہائیں!

شیماں نے کہا اَور اُسے چکر آ گئے، زمین و آسماں گھوم گئے، آندھیاں چلیں، جھکڑ چیخے، وہ بے بس ہو کر بھابی کے گلے سے لپٹ گئی۔ اُس کے سینے سے ایک غبار اُٹھا اَور آنکھوں سے چھم چھم آنسو برسے۔ بھابی نے اپنے ڈوپٹے کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھے اَور اُس کے گال سہلائے۔

پگلی! تو رو رہی ہے، پر یہ آنسو بھی تو زندگی میں صرف ایک ہی بار نصیب ہوتے ہیں!

....

بہادر نے حقّہ تازہ کیا۔ کڑوے تمباکو کی ایک چلم بھری اَور حقہ شیرے کے سامنے رکھ دیا۔ شیرا اُس مزدُور کی طرح تھکا ہُوا تھا جس نے مدتوں ایک بھاری بوجھ اُٹھائے رکھا ہو اَور اَب وہ بوجھ اُس کے سَر پر سے اُتار لیا گیا ہو۔ اُس نے پہلا کَش لیا اَور کہا:

بہادر! اِدھر میرے پاس آ کر بیٹھ۔

بہادر پائنتی پر بیٹھ گیا تو شیرے نے بڑی شفقت سے اُس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اَور کہا:

بہادر بیٹا! آج میرے سَر سے ایک پہاڑ اُتر گیا ہے، شیماں اَپنے گھر چلی گئی۔

بہادر نے سَر جھکا لیا۔ ہنگامہ گزر چکا تھا۔ اَب گھر میں سنّاٹا تھا۔ اُس کی مُونچھیں تھرتھرائیں اَور ہونٹ خم کھا گئے۔ آنکھوں کے کونے تر ہُوئے تو شیرے نے کہا:

بیٹیاں پرایا دھن ہوتی ہیں۔ پرائے گھر میں کب تک مہمان رہ سکتی ہیں! تجھے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ میرا فرض اَدا ہو گیا۔

ہاں بابا! میں نے خود شیماں کی ڈولی کو کندھا دیا۔ میں نے خود اُسے اِس گھر سے نکالا جہاں ہم اِتنے دِنوں اکٹھے رہ کر پلے اَور جوان ہُوئے۔

واہ وا! شیماں کون سے کالے کوسوں چلی گئی ہے۔ اِسی گاؤں میں تو ہے، جب چاہو اُسے مِل لینا۔

بہادر نے آنکھیں پونچھ لیں۔

....

اور اُس رات حیدر نے کہا:

شیماں!

یہ وُہی پکار تھی جو اُس نے ایک دِن گلی میں سُنی تھی اَور اُس کی رگ رگ کانپ گئی تھی، کنپٹیاں جلنے لگی تھیں اَور پیشانی گرم لوہے کی طرح تپ گئی تھی۔ لیکن آج یہ پکار اُس کے خُون میں مِل جُل کر نرم رَو نغمے کے مانِند رواں دواں ہو گئی تھی اَور اُسے نیند آنے لگی تھی ...... نیند جس میں شبنم کے خنک قطروں کی بارِش تھی اَور زندگی کا پیار تھا...... سُبک اَور خُمار آلود نیند......

....

اِس سال بہادر نے بڑی محنت سے کام کیا۔ شیماں کی شادی پر سارا جمع جتھّا اُڑ گیا تھا۔ کچھ قرض بھی لینا پڑا تھا۔ بابا شیرے نے کہا تھا:

بہادر! تیری ایک ہی تو بہن ہے، اپنے دِل کی حسرت نکال لے۔ پھر یہ موقع کہاں آئے گا؟

اَور بہادر نے سینہ ٹھونک کر جواب دیا تھا:

بابا! اگر شیماں کے لیے مجھے اپنی ہڈّیاں بھی بیچنا پڑیں تو میں دریغ نہیں کروں گا۔

لیکن جب اَن تھک محنت، پسینے، چلچلاتی دُھوپ اور کڑکڑاتی سَردی کا یہ سال گزر گیا تو بہادر کا قرض اَدا ہو چکا تھا۔ اَور بابا شیرے کے کندھے جھک گئے تھے۔ اُس کی ڈاڑھی میں اَب کالے بال خال خال ہی نظر آتے تھے۔ زندگی کی شام پڑ چکی تھی اَور ابھی تک عاقبت کے لیے زادِ راہ تیار نہیں ہُوا تھا۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا۔ ایک دِن اُس نے بہادر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

بہادر بیٹا! ساری عمر دُنیا کماتے گزر گئی۔ اَب کہو تو کچھ عاقبت سنوارنے کا کام بھی کرلوں۔

بابا!

بہادر نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

بہادر! موت تو برحق ہے۔

بابا! موت کا نام نہ لو۔

بہادر کے جسم میں تھرتھری آئی۔

واہ بھئی وا!......

شیرے نے کہا:

میں نے کوئی نئی بات کی؟

نہیں...... پر...... ساری برکتیں تیرے دم سے ہیں۔ تُو نے کنویں پر آنا چھوڑ دیا تو......

نہیں...... میں ہر روز کنویں پر آیا کروں گا۔ جس نے ساری عُمر مٹی سے نباہ کیا، وہ اُس سے جُدا کیسے ہوسکتا ہے!

....

بہادر نے شیرے کی جگہ لے لی، ہَل کا پھالا دھرتی کا سینہ چیرتا رہا، بہادر کے چہرے پر مہینوں اَور برسوں کی گرمی اَور سردی نے اپنے نقوش ثبت کرنا شروع کر دیے۔ اَب وہ گاؤں کا سَربراہ نمبردار تھا۔ وہ بڑی سنجیدہ باتیں کرتا۔ پنچایت میں بیٹھتا تو ذِمّے داریوں کا بوجھ اُس کی آنکھوں کی چمک بن جاتا اَور ماہ و سال کی یہ گردِش گورے اَور لاکھے، چنبے اَور تیلے پر بھی اَپنے نقوش کاڑھ گئی۔ گورا جوان چاروں بیلوں میں سردار تھا، اَب بہت زیادہ عُمر رسیدہ ہو چکا تھا۔ اَب وہ اُن کے ساتھ قدم سے قدم مِلا کر نہیں چل سکتا تھا۔

ایک دِن شیرے نے ہنس کر کہا:

بہادر! گورا بھی اَب میری طرح دُنیاداری سے اکتا چکا ہے۔ اِسے بھی اَب اللہ اللہ کرنے کے لیے چھٹی دے دے!

بہادر نے جلد ہی ایک نیا بیل خرید لیا۔ گورا اَب تھان پر بندھا رہتا اور دُوسرے بیلوں کو گدلی گدلی آنکھوں سے دیکھتا رہتا اور دُنیا کی بے ثباتی پر غور کرتا رہتا۔ اُس کی کھال ڈِھیلی پڑ کر جھُرّیوں کی صورت لٹک آئی تھی۔ اُس کی پسلیاں نکل آئی تھیں اور بڑھاپے کا نکمّاپن اُس کی ٹانگوں کی لڑکھڑاہٹ بن گیا تھا۔

بابا شیرے نے سوچا کہ گورا چند دِنوں کا مہمان ہے، اِس لیے اُس نے کہا:

بہادر بیٹا! گورے کے چارے پانی کا خیال رکھنا۔ بیس سال کا ساتھی ہے۔

بابا! مجھے تو ہر قسم کا خیال ہے، پر تیرا گورا کچھ زیادہ ہی فقیر بن گیا ہے۔ کبھی جی چاہے تو دو چار منہ مار لیتا ہے۔

بابا شیرے نے ہنس کر گورے کی گردن پر ہاتھ پھیرا۔ گورے نے گدلی گدلی آنکھوں سے شیرے کو دیکھا اور اُسے پہچان لیا۔ آخر بیس سال کا ساتھی تھا۔ بابا شیرے نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور کھُلے کھیتوں کی طرف دیکھا جہاں مکّی، باجرے اور جوار کے پودے پلٹن باندھے کھڑے تھے۔ برسات کا موسم گزر رہا تھا اور اَپنے پیچھے سَرسبزیاں چھوڑ رہا تھا۔ بابا شیرے نے سوچا: ''کتنی رُتیں بیت گئیں، کتنی برساتیں آئیں اور پیاسی زمین کی پیاس بجھا کر اَپنا دامن خالی کر گئیں۔ زندگی میں کتنے اُلٹ پھیر ہیں! اَب گورا بھی ساتھ چھوڑ رہا ہے!'' اِس خیال سے اُسے جھرجھری سی آئی، جیسے ہَوا کا ایک یخ بستہ جھونکا سَر سے پاؤں تک سَن سے گزر گیا ہو۔ ''میں موت سے ڈر گیا''...... شیرے نے سوچا...... ''واہ! میں بھی کتنے تھوڑے دِل کا ہُوں!''

گورا روز بروز لاغر ہوتا چلا گیا اور بابا شیرا ہر صبح یہ وَہم لیے ہوئے کنویں پر آتا کہ گورا رات کی تاریکیوں میں اَپنا سفر ختم کر چُکا ہو گا لیکن صبح گورے کو ناند پر کھڑے دیکھ کر اُسے اِطمینان بھی ہوتا اور حیرت بھی۔ اچانک ایک دِن گورے کے بجائے چنبے نے چارہ چھوڑ دیا۔ بابا شیرا جب کنویں پر آیا تو بہادر نے گھبرا کر کہا:

بابا! آج چنبا چارے کو منہ نہیں لگا رہا۔

شیرے نے ٹھوکر مار کر چنبے کو کھڑا کیا تو اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ شیرا بھی گھبرا گیا۔ اُس نے کہا:

بہادر بیٹا! چنبے کا پیٹ پھُولا ہُوا معلوم ہوتا ہے۔ میرو سے کہو گاؤں سے گڑ، اَجوائن اور سرسوں کا تیل لے آئے۔ اگر آم کا پُرانا اَچار مِل جائے تو بڑا اچھا ہے۔

میرو بھاگا بھاگا گاؤں گیا اور گڑ، اَجوائن اور سرسوں کا تیل لے آیا تو شیرے نے مرکّب بنا کر اُسے بانس کی ایک نال میں بھرا۔ بہادر نے چنبے کا مُنہ کھولا اور شیرے نے مرکّب اُس کے مُنہ میں اُنڈیل دیا۔ شیرا سارا دِن کنویں پر رہا۔ شام تک چنبے کو مرکّب کی کئی خوراکیں پلائی گئیں اور آم کا اَچار چٹایا گیا۔ شیرا شام کو گھر جانے لگا تو اُس نے کہا:

بہادرے! آج رات، تُو کنویں پر رہ جا۔ چنبے کو پیٹ اُپھارا ہے، رات دو تین بار جاگ کر دوائی پِلا

دینا اَور ہاں......

شیرے نے رُک کر کہا:

فکر کی کوئی بات نہیں۔ صبح تک چنبا بھلا چَنگا ہو جائے گا۔

لیکن شیرے کو رات بھر نیند نہ آئی۔ علی الصّبح وہ اَذان کے بُلاوے پر مسجد گیا اَور نماز پڑھنے کے فوراً بعد کنویں پر پہنچ گیا۔ بہادر اُس کے اِنتظار میں کھڑا تھا۔ شیرے نے دُور ہی سے بھانپ لیا کہ رات چنبے نے دم توڑ دیا ہے۔ اُس نے بہادر کے پاس آکر کہا:

بہادر بیٹا! چنبا مر گیا ہے؟

ہاں بابا!

اَور بہادر کی آنکھیں آنسوؤں سے تَر ہو گئیں۔

واہ بہادرے! ایک چنبے کے مرنے پر تُو اِتنا غم کر رہا ہے۔ خدا زندگی دے تو چنبے سے بھی اچھا بَیل خرید لیں گے۔

بابا شیرا کہنے کو تو یہ کہہ گیا پر اُس کی آنکھوں کے سامنے گُھپ اَندھیرا چھا گیا۔ وہ تھان کی طرف بڑھا۔ چنبا ایک طرف بے حِس و حرکت پڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں بے نُور تھیں اَور اُس کا پیٹ غبارے کی طرح پُھولا ہُوا تھا۔ گورا دُوسرے کھونٹے پر بندھا، مُردہ چنبے کو گُھور رہا تھا اَور اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ بابا شیرا چنبے تک پہنچتے پہنچتے خود بھی لڑکھڑا گیا۔ میرو نے آگے بڑھ کر سہارا دیا اَور کہا:

نمبردارا! تُو اِتنا تھڑدِلا تو نہیں تھا۔

نہیں میرو! مجھے چنبے کے مرنے کا افسوس نہیں۔ ایسے نقصان ہوتے ہی رہتے ہیں، پر مَیں سوچ رہا تھا کہ مرنا تو گورے کو تھا اَور دم توڑ دیا چنبے نے!

کس کو پتا، موت کس کو پہلے آئے گی؟

ہاں میرو...... پر گورے کا تو وقت اخیر تھا اَور چنبے نے ابھی جوانی کا میٹھا میوہ بھی سیر ہو کر نہ کھایا تھا۔

شیرے نے کہا اَور اُس کا جی بیٹھ گیا۔ موت کا اَندھا شِکاری نشانہ کہیں باندھتا ہے اَور لگ کسی اَور کے جاتا ہے۔ چنبا تو ابھی بھرپور جوان تھا، اُس کی رگ رگ میں بجلیاں تھیں۔ پٹھے پر ہاتھ نہ رکھنے دیتا تھا، ذرا چھیڑو تو ہَل کو لے کر ہَوا ہو جاتا تھا، ذرا سے لمس سے اُس کی حسّاس جِلد پر تھرتھری طاری ہو جاتی تھی، ملائم اَور چکنی کھال پر پانی کی ایک بُوند بھی نہ ٹھہر پاتی تھی اَور چنبے کو مَوت یُوں اُچک کر لے گئی جیسے وہ ننھا سا ممولا ہو جسے شِکرا ایک جھپٹ میں دبوچ لے جاتا ہے؛ اَور سوچتے سوچتے شیرے کی جُھرّیاں گہری ہو گئیں، آنکھوں کی چمک پر غم کی راکھ چھا گئی اَور نہ جانے کیوں وہ دو چار روز تک کنویں

پر آنے اَور بہادر کو آنکھ جما کر دیکھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اَور گورا ہڈّیوں کا پنجر بن کر رہ گیا، پر سانس کی دُھونکنی چلتی رہی۔ قدرت کے کھیل نیارے ہیں۔ اِس کا راز کس نے پایا ہے!

بابا شیرے نے گورے کی طرح ایک دم دُنیا سے جی اُٹھالیا! گھر سے مسجد اَور مسجد سے گھر۔ وہ کبھی کبھار کنویں پر آتا بھی تو مہمانوں کی طرح۔ ایک نظر کھیتی پر ڈال لیتا اَور بس۔ بہادر البتہ نئی فصل بونے سے پہلے یا کوئی سَودا طے کرتے وقت، اُس سے مشورہ لے لیتا۔

چنبے کی مَوت کے بعد سارے گاؤں کی قسمت گویا شیرے اَور بہادر کے گھر اُٹھ آئی۔ بہادر نے مٹّی پر ہاتھ ڈالا تو وہ بھی سونا بن گئی اَور زمین کی ساری دَولتیں، برکتیں اَور نعمتیں اُس کے قدموں پر نچھاور ہو ہو جاتی رہیں۔ لوگ کہتے:

یارو! بڑے اچنبھے کی بات ہے۔ رحمت کی برکھا ہماری زمینوں پر بھی ہوتی ہے، پر بہادر کی کھیتی میں تو سونا بکھیر جاتی ہے۔

یہ اپنی اپنی نیّت کی بات ہے۔

کوئی کسان کہتا۔

نیت نہیں، قسمت کہو! قسمت کے بھی کئی رُوپ ہیں۔ یہ عورت کی طرح کسی پر مہربان ہونے پر آتی ہے تو اَپنا سب کچھ لُٹا دیتی ہے۔

بابا شیرا مطمئن قلب لے کر گاؤں میں پھرتا۔ دولت اَور عزّت کی زیادتی نے اُس کے پِندار کو انگیخت نہ کی تھی۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ عاجز اَور نرم دِل ہو گیا تھا۔ دُوسروں کی مصیبت پر سب سے پہلے ہم دردی کا تحفہ لے کر پہنچتا لیکن یہ اِطمینان، یہ مسکراہٹیں، یہ زندگی جس میں بہار کے موسم کی نرم نرم دُھوپ تھی، شیرے کے دِل پر بوجھ بننے لگی۔ روشنیوں کے اِس نرم رَو سیلاب میں سے کبھی کبھار اَندھیرے کی کوئی اَندھی کرن بھی اپنی جھلک دِکھلا جاتی، شیرے کے جسم میں تھرتھری آجاتی اَور رُوئیں رُوئیں سے ٹھنڈا پسینہ پھُوٹ بہتا جیسے اُس نے کسی بل کھاتے سانپ کے گیلے پھَن کو چھُو لیا ہو اَور شیرے نمبردار نے آئے دِن صدقہ دینا اَور کھانا پکا کر غریبوں میں بانٹنا شروع کر دیا۔ لیکن اَن دیکھے بھُوت کا یہ ٹھنڈا ہاتھ اُس کے سینے سے دُور نہ ہُوا اَور شیرے نے دُعا مانگی:

مولا! میں نے آج تک دُنیا کی اِتنی خواہش نہیں کی تھی۔ میرا سب کچھ لے لے پر مجھے وہ اِطمینان لوٹا دے جو مدّتوں سے میرا ساتھی تھا!

....

سردیوں کی ایک رات کو بابا شیرا عِشا کی نماز سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا اَور گھر میں ابھی تک دیا جل رہا تھا اَور بہُو نے رات کے کام کاج سے فارِغ ہو کر ڈیوڑھی کا دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا کہ بہادر کنویں

سے لَوٹ آیا۔ شیرے نے پوچھا:

بہادرا! تُو نے کہا تھا' آج گندم کو پانی لگانا ہے اَور تجھے رات کو کنویں ہی پر رہنا تھا' پر تو چلا کیوں آیا؟

بابا! مجھے سردی لگ رہی ہے۔ میری پسلی میں درد ہے۔

پسلی میں درد ہے؟......

بابا شیرے کی آواز کپکپا گئی۔

کوئی فکر کی بات نہیں بابا۔ ابھی لحاف اوڑھ کر لیٹوں گا اَور پسینہ آئے گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔

پر تیری پسلی میں درد ہے......

بابا شیرے نے کہا:

پسلی میں درد!

اَور وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

بہادر نے لحاف لپیٹتے ہُوئے اَپنی بیوی سے کہا:

بابا کو چھوٹی سی بات کا فکر لگ جاتا ہے۔ میرا جسم گرم ہُوا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔

لیکن لحاف میں لپٹ کر بھی اُس کے درد کو کوئی اِفاقہ نہ ہُوا۔ اُس کی بیوی نے چُولھے میں سے کوئلے نکال کر مٹی کی انگیٹھی میں ڈالے اَور انگیٹھی اُس کی چارپائی کے پاس رکھ دی' لیکن بہادر کو پہلے سے بھی زیادہ سردی محسوس ہونے لگی اَور درد کے مارے سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ کچھ عرصے کے بعد بابا شیرا گاؤں کے بوڑھے حکیم کو لے کر آ گیا۔ حکیم نے بہادر کی نبض پر ہاتھ رکھا اَور پھر کچھ کہے بغیر چلا گیا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد وہ تین۳ پُڑیاں لے کر آ گیا۔ اُس نے کہا:

یہ بارہ سنگھے کے سِینگ کا کُشتہ ہے۔ بڑی اِکسیر شے ہے۔ تھوڑا سا دُودھ تو گرم کرو بہُو!

دُودھ گرم ہُوا تو بہادر کو ایک پُڑیا کِھلا دی گئی۔ حکیم نے کہا:

دُوسری پُڑیا آدھی رات کو دے دینا! میں علی الصبح آؤں گا۔ نمبردارا! کوئی فکر کی بات نہیں۔

پُڑیا کھانے کے کچھ دیر بعد بہادر کو کچھ اِفاقہ محسوس ہُوا اَور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ بابا شیرے نے کہا:

بہو! میرا مصلّا بچھا دو۔ دوا کے ساتھ دُعا بھی ہو تو اللہ ضرور رحم کرتا ہے۔

آدھی رات کو دُوسری پُڑیا کِھلائی گئی اَور بہُو تھک کر سو گئی لیکن بابا شیرا جاگتا رہا۔ وہ گِڑگِڑا کر دُعا مانگتا رہا، نفل پڑھتا رہا اَور بار بار بہادر کی پیشانی پر دم کرتا رہا؛ لیکن اُس کے دِل پر سے بوجھ نہ اُترا۔ غم اَور مصیبت کے منحوس سایوں کا بادل گہرا ہو کر سنگِ خارا کی چٹان بن گیا جو اُس کے دِل کا گلا گھونٹ رہی تھی۔

اَور صبح نے آتے آتے بہت دیر لگا دی۔

جب صبح کا ستارہ نکلا تو بابا شیرا گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ اُس نے اَپنے داماد حیدر کے دروازے پر دستک دی۔ حیدر آنکھیں مَلتے ہُوئے باہر آیا تو شیرے نے کہا:

حیدر بیٹا! بہادر کو رات سے پسلی میں درد ہے۔ تُو شہر چلا جا اَور کسی ڈاکٹر کو لے آ! دیکھ، روپے پیسے کے معاملے میں کنجوسی نہ کرنا، ڈاکٹر کو مُنہ مانگی فیس دینا۔

پر بابا! ابھی تو بہت سویر ہے۔ اَور سردی بھی کڑاکے کی پڑ رہی ہے۔

حیدر! ......

شیرے نے کہا:

تو رات کے اندھیرے اور سردی سے ڈرتا ہے اَور میری جان پر بنی ہُوئی ہے۔ تُو ابھی باپ نہیں بنا، تجھے کیا پتا!

حیدر نے کھیس کی بُکّل ماری اَور لاٹھی ہاتھ میں لے کر شہر کی طرف نکل گیا جو وہاں سے دس کوس دُور تھا۔

بابا شیرے نے صبح کی نماز اُمید و بیم کی کشمکش کے درمیان پڑھی۔ جب وہ مسجد سے واپس آیا تو بہو رو رہی تھی۔ اُس نے بہُو کے سَر پر ہاتھ پھیر کر کہا:

واہ بہُو رانی! دِل چھوٹا کیوں کر رہی ہو؟ میرا دِل کہتا ہے کہ بہادر کے سَر سے بَلا ٹَل گئی ہے۔

لیکن اُس کے دِل نے بغاوت کرتے ہُوئے کہا:

واہ شیرے! تُو مجھے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

بہادر کا درد بڑھ گیا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا:

بہادر بیٹا! صبر کر۔ کڑیل جوان تو اِتنے درد کو ماں کا دُودھ سمجھ کر پی جاتے ہیں۔

بہادر نے ہونٹ بھینچ لیے۔ درد کی ٹیسیں آنکھوں کا کرب بن گئیں۔ کرب جو بپھری ہُوئی مَوجوں کی طرح صبر کے بند سے رہ رہ کر ٹکراتا، بہادر کی پُتلیاں پھیل جاتیں، حواس تِنکوں کی طرح منتشر ہو جاتے اَور بھنچے ہُوئے ہونٹ کُھلتے اَور جوانی کا ضبط دبی سی کراہ کے ساتھ ہتھیار ڈال دیتا۔

ڈاکٹر بہت دیر سے پہنچا۔ اُس وقت تک بہادر کی آنکھوں سے ہوش و حواس رُخصت ہو چکے تھے۔ اُس کی پُتلیاں یُوں گھومتیں جیسے وہ اپنے گِرد و پیش کو حسرت کی نگاہ سے دیکھ رہی ہوں۔ اُس کی زبان میں ژولیدگی بھی آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے ٹِیکا لگایا، دوا پلائی، چند خوراکیں دوائی کی اَور ہدایات دیں تو بابا شیرے نے پوچھا:

ڈاک دار صاحب! بہادر اچھا تو ہو جائے گا نا؟

ڈاکٹر نے کہا:

کیوں نہیں؟ جوان آدمی کے اندر مقابلے کی قوت زیادہ ہوتی ہے۔ بیماری کا حملہ بے شک شدید ہے لیکن مریض طاقت وَر ہے۔

بابا شیرے نے سَر نہوڑا کر سوچا: "جب جوان آدمی پر بیماری حملہ کرتی ہے تو وہ اپنی پوری طاقت سے لیس ہو کر آتی ہے"۔ اَور اُس نے مایوسی کی شدّت میں اپنے ہونٹ کاٹ لیے۔ گاؤں کے باہر آکر ڈاکٹر نے حیدر سے کہا:

مریض کو سَرسام ہوگیا ہے۔ اگر کل صبح تک...... میرا مطلب ہے...... یعنی...... کل صبح سویرے مجھے لینے آجانا!

....

لیکن دُوسری صبح ہڈّیوں کا پِنجر گورا ابھی تک تھان پر کھڑا تھا۔ اُس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں اَور سانس کی دُھونکنی چل رہی تھی۔ چنبا جس کی رگ رگ میں جوانی کی آگ تھی، دِیے کے کم زور شعلے کی طرح مَوت کے ایک ہی سانس سے پھڑپھڑا کر بُجھ گیا تھا!

شیرے نمبر دار نے جو ساٹھ سال سے دُنیا کے گرم سرد سے مردانہ وار مقابلہ کر رہا تھا، یک لخت ہتھیار ڈال دیے۔ اُس نے جوانی کی بجھی ہُوئی راکھ کو دیکھا تو اُسے اپنے لڑکھڑاتے بڑھاپے پر غصہ آ گیا...... غصہ جو اچانک غم کے تُند ریلوں پر حاوی ہو گیا تھا، بِپھری ہُوئی مَوج کی طرح اُبھرا اَور اُس کی آنکھوں کی مایوس راکھ میں دوزخ کی دہکتی ہُوئی آگ کا شُعلہ بن گیا تھا۔ اُس نے غصے سے چیخ کر کہا:

لوگو! تم گورے کا گلا کیوں نہیں گھونٹ دیتے جس کا منحوس بڑھاپا چنبے کی جوانی کو کھا گیا۔

اُس کے ہاتھ بڑھاپے کے گلے کی طرف لپکے۔ اُس نے بڑھاپے کے نحیف و نزار گلے کو اِس زور سے گھونٹا کہ ہاتھوں کی رگیں اُبھر آئیں اَور پیشانی کی ایک ایک سِلوَٹ، ایک ایک جھَری اُبھری اَور تنی اَور پھر ہاتھوں کی گرفت خود بہ خود ڈِھیلی پڑ گئی اَور...... اُن لوگوں نے لپک کر بڑھاپے کو تھام لیا جو جوانی کی آگ کو سَرد ہونے سے نہ بچا سکے تھے۔

....

اُس شام ایک قبر پر کھڑے ہوکر، جس پر نئی نئی مٹی پڑی تھی، شیرے نے کہا:

حیدر! یہ قبر شیرے نمبر دار کی ہے نا؟

حیدر نے مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔

بہادر جب مبارک پور سے لَوٹ کر آئے تو اُسے کہنا کہ اِس پر ایک مٹھی خاک کی ضرور ڈال دے۔ تم اُسے منا لاؤ گے نا؟

ہاں! ہاں!

حیدر نے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

شیرے نے بڑبڑا کر کہا:

بہادر رُوٹھ گیا ہے۔ پر وہ جا بھی کہاں سکتا ہے؟ آخر اِسی گھر میں لَوٹ کر آئے گا۔

....

لیکن رُوٹھا ہُوا بہادر لَوٹ کر نہ آیا!

شیرے کے گھر میں خاک اُڑنے لگی۔ وفادار میرو تَن دہی سے کام کرتا لیکن اکیلا آدمی سارا کام نپٹا نہ سکتا تو کہتا: "نہ جانے نمبر دار کو کیا ہو گیا ہے؟" اَور جب وہ گاؤں آتا، تو بہادر کے تین[۳] بچّوں کو کھیلتے کودتے دیکھ کر سوچتا: "جس کے گھر میں تین[۳] لال ہوں، وہ دُنیا سے مُنہ کیوں موڑے؟" شیرے نے بہادر کا بہت اِنتظار کیا۔ وہ بہادر کو ڈھونڈنے کے لیے ہر روز مبارک پور جاتا۔ اُس کے سَر پر نہ پگڑی ہوتی نہ پاؤں میں جُوتا۔ سَر اَور ڈاڑھی کے بالوں میں خاک جم گئی تھی۔ وہ ہر روز شام کو بہُو سے پوچھتا:

ابھی بہادر نہیں آیا، بہُو؟

نہیں تو......

بہو کہتی اَور چپکے سے مُنہ موڑ کر دو[۲] آنسو بہا لیتی اَور شیماں اُٹھ کر اَندر چلی جاتی تاکہ خُوب دِل کی بھڑاس نکال سکے۔

جوانی کتنی بے سمجھ ہوتی ہے۔ کل صبح ایک پورے کھیت میں ہل چلانا تھا۔ اَب وہ آدھی رات گزرنے پر آئے گا اَور تھکے ہُوئے بَیل کی طرح گِر پڑے گا اَور خرّاٹے بھرتا رہے گا۔ صبح سُورج نکلے اُٹھے گا......

شیرا بڑبڑاتا ہُوا چارپائی پر لیٹ جاتا۔ آدھی رات بھی گزر جاتی اَور بہادر نہ آتا تو شیرا مایُوس ہو کر تارے گننے لگتا۔

....

آخر تین[۳] ماہ بعد شیماں کو اپنے سُسرال جانا پڑا تو بہُو نے میکے سے اپنی ماں کو بُلا لیا۔ بہُو کی ماں نے گھر کا اَبتر حال دیکھا تو رو پڑی:

بیٹی! تجھے یہ گھر کاٹ کھانے کو دَوڑتا ہو گا؟

ہاں ماں!

پھر کچھ دِنوں کے لیے میرے ساتھ چلی چلو!

پر میرے پیچھے بابا کا کیا حال ہو گا؟

شیماں کو بُلا لو۔

شیماں آج ہی سُسرال گئی ہے۔

ماں چُپ ہو گئی۔ اِتنے میں شیرا بھی باہر سے آ گیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ کُرتا پھٹا ہُوا

تھا، ننگے پاؤں زخمی تھے۔ اُس نے آتے ہی پوچھا:

بہو بیٹی! بہادر آ گیا؟

نہیں تو......

بہو نے مُنہ پھیر کر ماں کو دیکھا۔ بہُو کی ماں پہلے اِس بات کا مطلب نہ پا سکی۔ پھر اُس نے بیٹی کے چہرے کو دیکھا اَور بے اِختیار رو پڑی۔ اُس نے کہا:

نمبردارا! تُو نے یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟

بہادر جو رُوٹھ گیا ہے۔

تو کیا ہُوا۔ اُس کی نشانیاں جو تیرے پاس ہیں......

سمدھن نے کہا۔

شیرے نے چارپائی پر گِرتے ہُوئے کہا:

بہادر بیٹا! تُو کب لَوٹ کر آئے گا؟ اَب تو مَیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک چُکا ہُوں!

نانی نے نواسوں کو آگے بڑھایا۔ شیرے نے پہلے اُنھیں گھُور کر دیکھا۔ پھر دِیے کی ہلکی سی روشنی میں اُنھیں پہچان لیا اَور اُن کے سَروں پر ہاتھ پھیرا۔ سمدھن کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تو شیرے نے پوچھا:

بہن! تو کیوں رو رہی ہے؟

نمبردارا!......

سمدھن نے شیرے کے بازُو پر ہاتھ رکھ کر کہا:

تجھے معلوم نہیں، میں کیوں روتی ہُوں؟

نہیں۔

تو سُن......

سمدھن نے اپنے عزم کی تمام قوتوں کو جمع کرتے ہُوئے کہا:

بہادر اَب لَوٹ کر نہ آئے گا۔ وہ وہاں چلا گیا ہے جہاں سے کوئی لَوٹ کر نہیں آتا۔

ہائیں!......

شیرے نے تڑپ کر کہا:

بہادر لَوٹ کر نہیں آئے گا؟

چودھری!......

سمدھن نے سِسکیاں بھرتے ہُوئے کہا:

بہادر لَوٹ کر نہیں آئے گا۔ تیرا یہی حال رہا تو بہادر کی یہ نشانیاں، یہ ننھی سی کلیاں بھی مُرجھا کر رہ جائیں گی۔

شیرا سَر جھکا کر سوچنے لگا۔

سمدھن نے موقع کو غنیمت جانا اور کہا:

نمبر دارا! تیرے سوا اِن کا کون ہے؟ تُو نے اِن کو سہارا نہ دیا تو یہ موتی خاک میں مِل جائیں گے۔ چودھری ہوش کر! لوگ مَرنے والوں کے ساتھ مَر تو نہیں جایا کرتے۔ بِن آئی موت تو مُنہ مانگے بھی نہیں ملتی۔ کہو تو مَیں اِن کو ساتھ لے جاؤں۔

کن کو؟

تیری بہو اور بہادر کی نشانیوں کو۔ تُو بہادر کے لَوٹ آنے کا اِنتظار کرتا رہ!

نہیں ......نہیں ......

شیرے نمبر دار نے چَونک کر کہا:

نہیں ......

اور اُس کا سَر جھک کر گھٹنوں سے جا لگا۔ بہو نے سہارا دے کر اُسے چارپائی پر لِٹا دیا۔

حقیقت کا اِحساس شیرے پر بجلی بن کر گِرا، نرم رَو ہَوا کے ایک دھیمے جھونکے کی طرح آیا۔ اور شیرے نے اپنے جسم کے ساتھ ہی رُوح کو بھی ایک خُمار آلود نیند میں پایا۔ شیرے کے انگ انگ میں جُنوں کی آگ سرد ہُوئی تو اُس کے جسم اور دماغ سے ہر قوّت یُوں رُخصت ہُوئی جیسے جوار بھاٹے کے اُترنے کے بعد ریت اور خس و خاشاک باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ کئی دِن تک چارپائی سے نہ اُٹھ سکا اور آہستہ آہستہ راکھ میں پھر زندگی کا شرارہ چمکا تو شیرا چارپائی سے اُٹھا اور بہادر کی قبر پر پہنچا۔ اُس نے قبر کے سرھانے بیٹھ کر پہلی بار فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو اُس کے دِل کا دوزخ سرد پڑ گیا جیسے کسی نے کوثر کا ایک جام لُنڈھا دیا ہو۔

سمدھن نے کہا:

چودھری! تُو کہے تو میں تیری بہو کو چند دِنوں کے لیے ساتھ لے جاؤں؟

بہن! بہو سے پوچھ لو، پر...... یہ خالی گھر مجھے کاٹ کھانے کو نہ دوڑے گا؟

بہو نے کہا:

ماں! ابھی کیا ضروری ہے۔ ذرا بابا کی طبیعت ٹھیک ہو لے تو میں آ جاؤں گی۔

اور سمدھن مطمئن ہو کر اپنے گاؤں لَوٹ گئی۔

ایک دِن اَساڑھ کی پہلی مُوسلا دھار بارِش ہُوئی اور جَلی ہُوئی مٹّی سے نئی زندگی کی خُوش بُو اُٹھی تو شیرے کے دِل کا وہ پیار جاگ اُٹھا جو مٹی کے خمیر سے وابستہ ہے۔ اُس نے رات کو میرو سے کہا:

کل صبح ایک کھیت کو جوار کی بوائی کے لیے تیار کرنا ہے۔ میں صبح سویرے کنویں پر پہنچ جاؤں گا!

اَور میرو کا بڑھاپا بھی خوشی سے کانپنے لگا۔ وہ ساتھی جو تھک ہار کر راہ ہی میں بیٹھ گیا تھا' پھر ساتھ دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

سورج کی پہلی کرن پُھوٹی تو چند مَرلوں میں ہل چلنا باقی رہ گیا تھا۔ بُھربُھری گیلی مٹی کے ڈھیلے ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ہل کی سیدھی لکیریں اُبھری ہُوئی تھیں۔ دُھوپ تیز ہُوئی تو شیرے نے ایک ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا اَور دُوسرا ہل کی ہتھی پر اَور جب وہ ایک موڑ کاٹ چُکا اَور اُس کی پیٹھ سُورج کی طرف ہوئی تو اُس نے بہُو کو دیکھا جو صبح کا ناشتہ لے کر آ رہی تھی۔ شیرے نے کہا:

میرو! بہُو روٹی لے کر آ گئی ہے۔

دونوں نے ہل چھوڑ دیے اَور کیکر کی چِھدری چِھدری چھاؤں تلے آ کر بیٹھ گئے۔ بہُو نے پیالوں میں لسّی بھری' نمک کا ڈَلا پھیرا' لسی اَور روٹیاں اُن کی طرف بڑھا دِیں۔ شیرے نے پہلا لقمہ مُنہ میں رکھا تو وہ حلق میں اٹک گیا۔ اُس نے لسّی کا ایک گھونٹ بھرا تو لقمہ اُتر گیا اَور یہ گھونٹ زندگی کی ٹھنڈک بن کر حلق سینے تک پہنچ گیا اَور اُسے اَیسا لگا جیسے اُسے جلتے بلتے ریگ زار میں اچانک ٹھنڈا سایہ مِل گیا ہو۔

زندگی کے سفر میں کہیں نہ کہیں مُسافر کو یہ سایہ مل ہی جاتا ہے!

اُس نے کہا:

واہ بہو! آج مدتوں بعد روٹی اَور لسی کا مزہ آیا۔ بیٹی! تو نے روٹی میں کتنا گھی ڈال دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آج میرو کو ایک لقمہ بھی نہ دُوں۔

کھا لے نمبر دارا! میرے حصے کا بھی کھا لے......

میرو نے چمک کر کہا۔

بہو نے خالی مَٹکا سَر پر دھرا' اُس کے اُوپر چھابا رکھا اَور اُس پگ ڈنڈی پر ہو لی جو گاؤں کی طرف جاتی تھی۔ بابا شیرا اُسے دیکھتا رہا۔ بہُو ایک موڑ پر کماد کے ایک کھیت کی اوٹ میں چُھپ گئی اَور اُس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا:

اُٹھ میرو! تھوڑے سیاڑ باقی رہ گئے ہیں۔

نمبر دارا! تُو تھک گیا ہے' ذرا آرام کر لے۔

ہاں میرو! میں تو تھک گیا ہُوں' پر میں نے آج ہل کی ہتھی پر ہاتھ نہ رکھا اَور بہُو نے مُڑ کر دیکھ لیا تو اُس کا دِل ٹوٹ جائے گا۔

اَور شیرا کمر پر ہاتھ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا:

میرو! ہمارا بڑھاپا تو آخری منزل پر ہے' پر بہو کو ابھی پہاڑ جیسی جوانی کاٹنی ہے۔ آہ! تقدیر نے زندگی

کے کس موڑ پر دھوکا دیا!

اَور شیرے کا چہرہ خزاں رسیدہ پتّے کی طرح سُکڑ گیا تو میرو نے کہا:

نمبر دارا!

ہاں!

تیرے بہادر کی تین نشانیاں تیرے پاس ہیں۔ تو کس لیے جی مَیلا کرتا ہے؟

میرو! ......

شیرے نے سنجیدہ ہو کر کہا:

کونپلیں پُھوٹتی ہیں تو کسان آس لگا کر بیٹھتا ہے کہ کب یہ شگوفے بڑھیں گے، پروان چڑھیں گے اَور لہلہا کر پودے بن جائیں گے! لُو کا ایک جھونکا آئے تو یہ کونپلیں جھلس جاتی ہیں اَور کسان کا دِل لہُو ہو جاتا ہے۔ بادل گِھر گِھر کر بن برسے گزر جائیں تو پیاسے مُنہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں اَور اُن میں ایک قطرہ بھی نہیں ٹپکتا۔ کون جانتا ہے کہ جو کونپل مٹی کا سینہ چیر کر نکلی، وہ پروان چڑھ کر پَھل پُھول بھی دے گی؟

خزاں رسیدہ پتّے پر ساٹھ سالہ محنت اَور غم، دُھوپ کی بارِش، آس اَور نراس کے نقوش اُبھرے تو جھریاں گہری ہُوئیں اَور صدیوں کا دُکھ ایک لمحے میں سمٹ کر آیا۔ پھر بر کھا لگی اَور میرو نے سوچا: ''اچھا ہُوا آج کئی مہینوں کے بعد نمبر دار پہلی بار بہادر کو رویا''۔

آنسو گَرد سے اَٹے ہوئے چہرے پر گدلی ندیاں بن کر بہنے لگے...... طوفان تھما تو میرو نے کہا:

نمبر دارا! دُھوپ تیز ہو رہی ہے، تھوڑے سے سیاڑ باقی رہ گئے ہیں۔

میرو نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر بیلوں کو چھیڑا تو وہ لمحہ جو شیرے پر گزر گیا تھا، اَب اچانک میرو کے دِل میں اُتر آیا۔ میرو کو بہادر کی جوانی اَور رفاقت یاد آ گئی اَور پھر شیرے کا بڑھاپا اَور بہُو کی جوانی کی تصویر اُبھری تو وہ گہری سوچ میں کھو گیا۔

اچانک شیرے نے کڑک کر کہا:

اوئے میرو! پاڑا اوئے پاڑا۔

میرو نے گھوم کر شیرے کو دیکھا اَور اُسے شیرے کی آنکھوں میں وُہی چمک نظر آئی جو کبھی اُس نے شیرے کی جوانی میں دیکھی تھی۔ اُس نے پھالے کو اُٹھا کر سیاڑ سے سیاڑ مِلا دیا۔

☆☆☆

گلی کا گیت

اُس کا کنواں گاؤں سے ڈیڑھ دو کوس کے فاصلے پر تھا۔

اُس کے اِرد گرِد' درختوں کے گھنے جُھنڈ تھے اَور اُن کا سلسلہ ایک گھنے جنگل میں جا کر گم ہو جاتا تھا۔ اندھیرا چھاتے ہی ہَوا چلتی اَور درخت لہراتے تو وہ یُوں محسوس کرتا جیسے وہ اُس جنگل میں رَستہ بُھول گیا ہو۔ پھر اندھیرے کی لرزشوں میں کئی اَن جانے نغمے گُھل مِل جاتے۔ اُن میں سِسکیاں بھی ہوتیں اَور قہقہے بھی اَور وہ اکیلا کنویں کی مُنڈیر پر بیٹھ کر اُن نغموں کا سواگت کرتا۔ اُسے نہ ڈر لگتا' نہ وحشت محسوس ہوتی۔ بس یُوں لگتا جیسے وہ ایک دُنیا سے کٹ کر رہ گیا ہو اَور ایک نئی دُنیا کا اَسرار اُس کے رُوئیں رُوئیں میں رَچ بَس رہا ہو۔

جوں جوں رات ڈھلتی اَور سِتارے ڈھلکتے' وہ اَسرار گہرا ہوتا چلا جاتا اَور پھر فضا میں خنکی رَچ جاتی اَور ہَوا کے سانس سو جاتے۔ وہ کنویں کی مُنڈیر پر سے اُٹھتا اَور اُس کا انگ انگ لڑکھڑا رہا ہوتا۔ وہ مویشیوں کے پاس بچھی ہُوئی جھلنگا سی کھاٹ پر گِر کر تاروں کا ہم سفر بن جاتا۔ پھر اُسے نیند آجاتی۔ یہ نیند گہری بھی نہ ہوتی۔ نہ اُس میں خوابوں کا پرِستان آباد ہوتا۔ البتہ وہ ساری رات ستاروں کا ہم سفر رہتا اَور صبح اُس کی آنکھ کھلتی تو اُس کے سامنے چاند کا ہلکا سا پرتَو ہوتا یا مشرق کا کِنارہ...... شفق کی سُرخیوں سے رنگین' اَور پرندے چہچہا رہے ہوتے۔ دُور دُور تک پودوں کی پھننگوں پر اوس کے قطرے لرز رہے ہوتے اَور مویشی چُپ چاپ ناند میں مُنہ ڈالے رات کا بچا ہُوا چارا کھانے میں مصروف!

بشیرے جاگ رہے ہو؟......

اُس کا باپ علی الصبح اُس کے سرہانے آ کر پوچھتا۔

ہاں بابا!

وہ کھوئی کھوئی آواز میں جواب دیتا۔

رات سوتے رہتے ہو یا مویشیوں کا دھیان بھی رکھتے ہو۔

بابا' میں نہ سوتا ہوں نہ جاگتا ہُوں!

پھر کیا کرتے ہو؟

کچھ بھی نہیں۔ میں لیٹا رہتا ہُوں اَور تارے میرے ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔

تارے!......کون سے تارے! مویشیوں کا دھیان رکھا کرو بشیرے!

ذرا دیر بعد سُورج نکل آتا اَور دِن کا کام کاج شروع ہو جاتا۔ کبھی اُس کا ہاتھ ہَل پر ہوتا' کبھی چارا کاٹنے والی مشین کی دستی پر' کبھی وہ گادھی پر بیٹھ کر رہٹ کی رُوں رُوں میں کھو جاتا' کبھی پانی موڑنے کے لیے کھیت میں کھڑا ہوتا اَور کبھی کھیت کی مینڈھ پر شیشم کی چھاؤں تلے وہ روٹی کے چند نِوالے مُنہ میں ڈال رہا ہوتا۔ کھٹّی میٹھی لسّی جس میں نمک ہوتا اَور روٹی جو خُوش بُو دار گھی سے چُپڑی ہوتی اَور اُس خُوش بُو میں اُس کی ماں کی مسکراہٹیں ہوتیں جو اُس کی بھیگتی ہُوئی مَسیں دیکھ کر ایک عجب جذبے سے سرشار ہوتیں جیسے کہہ رہی ہوں: "بشیرے تُو سارا دِن' ساری رات کنویں پر رہتا ہے اَور میں اُداس رہتی ہُوں کیوں کہ تو میرا اکلوتا بیٹا ہے نا! کل تک تو میرے سینے سے چمٹ کر سویا کرتا تھا۔ آج تُو مجھ سے جُدا ہے"۔

اَور وہ پُوچھتی:

بشیرے' تجھے رات کو کنویں پر ڈر تو نہیں لگتا!

نہیں تو اماّں!

پر تیرے بِنا مجھے تو گھر سُونا سُونا لگتا ہے۔ میں تیرے باپ سے کہوں گی' کبھی کبھار وہ بھی رات کو کنویں پر آجایا کرے اَور تُو گھر میں سوئے......میری چار پائی کے ساتھ چار پائی ڈال کر۔

وہ مسکرا اُٹھتا تو ماں خوش ہو جاتی:

کل دالان میں چاندنی تھی بشیرے اَور مجھے ساری رات تیرا خیال آتا رہا۔

ماں کبھی رات کو تم یہاں رہو نا کنویں پر میرے پاس۔ چاند نکلتا ہے تو یُوں لگتا ہے' یُوں لگتا ہے ماں......

وہ چُپ ہو گیا۔

کہو بشیرے!

دُودھیا چاندنی جیسے ماممتا کا نُور' چار کھُونٹ بکھر گیا ہو۔

بشیرے نے مسکرا کر کہا۔ اُس کی ماں حیران ہو گئی۔ وہ کَن اکھیوں سے اُس کے چہرے کی طرف تکتی رہی۔ تب وہ کھِلکھِلا کر ہنس پڑی:

بشیرے! تُو بڑا شریر ہو گیا ہے۔

پھر وہ یکایک اُداس ہو گئی:

تیرا باپ اکیلا تھا اَور اُس کے ساتھ کنویں پر کام کرنے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ نہیں تو مَیں تجھے

مدرسے بھیجتی اَور تُو پڑھ لکھ کر......

نہیں ماں، مَیں مدرسے میں پڑھ کر کیا کرتا!

پر بشیرے! مجھے بڑا دُکھ ہے۔ تُو تو پڑھ لکھ کر کرسی پر بیٹھنے کے لائق تھا اَور تیرے باپ نے تجھے مٹّی میں رول دیا۔

بشیرے نے بُھربُھری مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھایا۔ اُس میں نمی کا ہلکا سا رچاؤ تھا اَور اُس سے خُوش بُو آ رہی تھی۔ گندم کے خوشوں، دھان کی منجروں اَور شفتل کے پُھولوں کی خُوش بُو......اُس نے کہا:

مٹی میں بڑی خُوش بُو ہے ماں!

ماں مسکرائی اَور اُس کی آنکھوں کے کونے بھیگ گئے۔

بشیرے، روٹی کھا چکے ہو؟

ہاں بابا!

اُٹھو چارا کاٹ لیں!

سنو تو!

اُس کی ماں نے کہا۔

کہو!

بشیرے کو دُوسرے تیسرے روز گاؤں آنے دیا کرو۔ وہ کوئی قیدی تو نہیں۔

پر کنویں پر کون رہا کرے؟

کبھی تم بھی رہ لیا کرو نا!

بشیرے کے باپ نے قہقہہ لگا کر کہا:

اچھا نیک بخت! آخر ماں ہو نا۔ بیٹے کا زیادہ خیال ہے:

آج گھر چلے جانا شام کو بشیرے!

نہیں بابا!

کیوں؟

میں دِن کی روشنی میں جاؤں گا۔ رات کو تو سارا گاؤں سو جاتا ہے۔

سن لیا نیک بخت؟

دِن کو تو کنوئیں پر کام ہوتا ہے۔ آج رات گھر ضرور آنا!

اُس کا باپ سَرِشام کھانا کھا کر کنویں پر آ گیا۔

بشیر جب کنویں سے گاؤں کی طرف چلا تو شام ہو چکی تھی۔ کوّوں کی ڈاریں جنگل کی طرف اُڑ کر

جا رہی تھی ۔شفق پر بادلوں کو آگ لگ چکی تھی ۔ درختوں کی پھننگوں پر اَندھیرا سرگوشیاں کر رہا تھا اَور ایک دو تارے ابھی سے نکل آئے تھے ۔ پگ ڈنڈی کے دونوں طرف دھان کے ننھے ننھے پودے پانی میں ڈوبے ہُوئے تھے اَور پانی میں شفق کی سُرخیاں تیر رہی تھیں ۔ اُسے یُوں لگ رہا تھا جیسے سارا منظر اُس سے پُوچھ رہا ہو "کہاں جا رہے ہو بشیرے؟" ہر کونپل کی نوک پر یہی سوال تھا جو ہَوا کی لرزشوں پر اُس تک پہنچ رہا تھا:

بشیرے کہاں جا رہے ہو؟

اپنے گاؤں میں!

کیوں؟

گلی کا گیت سننے کے لیے۔

کونپل کی نوک نے حیران ہو کر ہَوا کی لرزش سے کہا:

اِس سے پوچھو' یہ گیت کون سا ہے؟

میں نہیں جانتا۔ میں کنویں سے چلا تو گلی بہت دُور تھی ۔ اَب میں خود حیران ہُوں ۔ میں اِس کا گیت بھی سُن رہا ہُوں پر اِس کی لَے بڑی دِھیمی ہے جیسے کوئی کونپل پھُوٹ رہی ہو۔

کونپل نے شرما کر ہَوا کے دامن میں مُنہ چھپا لیا۔ پھر شام کا اَندھیرا گہرا ہو گیا اَور کائنات اُونگھ گئی ۔ جب وہ گاؤں میں پہنچا تو گلی میں اَندھیرا تھا' پر دونوں طرف کے کچّے مکانوں میں دِیے ٹمٹما رہے تھے۔ اُن کی لرزشوں پر کونپلوں کا نغمہ رقص کُناں تھا۔

تم کون ہو؟

گلی نے پوچھا۔

میں تیرا محرم ہُوں!

کب آئے؟

ابھی ابھی۔

اُس نے جواب دیا، "پر یہ گلی کی آواز تھی یا"...... اُس نے سوچا:

یہ آواز اجنبی بھی ہے اَور نہیں بھی لیکن میں نے پہلے اِسے کب سنا تھا؟

نہ جانے کب!

پھر ایک سایہ اُس کا ہم سفر ہو گیا۔ کیا یہ گلی کا سایہ تھا؟

تم کہاں رہے اِتنے دِنوں؟

سایے نے پوچھا۔

کنویں پر......

اُس نے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا۔

اُس اُجاڑ بیاباں کنویں پر؟ تمھیں ڈر تو نہیں لگتا وہاں؟

نہیں تو......

تم وہاں اکیلے نہیں ہوتے؟

نہیں تو...... رات بھر تارے میرا ساتھ دیتے ہیں۔

گلی کا گیت مسکرایا اور مسکراہٹ سے ایک سُر نے جنم لیا' جیسے کوئی کونپل زمین کا سینہ چیر کر پھُوٹ نکلی ہو۔

اِتنے تیز تیز کیوں چل رہے ہو؟

ماں نے کہا تھا' جلدی گھر آنا! اَب تو گلی کا سایہ بھی گہرا ہو گیا ہے۔

تم گاؤں کیوں آئے؟

ماں نے کہا تھا...... پر ایک بات اَور بھی تھی۔

کیا؟

میں گلی کا گیت سننا چاہتا تھا۔

گلی کا گیت؟...... پگلا کہیں کا...... گلیاں بھی گیت گاتی ہیں کیا!

سایے نے کہا۔

گلیاں بھی گاتی ہیں۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔

تم نے اِن کا گیت سنا؟

نہیں تو...... ابھی نہیں......

اَور ایک موڑ پر ایک گھر کی دیوار پر رکھے ہوئے دیے کی روشنی سے گلی کا ایک ننھا سا کونا روشن ہو گیا اَور گلی کا سایہ روشنی کے اُس حلقے میں آ کر رُک گیا۔ دیے کی لَو مسکرائی یا سِتارہ ٹُوٹا۔ اُسے یُوں لگا جیسے ماہیے کے دو بول جگنو کی طرح چمک اُٹھے ہوں یا گلی کا نغمہ دِھیمے سُر میں انگڑائی لے کر جاگ اُٹھا ہو۔

مجھے پہچانا بشیرے؟

سُر نے پوچھا۔

نہیں تو......

نہیں!

نغمے کا سُر اُداس ہو گیا......

کیوں؟

میں نہیں جانتا۔

مجھے پہچانو......

اُداس سُر بولا۔

کیوں؟

میں کیا جانوں...... اَپنے دِل سے پوچھو!

اُس نے اَپنے دِل میں جھانکا۔ وہاں کچھ سایے تھے۔ کچھ دیے ٹمٹما رہے تھے۔ روشنی اَور سایے گھل مل گئے تھے۔ اَور کوئی شے واضح نہیں تھی، جیسے اُس کے بچپن کی یادیں جن میں دُھند کے غُبار تھے اَور کبھی کبھار ایک کِرن بھی چمک جاتی تھی اور اُس کی روشنی میں اُس نے دیکھا کہ دو گھروں کے آنگنوں میں دُھوپ چمک رہی ہے اَور اُن کے درمیان ایک گلی حائل ہے۔ صرف دو تین ہاتھ چوڑی گلی اَور دُوسرے آنگن میں بکائن کے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں اَور سایے میں دُھوپ کے دھبّے لرز رہے ہیں اَور وہ اَپنے آنگن میں کھڑا اُسے دیکھ رہا ہے جو بکائن کے سایے تلے کھڑی تھی اَور اُسے اِشاروں سے بلا رہی تھی لیکن وہ آنگن کو چھوڑ کر گلی کو پار نہ کر سکا تھا کیوں کہ وہ بہت شرمیلا تھا اَور پھر اُسے یُوں معلوم ہُوا جیسے ہر طرف چاندنی بکھر گئی ہو اَور گرمیوں کی رات ٹھنڈے میٹھے سانس لے رہی ہو اَور وہ اُسے بلا رہی ہو:

"اِدھر آؤ بشیرے! آؤ، لکن میٹی کھیلیں"۔ پھر وہ اُسے تلاش کر رہا تھا لیکن وہ نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی:

تم کہاں ہو؟

میں یہاں ہُوں!

تب اُس نے اُسے ڈھونڈ لیا۔ وہ گلی کے ایک اندھیرے کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی اَور وہ اُسے ڈھونڈتا ہُوا اُس دیوار کے پاس سے کئی بار گزرا تھا۔ وہ اُسے پا نہ سکا تھا اَور اُس نے اُسے چھو لیا تھا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی اَور اُسے یُوں لگا تھا جیسے گلی گنگنا اُٹھی ہو اَور اُس نے گلی کے گیت کو چھو لیا ہو۔

تب اُسے اُجاڑ کنویں پر بھیج دیا گیا۔ وہ رات گئے گاؤں آتا لیکن وہ پھر گلی کا گیت نہ سُن سکا کیوں کہ اُس وقت گلی سوئی ہُوئی ہوتی اَور آج اُس نے پھر وُہی نغمہ سُن لیا تھا۔

یہ نغمہ جو کونپل کی نوک پر مدّتوں سے لرز رہا تھا۔

اُس کے آنگن میں لبالب چاندنی بھری ہُوئی تھی۔

اُس کی ماں نے خوش ہو کر کہا:

تم آ گئے بشیر بیٹا؟

ہاں ماں!

میں نے تیری چارپائی پر اُجلا کھیس بچھایا ہے۔ لے روٹی کھا!

اُس نے روٹی کھائی لیکن اُس کا سونے کو جی نہ چاہا۔

سو جاؤ بشیرے! دِن بھر کے تھکے ماندے ہو۔

ابھی نہیں ماں!

کیوں؟

میرا جی چاہ رہا ہے میَں......

وہ رُک گیا۔

کہو!

ماں، میرا جی چاہ رہا ہے میَں......لکن میٹی کھیلوں۔

پگلا کہیں کا! اِس عُمر میں کون لکن میٹی کھیلتا ہے؟ تیرا جی سونے کو نہیں چاہ رہا تو جا گھوم پھر آ!

اُس نے آنگن پار کیا اَور گلی میں آ گیا۔ گلی میں سایے تھے۔ گلی کے پار کے آنگن میں بکائِن کا درخت چُپ چاپ کھڑا تھا اَور گلی میں نہ اَندھیرا تھا نہ اُجالا اَور گلی خاموش بھی تھی۔ لیکن اُسے یُوں لگا جیسے اُس کے ہونٹوں پر نغموں کے طوفان بکھر رہے ہوں۔

جلدی آ جانا!

ماں نے پکار کر کہا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا لیکن بکائِن کا سایہ لرز اُٹھا۔

اَور چند لمحوں بعد گلی بول اُٹھی:

مجھے ڈھونڈ لو بشیرے!

تم کون ہو؟

مجھے ڈھونڈ لو تو بتاؤں گی۔

اُس نے گلی کا کونا کونا چھان مارا پر وہ نہ ملی۔ اُس نے اَندھیروں سے پوچھا کہ وہ کون ہے جس کو میں ڈھونڈ رہا ہُوں، پر اندھیروں نے کہا: "تم خود تلاش کرو! ہم نہیں بتائیں گے"۔

میں یہاں ہوں!

اُس نے گلی کے موڑ کے اُس کونے کو دیکھا جہاں سایہ گہرا تھا اَور چاندنی کہیں بہت دُور چلی گئی

تھی۔ اُس کا ہاتھ کھُردری دیوار سے لگ کر چھِل گیا۔

میں تو یہاں ہوں!

تم ہر جگہ ہو، پر کہیں بھی نہیں ہو۔

اِدھر آؤ، میں یہاں ہُوں!

اَور پھر اُس نے اُسے چھُولیا۔ وہ بڑی دِھیمی آواز میں ہنسی۔ ایک ننھا سا قہقہہ اَور گلی کے ہونٹوں پر نغموں کے رُکے ہُوئے طوفان اُمنڈ آئے۔ اَور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اَور بکائِن کے سایے جھُوم اُٹھے، جیسے وَجد میں آ گئے ہوں اَور نہ جانے یہ کس طرح ہُوا کہ وہ گلی پار کر کے دُوسرے آنگن میں پہنچ گیا اَور گلی یکایک اُداس ہو گئی تھی اَور اُداس نغمے نے کہا تھا:

تم نے گلی پار کر لی اَور آنگن میں پہنچ گئے، اَب کیا ہوگا! اَب کیا ہوگا؟

میں کیا جانوں؟......

اُس نے جواب دیا۔

بشیرے!

ایک آواز نے اُسے یُوں پکارا جیسے ایک آنسو چھَن سے گِر پڑا ہو۔

ہُوں۔

یہ کیا کِیا تم نے؟

تمھیں چھُولیا۔

پر تم میرے آنگن میں کیوں آئے؟

میں......نہ جانے کیوں؟

جانتے ہو اَب کیا ہوگا؟

میں کچھ نہیں جانتا۔

بشیرے!

اُس کی ماں اَپنے آنگن میں کھڑی ہو کر پکاری۔

جاؤ، تمھاری ماں تمھیں بُلا رہی ہے!

اَور وہ ماں کے پاس آ گیا لیکن وہ پار کے آنگن میں بھی کھڑا تھا۔

تم گلی پار کر کے کہاں گئے تھے بشیرے؟

اُس کی ماں نے پوچھا۔

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

اُس نے چارپائی پر بیٹھ کر پوچھا۔

وہ جودُوسرا آنگن ہے، وہ یہاں سے بہت دُور ہے ناماں؟

کون سا؟

اُس نے گلی کے پار کے آنگن کی طرف اِشارہ کیا۔

نہیں تو پگلے! میں اپنے آنگن میں کھڑی ہوتی ہُوں تو میرا سایہ وہاں تک پہنچ جاتا ہے۔

پر وہ بہت دُور ہے...... کالے کوسوں دُور!

ہاں ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔ وہ دُور بھی ہے، کیوں کہ اُس آنگن کے رہنے والے ہمیں اپنا نہیں سمجھتے!

اُس نے یہ نہ پُوچھا کہ اُس آنگن کے رہنے والے اُنھیں اپنا کیوں نہیں سمجھتے۔ وہ سوچتا رہا، اَور رات ڈھل گئی، چاندنی ماند پڑ گئی، تب پھیکی پھیکی چاندنی میں صبح کی سفیدی گھل مل گئی اَور اُسے نیند نہ آسکی۔ رات کا طلسم ٹوٹتا رہا۔ پھر یکایک صبح ہوگئی اَور اُس کی ماں نے دُودھ بلونا شروع کر دیا۔ وہ چپکے سے اُٹھا اَور گھر سے نکل گیا۔ گلی میں آیا تو گلی کے اَندھیروں نے لپک کر اُس کا سواگت کیا۔ اُس نے گلی کے پار آنگن پر نظر ڈالی۔ بکائن کے درخت پر چڑیاں کُلبلا رہی تھیں۔ ایک چڑیا چُوں چُوں کی دِھیمی آواز سے گلی کی خاموشیوں سے ہم کلام ہُوئی تو آنگن جاگ اُٹھا۔

تم گلی میں کھڑے ہو؟

ہاں!

کیوں؟

یوں ہی۔

نہیں سچ کہو۔

''میں سچ کہوں یا نہ کہوں......'' اُس نے سوچا: ''میں کہہ دوں کہ گلی جاگ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے آنکھیں مَل کر مَیں گلی کا گیت سننا چاہتا تھا...... نہیں...... پھر میں کیا کہوں؟

میں جانتی ہوں بشیرے، تم اِس وقت گلی میں کیوں آئے!

کیا جانتی ہو؟

اپنے دِل سے پوچھو۔

میں تو رات بھر تیرے آنگن میں کھڑا رہا۔

دیکھو! دِن کی روشنی میں تم نے گلی پار کی تو تمھیں تخت ہزارے سے آنا پڑے گا۔

میں آؤں گا۔

تم میرے ساتھ ساتھ چلو! گلی کا اَندھیرا چھٹے گا تو میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھنا۔ میں تو چناب کے اُس پار پھُولوں کی سیج پر تمھارا اِنتظار کر رہی ہُوں۔ آج سے نہیں...... نہ جانے کب سے!

وہ شانہ بشانہ چلنے لگے۔ پھر گلی کا اندھیرا چھٹ گیا۔ اُس نے اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ روشنی کی ایک کِرن اُن آنکھوں میں اِنتظار کا دِیا بن گئی تھی جو سَرِ راہ جل رہا تھا کہ مُسافِر تاریکی میں رَستہ بھول نہ سکے اَور مُسافِر کو اَپنی منزل مل گئی تھی۔ وہ کانپ گیا۔ اُس کی پیشانی پر پسینہ آ گیا۔ اُس نے سوچا: ''میں تو چناب پار کر چکا ہُوں''۔

....

تیرا کام میں جی نہیں لگ رہا بشیرے آج؟

اُس کے باپ نے کہا۔

نہیں تو......

اُس نے پیشانی کا پسینہ پُونچھ کر کہا۔

باپ نے اُس کی فرّاخ پیشانی پر ایک عجیب سی چمک دیکھی۔ اُسے یُوں لگا جیسے بشیرا اِس کام کے لیے نہیں بنا تھا جو وہ کر رہا تھا۔

بشیر بیٹا! جا چھاؤں تلے آرام کر۔

نہیں......

اُس نے کسّی کے دستے پر ہاتھ رکھا اَور کام میں جُٹ گیا۔ اُس کا باپ تھک گیا اَور پھر دوپہر گزری اَور شام پڑ گئی۔ وہ گاؤں جانے والی پگ ڈنڈی پر روانہ ہُوا تو کونپلیں اُس سے ہم کلام ہُوئیں اَور چاند نکل آیا لیکن گلی میں سایہ تھا اَور چاند کی کِرنیں مُنڈیروں کو چُھو کر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اَور جب چاندنی چار سُو پھیل گئی اَور آنگن نیند میں مدہوش ہو گئے تو وہ گلی پار کرنے کے لیے اُٹھا۔

بشیرے!

ماں!

اُس نے چَونک کر کہا۔

کہاں جا رہے ہو؟

گلی کے اُس پار......اُس آنگن میں!

وہاں نہ جاؤ بشیرے!......

اُس کی ماں نے کانپتی ہُوئی آواز میں کہا۔

ماں! میں تو گلی پار کر کے وہاں سے ہو بھی آیا۔

یہ تُو نے کیا کِیا پگلے؟

اُس کی ماں رو پڑی:

تم نہیں جانتے، اُس آنگن کے لوگ بہت ظالم ہیں، خونی ہیں، وہ تمھارے باپ کے جانی دُشمن ہیں۔ اُنھوں نے تمھارے دادا کو قتل کیا۔ تمھارا باپ اُن سے چُھپ کر اُس دُور کے کنویں پر چلا گیا ہے۔

پر ماں! وہ تو بہت اچھی ہے۔

کون؟

زینو!

ہاں اچھی ہے، بہت اچھی ہے بشیرے! پر تم اُس کے آنگن میں کیوں گئے؟ اَب کیا ہوگا؟ اَب کیا ہوگا؟......

ماں نے اُسے سینے سے لگا کر کہا۔

وہ اَپنے آنگن میں کھڑا رہا اَور دُوسرے آنگن میں بکائِن کی چھاؤں میں ایک سایہ لرزتا رہا اَور کانپتا رہا اَور رات گزرتی رہی۔ چاند ڈھلتا رہا اَور گلی روتی رہی اَور صبح سویرے گلی سُونی اَور سُنسان تھی، سوئی سوئی سی، جیسے رات اُس کی آنکھوں میں کٹ گئی ہو اَور اَب غم کی ماری کی آنکھ لگ گئی ہو اَور وہ گلی میں سے یُوں گزر رہا تھا جیسے کوئی اجنبی راستہ بھُول گیا ہو اَور اُس کی آنکھ میں روشنی بھی نہ ہو اَور پھر گلی کے آنسو ٹپک پڑے۔ اُسے یُوں لگا جیسے آنسوؤں کی بوچھار اُس کے چہرے کو نہلا گئی ہو اَور اُس کی آنکھ کھل گئی ہو۔ اُس نے دیکھا کہ گلی میں صبح کا اُجالا تھا اَور وہ کُولھے پر گھڑا رکھے یُوں کھڑی تھی جیسے ابھی اُس کی کمر لچک جائے گی اَور اُس کے پاؤں رقص میں آجائیں گے اَور گلی مسکرا کر گانے لگے گی۔

کل مَیں بکائِن کے نیچے کھڑی رہی اَور تم اَپنے آنگن میں کھڑے رہے مگر گلی پار نہ کر سکے۔

میں اَب گلی پار نہ کرسکوں گا زِینو!

کیوں؟

ماں کہہ رہی تھی، تیرے گھر والے ہمارے جانی دُشمن ہیں۔

اپنے بابا کو بھیجو نا ہمارے ہاں!

نہیں...... وہ تیرے آنگن میں پاؤں بھی نہیں رکھ سکتا زِینو!

لیکن تم تو اِس گلی کو ایک بار پار کر چکے ہو۔ اَب لَوٹ جاؤ گے؟

نہیں تو...... نہیں تو...... پر ماں رو پڑی تھی۔ اُس کے آنسو میرے پاؤں کی زنجیر بن گئے تھے۔ میں کیا کروں زِینو! میں تو رات بھر اَپنے آنگن میں کھڑا رہ کر بھی تیرے آنگن میں تھا اَور گلی روتی رہی تھی۔

اَب تم میرے آنگن میں نہ آنا بشیرے!

زِینو......!

میں تمھارے پاس آیا کروں گی۔

نہیں......

اُس نے گھبرا کر کہا:

زِینو' اَیسا نہ کرنا!

جاؤ...... اَپنے کنویں پر جاؤ......

اُس شام بشیر کنویں سے گھر نہ آیا حالاں کہ گلی اُسے اَپنی طرف بلاتی رہی تھی ۔ وہ پگ ڈنڈی پر کھڑے ہو کر گاؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درختوں کے جُھنڈ میں گھِرا ہُوا گاؤں' شام کے دُھندلکوں میں ڈوب رہا تھا۔ پھر اچانک جنگل کی طرف اَندھیرا لپکا اَور سارے گاؤں کو نِگل گیا۔ اُس نے اَپنے کھٹولے پر بیٹھ کر تاروں سے ہم کلام ہونا چاہا لیکن تارے بھی آج گُم صُم تھے...... ایک شام...... دو تین ...... کئی شامیں گزر گئیں اَور گزرتی رہیں ۔ گلی کا نغمہ اُسے پکارتا رہا۔ اُس کے قدم اُٹھنے کے لیے بے تاب ہو جاتے رہے لیکن ماں کے آنسو پاؤں کی زَنجیر بن جاتے رہے ۔ پھر ایک رات دُھندلکوں میں ایک سایہ اُبھرا اَور وہ حیران ہو گیا۔ تب اُس کا اَنگ اَنگ لرز اُٹھا اَور اُس نے کانپتی ہُوئی آواز میں پُوچھا:

زِینو! تم کیوں آئیں؟

لکن میٹی نہیں کھیلو گے؟

اُس نے ایک ننھا سا قہقہہ لگایا اَور کنویں کی تنہائیاں سب جاگ اُٹھیں:

جب گاؤں سے چلی تھی تو سوچ رہی تھی' جنگل کے اُس پار کیا ہے!

جنگل کے اُس پار؟

اُس نے حیران ہو کر پوچھا۔

میں روز شام کو دیکھتی ہُوں کہ کوّوں کی ڈاریں اُس طرف اُڑ کر جاتی ہیں اَور جب رات ہوتی ہے تو اَندھیرے چھا جاتے ہیں اَور یُوں لگتا ہے جیسے جنگل میں کوئی اَسرار بستا ہو۔

میں جنگل میں ایک بار تھوڑی دُور تک گیا تھا کہ اَندھیرا چھا گیا زِینو! اَور میں لوَٹ آیا۔ مجھے اَندھیروں سے ڈر لگتا ہے۔

جنگل کے اُس پار تو روشنی ہو گی بشیرے!

ہو گی!...... کون جانے...... میں ایک بار ضرور اُس پار جاؤں گا۔ اگر روشنی ہُوئی تو ہم دونوں......

ہم دونوں؟......

زِینو کی آواز کانپ گئی۔

ہاں ہم دونوں...... تم ڈر تو نہیں گئیں زِینو؟

ہاں...... میں ڈر گئی ہُوں۔ ہم ایک بار جنگل کو پار کر گئے تو لوَٹ کر نہ آسکیں گے۔

سچ کہتی ہو...... پر اَب آؤ...... میرے ساتھ...... میں تمھیں تاروں کے جنگل میں لے چلوں...... میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو نا...... دیکھو تو تاروں کا قافلہ چل بھی پڑا۔ رات بھیگ رہی ہے۔ اَور تارے چل رہے ہیں۔ ابھی میرا کھٹولا' اُڑن کھٹولا بن جائے گا۔ ہم آسمانوں میں اُڑیں گے۔ اَور پھر ہم سِتاروں

کے جنگل میں پہنچ جائیں گے۔

زِینو کو یُوں لگا جیسے وہ واقعی اُڑن کھٹولے میں بیٹھی ہو اور اُس کی آنکھیں مُندھ رہی ہوں۔ جب وہ جاگی تو اُس کے بالوں میں شبنم کی نمی تھی۔ اَور چہرہ بِھیگا ہُوا تھا۔ اَور بشیر جاگ رہا تھا اَور تاروں کا قافلہ رواں تھا۔ اُس نے کہا:

میں جاتی ہُوں بشیرے! تم پتا کر رکھنا' اگر اُس پار روشنی ہُوئی تو ہم جنگل پار کر جائیں گے۔

ایک سَرد لہر آئی اَور وہ کانپ کر رہ گیا!

....

صبح ہُوئی تو جنگل جاگ اُٹھا۔ وہ سَرسبز درختوں کے ہیولوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا' پر اُسے جنگل سے پار جانے کی ہمت نہ ہُوئی۔ وہ ہر رات گاؤں سے آنے والی پگ ڈنڈی کو دیکھتا رہا لیکن وہاں اَندھیروں میں کوئی سایہ نہ اُبھرا اَور زِینو کی آواز اُس کے کانوں میں گونجتی رہی "اگر اُس پار روشنی ہُوئی تو ہم جنگل پار کر جائیں گے"۔ نہ جانے کتنے دِن گزر گئے اَور وہ جنگل میں نہ جا سکا۔ تب ایک صبح اُس کے قدم خود بہ خود جنگل کی طرف اُٹھ گئے۔ اُس نے جنگل میں قدم رکھا تو وہ اَندھیروں میں ڈُوب گیا۔ اَندھیروں اَور خاموشی میں جنگل میں ہُو کا عالَم طاری تھا اَور گھنے درختوں کے سایے گلے مِل رہے تھے؛ اَندھیرا سائیں سائیں کر رہا تھا' پر وہ چلتا رہا کیوں کہ گھنے سایوں میں خنکی تھی۔ اُسے چلتے چلتے نیند کی ایک جھپکی سی آئی اَور پھر اَندھیرے کا خوف اُس کے دِل سے یُوں چُھٹ گیا جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ وہ نڈر ہو کر بڑھتا رہا اَور اُس کے پاؤں تھک گئے لیکن جنگل کی مَسافت طے نہ ہُوئی۔ پھر یکایک ایک کھِڑکی سی کھُلی۔ جنگل کے اُس پار روشنی تھی۔ سہ پہر کی سنہری دُھوپ چھائی ہُوئی تھی اَور دُور دُور تک سَرسبز کھیت لہلہا رہے تھے۔ اَور اُن کے درمیان بل کھاتی ہُوئی پگ ڈنڈیاں دُھوپ میں چمک رہی تھیں۔

زِینو! زِینو! جنگل کے اُس پار روشنی ہے اَور دُھوپ بھی۔

اُس نے خوشی سے چِلّا کر کہا۔

وہ جنگل کے کِنارے ہَری ہَری دُھوپ پر بیٹھ گیا۔ خنک سایوں نے اُس کی پیشانی پر محبّت کا بوسہ دیا تو اُسے نیند آ گئی...... بڑی گہری' بڑی میٹھی نیند! جب وہ جاگا تو اُس کی رگوں میں نیا خون دوڑ رہا تھا۔ لیکن سَرسبز کھیتوں اَور چمکتی پگ ڈنڈیوں پر سُرمئی اَندھیرے چھا گئے تھے اَور جنگل کے سایے گہرے ہو گئے تھے۔ وہ لوٹا تو اُس کے دِل میں مشعل جَل رہی تھی اَور راستہ صاف اَور واضح تھا۔ تب جنگل نے اَپنی کھِڑکی کھول دی۔ اُس نے جھانک کر دیکھا تو اُسے یُوں لگا جیسے کھیتوں کی سَرسبزی میں کاجل جھلک رہا ہو۔

بشیرے!

ایک اُونچی غم زدہ آواز نے اُسے پکارا۔

ہاں بابا! میں بشیر ہُوں۔

تو کہاں گیا تھا؟

جنگل کے اُس پار۔

جنگل کے اُس پار!...... کیوں؟

یہ دیکھنے کے لیے کہ جنگل کے اُس پار کیا ہے!

اچھا ہُوا تو کنویں پر موجود نہیں تھا۔

کیوں بابا؟

کل شام زِینو یہاں آئی تھی۔

زِینو!......

اُس نے تڑپ کر کہا۔

بشیر بیٹا! اچھا ہُوا تم یہاں نہیں تھے۔ میں کھیت میں چارا کاٹ رہا تھا جب وہ خُونی یہاں آئے اَور مجھے بالوں سے پکڑ کر کھیت میں گھسیٹتے پھرے۔ وہ مجھ سے پوچھتے رہے، بشیرا کہاں ہے؟ زِینو کہاں ہے؟ میں نے کہا، مَیں پرسوں شام اُسے کنویں پہ چھوڑ گیا تھا۔ پر کل صبح سے وہ کنویں پہ موجود نہیں، میں خود بڑا فکر مند ہوں۔ میرا خیال ہے، وہ اَپنے ننھیال چلا گیا ہے اَور زِینو کے متعلق تم مجھ سے بہتر جانتے ہو، مجھ سے کیوں پوچھتے ہو؟ وہ مجھے گھسیٹتے ہُوئے کنویں پر لے آئے اَور میں نے دیکھا کہ زِینو تیرے کھٹولے پر سَر جھکائے بیٹھی ہے اَور تُو کہیں بھی نہیں۔ اُنھوں نے زِینو کو بالوں سے پکڑ کر کھٹولے سے اُٹھایا اَور کہا فیضُو، آج بشیرا یہاں ہوتا تو ہم تیری نسل کو ختم کر ڈالتے...... بشیرے اِدھر آ......

وہ قریب آیا تو اُس کے باپ نے اُسے گلے سے لگا لیا۔ گال سے گال ملا دیے۔ اُس کے سَر کا بوسہ لیا۔ اُس کی پیشانی کو چُوما اَور روتے ہوئے کہا:

بشیرے! مَیں رات بھر مَرا رہا، میں اَب زندہ ہُوا ہُوں!

زِینو کہاں ہے؟

اُس کے بھائی اُسے گاؤں لے گئے۔

اُس نے گاؤں کی طرف جانے والی پگ ڈنڈی پر قدم رکھا تو اُس کے باپ نے کہا:

رُک جاؤ بشیرے!

کیوں بابا؟

گاؤں نہ جاؤ، وہ لوگ تیرے خون کے پیاسے ہیں!

پر بابا! مجھے زینو کو بتانا ہے، جنگل کے اُس پار روشنی ہے۔

اَب کیا فائدہ بشیرے!

پھر اُس کے کان میں گلی کا گیت گُونج اُٹھا۔

بابا! مَیں گاؤں جاؤں گا، گلی کا گیت مجھے بُلا رہا ہے۔

سنو تو! یہ گلی کا گیت نہیں ہے۔

گلی کا گیت نہیں ہے؟......

اُس نے حیران ہو کر کہا۔

یہ تو شہنائی کی آواز ہے۔

شہنائی!

ہاں بیٹا! زِینو کی بارات کل رات سے آئی ہُوئی ہے۔

پر بابا! جنگل کے اُس پار روشنی ہے...... اُس پار......

اُس نے جنگل کی طرف اِشارہ کیا جہاں صبح کا اُجالا چھا رہا تھا۔ لیکن گاؤں کی طرف سے شہنائی کا گیت اِتنی اُونچی اَور تیز لَے میں گُونجا کہ جنگل پر اَندھیرا چھا گیا اَور گلی کے گیت نے اَندھیرے کی اَتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر ایک سسکی لی اَور پھر اُس کا دم گُھٹ گیا!

☆☆☆

کرامت

پیر سخی بادشاہ کے مزار پر عُرس کی تیاریاں ہو رہی تھیں!

مزار گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ سامنے ایک سپاٹ میدان تھا اور دُور دُور تک کھیت تھے۔ برسات کا موسم ابھی ابھی ختم ہُوا تھا۔ باجرے اور مکئی کی فصلیں کٹ چکی تھیں۔ کماد اور کپاس کے ہرے بھرے کھیت ابھی تک موجود تھے۔ باقی کھیتوں میں ہَل چل رہے تھے اور اُنھیں گندم کی بوائی کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ قافلۂ اَبرِ باراں کے چند بچے کھچے ٹکڑے ابھی تک اُڑ رہے تھے۔ آسماں کی نیلاہٹ، کھیتوں کی سَرسبزی اور نرم نرم دُھوپ میں مزار کے ہشت پہلو گنبد کی سفیدی دُور دُور سے نظر آتی تھی اور بڑا مقدّس منظر پیش کرتی تھی۔

ٹیلے پر مزار کے سامنے ڈھول بج رہا تھا۔ نیچے میدان میں دُکانیں لگ رہی تھیں۔ ٹیلے کے عین نیچے ایک بوسیدہ سا شامیانہ تنا ہُوا تھا اور اُس کے نیچے چٹائیاں بچھی ہُوئی تھیں۔ عین وسط میں چٹائیوں پر دری تھی اور اُس کے اُوپر ایک گاؤ تکیے کے سہارے سخی بادشاہ کے جانشین، چَن پیر بیٹھے ہُوئے تھے۔ سامنے مریدانِ باصفا کا حلقۂ اِرادت تھا۔ اُن میں چیتھڑے پہنے ہُوئے مفلس بھی تھے اور سفید پوش چودھری بھی۔ پیر صاحب عُرس کے اِنتظام بہ چشمِ خود ملاحظہ فرما رہے تھے۔ کبھی کبھار کسی کو ہدایت بھی فرما دیتے تھے۔

پیر صاحب کا لباس پرانی طرز کا تھا۔ ڈِھیلا ڈھالا کھلے بازوؤں کا کُرتا، سَر پر سبز عمامہ، گلے میں سلیمانی دانوں کی بیش قیمت تسبیح، پیشانی پر اَثرالسجّود، ڈاڑھی پر مہندی کا سُرخ رنگ، آنکھوں میں شب بیداری کی ہلکی ہلکی سُرخی اور وہ پُرکشش چمک بھی جو رُوح کے ساز پر مضراب کا کام دیتی ہے اور کہربا کی طرح تنکے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ باتوں میں نرمی، لہجے میں گھلاوٹ اور درد، عارفانہ دِل کشی کی ہر ادا، ایک ایک لفظ پھول بن کر گِرتا اور مخلص لوگ اُنھیں اپنی جھولیوں میں بھر لیتے، جیسے وہ نایاب موتی ہوں۔

چن پیر، حضرت سخی بادشاہ کی دسویں پُشت سے تھے۔ سخی بادشاہ خرقۂ خلافت لے کر بخارے سے آئے

یا سمرقند سے لیکن اِس اُجاڑ جگہ پر ڈیرا لگا کر بیٹھ گئے تو جنگل میں منگل ہو گیا۔ اِرد گِرد گاؤں کے گاؤں آباد ہو گئے۔ بنجر زمینیں جو مدّت سے کسی معجزہ نما ہاتھ کا اِنتظار کر رہی تھیں مسکرا کر بار آور ہو گئیں اور چپّا چپّا سونا اُگلنے لگا۔ لیکن سخی بادشاہ زمین کے بھُوکے نہ تھے۔ اَب سخی بادشاہ کے نام پر آباد ہونے والے گاؤں، سخی آباد کے تین چوتھائی حصے پر چودھری ہیبت خان اَور اُس کے خاندان کا قبضہ تھا اَور باقی ایک چوتھائی پر سخی بادشاہ کی دسویں پُشت پل رہی تھی، اَور تقسیم در تقسیم کے بعد زمین اَب مَرلوں اَور کنالوں کی تنگ دامانی میں سمٹ آئی تھی۔

چن پیر کے پاس بھی صرف چند گھماؤں زمین تھی لیکن وہ مُتولّی ہونے کی حیثیت سے نذر و نیاز، نذرانوں اَور چڑھاووں کے حق دار تھے؛ اِس لیے خاصے خوش حال تھے۔

سخی بادشاہ کو لوگ زِندہ پیر کہتے۔ منوں مٹی کے بوجھ اَور دس پُشتوں کے طویل زمانے کے بُعد کے باوجود زِندہ تھے۔ ابھی تک اُن سے کرامتوں کا صُدور ہو رہا تھا۔ کہتے ہیں، گاؤں میں جب کسی پر ظلم ہوتا اَور وہ سخی بادشاہ کے مزار پر آ کر فریاد کرتا تو مزار ہِل جاتا اَور گاؤں کے لوگ جب تک اُس ظلم کا اِزالہ نہ کر دیتے، سخی بادشاہ کو چین نہ آتا۔ مزار کے سرھانے بیری کا ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ سخی بادشاہ کے اَپنے مبارک ہاتھوں کا لگایا ہُوا ہے۔ اِس کا تنا کھوکھلا اَور خشک ہے۔ تنے کی چھال صدیوں کے عملِ فرسودگی کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کر اُتر چکی ہے۔ لیکن اِس کی چوٹی پر ایک سَرسبز شاخ ابھی تک موجود ہے جو مزار پر چھتر بن کر سایہ کیے رہتی ہے۔ نہ جانے اِس سوکھے تنے کی کون سی رگ زِندہ ہے کہ شاخ کے چھتر تک زندگی کا اَمرت رس لے جاتی ہے! اِس شاخ کے پتّے کھانے سے اکثر لوگوں کی منتیں پوری ہوتی ہیں اَور دِل کی مرادیں بر آتی ہیں اَور بیماروں کو شِفا مِلتی ہے۔

اَور چن پیر بھی حضرت سخی بادشاہ کے سچّے جانشین تھے۔ وُہی زُہد، وُہی اِتقّا، وُہی کرامتیں۔ اُن کے دم چھُو میں بھی جادُو کا اَثر تھا۔ لوگ دُور دُور سے آتے اَور فیض پاتے اَور سالانہ عُرس پر تو صادق الیقیں لوگ سِندھ اَور بلوچستان سے بھی آ پہنچتے۔

لیکن دسویں پُشت کے بعد اِس سلسلے کا مستقبل تاریک نظر آ رہا تھا۔ چن پیر کے تین لڑکے تھے۔ تینوں کا راستہ مختلف تھا۔ بڑے صاحبزادہ صاحب کالج کو ہاتھ لگا کر اَب گاؤں واپس پہنچ چکے تھے۔ وہ کھیل کود کے دِل دادہ تھے۔ گاؤں کے نوجوان ٹولے کے سردار، شکار کے رسّیا، تاش کے ہر کھیل کو جاننے والے، چودھری ہیبت خان کے لڑکے بہرام خان سے اُن کی گاڑھی چھنتی تھی۔ سارا دِن تاش کا

کھیل جاری رہتا۔ لوگ اُسے بُرا سمجھتے لیکن چن پیر ایک دو بار سرزنش کر کے خاموش ہو رہے تھے۔ تاہم اُنھیں یہ کھٹکا مسلسل لگا رہتا کہ اُن کے بعد گدّی نشینی کا کوئی اہل نہیں۔ دُوسرے، دونوں بچے کھلنڈرے تھے۔ اَور اُن میں سے بھی کسی نے اُس جَوہر کا اِظہار نہیں کیا تھا جو مسندِ اِرشاد کے قابل بناتا ہے۔ اِس لیے مجبور ہو کر اُنھیں بھی دُنیاوی تعلیم کی طرف راغب کرنا پڑا۔ فرصت کے وقت پیر صاحب اُنھیں مذہبی کتب کے چند لفظ بھی پڑھا دیا کرتے تھے لیکن یہ کڑوے گھونٹ اُن کے حلق سے نیچے نہ اُترتے اَور پیر بادشاہ مجبور ہو کر سختی پر اُتر آتے اَور یہ سختی بھی بے نتیجہ رہتی۔

دُوسرے دِن عُرس تھا!

چن پیر عُرس پر شدّت سے لہو و لعب سے گریز کرتے۔ آج تک سخی بادشاہ کی خانقاہ پر پایل کی جھنکار بلند نہ ہُوئی تھی، البتہ قوّال ضرور ہوتے لیکن اُن کے طبلے، ہارمونیم اَور سارنگیاں بھی عارِفانہ غزلوں کے چند سُرتالوں سے آگے نہ بڑھ سکتیں۔ عُرس پر میلہ ضرور لگتا۔ لوگوں کے ٹھَٹ کے ٹھٹ بھی لگ جاتے۔ بازار کی رونق بھی دیدنی ہوتی۔ گاؤں کی ٹَمیاریں، بن سنور کر میلے میں گھومتیں لیکن اِس کے باوجود عُرس ایک ذریعہ تھا لوگوں کو عارِفانہ کلام اَور وعظ و نصیحت کے چند لفظ سُنانے کا۔ عُرس پر کوئی نہ کوئی واعظِ شیریں مَقال بھی آتے اَور لوگوں کو سلوک اَور معرفت کی بلند منزلوں کی طرف بلانے کا فرض اَدا کرتے۔

تاہم اِس عُرس پر صاحب زادہ صاحب کبڈّی اَور کُشتی وغیرہ کی بِدعتوں کو جاری کرنے کا عزمِ صمیم کر چکے تھے اَور پیر صاحب اُنھیں بے ضرر سمجھ کر خاموش ہو گئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صاحب زادہ صاحب کسی نہ کسی کام میں مشغول رہیں کہ بے کار آدمیوں کو شرارتوں اَور بُرائیوں کے سِوا کیا سُوجھتا ہے! خدا کا شکر ہے کہ ابھی اُنھوں نے طوائف کے مُجرے کے لیے اِصرار نہیں کیا تھا؛ ورنہ اکثر خانقاہوں پر صبح شام طبلوں کی گھمک کے ساتھ پایل کی جھنکار بھی بلند ہوتی رہتی ہے۔ الحمدُلِلّٰہ سخی بادشاہ کی خانقاہ ناپاک قدموں کے اِبلیسی رقص سے محفوظ تھی!

مغرب کی نماز سے پہلے پہلے سارے اِنتظامات مکمل ہو گئے۔ مغرب کی نماز کے بعد، باہر سے آنے والے عقیدت مندوں کو لنگر سے کھانا تقسیم ہُوا اَور عِشا کے بعد تو کچھ لوگ گاؤں میں رات بسر کرنے کے لیے چلے گئے اَور کچھ شامیانے کے نیچے بازوؤں کا تکیہ لگا کر سو گئے۔ پیر صاحب ہر طرح سے اِطمینان کر کے گھر جا رہے تھے کہ راستے میں اُنھیں چودھری ہیبت خان مِلا:

پیر بادشاہ! آج مَیں خدمت میں حاضر نہ رہ سکا۔ کوئی میرے لائق کام؟

سب کام بفضلہٖ ٹھیک ہو رہے ہیں۔ البتہ عُرس پر ضرور حاضر رہیں۔
اِنشاء اللہ پیر بادشاہ۔

چودھری ہیبت خاں سے دو باتیں کر کے پیر صاحب نے دو قدم ہی بڑھائے ہوں گے کہ ایک آواز نے اُنھیں پکارا:

پیر بادشاہ!

کون؟......

پیر صاحب نے چونک کر پوچھا اَور پھر خود ہی آواز پہچان کر کہا:

کریم تم؟ اچھا ہُوا تم آ گئے۔

پیر صاحب نے اپنے لہجے میں خوش آمدید کا رنگ پَیدا کرنے کی کوشش کی۔

پیر بادشاہ! میں ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہُوں۔

ضروری بات ......گلی میں؟......

پیر صاحب نے گھبرا کر کہا:

صبح مسجد میں! اِس وقت ہم تھک کر گھر آرام کی غرض سے جا رہے ہیں۔

پر پیر بادشاہ، وہ بات بہت ضروری ہے۔

کریم نے لجاجت سے بھری ہُوئی آواز میں کہا۔

ہاں ہاں لیکن یہ کون سا وقت ہے بات کرنے کا؟......

پیر صاحب کے لہجے میں خشونت تھی:

جاؤ، دربار شریف میں شامیانے کے نیچے رات گزارو!

اَور پیر صاحب نے بڑبڑاتے ہوئے قدم بڑھا لیے:

کم بخت نے جینا دوبھر کر دیا ہے۔ جب دیکھو، راستہ روکے کھڑا ہے۔ میرے پاس قارون کا خزانہ تو نہیں کہ لُٹاتا پھروں!

....

کریم بخش کبھی پیر صاحب کا خاص ُالخاص خادِم تھا۔ برسوں اُن کے پاس رہا۔ اُنھیں وضو کراتا۔ اُن کے ساتھ مُریدی دَورے پر جاتا۔ اُن کے سارے گھر کا کاروبار اُسی کے سپرد تھا۔ بیبیاں اُس سے پردہ نہیں کرتی تھیں۔ حویلی کے ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھری اُسے رہنے کے لیے ملی ہُوئی تھی۔ کریم کی اِکلوتی لڑکی اِسی گھر میں پیدا ہُوئی اَور پیر صاحب کی نظروں کے سامنے اُنھیں کے جُھوٹے ٹکڑوں پر پَل پوس کر جوان ہُوئی۔ بڑے صاحب زادے کے ساتھ کھیلتے کودتے پروان چڑھ گئی۔ اَور ایک دِن

اَیسا آیا جب پیر صاحب نے اُن دونوں کو کھیلتے اَور چہچہاتے ہُوئے دیکھا تو اُن کا تن بدن کانپ گیا۔ صحن کے ایک کونے میں اُگا ہُوا گلاب کا پَودا ہر وقت نظروں کے سامنے رہتا ہے اَور اُس کی ہستی معمول کا ایک جُزو بن کر شعوری نظارے کو دعوت نہیں دیتی لیکن جب اُس کی ٹہنی پر سُرخ، بھرا بھرا پھُول، شبنم سے دُھل کر اَپنی تمام تر رعنائیوں کو لیے چٹک اُٹھتا ہے اَور شرمیلی خُوش بُوؤں کا ایک ریلا شام میں در آتا ہے تو شعور کی آنکھ یک دم بیدار ہو جاتی ہے اَور گلاب کا یہ پودا ایک چونکا دینے والی حقیقت کا رُوپ دھار لیتا ہے، اَور پیر صاحب نے اپنے خادِم کریم کو بُلا کر کہا:

کریم بخش! تمھاری لڑکی جوان ہو چکی ہے۔

جی پیر بادشاہ۔

اَب تمھارا اِس لڑکی کے ساتھ میرے گھر میں رہنا کچھ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔

کیوں پیر بادشاہ؟

کریم نے حیران ہو کر پوچھا۔

تم نہیں سمجھتے۔ صاحب زادہ صاحب ماشاء اللہ جوان ہو چکے ہیں۔ اِسی گھر میں ایک جوان لڑکی کا......

پیر بادشاہ!......

کریم نے یکایک حقیقت کا احساس کرتے ہُوئے تھرائی ہُوئی آواز میں کہا:

صاحب زادہ صاحب اَور شیداں اکٹھے کھیل کود کر بڑھے۔ وہ......

کریم! ہم تمھارے لیے مکان کا اِنتظام کر دیتے ہیں۔ تم بال بچوں کو لے کر وہاں اُٹھ جاؤ! ہماری غیرت گوارا نہیں کرتی کہ دو نامحرم اکٹھے رہیں۔ آگ لگنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہر چنگاری کو بُجھا ڈالا جائے۔ آگ بھڑک اُٹھے تو سات سمندروں کا پانی بھی اُسے نہیں بجھا سکتا۔

کریم کے ہر احتجاج کے باوجود اُسے گاؤں کے شمالی کونے میں ایک گھروندا دے دیا گیا لیکن کریم کے اِخلاص اَور معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ تہجّد سے پہلے پیر صاحب کے ہاں پہنچتا۔ سردیاں ہوتیں تو اُن کے وُضو کا پانی گرم کرتا۔ گرمیاں ہوتیں تو کنویں سے تازہ پانی بھر کر لاتا۔ وضو کرواتا۔ نہلاتا دُھلاتا۔ صبح سے لے کر عِشا تک اُن کی خدمت کرتا۔ باقاعدہ مریدی دَورے پر ساتھ جاتا اَور اِس طرح بڑی آسانی سے گھر بھر کی روٹیاں اکٹھی کر لیتا۔ بیبیاں اَپنے پرانے کپڑے دے دیتیں جو اُس کی لڑکی شیداں پہنتی۔ اَور گاؤں کی اکثر لڑکیاں اُسے رشک کی نگاہ سے دیکھتیں۔

شیداں کچھ خُوب صُورت بھی نہ تھی۔ سانولا رنگ، چہرے کے نقوش، تیکھے نہ سپاٹ۔ ہاتھ پاؤں

عام گنوار مٹیاروں کی طرح بھاری اَور مضبوط‘ نہ آنکھوں میں نرگس کی حیرت نہ دہانہ غنچے کی طرح تنگ لیکن اِس کے باوجود وہ صاف ستھرے کپڑے پہن لیتی اَور دُوسرے تیسرے روز نہا دھو لیتی تو جوان مونی کی طرح اُس کے قدم زمین پر نہ ٹکتے۔ گاؤں کی دُوسری لڑکیوں کے مقابلے میں برتری کا یہ احساس اُسے حُسن تو عطا نہ کر سکا لیکن نسائیت کی کئی اَداؤں کو ضرور جِلا دے گیا تھا؛ اِس لیے جب وہ گاؤں کی گلیوں میں سے گزرتی تو گاؤں کے نوجوان‘ دِل تھام لیتے۔ کریم‘ ذات کے لحاظ سے کمین تھا۔ گاؤں کے چودھری اُس کی لڑکی کی اِس پُرغرور جوانی کو غصے کی نگاہوں سے دیکھتے اَور پھر بڑے صاحب زادہ صاحب چھپ چھپا کر اُس گلی میں سے کبھی کبھار گزر جاتے تو لوگوں کے غصے اَور کینے کو مہمیز لگ جاتی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اُسے دیکھتیں تو کہتیں:

آخر کمین ہے نا! جوانی کا کتنا مان ہے۔ زمین پر پاؤں ہی نہیں ٹکتے۔ خدا گنجے کو ناخن نہ دے۔ اِس کے دِیدوں کا پانی تو مر ہی گیا ہے‘ پر یہ گاؤں کی عزت بھی اَپنے ساتھ لے ڈوبے گی۔

ایک دِن شام کے قریب پیر صاحب گلی میں سے گزرے تو شیداں اَپنے گھر کے دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ پیر صاحب کو دیکھ کر اَندر جانے کے لیے مُڑی ہی تھی کہ کریم نے دُور سے پکار کر کہا:

شیداں بیٹی! اندر آنگن میں چار پائی بچھا کر اُس پر دُھلا کھیس ڈال دے۔ آج پیر بادشاہ ہمارے گھر آ رہے ہیں۔

کریم کی آواز میں خوشی کی لرزشیں تھیں۔ وہ مدت سے اِصرار کر رہا تھا کہ پیر صاحب اُس کے گھر کو بھی اَپنے مبارک قدموں سے برکت دیں اَور آج پیر صاحب ایک بیمار چودھری کی عیادت کر کے گلی میں سے گزر رہے تھے کہ اُن کے ضمیر نے پکار کر کہا:

ایک عقیدت مند تیرے قدموں کو باعثِ یمن و برکت خیال کرتا ہے اَور تُو اُس کی اِس چھوٹی سی خواہش کو بھی پورا نہیں کر سکتا!

اَور اُن کے نفس نے اُن کے ضمیر کی آواز پر لبّیک کہہ دیا۔

پیر صاحب نے آنگن میں قدم رکھ کر کہا:

کریم! مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ ہم چند لمحوں کے لیے بیٹھیں گے۔

شیداں اِس اَثنا میں چار پائی بچھا کر اُس پر اُجلا کھیس ڈال چکی تھی۔ پیر صاحب نے پوچھا:

کریم! آج شیداں گھر میں اَکیلی معلوم ہوتی ہے۔

جی سرکار! اِس کی ماں کل سے میکے گئی ہے۔

پیر صاحب نے چار پائی پر بیٹھ کر کہا:

کریم! تم نے شیداں کے لیے کوئی رشتہ ڈھونڈ لیا ہے؟

جی ہاں پیر بادشاہ! اِس کے ماموں کے ہاں اِس کی بات پکّی ہو چکی ہے۔

الحمدُللہ! جوان لڑکیوں کو زیادہ دیر تک گھر میں بٹھائے رکھنا اچھا نہیں ہوتا۔ اِس کی شادی پر میں حسبِ توفیق تمھاری مدد ضرور کروں گا۔ مجھے کچھ دِن پہلے بتا دینا!

کریم کی باچھیں کھل گئیں۔ اُس نے گویا زمین پر بچھتے ہُوئے کہا:

پیر بادشاہ! تیری نظر کی ضرورت ہے ...... میں ......

اَور کریم اپنی بات پُوری نہ کر سکا۔ اُس کی پھٹی پھٹی آنکھیں دروازے سے چپک گئیں۔ پیر صاحب نے گھوم کر دیکھا تو اُن کا جسم سُنّ ہو گیا۔ صاحب زادہ صاحب کا ایک قدم دہلیز کے اَندر اَور دُوسرا باہر تھا اَور وہ زمین میں گڑ کر بُت بن چکے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اُنھوں نے قدم دہلیز سے باہر کھینچا۔ مُڑے اَور گلی میں غائب ہو گئے۔ معاً مغرب کی اذان تھرتھرائی۔ پیر صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے گلی میں قدم رکھا تو کریم بھی پیچھے پیچھے تھا۔ مسجد میں پہنچ کر اُنھوں نے وضو کیا اَور جماعت کے ساتھ نماز اَدا کی۔ نوافل پڑھ چکنے کے بعد جب وہ مسجد سے نکل کر گلی میں آئے تو کریم پھر بھی اُن کے پیچھے پیچھے تھا۔ گھر کی ڈیوڑھی میں قدم رکھ کر اُنھوں نے مُڑ کر کریم کو دیکھا۔ کریم شرم اَور غیرت کے بوجھ تلے جھکا' دروازے میں کھڑا تھا۔ پیر صاحب نے سَرد لہجے میں کہا:

کریم! آج تم ہمیں اَپنے گھر میں اَپنی غیرت کا جنازہ دِکھلانے کے لیے لے گئے تھے؟

نہیں ...... نہیں ...... پیر بادشاہ ...... مجھے اِس بات کا پتا نہ تھا۔ میں نمک حرام نہیں۔ میں بے غیرت نہیں۔ میں شیداں کا مُنہ کالا کر کے' چُٹیا کاٹ کر' گلی گلی پھراؤں گا۔

نہیں ......

پیر صاحب نے دھیرے سے کہا:

اِس بات کا چرچا نہ کرو۔ تم چپکے سے اپنا گھر بار لے کر کسی دُوسرے گاؤں میں چلے جاؤ!

کریم نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے حسبِ معمول عِشا کی نماز پیر صاحب کے ساتھ پڑھی اَور جب پیر صاحب اِستراحت کے لیے زنانے میں چلے گئے تو وہ بوجھل قدموں کے ساتھ گھر آیا۔ اُس نے شیداں کی طرف آگ بھری ایک نظر ڈالی' پر زبان سے کچھ نہ کہا اَور ساری رات' اُس کی کروٹیں بدلتے گزر گئی اَور اُسے نیند نہ آئی۔ صبحِ کاذب کے وقت وہ حسبِ معمول جاگا اَور پیر صاحب کے ہاں چلا آیا۔ اُنھیں تہجد کی نماز کے لیے وضو کروایا۔ صبح کی نماز کا وقت ہُوا تو کریم اُن کے ساتھ مسجد میں گیا۔ مسجد

سے واپس آکر پیر صاحب نے اُسے سَو روپے دیتے ہوئے کہا:

کریم! تُو ہمارا پرانا خدمت گار ہے۔ تجھے اپنے سے جُدا کرتے ہُوئے قلق بھی تو ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے! میں تقدیر کے آگے مجبور ہُوں۔ خاندان کی عزّت کا سوال......

کریم نے سَو روپے لیے تو اُس کی خشک آنکھوں سے رُکا ہُوا سونا پھُوٹ بہا۔ اُس کی ڈاڑھی تر ہو گئی اور اُس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ پیر صاحب نے بڑی شفقت کے ساتھ اُس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا:

کریم! تقدیر کے آگے سپر ڈال دو!

اور تیسرے دِن کریم اپنے آبائی گاؤں پر حسرت کی ایک نظر ڈال کر چار کوس دُور، نُور پُور چلا گیا۔

لیکن کریم اپنے نئے ماحول میں رَس بَس نہ سکا۔ ایک ڈگر پر چلتے چلتے زندگی میں وہ لچک باقی نہ رہی تھی جو نئے حالات سے سازگار ہو جاتی ہے۔ زندگی کی نہج مقرّر ہو چکی تھی۔ اب اُس سے تھوڑا سا اِنحراف بھی مشکل تھا۔ اُس نے ساری عُمر اپنے ہاتھوں سے کوئی محنت کا کام نہیں کیا تھا۔ اَب وہ ہَل چلانے، نلائی کرنے، فصل کاٹنے اور گھاس کھودنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اُس کے پاس نقد سَو روپے تھے۔ فصل کی کٹائی ہو رہی تھی۔ اگر وہ چاہتا تو کٹائی کر کے سال بھر کا غلّہ اکٹھا کر لیتا لیکن مصلّے پر بیٹھنے والا اور وِرد و وظائف کی جنّت میں گم رہنے والا کریم چلچلاتی دُھوپ میں پسینہ بہانے کی زحمت کیسے گوارا کر لیتا! اُس نے اللہ پر ڈور چھوڑ دی اور اندوختہ اور سَو روپے چھ۶ ماہ کے اندر اندر ختم ہو گئے۔

اِن چھ۶ مہینوں میں وہ دسویں پندرھویں دِن پیر صاحب کے ہاں حاضری ضرور دیتا رہا۔ اگر پیر صاحب کے پاس کوئی مرید آئے ہوئے ہوتے تو وہ نذرانہ دیتے وقت کریم کو بھی ایک دو روپے دے دیتے لیکن چھ۶ ماہ کے بعد جب اِفلاس اور فاقوں نے اپنی پہلی عفریتی جھلک دِکھائی تو وہ پیر صاحب کے سامنے جا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ اُس نے منہ سے کوئی بات نہ کہی لیکن پیر صاحب نے تسلّی و تشفّی کے الفاظ اور دُعاؤں کے علاوہ اُسے کچھ رقم اور جنس بھی دی۔ اندر سے بیبیوں نے اپنے اُترے ہوئے کپڑے دیے اور کریم واپس اپنے گاؤں آ گیا۔ چند ماہ اور گزر گئے۔ اور ایک دِن کریم اپنے صحن میں بیٹھا، پیر صاحب کے ہاں جا کر ہاتھ پھیلانے کے منصوبے باندھ رہا تھا اور اُس کی بیوی اُس دِن فاقے سے بچنے کے لیے کسی چودھری کے ہاں اَناج پھٹکنے گئی ہُوئی تھی کہ بڑے صاحب زادہ صاحب اچانک اندر آ گئے۔ کریم نے چونک کر تعظیم کی اور کہا:

صاحب زادہ صاحب! خیر تو ہے؟ بڑے پیر صاحب ماشاء اللہ خیریت سے تو ہیں؟

ہاں ہاں، ہر طرح کی خیریت ہے۔ میں بہرام خاں کے ساتھ رحیم پُور کے ایک چودھری کے ہاں شادی میں گیا ہُوا تھا۔ تمھارا گاؤں راستے میں پڑتا تھا۔ خیال آیا کہ تم سے بھی مِلتا چلوں۔ آخر خاندان

کے پرانے نمک خوار ہو۔

کریم خوشی سے پھُولا نہ سمایا۔ وہ دوڑ کر اندر سے چارپائی اُٹھا لایا۔ اُس نے اُونچی آواز میں کہا:

شیداں بیٹی! دیکھ تو صاحب زادہ صاحب آئے ہیں۔ اندر سے کھیس لا اور چارپائی پر بچھا دے!

شیداں کھیس لے کر آئی تو کریم چپکے سے باہر چلا گیا۔ صاحب زادہ صاحب نے میدان صاف دیکھا تو شیداں کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کی جرأت کر لی۔ شیداں پھُول دار چھینٹ کی قمیص اور رنگ دار پاپلین کی شلوار پہنے ہوئے تھی جس کے پائنچے اُڑے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے صاحب زادہ صاحب کے گھر کی اُترن تھے۔ لیکن اِن بوسیدہ کپڑوں میں بھی شیداں کی جوانی نکھر آئی تھی۔ اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور اُس کے سانولے رُخساروں پر شرم کی شفق پھُول رہی تھی۔ صاحب زادہ صاحب کو، معمولی شکل وصورت کی شیداں بے اِنتہا حسین معلوم ہُوئی ...... وِیرانے میں کِھلے ہوئے پھُول کی طرح جس کی پتّیاں کھُردری ہوتی ہیں اور جس کا رنگ تیز دُھوپ میں لُو کے تھپیڑوں سے مُرجھایا ہوتا ہے، لیکن جو گداز نہ ہونے کے باوجود اپنے ماحول میں حسن وخوبی کا مرقعِ دِل پذیر نظر آتا ہے!

صاحب زادہ صاحب چارپائی پر دیر تک گنگ ہو کر بیٹھے رہے۔ اِس سے قبل وہ اپنے گاؤں میں چھپ چھپا کر اُس سے ایک دو باتیں کر لیا کرتے تھے۔ اب چھ ماہ کے بعد بات کرنی مشکل معلوم ہو رہی تھی۔ ہونٹ خشک تھے اور زبان گویا تالو سے لگ چکی تھی۔ ایک عرصے کے بعد اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے کہا:

شیداں!

شیداں لرز کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اُس کا چہرہ کانوں کی لووں تک سُرخ ہو گیا۔ اُس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور اُس کی نگاہوں نے جھک کر کہا:

جی!

آ...... آ...... آج دیکھو مَیں آ ہی گیا۔

شیداں کے ہونٹ کانپے لیکن اِس سے پہلے کہ لرزشیں لفظوں کے آہنگ میں ڈھل سکیں، کریم کسی چودھری کے ہاں سے ایک پیالہ دُودھ مانگ کر لے آیا۔ اُس نے دونوں کو دیکھا تو بالکل نہ ٹھٹکا۔ اُس نے آگے بڑھ کر پیالہ صاحب زادہ صاحب کی خدمت میں پیش کرتے ہُوئے کہا:

صاحب زادہ صاحب! آپ کا خادم کریم اِس سے زیادہ کیا خدمت کر سکتا ہے؟

صاحب زادہ صاحب نے کانپتے ہاتھوں سے پیالہ لیا اور غٹا غٹ پی گئے۔ پھر کریم نے شیداں سے کہا:

شیداں بیٹی! میں ذرا صاحب زادہ صاحب کے لیے حُقّہ تازہ کر لاؤں۔

کریم نے حُقّہ ہاتھ میں لیا اَور باہر جانے لگا۔ صاحب زادہ صاحب اَپنی جیب ٹٹول کر کہنے ہی والے تھے کہ بابا کریم حُقّہ بھرنے کی ضرورت نہیں، میرے پاس سِگریٹ ہیں لیکن نہ جانے کس مصلحت نے اِن لفظوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اَور کریم حُقّہ لے کر دروازے سے باہر نکل گیا۔

صاحب زادہ صاحب نے پھر نظریں اُٹھا کر شیداں کو دیکھا۔ شیداں اُن کی طرف پیٹھ کیے ذرا دُور کھڑی تھی۔ صاحب زادہ صاحب نے ذرا دِھیمے سے کہا:

شیداں!

شیداں نے مُڑ کر دیکھا۔

یہاں آؤ۔

شیداں نے قریب آ کر کہا:

جی!

تم نے کبھی ہمیں یاد کیا؟

شیداں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلے ایک دو لمحوں کے لیے اُس کی آنکھیں جھکی رہیں۔ پھر اُس نے نظریں اُٹھائیں تو اُن میں شرارت کی بجلیاں تھیں۔ ایک الھڑ جوانی نے اِٹھلا کر کہا:

نہیں...... مجھے یاد کرنے کی کیا پڑی تھی بھلا؟

صاحب زادہ صاحب پہلے حیران ہوئے، پھر مسکرائے اَور آخر اُنھوں نے جرأت کر کے شیداں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ ہاتھ کورے کھدّر کی طرح کُھردرا تھا۔ اُس کی ہتھیلی میں بھی گداز نہیں تھا۔ موٹی موٹی اُنگلیوں کی اُن گھڑت پوروں میں بھی کوئی نفاست نہ تھی لیکن نہ جانے یہ ہاتھ کیوں اِتنا گرم اَور تر تھا! اِس میں زندگی کی فراوانی تھی۔ اَور ایک لحظے کے اَندر اَندر صاحب زادہ کے ہاتھ کی گرفت میں اِس ہاتھ کی دُرشتی اَور سختی پگھل کر موم بن گئی تھی۔ ایک دِھیمی سی آنچ صاحب زادہ کے خون میں گُھل مل کر، اُن کے احساس کو پگھلا کر، اُن کی پیشانی کو پسینے سے تر کر گئی۔ اُنھوں نے گرفت کو سخت کرتے ہُوئے شیداں کو اَپنی طرف کھینچا۔ شیداں نے لچک کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی:

آپ کیا کر رہے ہیں؟

اُس نے دِھیمی آواز میں کہا۔

اَور کُھلے دروازے سے حُقّہ ہاتھ میں لیے، کریم اَندر داخل ہُوا۔ اُس نے یہ لفظ سُن لیے۔ اُس نے شیداں کے ہاتھ کو صاحب زادہ کے ہاتھ میں دیکھا۔ اُس کا ایک قدم ٹِھٹکا لیکن دُوسرا آگے بڑھ آیا۔

نے ایک سہما سہما کش لیا لیکن کریم سے نظریں نہ مِلا سکے۔ شیداں چپکے سے کھسک کر مکان کے اندر چلی گئی۔ دیر تک صاحب زادہ صاحب کو بات کرنے کی جرأت نہ ہُوئی:

کریم! اَب میں جاتا ہُوں۔

آج یہیں رہ جائیں صاحب زادہ صاحب!

یہیں......!

صاحب زادہ صاحب نے خوف سے لرز کر کہا:

نہیں......!

اُنھوں نے سہمی ہُوئی نظریں جھکا لیں۔ ''کتنی عجیب بات ہے''...... اُنھوں نے سوچا: ''اِس نے مجھے عین موقع پر دیکھ لیا تھا۔ شیداں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اَور یہ مجھے کہہ رہا ہے کہ میں رات اِن کے ہاں رہ جاؤں۔ اِس میں کیا راز ہے!'' اَور اُنھوں نے کن اکھیوں سے کریم کو دیکھا اَور اُن کا خوف حیرت میں بدل گیا۔ کریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اُس کی آنکھوں میں چمک تھی اَور اُس مسکراہٹ' اُس چمک میں ایک عجیب رمز تھی۔ صاحب زادہ صاحب کے حواس جو خوف اَور حیرت کے تُند تھپیڑوں سے بِکھر چکے تھے' یک جا ہوئے تو اُن کی سوچ کچھ واضح ہوگئی اَور وہ بہت حد تک اِس مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گئے۔ اُنھوں نے سوچا: ''شیداں اَب بھرپور جوان ہے۔ ابھی ابھی وہ آگ کی دِھیمی سی آنچ بن کر اُن کے انگ انگ میں رچ گئی تھی اَور بابا کریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے''...... اِس کا مطلب اُنھوں نے اَپنے آپ سے پوچھا لیکن کوئی فیصلہ کُن جواب نہ پاکر وہ چارپائی سے بادلِ ناخواستہ اُٹھے:

نہیں بابا' مجھے جانا چاہیے! میں آج رات یہاں رہ گیا تو ابّا سے کیا بہانا کروں گا۔

اچھا آپ کی مرضی۔

کریم نے بہ دستور مسکراہٹ کا سہارا لیتے ہُوئے کہا۔

پھر موقع مِلا تو ضرور آؤں گا......

صاحب زادہ صاحب نے اُونچی آواز میں کہا تاکہ شیداں بھی سُن سکے:

میری گھوڑی باہر تکیے میں بندھی ہے بابا کریم!

میں چل کر زِین کستا ہُوں۔ آپ حقّے کے ایک دو کش اَور لگالیں......

کریم نے کہا اَور وہ لپک کر باہر نکل گیا۔ صاحب زادہ صاحب پھر حیران ہو کر فضاؤں میں گھورنے لگے۔ اُنھوں نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے کہا:

شیداں!

شیداں آواز سن کر باہر نکلی۔ اَب اُس کی چال میں جھجک نہیں تھی، یہ تمکنت اَور غرور کی فراوانی تھی۔ وہ عورت بیدار ہو چکی تھی جس کی نسائیت کو پہلی بار آواز دے کر بلایا گیا ہو۔ وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہوئے آئی اَور اُس نے قریب آکر پوچھا:

کہیے!

صاحب زادہ صاحب اُس کے لہجے کی اِس خود اِعتمادی سے چونک کر دَب گئے۔ اُنھوں نے تتلا کر کہا:

کچھ بھی نہیں...... میرا مطلب ہے...... میں جا رہا ہُوں۔

شیداں نے یہ نہ پوچھا کہ آپ پھر کب آ رہے ہیں اَور صاحب زادہ صاحب مایوس ہو کر شیداں کے آنگن سے نکلے اَور باہر گلی میں آ گئے۔ اُنھوں نے ایک بار مُڑ کر دیکھا، شیداں آنگن میں کھڑی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی جو اُس نے کریم کے ہونٹوں پر دیکھی تھی۔

تکیے میں پہنچ کر اُنھوں نے گھوڑی کی باگ ہاتھ میں لی۔ رِکاب میں پاؤں رکھا اَور اُچک کر پیٹھ پر بیٹھ گئے۔ گھوڑی دو قدم آگے بڑھی تو اُنھوں نے باگ کھینچتے ہوئے کہا:

بابا کریم!

کریم قریب آیا تو اُنھوں نے جیب سے دس روپے کا نوٹ نکال کر کہا:

بابا! تُو ہمارے گھر کا پرانا خادم ہے۔ یہ لو!

کریم بے تاب ہو کر آگے بڑھا اَور اُس نے صاحب زادہ صاحب کے ہاتھوں سے نوٹ چھین کر کہا:

آپ پھر کب آئیں گے؟

کریم نے نوٹ کو دیکھا اَور اُس کی آنکھوں میں اُس حریص بھُوکے شِکاری کا ہوس آمیز اِشتیاق لہرایا جو شِکار کو آہستہ آہستہ جال کا رُخ کرتے ہُوئے دیکھ رہا ہو!

اَور اُس دِن کریم نے بڑے پیر صاحب کے ہاں جانے کا اِرادہ ترک کر دیا:

اَب تو گنگا گھر میں بہے گی۔ کنواں خود چل کر پیاسوں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ ہُوں! مجھے اَب پیر بادشاہ کے آگے گڑگڑانے کی کیا ضرورت ہے!

اُس کا چہرہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں کا کُچلا ہُوا غرور اِنتقام کی آگ بن گیا:

میں نے کیا قصور کیا تھا کہ پیر بادشاہ نے اِن بوڑھی ہڈّیوں کو گھر سے نکال باہر کیا!

پھر اُسے شیداں کا خیال آیا اَور ایک خوف کالے بادل کی طرح اُمنڈا اَور اُس کے دِل پر چھا گیا۔ بجلیاں کڑکیں اَور اُن کی گھن گرج میں وہ تنکے کی طرح اُڑا اَور پِس کر رہ گیا: ''نہیں...... نہیں...... میں......'' اُس نے کہا: ''لیکن میں بوڑھا ہُوں...... میں کمینگی پر مجبور ہُوں''۔ اَور ایک قطرہ پھسل کر اُس کی

ڈاڑھی میں جذب ہو گیا۔

اُس رات اُس نے شیداں کی ماں کو صاحب زادہ صاحب کے آنے کی خبر سُنائی تو اُس نے گھبرا کر کہا:

پیر بادشاہ کیا کہیں گے! یہ اچھا نہیں ہُوا۔ اَب ہمیں نُور پُور سے بھی نکلنا پڑے گا۔

نہیں......

کریم نے غُصّے سے ہونٹ بھینچ کر کہا:

ہمیں پیر بادشاہ کی کیا پروا! وہ ہمیں دیس نکالا بھی دے دیں تو صاحب زادہ صاحب ہمارے ہاں آتے رہیں گے۔

شیداں کی ماں نے حیران ہو کر پوچھا:

پر صاحب زادہ صاحب ہمارے ہاں کیوں آئیں گے؟ اُنھیں ہمارے گھر سے کیا ملے گا؟

کریم کی آنکھ چمکی۔ اُس کے ہونٹ پھڑکے۔ پھر چمک بجھ گئی۔ اُس نے آنکھیں جھکا کر رُندھے ہوئے گلے سے کہا:

شیداں......

شیداں؟......

کریم کی بیوی نے پریشان ہو کر کہا۔

ہاں ہاں! جس آگ کو بھڑکنے سے پہلے ہی بجھا دینے کی کوشش کی گئی تھی، وہ بجھ نہیں سکی۔ آگ بھڑک چکی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

بجھارتوں میں بات کر رہے ہو۔

تو نہیں سمجھے گی۔ اِدھر آ پگلی!......

کریم نے قہقہہ لگا کر کہا۔ شیداں کی ماں نے چند لمحے حیران ہو کر کریم کی طرف دیکھا۔ پھر وہ اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ کریم نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کا رنگ فق ہو گیا۔ اُس کا جسم شدّت سے کانپا۔ چند لمحوں کے لیے اُس کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ اُس نے گلے پر ہاتھ رکھا اور پھر خشک گلے سے آہوں اور سسکیوں کا دُھواں اُٹھا۔ اُس نے سُوکھے ہونٹوں پر سُوکھی زبان پھیرتے ہوئے کہا:

شش...... شش...... شرم کرو...... سفید ڈاڑھی پر کالک مَلنا چاہتے ہو؟ آگ لگ جائے تو صرف دُوسروں کا نہیں، اَپنا بھی گھر جل جایا کرتا ہے۔

ہوں، پگلی!......

کریم نے بڑے سکون سے کہا:

شیداں کو سمجھادے! دیکھ میری بوڑھی ہڈّیوں میں اِتنا سَت کہاں کہ مَیں کمین بن کر دُوسروں کا کام کرتا پھروں۔بھوکوں مَرنے سے بہتر ہے۔

نہیں......

شیداں کی ماں نے آنسوؤں کے طوفان میں سے کہا:

لوگ ہمارے مُنہ پر تھوکیں گے۔ہم دُنیا کو مُنہ دِکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔میں اِس بے شرمی میں تمھارا ساتھ نہیں دے سکتی۔

کریم نے مُنہ دُوسری طرف پھیر لیا۔شیداں کی ماں دو۲ دِن تک کریم سے نہ بولی۔

ایک ہفتے کے بعد صاحب زادہ صاحب پھر نُور پُور کسی بہانے سے آئے۔شیداں گھر پر نہیں تھی۔ دو گھڑی بعد جب مایوس ہو کر اُٹھنے ہی والے تھے تو کریم نے کہا:

صاحب زادہ صاحب! آپ جا رہے ہیں؟

ہاں ہاں! میں نے سوچا تھا، کریم ہمارے گھر کا پرانا خادم ہے۔میں اُس سے مِلتا چلوں۔اَب مجھے جانا چاہیے۔

لیکن عین اُسی لمحے شیداں آنگن میں آگئی۔صاحب زادہ صاحب کے قدم خود بہ خود رُک گئے۔ اُنھوں نے پھر چارپائی پر بیٹھتے ہُوئے کہا:

بابا! اگر تم چاہتے ہو تو ایک گھڑی اَور بیٹھ جاتا ہُوں۔

کریم چپکے سے باہر نکل گیا۔شیداں کی ماں آج پھر گھر میں موجود نہیں تھی۔صاحب زادہ صاحب کچھ دیر خالی آنگن میں گھومتے رہے۔یکایک ایک سایہ لپکا۔صاحب زادہ صاحب نے چونک کر دیکھا۔ شیداں اُن کے پاس سے گزر رہی تھی۔صاحب زادہ صاحب نے لپک کر اُس کی قمیص کا دامن پکڑ لیا۔شیداں نے مُڑ کر بڑی پُرغرور نگاہوں سے دیکھا، گویا پُوچھ رہی ہو: ''تمھیں یہاں کس نے بلایا؟'' صاحب زادہ صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا:

شیداں!

شیداں کے قدم ڈگمگائے۔اُس کا رُواں رُواں محبّت کے اِس بلاوے پر پھڑک گیا۔لیکن نِسائی غرور نے اُس کا دامن پکڑ لیا۔اُس نے جذبات کی رَو پر قابو پاتے ہوئے بڑے سکون سے پُوچھا:

کہو، تم یہاں کیوں آئے؟

تمھیں، صرف تمھیں ایک نظر دیکھنے کے لیے......

صاحب زادہ صاحب نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہُوئے کہا۔

ہوں!......

شیداں نے ایک جھٹکے سے دامن چھڑا کر کہا:

جھوٹ! غریبوں سے کون ملنے آتا ہے؟ تم اپنے کسی کام سے آئے ہوگے۔

نہیں شیداں...... مجھے اِس گاؤں میں کوئی کام نہ تھا۔ سچ جان، صرف تجھی سے ملنے کے لیے آیا۔

شیداں مسکرائی۔ صاحب زادہ صاحب اِس مسکراہٹ کے ساتھ اُڑے اَور اُن وادیوں میں آوارہ ہو گئے جہاں محبّت کی پہلی کرن پھُوٹ کر اُجالوں کا سَیلاب بن جاتی ہے۔ ابھی وہ آسمان سے زمین پر لَوٹ کر نہ آئے تھے کہ بابا کریم سامنے آ موجود ہوا۔ اُنھیں کریم سے نفرت محسوس ہوئی لیکن وہ کانپ کر بیٹھ گئے۔ شیداں وہاں سے ہٹ کر اندر چلی گئی اَور اِس ملاقات کے بعد صاحب زادہ صاحب اُس جال میں پوری طرح پھنس کر رہ گئے جو کہ کریم نے بڑی احتیاط سے بچھایا تھا۔

صاحب زادہ صاحب کے جانے کے بعد کریم اَور اُس کی بیوی میں پھر عزّت اَور غیرت کے معاملات پر لے دے ہُوئی لیکن بالآخر کریم کی بیوی نے اِس شرط پر ہتھیار ڈال دیے کہ تعلّقات محبت کے معصوم کھیل سے آگے نہیں بڑھیں گے اَور صاحب زادہ صاحب گاؤں والوں کی نظروں سے بچ بچا کر آیا کریں گے۔ اِس کے باوجود جب کریم صاحب زادہ صاحب سے خیرات وصول کرتا تو صدیوں سے وِرثے میں آئی ہُوئی غیرت چیخ اُٹھتی۔ اُس کا ضمیر تلملاتا اَور کئی بار آنسوؤں کا گرم لاوا اُس کے حواس کو جلا کر رکھ دیتا اَور وہ کہتا: "آسمان سے بجلی بھی نہیں گرتی کہ یہ بے غیرت جسم بھسم ہو کر رہ جائے!" اَور ہر ملاقات پر صاحب زادہ صاحب کی بے باکیاں بڑھتے چلے جاتیں لیکن نہ آسماں سے بجلی گِری، نہ زمین کا سینہ شق ہُوا کہ وہ اُس میں سما جاتا!

اَور نوُر پُور کے چھوٹے سے گاؤں میں صاحب زادہ صاحب کی ملاقاتیں خفیہ نہ رہ سکیں۔ ہَوا کا ایک سانس چنگاری کو اُڑا لے گیا اَور جنگل میں آگ لگ گئی۔ خوف ناک شعلے لپکے اَور پھر سخی پُور کے بڑے پیر صاحب بھی اِن شعلوں کو نہ بجھا سکے۔ اُنھوں نے کہا:

نُور پُوریو! تم سوئے ہوئے تھے۔ تمھارے گاؤں میں تمھاری آنکھوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوتا رہا اَور تم کچھ نہ کر سکے۔ اگر تم صاحب زادے کی ذلیل گردن مروڑ دیتے تو میں کہتا کہ تم نے مَردوں کا سا کام کیا۔ اگر اَب صاحب زادہ تمھارے گاؤں میں قدم رکھے تو اَپنا اِنتقام لینے میں میرا ذرا بھی لحاظ نہ رکھنا۔ اِس نے صدیوں کی خاندانی عزّت کو خاک میں مِلا دیا ہے۔ اِس کا وجود زمین کے سینے پر بوجھ ہے۔

پیر صاحب آگ بھبوکا ہو کر اِتنا تو کہہ گئے لیکن جب غصہ فرو ہُوا تو کانپ گئے: "اگر کوئی غیرت مند ہاتھ صاحب زادہ صاحب پر اُٹھ گیا تو کیا ہوگا...... کیا ہوگا!" اَور وہ رات کو دیر تک مصلّے پر بیٹھ کر دُعائیں

مانگتے رہے کہ خدا اُنھیں اِتنی بڑی آزمائش میں نہ ڈالے۔

دو چار دِن بعد نور پور والوں نے کریم کو نور پور سے بھی نکال دیا۔ اَب کریم کے سامنے لق ودق صحرا تھا اَور کوئی پناہ کی جگہ نہیں تھی۔ اُس کی بیوی نے کہا:

میرے میکے میں چلو۔ شاید ہمیں وہاں رہنے کا ٹھکانا مل جائے!

اَور ایک دِن، شام کے وقت کریم، اُس کی بیوی اَور شیداں نور پور سے نکلے تو کریم کی بیوی رو رہی تھی۔ کریم خود اَپنی لگائی ہُوئی آگ میں جَل بھُن کر بھسم ہو چکا تھا اَور شیداں کی دوشیزگی کو لُو لگ چکی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے شعلے سَرد تھے۔ اُس کا دِل پتھر کا ایک ٹکڑا بن چکا تھا۔ اُس نے سَر جھکا کر اَپنی خوف ناک تقدیر سے خاموش سمجھوتا کر لیا۔

سسرال والوں نے کریم کو بادلِ ناخواستہ قبول تو کر لیا لیکن شیداں کے ماموں نے کہا:

کیوں کریم! تم اَپنے مُنہ پر کالک مل کر ہماری عزت کو بھی خاک میں مِلانے کے لیے آئے ہو؟ مجھے اَور ذلیل نہ کر رحمے! تُو ہی بتا، اَب میں کہاں جا کر مُنہ کالا کروں؟

شیداں کے منگیتر نے شیداں کو ایک نظر دیکھ کر اَپنی ماں سے کہا:

ماں! تم نے بہت جلدی کی۔ نہ سہرے بندھے، نہ برات چڑھی اَور تو ڈولا گھر لے آئی۔ ماں، اِس گندگی کے ٹوکرے کو کسی گھورے پر پھینک دے!

اَور شیداں کی زندگی کا وُہ دَور شروع ہو گیا جس میں نہ جنت کے خنک سایے ہوتے ہیں، نہ جہنم کے شعلے؛ راکھ کے اَنبار ہوتے ہیں...... بجھی ہُوئی راکھ کے ڈھیر! زندگی میں جلی ہُوئی مٹی کا ذائقہ رَچ جاتا ہے۔

چند دِن بعد شیداں کی ممانی کی زبان سے طعنوں اَور مہنوں کے تیر چلنے لگے۔ وہ کہتی:

میں اِس ڈائن کی صُورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ یہ میرے گھر کو کھا جائے گی۔ ایسی منحوس چڑیلوں سے تو موت بھی دُور بھاگتی ہے۔

اَور ممانی کی بِس بھری نظریں ہر لمحے شیداں کے پیچھے لگی رہتیں، لیکن یہ تیر شیداں کے دِل کے پتھر سے ٹکرا کر کُند ہو جاتے۔ شیداں کی بے حِسی پر ممانی اَور بھی چمک اُٹھتیں اَور شیداں کی ماں چپکے سے آنسو بہا کر خاموش ہو رہتی۔

اَور ایک دِن ممانی نے شیداں کے ماموں کے ساتھ تنہائی میں کچھ ایسی بات کی کہ اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُس نے گنڈاسا ہاتھ میں لے کر کہا:

میں اِس کلموہی کا سَر کاٹ دُوں گا۔ میں اِسے......

شیداں کی ماں نے یہ سُنا تو کلیجا تھام کر بیٹھ گئی۔ کریم، سخی پُور گیا ہُوا تھا۔ وہاں وہ گاؤں والوں کی

نظروں سے بچ کر بڑے پیر صاحب سے مِلا۔ اُنھوں نے سَو روپے دے کر بڑی لجاجت سے کہا:

کریم جاؤ اور شیداں کے ہاتھ پیلے کر دو! تم اِس گھر کے نمک پر پلے ہو۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو ورنہ اِس گھر کی عزّت خاک میں مل جائے گی۔

اَور جب کریم سخی پور سے واپس آیا تو شیداں کے ماموں نے کہا:

کریم! تُو میرے گھر سے شیداں کو لے کر نکل جا۔ میں غریب ہُوں، پر تیری طرح بے غیرت نہیں۔ عزّت جان سے بھی پیاری ہوتی ہے۔ اگر تُو یہاں رہا تو میں شیداں کا سَر کاٹ کر پھانسی پر چڑھ جاؤں گا۔

کریم نے اَپنے سُسرال کا گاؤں بھی چھوڑ دیا۔ اَب وہ سخی پُور سے پندرہ[۱۵] کوس دُور ایک گاؤں میں چلا گیا جہاں ابھی کریم کی بے غیرتی کی شہرت نہیں پہنچی تھی۔

چھ[۶] ماہ گزرنے کے بعد وہ پیر صاحب سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ دُوسرے دِن عُرس تھا اور پیر صاحب اُسے دُھتکار کر اَپنے حجرے کے پُرسکُوں تقدس میں محصور ہو چکے تھے: ''میں اِس بے غیرت کمینے کے لیے قارون کا خزانہ کہاں سے لاؤں؟''...... اُنھوں نے سوچا: ''میں اِس کی مصیبتوں کا ذِمّے دار نہیں۔ بے شرم خود تو ہاتھ پاؤں ہلانا عار سمجھتا ہے۔ اگر صاحب زادہ صاحب کو اَپنے ہاں آنے سے روک نہ سکتا تھا تو مجھے وقت پر کیوں نہ بتا دیا؟'' اِس کے باوجود پیر صاحب رات بھر بے چین رہے۔ تہجّد کی نماز میں یک سُوئی غائب رہی۔ صبح کی نماز بھی خلافِ معمول بے کیف رہی اَور وہ وِردو وظائف میں کئی بار تسبیح کا شمار بھی بھول گئے۔ ایک عجیب سا خوف طاری رہا جس میں آنے والی مصیبت کے سایے تھے۔ لیکن عُرس کے دِن کی صبح بڑی شوخ، بڑی پاکیزہ اَور بے اِنتہا حسین تھی۔ دُھوپ میں نرم نرم حِدّت کی گھلاوٹ تھی۔ چارسُو تقدس کی نُورانی بارِش ہو رہی تھی۔ پیر سخی بادشاہ کے مزار کا سفید گنبد دُور دُور تک ضِیا پاشیاں کر رہا تھا۔ اِرد گِرد حدِّ اُفق تک سَر سبز کھیت جُھوم رہے تھے۔ اَور مزار کے سامنے کے مَیدان میں لوگوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ رات ہی رات میں بازار لگ چُکا تھا۔ جُھولے اَور پنگوڑے رُوں رُوں کر رہے تھے۔ یہ کایا پلٹ دیکھ کر پیر صاحب کی طبیعت کا اِنبساط عُود کر آیا۔ پنڈال کے عین وَسط میں تکیے کے سہارے بیٹھ کر اُنھوں نے عُرس کا مشاہدہ کیا۔ پنڈال آہستہ آہستہ بھر رہا تھا۔ مُرید آ رہے تھے اَور اُن کے گھٹنوں کو چُھو کر حلقے میں دو زانُو ہو کر بیٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ہر مُرید سے خیریت کے دو لفظ پوچھ لیتے۔ کسی کو دُعا دیتے، کبھی کبھار مسکرا دیتے اَور اُن کی مسکراہٹ مجمع میں خُوش بُو کی طرح بِکھر جاتی۔ وقتاً فوقتاً معرفت کے چند مسائل بھی زیرِ بحث آتے...... شریعت اَور طریقت کی آویزش، جذب و سلوک کی منزلیں، جبر و اِختیار کی لاینحل گتھیاں، اَولیا اللہ اَور مجذوب دیوانوں کی کرامتیں اَور خوارقِ عادات تحیّر میں کھوئے ہوئے سالکین کی دِلچسپ حکایات؛ قطب

اَور اَبدال کے درجے میں لطیف سا اِمتیاز...... یہ گفتگو ہر پہلو سے جاذِبِ توجہّ تھی اَور پیر صاحب کریم کو کلیۃً محو کر چکے تھے اَور کریم اُس مجمع میں موجود بھی نہیں تھا۔ ایک چہرہ دیکھ کر پیر صاحب کو شُبہ ہُوا کہ یہ کریم ہے اَور اُن کی زبان پر آیا ہُوا لفظ ژولیدگی میں بھٹک گیا لیکن دُوسرے ہی لمحے اُن کا شُبہ دُور ہُوا تو اَلفاظ پھر موتیوں کی تول تلنے لگے۔

جب پنڈال بھر گیا تو قوّالوں کو اِجازت مِلی کہ رُوح کے ساز پر مضرابِ معرفت کی چوٹ لگائیں؛ اُنھوں نے ساز دُرست کیے، طبلے پر تھاپ پڑی، ہارمونیم کے سُر چیخے، سارنگی کے تار جھنجھنائے تو پنڈال میں تِل رکھنے کو جگہ نہ رہی۔

حمدِ باری تعالیٰ اَور نعتِ رسول ؐ کا کیف بکھرا۔ فارسی اَور اُردو غزلیات کا دَور شروع ہُوا لیکن یہ تغزّل دیہی طبقے کے مزاج کے موافق نہیں تھا۔ اِس لیے تھوڑی دیر بعد جب ہیر وارث شاہ، بلّھے شاہ اَور خواجہ فرید کی کافیوں، مولوی غلام رسول کی یوسف زلیخا اَور میاں محمد بخش کی سیف الملوک کے دَور کا آغاز ہوا تو مجمع جھوم اُٹھا۔ چند لوگوں پر حال اَور وَجد کے دورے پڑے اَور قوّالوں پر روپوں کی بارش ہُوئی۔ قوّالی کے بعد دوپہر کا لنگر تقسیم ہُوا۔ ظہر اَور عصر کے درمیان ایک واعظِ شیریں مقال پنجابی میں سُرودِ معرفت بکھیرتے رہے۔ اَور اِس دوران میں نوجوانوں کا ٹولا مزار کے پاس ایک کھیت میں، جہاں نیا نیا ہل چلا تھا، جمع ہو چُکا تھا۔ اِس ٹولے کے سردار، صاحب زادہ صاحب تھے۔ یہاں کبڈّی کا مقابلہ ہُوا، کشتیاں لڑی گئیں، کلائیاں پکڑ کر زور آزمائیاں کی گئیں اَور کئی بار سخی پُور اَور رحیم پُور والوں کے ہاتھ لاٹھیوں تک پہنچتے پہنچتے رُک گئے۔ ایسے مجمعوں میں لاٹھیاں نہ چلیں، تھوڑا سا خون نہ بہے اَور ایک دو سَر نہ پھوٹیں تو پنجابی خون کی گرمی کو لطفِ جوانی حاصل نہیں ہوتا۔

عصر کے بعد اَور مغرب سے پہلے چوھدری ہیبت خاں کے گھر سے مزار کی چادر کا جلوس برآمد ہُوا۔ سخی پُور میں یہ رسم قدیم سے چلی آ رہی تھی کہ عُرس کے موقع پر مزار کی چادر ہمیشہ گاؤں کے سب سے بڑے چوھدری کے گھر سے آتی۔ جلوس کے آگے آگے قوّال، سید سخی بادشاہ کی مدح میں منقبت گاتے ہوئے آ رہے تھے۔ پیچھے پیر صاحب تھے اَور اُن پر سبز عَلم کا سایہ تھا اَور اُن سے پیچھے سفید پوش چودھریوں کا جلوس تھا جو چادر اَور تبرک سَر پر اُٹھا کر لا رہے تھے۔ سخی بادشاہ کے مزار کے تعویذ کو سبز ریشمیں چادر سے ڈھانک کر دُعائے فاتحہ پڑھی گئی، تبرک تقسیم ہُوا اَور عُرس ختم ہو گیا۔

سورج مغربی اُفق پر تیر کر ڈوب گیا تو سخی بادشاہ کے مزار پر ہُو کا عالم چھا گیا اَور نوچندی جمعرات

کا چاند معصوم سی مسکراہٹ لیے نمودار ہُوا۔ اندھیروں اَور اُجالوں میں مختصر سی کشمکش ہُوئی اَور اِس کشمکش میں گنبد کی سفیدی پھیکی پڑتے چلے گئی اَور عشا کی اذان نے تھرتھرا کر خاموشیوں کو اَور گہرا کر دیا۔ نماز پڑھ کر وہ مزار پر آئے۔ اُنھوں نے روز کے معمول کے مطابق دُعائے فاتحہ پڑھی۔ مزار کے سرہانے سے صندوقچی اُٹھائی جس میں دِن بھر کے چڑھاوے کی رقم تھی۔ صندوقچی لے کر' پیر صاحب باہر نکل آئے اَور مزار کو کُنڈی لگا دی۔

لیکن باہر جہاں پھیکی چاندنی کے ساتھ درختوں کے سایے اُلجھ رہے تھے' اُن کے دِل پر ایک عجیب و غریب غم کا بوجھ پڑا۔ اُنھوں نے سوچا: "ہر ہنگامے کے بعد یہ کیفیت ضرور دِل کا بوجھ بنا کرتی ہے۔ مجھے اِس سے خائف نہیں ہونا چاہیے۔ پھر مَیں تھک بھی تو گیا ہُوں!" لیکن اِن تسلّیوں کے باوجود اِطمینانِ قلب کی وہ منزل نہ آئی جہاں ہر خوف' ہر اندھیرا' ہر پریشانی' سکون کا ریشمیں لَبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ بستر کی نرمی اَور گداز میں بھی وہ اِس بوجھل ہاتھ کو محسوس کرتے رہے۔ نیند آئی لیکن ہر کروٹ کے ساتھ عجیب و غریب' بے سروپا خوابوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اِن خوابوں میں تسلسل نہیں تھا۔ اُلجھے ہُوئے خواب بھیانک بھی نہیں تھے اَور اُن میں خوف کا وہ نقطۂ عُروج بھی نہیں تھا کہ رَونگٹے کھڑے ہو جائیں!

وہ تہجد کی نماز کے لیے معمول سے پہلے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اُنھوں نے خشوع و خضوع اَور وِرد و وظائف میں پناہ لی۔ تسبیح کی گردشوں کا کوئی شمار باقی نہ رہا لیکن غم کا بوجھل ہاتھ ایک لمحے کے لیے بھی اُن کے دِل سے دُور نہ ہُوا۔ وہ صبح کا اِنتظار بھی نہ کر سکے اَور مسجد میں پہنچ گئے۔ مسجد تنہا اَور خالی تھی۔ اندر مٹی کا مدھم دیا جل رہا تھا۔ روشنی پھیکی اَور اُداس تھی۔ سرسوں کے تیل کی جَلی ہُوئی بُو ہر طرف پھیلی ہُوئی تھی۔ لَو تھرتھرا رہی تھی۔ وہ مسجد سے نکل آئے۔ اُنھوں نے مزار کا رُخ کیا۔ مزار کے گنبد کی سفید چمک' زِندگی سے خالی تھی۔ تاروں کی روشنی کا غُبار' گنبد پر چھایا ہُوا تھا لیکن اُس کی چمک میں لاش کے زرد چہرے کی کیفیت بھیانک تھی۔ وہ کانپ کر آگے بڑھے لیکن پھر ڈر کر پیچھے ہَٹ آئے۔ یہ پہلی بار تھی کہ وہ مزار کے قریب جانے سے جھجکے۔

مزار کے خادِم نے اَپنے حُجرے سے باہر نکل کر پوچھا:

کون؟

م......م......مَیں......

پیر صاحب نے سَر سے پاؤں تک لرز کر کہا۔ چند لمحوں بعد اُنھوں نے حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا:

خادِم! میں ہُوں۔

خادِم نے پیر صاحب کی آواز پہچان لی۔ وہ آگے آیا اَور اُس نے تھرتھر کانپتے ہُوئے کہا:

یا پیر! یہ خواب کی بات ہے یا میرا وَہم ...... مجھے آدھی رات کو مزار کے اَندر سے کسی بچّے کے رونے کی آواز آئی۔ پر سرکار،جب میں حجرے سے باہر نکل آیا تو یہ آواز بند ہو گئی!

بچّے کی آواز؟......

پیر صاحب اِس اچانک اِنکشاف پر سُنّ ہو کر رہ گئے۔ اُن کی آواز پاتال میں ڈوب گئی۔ شدّتِ خوف سے اُن کی ٹانگیں کانپیں اَور وہ ایک درخت کے تنے کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے۔

پہلے یا دُوسرے دِن کے بچّے کی آواز پیر بادشاہ!

نہیں ......نہیں ......

اُنھوں نے اَپنے آپ سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا:

یہ تمھارا واہمہ ہے......مزار کے اَندر سے!......نہیں......نہیں ...... تو رات بھر خواب دیکھتا رہا۔

پر سرکار! سخی بادشاہ زِندہ پیر ہیں۔ یہ اُن کی کرامت ہے۔

لیکن اُنھیں بچّے کی طرح رونے کی کیا ضرورت پیش آئی! تُو بے سروپا واہموں کو بزرگوں کی کرامت سمجھ رہا ہے۔

اَور یکایک ایک تارا ٹوٹا۔ اَندھیروں کا غُبار روشن ہُوا اَور ایک تیز شُعاع گنبد پر پڑی۔ گنبد کی سفیدی یک دم چمکی اَور پیر صاحب اِس مافوق الفطرت چمک سے ڈر کر ایک قدم پیچھے ہَٹ گئے اَور پھر اچانک ایک نوزائیدہ بچّے کی آواز فضا کی خاموشیوں کا سینہ چاک کر کے اُبھری اَور تھرتھرائی اَور ایک لمحے کی مختصر اُڑان میں فضا کی گمبھیر خاموشیوں میں ڈوب گئی۔ پیر صاحب کے جسم و رُوح کی ہر رگ جھنجھنائی اَور پھر فضا کے سَرد اَور بے جاں اَندھیروں کا جزُو بن گئی۔ اُن کے قدم نہ زمین پر تھے اَور نہ آسمان پر۔ وہ خلاؤں میں تحلیل ہوئے اَور اُن کے گِرد وپیش کی ہر مادّی شے اُن کے ساتھ اِس گمبھیرتا میں ڈوب گئی۔ آسمان کے سارے تارے ٹوٹ کر غُبار بن گئے اَور زمین بھک سے اُڑ کر اِس غُبار میں حل ہو گئی ......ننھی سی آواز کی دُوسری لرزِش نے کائنات کو یک جا کیا۔ ستارے اُڑ کر آسمان کی طرف لَوٹ گئے۔ بکھری ہوئی راکھ مٹّی اَور درختوں اَور گنبد کے ہیُولے اُبھرے۔ روشنی کے دھبّوں نے پھر سِتاروں کی شکل اِختیار کی۔ گنبد کی سفیدی پر ایک اَور ٹوٹنے والے تارے کی تیز شُعاع منعکس ہُوئی اَور پیر صاحب نے قیامت کے بعد زِندگی کے اِس نئے جنم پر آنکھیں مَلیں اَور جذبات سے گلوگیر آواز میں تیز تیز کہا:

جاؤ! چیخ چیخ کر اِعلان کر دو کہ سخی بادشاہ زِندہ پیر ہیں۔ لوگو آؤ! اَور اُن کی کرامت کو آنکھوں سے دیکھو۔

خادِم نے گاؤں کی طرف ایک قدم بڑھایا ہی تھا کہ پیر صاحب کی جذباتیت نے یکایک عقلِ باشعور کا

رُوپ دھار کر کہا: ''ابھی نہیں ...... ابھی تحقیق کی ضرورت ہے!'' اَور اُنھوں نے خادِم کو آواز دے کر روک لیا۔ خود قرآن کی آیات پڑھ کر اَپنے آپ پر دم کیا اَور جرأت پا کر مزار کا رُخ کیا۔ اُنھوں نے کانپتے ہاتھوں سے مزار کی کُنڈی کھولی۔ دروازہ چرچرایا۔ اَندر دیے کی لَو ٹمٹمائی اَور ہَوا کے ایک جھونکے سے لرز کر بُجھ گئی۔ پیر صاحب اَندھیرے میں آگے بڑھنے سے ہچکچائے۔ اُنھوں نے خادِم سے پُوچھا:

تمھارے پاس روشنی ہے ...... دیا سلائی؟

نہیں سرکار ...... طاقچے میں دیا سِلائی ضرور ہو گی۔

پیر صاحب ڈرتے ڈرتے مزار کے اَندر داخل ہُوئے۔ ٹٹول ٹٹول کر طاقچہ تلاش کیا اَور ڈِبیا نے اُن کی اُنگلیوں کو مَس کیا۔ دیا سِلائی کی رگڑ سے جو ننھا سا شُعلہ پَیدا ہُوا' وہ لرز کر بُجھ گیا۔ لیکن روشنی کے اِس قلیل سے وقفے میں حقیقت کا چہرہ دوپہر کے سُورج کی طرح چمک گیا۔ یہ دُوسرا ناگہانی صدمہ تھا، لیکن پیر صاحب کی قوّتِ برداشت نے اِسے بہت جلد قبول کر لیا۔ اُنھوں نے دھیرے سے کہا:

جاؤ ...... ہیبت خاں کو بلا لاؤ لیکن ......

اُنھوں نے پَپڑی جمے ہونٹوں پر سُوکھی زبان پھیری:

اَور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو!

اَور پھر دو چار لمحوں کے توقّف کے بعد اُنھوں نے اَپنے آپ سے کہا: ''اَب میں کیا کروں؟ صدیوں کی خاندانی عزّت خاک میں مِل گئی ہے ...... نمک حرام نے کِتنا خوف ناک اِنتقام لیا ہے! ...... خوف ناک ......!!''

☆☆☆

کاغذی پَیرہن

آدھی رات کو اُسی مدُھر سُر نے اُس کے کان میں سرگوشی کی تو اُس کی آنکھ کھُل گئی۔
یہ ایک بے نام سا سندیسا تھا جو متواتر تین۳ راتوں سے ایک پُھوار بن کر اُس کے تن بدَن پر بِکھر جایا کرتا تھا۔ اُس میں من کے دُکھ کا مِیٹھا سا کیف بھی ہوتا۔ اُس نے اپنے سرھانے کی کھڑکی کھولی تو یخ بستہ بھیگا ہُوا جھونکا آیا۔ اُسے کپکپی سی لگ گئی۔ باہر گھور اندھیرا تھا۔
کھڑکی بند کردو زرینہ!......
شاہدہ نے کہا:
بہت سَردی ہے۔
زرینہ نے کھِڑکی بند کردی تو شاہدہ نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا:
تم آدھی رات کو کھڑکی کیوں کھولتی ہو زرینہ؟
یوں ہی ......شاید...... کمرے کی بند ہَوا میں آدھی رات کو گھٹن سی محسوس ہوتی ہے۔
دیکھو زرینہ! مجھے ٹالو مت۔ میں جانتی ہُوں تم کھُلی کھِڑکی میں سے پنچھی بن کر نہیں اُڑ سکتیں۔ پھر بھی تم جو کھِڑکی کھولتی ہو تو اِس میں کچھ راز ضرور ہے۔
نہیں!......
زرینہ نے سوئی سوئی آواز میں کہا۔
شاہدہ نے اپنے سرھانے' تپائی پر پڑا لیمپ جلا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیلی تو گھور اندھیرے کا سُپنا ٹوٹ گیا۔ زرینہ نے آنکھیں جھپک جھپک کر روشنی کو اپنے من میں رچانا چاہا۔ آنکھوں میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی اَور من کا مِیٹھا سا دُکھ جاتا رہا تو زرینہ نے سپاٹ سی آواز میں کہا:
شاہدہ! میں آدھی رات کو ایک سُپنا دیکھتی ہُوں۔
کون سا سُپنا؟
شاہدہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اَور اِشتیاق بھی۔
میرے کانوں میں ایک مِیٹھا سا سُر گونجتا ہے جیسے آسمانوں سے اُترا ہو۔

تم تو سَدا کی پگلی ہو......

شاہدہ نے ہنس کر کہا:

سنہرے خواب دیکھنے والی شہزادی، چل سوجا!

زرینہ سوئی تو گھوڑے بیچ کر سوئی۔ صبح جب وہ آنکھیں ملتے ملتے اُٹھی تو سپنوں والا دریچہ کھُلا ہُوا تھا اَور پائیں باغ میں آم اَور جامن کے درختوں پر رنگا رنگ کے پرندے گا رہے تھے اَور اُن کی پھننگوں پر سردیوں کی سنہری دُھوپ کانپ رہی تھی۔ وہ گرم چادر اوڑھ کر آنگن میں آئی تو شاہدہ نے پکار کر کہا:

زرینہ! اِدھر تو آ۔

کیوں کیا بات ہے شاہدہ؟

کچھ بھی نہیں...... میں تنہائی محسوس کر رہی تھی۔

آج گھر خالی ہے؟

چچا ابھی چائے پی کر نکل گئے ہیں۔ اُنھیں باہر کچھ کام ہے اَور چچی مُنہ اَندھیرے کنویں پر چلی گئیں۔ اَدھ بلوئے دہی کا اِتنا بڑا کٹورا پیا، شال لی اَور گھر سے نکل گئیں......

شاہدہ نے کہا۔

اَور زرینہ کے مسکراتے ہوئے لبوں کے ایک خَم میں مسکراہٹ کی اَدھ کھِلی کلی شرما کر رہ گئی۔ شاہدہ باورچی خانے میں چُولھے کے سامنے چوکی پر بیٹھی ہُوئی تھی۔ سَردیوں کی آگ میں بھڑک نہ تھی...... شُعلوں کی تڑپ، آگ کا عکس شاہدہ کے چہرے پر پڑ رہا تھا اَور آنکھوں میں ننھے منّے شعلے لہرا رہے تھے۔ اِس کے باوجود شاہدہ شعلۂ جوّالہ تو نہیں لیکن سردیوں کی اِس پُرسکوں آگ کا دِیپک راگ ضرور لگ رہی تھی۔ اَور زرینہ نرم نرم دُھوپ میں ننگے سَر یُوں کھڑی تھی جیسے سُورج دیوتا کے مندِر کی دیوداسی ہو۔ گھنے سیاہ بال کمر تک پہنچ رہے تھے اَور ہلکے نیلے رنگ کی گرم چادر پر بکھر گئے تھے اَور اُس کی آنکھوں میں نیند کا خُمار تھا جس سے کچے خوابوں کے نغمے چھلک رہے تھے۔

شاہدہ!......

زرینہ نے دھیمی آواز میں کہا:

تم نے اُس چڑیا کا گانا سُنا جو مُنہ اَندھیرے بیری کے ٹُنڈ مُنڈ درخت پر بیٹھ کر گاتی ہے؟

ہاں!

کل مجھے بھی جلد جگا لینا۔ میں اُس چڑیا کا راگ سننا چاہتی ہوں۔ کتنے دُکھ بھرے اَنداز میں گاتی ہے!

اَور شاہدہ، مجھے تو اَیسا لگتا ہے جیسے پائیں باغ کے کسی دُور کے درخت سے اُس کی راگنی کا جواب بھی آتا ہو۔

شاید!......

شاہدہ نے اُس کے رُومان پرور جذبات کا ساتھ نہ دیا:

میں تو گاؤں سے تنگ آ چکی ہُوں۔

اِتنی جلد؟ ابھی تو بھیّا بھی نہیں آئے۔

کامِل نہ جانے کہاں رہ گیا ہے!

شاہدہ نے شرما کر کہا اور اپنی شرماہٹ کو شعلوں کے دھیمے سے عکس میں چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

آئیں گے ضرور۔ کیوں نہ آئیں گے بھلا؟ میری سرکار کچے دھاگے سے بندھ کر آئے گی۔ شاہدہ رانی اُن کے لیے شہر کی ساری رونقیں چھوڑ کر اِس اُجاڑ سے گاؤں میں آ بسیں اور کامِل بھیا ہیں کہ دُور پہاڑوں پر برف کے نظارے کر رہے ہیں۔ اُنھیں برفیلی تنہائیوں میں کیا خاک لطف آتا ہوگا!

زرینہ کے لہجے میں چمک تھی اور شاہدہ کی آنکھوں میں شفق کا رنگ گہرا ہو گیا تھا۔

زرینہ! تم آدھی رات کو کون سا سپنا دیکھتی ہو؟

میں ......

زرینہ چَونک گئی:

میں نے رات ہی جو بتا دیا تھا۔

تم نے صرف اِتنا کہا تھا کہ تم ایک میٹھا سا سُر سنتی ہو۔

ہاں! ایسا لگتا ہے جیسے یہ سُر میری رُوح میں رچ جانے کے لیے تتلی کی طرح پھڑپھڑاتا ہو۔

بس اِتنا سا سپنا...... تم کھڑکی کیوں کھولتی ہو؟

میں ڈرتی ہُوں، یہ راگنی، بند کھڑکی کے ساتھ سَر پھوڑ کر نہ مر جائے۔

گاؤں میں آ کر ایسے سپنے دیکھنے کی کیا وجہ؟ تم نے کچھ غور کیا زرینہ؟

نہیں! ......

زرینہ نے دھیمے لہجے میں کہا:

میں نے غور نہیں کیا اور سوچنا بھی نہیں چاہتی شاہدہ! میں تو چاہتی ہُوں، یہ دُور دیس سے آنے والا سرمیری رُوح میں رچ جائے تو میں نیلے آکاش کو جا چھُوؤں۔

میں تیری طرح سنہرے خواب دیکھتی ہُوں نہ مجھے شاعری آتی ہے زرینہ! پر میں نے سنا ہے پنجاب، ہیر رانجھے اور سوہنی مہینوال کا دیس ہے۔ اِس دیس میں رانجھے اور مہینوال بانسری بجاتے ہُوئے آتے ہیں اور ہیریں اور سوہنیاں راگنی کی لَے پر رقص کرتے ہُوئے اُن کا اِستقبال کرتی ہیں۔

شاہدہ باجی! اگر کامل بھائی دو چار دِن اور پہاڑوں پر رہ جائیں تو پنجاب کی شاعری کو "کامل شاہدہ" نامی ایک اور قِصّہ ہاتھ آ جائے......

زرینہ کی شوخی نے اَپنا اِنتقام لے لیا۔

یہ آدھی رات کو جو سُر تیری رُوح میں رچ بس جانے کے لیے پَر تول رہا ہے، کہیں اُسی بانسری کا نغمہ نہ ہو!......

شاہدہ کی آنکھیں شرارت سے مسکرائیں اَور زرینہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑی جیسے ساون کی ایک گھٹا پھٹ پڑی ہو۔ پھر گھٹا برس کر اچانک کُھل گئی تو فضا میں کامل سکون طاری ہو گیا۔ زرینہ باورچی خانے کے اَندر آئی اَور شاہدہ کے پہلو سے پہلو مِلا کر چوکی پر بیٹھ گئی۔ شُوں شُوں چائے کا پانی اُبلنے لگا اَور دونوں خواب کے ایک عالَم میں کھو گئیں۔

....

چھوٹے سے سٹیشن کا پلیٹ فارم خالی تھا۔ دونوں بہنیں اَپنا اَپنا اٹیچی کیس لے کر اُتری ہی تھیں کہ گاڑی۔ پَھک پَھک کرتے چل دی۔ یکایک چچا جمال لپک کر کہیں سے آ گئے:

لڑکیو! تم آ گئیں؟

دونوں بہنیں مسکرائیں۔ چچا نے باری باری دونوں کے سَر پر ہاتھ پھیرا اَور اُنھیں ساتھ لے کر سٹیشن سے باہر آ گئے۔ اُنھیں تانگے پر بٹھا کر چچا نے راسیں ہاتھ میں لیں اَور کچی سڑک کا سفر شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں کِناروں پر درخت تھے اَور گندم کی نوخیز کونپلیں دُور دُور تک سبزۂ نورستہ کی چادریں بن کر پھیلی تھیں۔ تانگا اُچھلتے کُودتے نالے تک پہنچ گیا۔ نالے پر پُل نہیں تھا اَور اُس کے اَندر پایاب پانی تھا۔ جب تانگا نالے کے اَندر پہنچا تو کیچڑ میں پھنس کر رہ گیا۔ چچا نے کہا:

بھئی بڑی مصیبت ہُوئی۔ دُور دُور تک کوئی نظر نہیں آ رہا۔

چچا نے غصے سے گھوڑے کو دو تین چابک بھی لگائے۔ گھوڑے نے زور مارا لیکن تانگا اَپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ سامنے کے کِنارے پر درختوں کا ایک جُھنڈ تھا اَور ہَری ہَری دوب کا ہموار فرش، اَور اُس جُھنڈ سے بانسری کا ایک نغمہ پُھوار کی طرح گرا تو چچا جمال نے پکار کر کہا:

اوئے احمد! اِدھر تو آ۔

آیا بھائی آیا۔

سامنے کے ڈھلوان سے ایک درمیانے قد کا گٹھے ہوئے جسم والا نوجوان اُترنے لگا جس کے ہاتھ میں بانسری تھی۔ پانی کے قریب پہنچ کر اُس نے بانسری کو تہمد کی ''ڈب'' میں اُڑس لیا اَور جُوتے اُتار کر ایک طرف رکھ دیے۔ تہمد کا لنگوٹ کس کر وہ پانی کے اَندر آ گیا۔ اُس نے زرینہ کی سیٹ کے ساتھ والا پہیا گھمایا تو چچا نے گھوڑے کو چابک لگایا اَور پہیا ایک دھچکے کے ساتھ کیچڑ سے نکل گیا اَور تانگا سامنے کے

ڈھلوان پر چڑھتے ہوئے چشم زدن میں ہموار سڑک پر پہنچ گیا۔ احمد نالے میں کھڑا تھا اور بڑی بے نیازی کے عالم میں تانگے کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک نظر زرینہ کو دیکھا لیکن یہ کم نگہی ایک اُڑتی سی جھلک تھی جو ہموار سڑک تک پہنچتے پہنچتے چند دھچکوں میں یوں گھل مل گئی تھی کہ ایک بھرپور نظر کے قالب میں بھی نہ ڈھل سکی۔

چچا ایک لمحے کے لیے بھی نہ رُکے کہ احمد کا شکریہ اَدا کرلیں۔ زرینہ کو کچھ افسوس سا ہُوا۔ تانگا چند گز آگے بڑھا ہوگا کہ احمد بھی کِنارے پر آ کھڑا ہوا۔ اُس نے بانسری مُنہ سے لگائی اور نغمے شبنم کے قطروں کے مانند برسنے لگے۔ اُن کے آہنگ میں گھن گرج نہیں تھی۔ زرینہ کی پیشانی پر اوس کا ٹھنڈا چھینٹا پڑا۔ تانگا گاؤں کے گِرد چکّر کاٹتے ہُوئے گاؤں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر کوٹھی کے سامنے آکر رُکا تو زرینہ کی آنکھیں خود بہ خود مُندھ سی گئیں۔ اُس نے کامل کا ہیولا دیکھا جس کے ہونٹوں سے بانسری لگی ہُوئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایک مافوق الفطرت چمک تھی جو بڑے اِضطراب کے ساتھ اُس کا اِستقبال کر رہی تھی۔ زرینہ کا رُواں رُواں کانپ گیا۔

"ایک کا ہیولا دُوسرے میں کیوں مدغم ہوگیا تھا؟"...... اُس نے سوچا۔

لڑکیو، اُترو! تمھاری چچی پھاٹک پر کھڑی تمھارا اِنتظار کر رہی ہیں۔ کامل میاں تو سوات کی سَیر کو گئے ہیں۔ آج گھر پر ہوتے تو کتنا لطف رہتا!

کامل گاؤں میں نہیں چچا؟

شاہدہ نے چونک کر پوچھا۔

نہیں بیٹی۔

لیکن میں نے اُنھیں ابھی ابھی پھاٹک پر کھڑے دیکھا......

زرینہ نے شاہدہ کے کان میں دھیمے سے کہا۔

تمھیں دھوکا ہُوا ہوگا زرینہ! پھر تم ہو بھی تو سدا کی پگلی۔ خواب دیکھنے والی شہزادی......

شاہدہ نے بڑی بہن کی سی شفقت کے ساتھ زرینہ کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہُوئے کہا۔

....

دونوں بہنیں بہ یک وقت گویا نیند سے بے دار ہُوئیں۔ ایک دُوسری کو پہچان کر حیران ہوگئیں۔

شاہدہ نے چائے دانی میں پتی ڈال کر پانی اُنڈیل دیا:

چائے پیو زرینہ!......

شاہدہ نے سوئی ہُوئی آواز میں کہا اور تازہ مکھن میں تلے ہوئے ٹوسٹ اُس کی طرف بڑھادیے۔

زرینہ نے ایک پیالی چائے بنائی اَور ایک دو گھونٹ ہی بھرے تھے کہ چچی آ گئیں۔ اُن کے پیچھے مَیلے کپڑے پہنے رجّو تھی جس کے سَر پر دُودھ سے چھلکا ہُوا ولٹوہا تھا۔

لڑکیو!......

چچی نے بڑی پاٹ دار آواز میں کہا:

گاؤں میں آئی ہو تو خالص دُودھ پیو، مکھن کھاؤ! گرم پانی پی پی کر کیوں اَپنا کلیجا جلا رہی ہو؟ رکھ دے ولٹوہا رجو!

چچی نے خود بڑھ کر رجو کے سَر سے ولٹوہا اُتارا اَور گھڑونچی پر رکھ دیا۔

رجو بیٹی! ذرا شہر کی اِن لڑکیوں کو اَپنا چہرہ تو دِکھا دو۔

چچی نے مسکرا کر کہا اَور رجو نے ملگجی چادر سے چہرے کو اَور بھی ڈھانپ لیا۔

شاہدہ نے کہا:

چچی جان! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ پہلے رجو کا تعارف تو کروا دیا ہوتا ہم سے!

رجو پچھلے سال سے یہیں میرے ہاں کام کرتی ہے۔ دو چار دِن ننھیال رہ کر کل شام آئی تھی۔ رجو! یہ شاہدہ اَور زرینہ ہیں۔ شہر سے آئی ہیں کہ گاؤں میں رہ کر ہَوا بدلیں، پر جب سے آئی ہیں گھر کی چار دیواری میں بند ہیں۔

چچی کے اِصرار پر رجو ایک پیڑھی پر بیٹھ گئی تو زرینہ نے کہا:

رجو! دِکھا دو نا چہرہ ہمیں۔

رجو اَور بھی سکڑ سمٹ گئی۔ شاہدہ نے چائے کی ایک پیالی بنا کر رجو کی طرف سرکا دی تو چچی نے کہا:

پی لے رجو! دیکھ لینا زیادہ گرم نہ ہو۔

رجو نے کھدّر کی چادر میں لپٹا ہُوا ہاتھ باہر نکالا تو شہر کی لڑکیاں حیران رہ گئیں۔ یہ بھرا بھرا، گورا ہاتھ تھا جس کے کھردرے پن میں گدرایا ہُوا حُسن تھا۔ لمبی لمبی نازک اُنگلیوں کی مخروطی پوریں سُرخ تھیں اَور ناخن برتن مانجھنے، آٹا گوندھنے اَور اُپلے تھاپنے کی وجہ سے کچھ بدرنگ سے اَور ٹوٹے ٹوٹے تھے اَور جب رجو نے شرماتے شرماتے چہرے سے چادر کا پلّو ہٹایا تو شاہدہ اَور زرینہ حیرت کے مارے دم بہ خود رہ گئیں۔ اِتنا صحّت مند چہرہ کہ جیسے تازہ تازہ لہو کا غازہ پھرا ہُوا ہو اَور گال جیسے اَنار کے پھُول اَور آنکھیں اگر کنول کے ساغر تھیں تو اُن میں شبنم سے دُھلے ہوئے چنبیلی کے پھُولوں کی مہک بھی تھی اَور سیاہ پلکیں سُرخ سُرخ گالوں پر یُوں گر رہی تھیں جیسے آگ کے ساتھ کھیل رہی ہوں اَور ابھی جَل جائیں گی۔

لڑکیو! دیکھو دُودھ اَور مکھن پر پلی ہُوئی جوانی کو۔ میری مانو تو اَب یہیں رہ جاؤ دونوں بہنیں۔ شاہدہ!

تم نے بارھویں کا اِمتحان پاس کر لیا ہے نا؟

جی چچی جان! اَور میں نے بی اے کے پہلے سال میں داخلہ بھی لے لیا ہے۔

کیا کروگی اِتنا پڑھ کر! یہیں گاؤں ہی میں تو......

یہ چچی کا بڑا پسندیدہ موضوع تھا۔

بے چاری شاہدہ نے بات کاٹ کر کہا:

چچی جان! اَب رجو روز آیا کرے گی نا؟

چائے پی کر شاہدہ اَور زرینہ صحن میں آگئیں۔ دو چار لمحے دُھوپ میں کھڑے ہو کر دونوں اَندر سے کرسیاں اُٹھا لائیں۔ کرسیاں بچھا کر دونوں بیٹھ گئیں تو زرینہ نے کہا:

شاہدہ! تم نے رجو کی شکل وصُورت میں کوئی مشابہت دیکھی؟

نہیں تو۔

سوچو...... تاریخِ ہندوستان کی کسی دِل آویز ہستی سے......

شاہدہ نے کچھ دیر سوچ کر کہا:

تمھارا اِشارہ نورجہاں کی طرف ہے نا؟

زرینہ نے اِثبات میں سَر ہلا دیا تو شاہدہ نے ذرا چڑ کر کہا:

بہت دُور کی کوڑی لائی ہو۔ کہاں نور جہاں، کہاں یہ گنوارن!

نہیں شاہدہ، تم اِنصاف سے کام نہیں لے رہیں!

زرینہ کی آنکھوں میں مدھم سی شرارت تھی۔

تم کیوں مسکرائیں زرینہ؟......

شاہدہ نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

یوں ہی...... شاید اِس لیے کہ تاریخ کی نورجہاں تو گلاب کی پنکھڑی سے بھی نازک تھی اَور عِطرِ گلاب کی موجد اَور یہ گاؤں کی نورجہاں، اُپلے تھاپنے کی ماہر اَور اِس کے کپڑوں سے کھٹی لسی کی بُو باس بھی آتی رہی......

زرینہ نے شوخی سے کہا۔

اِتنا مت اِتراؤ زرینہ! میں نے تو رجو کو دیکھ کر اِتنا احساسِ کمتری محسوس کیا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے اَور میں نے پہلی بار......

شاہدہ کچھ اَور کہنے ہی والی تھی کہ چچی اندر سے آگئیں۔ شاہدہ اُٹھی اَور کشیدہ کاری کا سامان لے آئی۔ زرینہ اندر سے ایک کتاب لا کر پڑھنے لگی۔ صحن میں گرم گرم دُھوپ کا گہرا سکون چھا گیا تھا۔ پائیں باغ کے کسی درخت پر ایک گلدم چہکنے لگا۔ اُس کی چہک میں نوخیز دُھوپ کا سیّال نغمہ تھا کہ قطرہ قطرہ ہو کر

گر رہا تھا جیسے آب شار کا دِھیما سا راگ ہو کہ دُھوپ اَور سایوں میں گم ہو ہو کر اُبھر رہا ہو۔

اچانک چچی نے کہا:

لو آ بھی گئے وہ۔

کون؟......

شاہدہ نے پوچھا۔

تمھارے چچا، پر اِتنی جلدی!......

نہیں چچی جان! یہ تو کامل بھائی ہیں۔

زرینہ نے کہا۔

شاہدہ کی اُنگلیوں میں سلائیاں رُک گئیں۔ کامل نے اٹیچی کیس فرش پر رکھتے ہُوئے کہا:

زرینہ تم؟......اَور شاہدہ!......آج تو کمال ہو گیا......میرے اِستقبال کے لیے......اَور میں شرپاتن سنگھ بھی نہیں کہ سوات کا کوئی مونٹ ایورسٹ ہی فتح کر کے لَوٹتا۔ میں اِتنے بڑے اِعزاز کے قابل کہاں تھا!

کامل بھائی! اِتنی بھی کسرِ نفسی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ خاکی سُوٹ میں شرپاتن سنگھ تو نہیں، البتہ برفانی ریچھ کے شکاری ضرور معلوم ہو رہے ہیں۔

زرینہ چہکی۔

شاہدہ!......

چچی نے شاہدہ کو محبّت بھری نظروں سے تکتے ہُوئے کہا:

تم نے کوئی بات نہیں کی۔

میں......چچی جان......میں تو سوچ رہی تھی کہ کامل آئیں گے تو اُن کے ایک کندھے پر بندوق لٹک رہی ہو گی اَور دُوسرے پر کیمرہ ہو گا۔

کیمرہ بڑے ٹرنک میں سٹیشن پر پڑا ہے۔ بندوق مَیں ساتھ لے کر ہی نہ گیا تھا۔ شاہدہ! مجھے افسوس ہے، تمھاری خواہش کے مطابق پورا نہ اُتر سکا۔

کامل نے ہنس کر کہا۔ زرینہ نے صحن میں ایک اَور کرسی بچھا دی۔ چچی باورچی خانے میں چلی گئیں اَور سردیوں کا خوش گوار دِن چٹکیوں میں بیتنے لگا۔ زرینہ چہک چہک کر باتیں کرتی رہی۔ شاہدہ خاموش رہ کر کن اکھیوں سے کامل کو دیکھتی رہی جیسے اِن بکھری بکھری جھلکیوں سے اُسے اپنے من میں بسا لینا چاہتی ہو۔

زرینہ نے کہا:

کامل بھائی! اگر آپ دو چار دِن نہ آتے تو شاہدہ باجی بیراگن بن کر سوات کی طرف نکل جاتیں۔

زرینہ!......

شاہدہ نے شرم اَور غصے سے پکار کر کہا۔

کامل کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔

کامل بھیا! مجھے تو ڈر تھا کہ پنجاب کی شاعری میں ایک اَور قصے کا اِضافہ ہو جاتا۔ قصہ کامل شاہدہ......

زرینہ کی شوخ نگاہوں میں شرارت کی پِسی ہُوئی بجلیاں تھیں لیکن کامل یکایک بجھ سا گیا۔

شاہدہ حجاب سے پکار کر کہنے لگی:

زرینہ جب سے گاؤں آئی ہے' آدھی رات کو دریچہ کھول کر ایک راگنی کا سواگت کرتی ہے۔

کون سا دریچہ؟......

کامل نے چَونک کر پوچھا۔

وہی جو پائیں باغ کی طرف کُھلتا ہے۔

یہ تو بڑی خطرناک بات ہے زرینہ!......

کامل نے چمک کر کہا:

اِس دریچے سے ساون کا پہلا جھونکا آتا ہے۔ اُس پر اَبرِ باراں کی نم دار پھُوار ہوتی ہے اَور اِنھیں آم اَور جامن کے کومل پتّوں سے پہلی بار کویل کی راگنی جنم لیتی ہے۔

بات ختم کر کے کامل چُپ چاپ اَپنے آپ میں کھو گیا۔

لڑکیو! کھانا تیار ہے۔ کامل کو بہت بھوک لگ رہی ہوگی......

چچی نے کہا اَور شاہدہ اُٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ زرینہ اَور کامل اکیلے رہ گئے تو ایک مدّت بعد کامل نے کہا:

زرینہ! جو کچھ شاہدہ نے کہا' سچ ہے؟

سچ!......

زرینہ نے حیران ہو کر کہا:

وہ تو ایک سپنا ہوتا ہے جو آنکھ کُھلتے ہی ٹُوٹ جاتا ہے۔

زرینہ! پائیں باغ کے اِس دریچے سے یہ راگنی ضرور در آتی ہے۔ میں نے تو یہ سپنا اُس وقت دیکھا تھا جب گھٹائیں اُمنڈی ہُوئی تھیں اَور آموں میں ٹپکا لگ رہا تھا اَور آدھی رات کو برہا کی ماری ایک کویل بھی کوک رہی تھی اَور سردیوں کی آدھی رات کا یہ سپنا!...... میں حیران ہُوں' یہ مدُھر سا سُر شبنم کی کسی بُوند پر تھرتھرایا ہوگا زرینہ؟

کامل نے زرینہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ زرینہ نے کانپ کر آنکھیں جُھکا لیں اَور دھیمے سے کہا:

یہ تو نیند کا ایک مذاق ہے کامل بھائی!

نہیں!......

کامل نے بڑے تیقّن سے کہا۔

کھانا کھالو کامل!

چچی نے باورچی خانے سے پکار کر کہا۔

کامل بادلِ ناخواستہ اُٹھا۔ کھانے کی میز پر بہت کم باتیں ہوئیں۔ تب کامل آرام کرنے کے لیے اَپنے کمرے میں چلا گیا اَور رجو میز پر سے برتن اکٹھے کرنے لگی۔ برآمدے میں آ کر شاہدہ نے زرینہ سے کہا:

میں حیران ہُوں زرینہ!

کس بات پر؟

رجو اِس گھر میں پچھلے سال سے کام کر رہی ہے لیکن اُس سے میز پر کھانا لگانے کا کام نہیں لیا جاتا۔

یہ کون سی حیرت کی بات ہے؟......

زرینہ نے جواب دیا۔

میں نے چچی سے ذِکر کیا تو وہ مسکرا کر کہنے لگیں، تمھارے کامل اِس بات کو پسند نہیں کرتے۔ اکثر باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھا لیتے ہیں......

شاہدہ نے کہا۔

اچھا ہے۔ کون سا اِتنا بڑا کنبہ ہے کہ ہر روز کھانے کا میز لگے۔ یوں بھی تو سادگی میں لطف ہے باجی!

لیکن رجو اِس گھر کی نوکرانی ہے زرینہ!

شاہدہ کے لہجے میں تھوڑی سی تلخی تھی۔

سہ پہر کی چائے پی کر چچی نے باورچی خانے کا کام رجو کو سونپا اَور شاہدہ اَور زرینہ کو ساتھ لے کر کنویں کی طرف روانہ ہوگئیں۔ کامل تھکا ہُوا تھا، ساتھ نہ جا سکا۔ جب وہ پھاٹک پر پہنچیں تو چچا بھی تحصیل سے آ گئے۔ اُن کے چہرے پر غصہ تھا۔ کہنے لگے:

بھئی لڑکیو! تمھیں سردیوں میں گاؤں آنے کی کیا سُوجھی؟ گرمیوں کی چھٹیوں میں آتیں تو ساون بھادوں کی جھڑی کا مزہ اُٹھاتیں۔ کامل میاں آ گئے؟

آ گئے۔

زرینہ نے کہا۔

اچھا ہُوا آ گئے۔ اِس سال بی اے کر لیں تو اُنھیں مال کے محکمے میں بھرتی کرا دُوں، خواہ پٹواری ہی کیوں نہ لگیں۔

نہیں پچا، وہ تو ایم اے میں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔

زرینہ نے کہا۔

نہیں جی! بڑے بھیا اِتنا پڑھ لکھ کر ارسطو بھی بن گئے تو ہمیں کیا! کالج میں پروفیسر ہونے سے تو بہتر تھا کہ محکمہ مال میں بھرتی ہوتے۔ آج کہیں ڈی سی نہیں تو مال افسر ضرور لگے ہوتے اور خاندان کا وقار......

چلو لڑکیو! شام پڑ رہی ہے......

چچی نے بات کاٹ کر کہا:

آج تمھارے پچا کو تحصیل میں کرسی نہیں ملی ہوگی۔

کنواں گاؤں سے ایک میل دُور تھا۔ گندم کی مخملیں وسعتیں دُور اُفق سے جا ملی تھیں۔ پگ ڈنڈی زرد زرد دُھوپ میں چمک چمک کر کجلا رہی تھی۔

لڑکیو! سردیوں کا دِن تو یُوں چٹکیوں میں گزر جاتا ہے۔ ہم نے دیر کر دی۔

چچی نے کہا۔

سردیوں کا دِن جُوں جُوں ڈھلتا ہے، طبیعت اُداس ہوتی چلی جاتی ہے۔

شاہدہ بولی۔

نہیں تو۔ ابھی ڈوبتے سُورج کا نظارہ تو دیکھنا، کتنا دِل فریب ہوگا!

زرینہ نے کہا۔

یکایک ایک طرف سے بانسری کے نغموں کی پھوار آئی تو چچی نے کہا:

وہ پاگل سا لڑکا احمد ہے۔ کچھ کام نہیں کرتا، سارا دِن بانسری مُنہ سے لگائے رہتا ہے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔

کماد کے کھیت کی اوٹ سے احمد یُوں اچانک سامنے آنکلا جیسے کوئی اَسرار ہو۔ اُس نے بانسری منہ سے ہٹا کر چچی کو سلام کیا۔ چچی نے ہنس کر پوچھا:

احمد، کیا کر رہے ہو؟

یوں ہی موج میلہ ماسی!

چچی کھِل کھِلا کر ہنس پڑیں اَور احمد پگ ڈنڈی سے ہٹ کر کماد کے کھیت میں کھڑا ہو گیا۔ چچی اُس کے پاس سے گزر گئیں، اُن کے بعد شاہدہ، موج میلہ سَر جھکائے کھڑا رہا۔ جب زرینہ پاس سے گزرنے لگی تو اُس نے آہستہ آہستہ سُر اُٹھایا اَور زرینہ یُوں ہی مسکرا پڑی۔ موج میلہ زرینہ کی اِس مسکراہٹ میں اُلجھ کر حیران ہو گیا۔ اُس نے زرینہ کی آنکھوں میں ڈری ڈری نگاہوں سے جھانک کر دیکھا تو زرینہ جھینپ سی گئی۔ یہ ایک منظر!......اَور پگ ڈنڈی کے پیچ وخم میں گہرائیاں اَور گیرائیاں پیدا ہو گئیں۔ اُس نے

ایک قدم آگے بڑھایا تو موج میلے کا ہیولا دُھندلا پڑ گیا اَور کماد کے کھیت کے متوازی پگ ڈنڈی کا ایک بل ختم ہُوا تو دُوسرے موڑ سے کامل بھیا کا سَراپا یُوں اُبھر آیا جیسے کالی گھٹا میں سے ایک سِتارہ' لیکن اُس میں آب و تاب تھی' زندگی اَور گرمی تھی۔ یہ تو ایک حقیقت تھی' خواب نہیں تھا۔ اِس پر تصوّر کی دُھندلاہٹ بھی نہیں تھی حالاں کہ کامل بھیا کو ابھی ابھی وہ گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی تو یہ ہیولا شام کے دُھندلکے میں تحلیل ہو گیا۔ ایک سَرد جھونکا آیا اَور اُس کے دوش پر نغمے کی ایک پھوار' اَور سردیوں کی اُداس شام نے اُس کے کان میں سرگوشی کی: ''زرینہ! یہ دُوسری بار ہے' تو نے موج میلے کی بانسری کی لے میں سے کامل بھائی کے سراپے کو تخلیق ہوتے دیکھا''۔

زرینہ!

شاہدہ نے دو قدم پیچھے آ کر اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا:

کیا سوچ رہی ہو؟

کچھ بھی نہیں شاہدہ۔

اَور دُور اُفق کی گولائیوں میں درختوں کے پیچھے سُورج ڈوب گیا اَور شفق پھُول کر گل و گلزار بن گئی اَور سَرسبز کھیتوں پر سنہری سایے لہرانے لگے۔ جب وہ کنویں سے لَوٹ کر آئیں تو اَندھیرا چھا چکا تھا اَور گاؤں میں دیوں کی ٹمٹماہٹیں تھیں۔

خوب سَیر رہی زرینہ؟

کامل نے' جو برآمدے میں کرسی بچھائے بیٹھا تھا' پُوچھا۔

خوب! رستے کے ایک موڑ پر موج میلے نے بانسری بجا کر ہمارا سواگت کیا۔

موج میلہ! وہ تو اِس گاؤں کا رانجھا ہے۔ میرا تو لنگوٹیا ہے۔ کہو تو کل اُس سے جی بھر کر بانسری سنیں!

نہیں......

زرینہ کی آواز تھرا گئی۔

نہیں!

کامل نے حیران ہو کر دُہرایا۔

....

اِس اَثنا میں شاہدہ نے ہر کمرے میں لیمپ روشن کر دیے۔ برآمدے میں روشنی کی کرنیں آئیں تو چچی بولیں:

شاہدہ کتنی سگھڑ بیٹی ہے۔ میں تو سدا کی پھوہڑ ہوں۔ شاہدہ اِس گھر میں آ گئی تو اِس کی کایا پلٹ کر رکھ دے گی۔

کھانے کی میز پر چچا اَور چچی کی موجودگی میں کوئی خاص باتیں نہ ہو سکیں۔ ڈرائنگ رُوم میں

دِھیمی سی روشنی تھی اَور یہاں کامل ایک چشمے کی طرح اُبل پڑا۔ سوات کے نظارے، چھوٹے چھوٹے لطیفے، ہلکی پھلکی سدا بہار کہانیاں۔ یکایک کامل خاموش ہوگیا، جیسے جھرنے کے مُنہ پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ ایک لطیفے کو ادھورا چھوڑ کر باورچی خانے میں چلا گیا تو شاہدہ نے اُداس لہجے میں کہا:

زرینہ! تمھیں کچھ عجیب سا احساس نہیں ہوتا۔

کیا؟

کامل کچھ بدل سے گئے ہیں۔

نہیں تو......

پھر میرا احساس غلط ہے۔

شاہدہ نے کہا اَور باورچی خانے سے چچی کی پاٹ دار آواز آئی۔

بیٹا کچھ دِنوں سے تیرے خیالات بدل گئے ہیں۔ رجو اِس گھر کی نوکرانی ہے۔ میں اُس کے ساتھ بڑی محبّت سے پیش آتی ہوں لیکن اُسے گھر کا ایک فرد کیسے سمجھ لوں! تم پسند کرو گے کہ تمھارے ساتھ ایک میز پر بیٹھ کر کھانا کھائے؟

یقیناً!

کامل نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔

یہ نیا تجربہ بھی کر لینا بچّے، پر پہلے رجو سے تو پوچھ لینا کہ وہ اِس کے لیے تیار بھی ہے یا نہیں!

کامل واپس آیا تو اُس کے چہرے پر جھوٹی مسکراہٹ کی پرچھائیاں تھیں۔

امّاں جان بھی کتنے پرانے خیالات کی عورت ہیں! اِنسان کو اِنسان نہیں سمجھتیں۔ کھانا کھا لینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے، وہ بے چاری رجو کے سَر پر رکھ کر اُسے چلتا کرتی ہیں۔

رجو!

شاہدہ کے ہونٹ مسکرانے کی کوشش میں کانپ کر رہ گئے اَور وہ ہونٹ بھینچ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

کامل بھیا! جب شاہدہ باجی نے پہلی بار رجو کو دیکھا تھا تو اُن کے پسینے چھُوٹ گئے تھے۔

سچ؟

کامل نے کھوئے کھوئے انداز میں پوچھا۔

کامل بھائی! آپ نے کبھی غور کیا، رجو کی شکل وصورت میں ایک خاص مشابہت ہے۔

نہیں......

تاریخِ ہندوستان کی ایک نہایت دِل فریب ہستی سے جس کا ایک ہاتھ پنگوڑا جھلاتا رہا اَور دُوسرا ہاتھ حکومت کی باگ پر رہا۔

کامل کافی دیر تک سوچتا رہا۔ تب اُس کی آنکھیں صبح کے ستارے کے مانند چمک کر روشن ہوگئیں۔

اُس نے وفورِ جذبات کے ساتھ کانپتے ہُوئے ہونٹوں سے کہا:

زرینہ! یہ اِلہام تمھیں کیسے ہوا؟

مجھے!

زرینہ نے حیرت بھری نگاہوں سے پوچھا۔

یہ تو میرے تخیل کی ادھوری سی تشبیہ تھی تمھیں اِتنے عظیم اَلفاظ کہاں سے مل گئے؟ زرینہ! تُو نے اِتنا اُونچا راز کیسے پالیا؟ میری رُوح مدّت سے اِس کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

کامل نے تیز تیز کہا۔ اُس کے لہجے میں بڑی گمبھیرتا تھی۔

کامل بھائی......

زرینہ نے عام لہجے میں کہا:

آپ تو بہت اُونچے اُڑ گئے۔ میں نے تو بڑی معمولی سی بات کی تھی......زمین کی بات!

....

رات بہت لمبی تھی!

شاہدہ حسبِ معمول صبح سویرے اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اُس نے پائیں باغ والی کھڑکی کھول دی۔ ٹھنڈی ہَوا کا ایک بھیگا جھونکا آیا تو زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ابھی کمرے میں گھپ اَندھیرا تھا۔ وہ کروٹ بدل کر پھر سوگئی۔ پھر اُس کی آنکھ کھلی تو کھڑکی میں سے صبح کی سُرخیاں جھلک رہی تھیں۔ وہ چادر اوڑھ کر برآمدے میں آئی تو کامل اُس کے اِنتظار میں کھڑا تھا۔

زرینہ! آج رات تو نے وہ سپنا دیکھا؟

کامل کے اِس اچانک سوال پر زرینہ کا تن بَدن تھرّا سا گیا:

میں نے کوئی سپنا نہیں دیکھا کامل بھائی!

سچ کہہ رہی ہو زرینہ؟

آپ کو یقین نہیں آرہا کامل بھائی!

زرینہ نے پُرسکوں لہجے میں کہا۔

یہ سُر یہ راگنی تو کسی بہت بڑے اِنقلاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ہوگی......لیکن میں نے تو کسی طوفان کو سَر اُٹھاتے نہیں دیکھا۔

یہ راگنی جب پہلی بار میری رُوح سے ہم کلام ہُوئی تھی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ آج میری زِندگی کا پہلا دِن شروع ہُوا ہے۔ دھیرے دھیرے یہ میرے رُوئیں رُوئیں میں رچ گئی۔ اَب یہ ایک گہرا دُکھ بن گئی ہے۔ میں اِس سے بھاگتا ہُوں۔ یہ دامن پکڑ کر میرے پیچھے بھاگتی ہے گویا یہ میرا سایہ ہو۔ میں اِس سایے سے نجات حاصل نہیں کرسکتا زرینہ!

میں ابھی اِس منزل پر نہیں پہنچی۔

زرینہ نے کامل کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

زرینہ! تم مجھے سمجھ سکتی ہو۔ میرا اَور تمھارا درد ایک ہے۔

زرینہ کے جسم کو ایک یخ بستہ لہر چھُو کر گزر گئی۔ اُس نے کپکپا کر کہا:

میں نہیں سمجھ سکتی کامل بھائی!

نہیں زرینہ! میں تم سے اِلتجا کرتا ہوں، مجھے ضرور سمجھنے کی کوشش کرو!

کامل نے بڑے خلوص سے کہا اَور زرینہ کی آنکھوں میں خوف کی ایک جھلک پیدا ہوگئی۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی:

نہیں کامل بھائی!

زرینہ! میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہُوں۔ اگر تم نے میرے دِل کا راز نہ سنا تو......

زرینہ نے باورچی خانے کی طرف قدم بڑھا لیے۔

کامل بھائی! شاہدہ باجی چائے تیار کر چکی ہوں گی۔ آیئے، ناشتہ کیجیے......

زرینہ نے کہا۔ اَور اِتنا کہہ کر بھاگ کھڑی ہوئی جیسے ابھی آتش فشاں پھٹ جائے گا، زمین کانپے گی، آسمان رُوئی کی طرح دھنکا دیا جائے گا اَور سِتاروں کی دُھول اُڑکر ساری دُنیا پر چھا جائے گی۔

....

ناشتے کے بعد کامل اُنھیں ساتھ لے کر گاؤں کے اِردگِرد گھومتا رہا۔ یہ دِن بڑا خوش گوار تھا۔ نرم گرم دُھوپ، کسی شاعر کے احساس کی طرح لطیف اَور منزّہ تھی۔ نالے کے کنارے، پائیں باغ میں، کنویں پر، کامل ہر جگہ اُن کی تصویریں لیتا رہا۔ نالے کے کنارے ایک ٹیلے پر موج میلے سے اُن کی مڈھ بھیڑ ہوگئی۔ کامل موج میلے کے ساتھ بڑی گرم جوشی سے پیش آیا۔ کامل نے موج میلے سے بانسری کی چند دھنیں سنانے کی فرمائش کی۔ زرینہ خوف زدہ ہو کر شاہدہ کے پیچھے چھُپ گئی۔ موج میلے نے ہنس کر کامل کو ٹال دیا۔ کامل اِصرار کرتا رہا اَور زرینہ کا دِل دھڑکتا رہا، جیسے موج میلے نے بانسری مُنہ سے لگائی تو آتش فشاں کا دہانہ پھٹ پڑے گا اَور وہ گھٹنوں کے بل گِر کر کامل بھائی کی پُوجا کرنے لگ پڑے گی لیکن موج میلہ مسکراہٹ کی آڑ میں اِنکار کرتا رہا۔ کامل ناگواری کا احساس لیے، اُنھیں ساتھ لے کر آگے بڑھ گیا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر زرینہ سیدھی اَپنے کمرے میں چلی گئی۔ بستر پر لیٹ کر وہ ایک کتاب پڑھنے لگی۔ پھر اُس کی آنکھ لگ گئی۔ نیند میں شفّاف دُھوپ کا سا سماں تھا لیکن اِس کے باوجود زرینہ کے خواب اُلجھے ہُوئے تھے۔ کچھ واضح نہیں تھا، جیسے خوابوں کی وادی میں سنہری دُھند چھائی ہُوئی ہو!

شاہدہ نے اُس کا کندھا ہِلا کر کہا:

چائے نہیں پیوگی زرینہ۔

یہیں بھیج دو رجو کے ہاتھ باجی!

زرینہ سوئی سوئی آواز میں بولی۔

رجو!......

شاہدہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا:

چچی اُسے ساتھ لے کر کنویں پر جا چکی ہیں۔

تو چلو میں تمھارے ساتھ باورچی خانے میں چلتی ہُوں!

زرینہ اُچک کر بستر میں سے نکلی۔

صحن میں زرد، اُداس سی دُھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

زرینہ! نہ جانے اِس دفعہ گاؤں میں میرا جی کیوں نہیں لگا؟ کیوں نہ کل ہم لَوٹ چلیں!

کامل بھائی کیا کہیں گے؟

وہ ہمیں نہیں روکیں گے۔ تم نے دیکھا نہیں، وہ کچھ بدل سے گئے ہیں!

نہیں تو......

زرینہ اَور کچھ نہ کہہ سکی۔

زرینہ! جب چچی کنویں پر جانے لگیں تو وہ صحن میں بیٹھے تھے۔ چچی کے جاتے ہی وہ بھی باہر نکل گئے۔

زرینہ کو اپنی رُوح میں ایک عجیب کھوکھلے پن کا احساس ہوا لیکن اُس نے مسکرا کر کہا:

شاہدہ باجی! محبت کے سفر میں ایسی منزلیں آیا کرتی ہیں۔ کبھی اندھیرے کبھی اُجالے!

شاہدہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی اُداس آنکھوں میں مسکراہٹ تھی اَور دھیرے دھیرے یہ مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگ گئی تو زرینہ شاہدہ سے لپٹ گئی:

میری پگلی باجی!

اَور شاہدہ سے لپٹے لپٹے ماحول پر خوابوں کے دُھندلکے چھا گئے۔ ایک دُھواں سا بکھر گیا اَور اُس کے ایک مرغولے سے کامل بھیا کا سراپا دھیرے دھیرے تشکیل پانے لگا تو زرینہ نے کانپ کر شاہدہ کو چھوڑ دیا۔ اُس نے سوچا: ''مجھے کیا ہو گیا ہے! میں کامل بھائی کو کس رُوپ میں دیکھنے لگ پڑی ہوں۔ شاہدہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہمیں یہاں سے چلے جانا چاہیے''۔

....

دھیرے دھیرے ایک اَور دِن بیت گیا۔

ایک اَور رات آگئی۔ آج اُسے بہت دیر کے بعد نیند آئی اَور نیند کی دیوی نے ابھی جادُو کا آنچل پھیلایا بھی نہ تھا کہ رُوح کے دریچے پر اُسی دِھیمے سے سُرنے دستک دی۔ اُس نے لپک کر سرھانے کی کھڑکی کھول دی۔ پائیں باغ میں خوابوں کا گہرا سکون تھا۔ تب اَندھیرے میں ایک سرسراہٹ ہوئی اَور دُور سے ہَوا کے ایک جھونکے کے ساتھ بانسری کا ایک نرم خرام نغمہ بھیگ بھیگ کر اَندر آیا۔ اُس نے کھڑکی بند کردی اَور تکیے پر سَر رکھ دیا۔ تکیے کا ٹھنڈا لمس نیند کا گہرا خمار بن گیا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو اُس کا کلیجا دَھک سے رہ گیا۔ کامل اُس کے بستر کے ساتھ ساکت و صامت کھڑے تھے۔ شاہدہ باجی کا بستر خالی تھا۔

ابھی کامل کے ہونٹ کھلے بھی نہ تھے کہ زرینہ نے کہا:

کامل بھائی! آج رات اُس راگنی نے پھر میرے خواب محل کے دریچے پر دستک دی۔

سچ؟

کامل کے لہجے میں مسرّت کی کھنک تھی۔

ہاں ......نہیں......

زرینہ تذبذب میں پڑگئی:

یہ تو ایک پریشان خواب تھا۔

میں نے بھی پہلے اِسے پریشان سپنا سمجھا تھا' پر جب میں نے اِس کی تعبیر دیکھی تو میری دُنیا لرز اُٹھی۔

تعبیر!......کون سی تعبیر؟......

زرینہ نے نڈھال سی آواز میں پوچھا۔

یہ تعبیر ایک خوف ناک حقیقت بن کر آئی زرینہ! میں نے صدیوں کی روایات کے محلوں کو دھڑام سے گرتے دیکھا۔ اَب میں آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہوں۔

میں نہیں سمجھی۔

تم سمجھنے کی کوشش کرو زرینہ! میں صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں۔

نہیں......

زرینہ! میرے خواب کی تعبیر رجو ہے۔

رجو؟

زرینہ نے کانپ کر کہا۔

یہ وہی راگنی ہے جو میری رُوح کے دریچے پر دستک دیتی تھی۔ اَور وہ میری رُوح میں رچ گئی ہے۔

زرینہ کے ہونٹ خشک ہوگئے۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھیں حیرت سے لبریز کنول بن گئیں۔

میں نے راز اِفشا کردیا ہے میرے دِل سے بوجھ اُتر گیا ہے۔ زرینہ! مجھے اُمید ہے تم مجھے سمجھنے کی کوشش کروگی۔

میرا اَور تمھارا درد ایک ہے۔ مجھے شاہدہ کے جذبات کا بڑا احساس ہے۔ میں جانتا ہُوں، دِل کا نازک آبگینہ ٹوٹ جائے تو دُنیا کی ساری مدھر راگنیاں اپنی موت آپ مَر جاتی ہیں لیکن اُن کی راکھ سے ایک نیا نغمہ بھی جنم لیتا ہے۔

کامل اِتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

زرینہ بُت بنے بستر پر بیٹھی رہی۔ کمرے کی فضا سرد اَور منجمد سی تھی۔ نہ جانے کہاں سے ایک شعلہ لپکا۔ زرینہ نے شرارے اَور اَنگارے اُڑتے دیکھے۔ دو شرارے اُس کی آنکھوں میں آگرے تو وہ دہکتے ہوئے سُورج بن گئیں۔ اُس کا چہرہ تمتمایا اَور کنپٹیوں سے دھماکے اُٹھے۔

کامل نے کمرے سے نکلنے کے لیے قدم بڑھایا تو زرینہ نے تھرتھرائی ہُوئی آواز میں کہا:

کامل بھائی! خواب دیکھنے کے بعد آج رات مَیں اچانک جاگ اُٹھی تو میں نے کھڑکی کھول دی۔ پھر میں نے جاگتے میں ایک اَور سپنا دیکھا۔ میں نے بھیگے ہُوئے جھونکے پر بانسری کا ایک نغمہ سُنا۔

بانسری کا نغمہ؟

کامل چَونک اُٹھا۔

بانسری کا نغمہ جو دُور، بہت دُور سے آرہا تھا۔ اُس میں کسی کے دِل کا درد بھی تھا۔

آدھی رات کو بانسری پر کس نے نغمۂ محبّت جگایا؟

میں نہیں جانتی۔ یہ نغمہ ہَوا کے دوش پر آیا تھا۔ دیکھیے کامل بھائی! میں نے اَپنا راز کہہ دیا۔ میرا اَور آپ کا درد ایک ہے۔ آپ اَور صرف آپ مجھے سمجھ سکتے تھے۔

نہیں ...... ہاں ......

کامل نے لکنت کے سے اَنداز میں کہا۔

دیکھیے کامل بھائی!......

زرینہ نے اُس کا دامن پکڑ کر کہا:

مجھے سمجھیے!

میں نہیں سمجھنا چاہتا۔ تم روایات سے باغی ہو۔ آج تک ہمارے خاندان کی کسی لڑکی نے اِس قسم کا نغمہ نہیں سُنا۔ یہ کون تھا جس نے تجھے بانسری پر پکارنے کی جرأت کی؟

کامل نے غصے سے لرز کر پوچھا۔

نہ جانے کون؟ یہ آپ کے گاؤں میں اِتنی مدھر بانسری کون بجاتا ہے کامل بھائی!

وہ پگلا ...... وہ موج میلہ ......

کامل بجھ کر رہ گیا۔

کون جانے......شاید......میرے خوابوں کی تعبیر......

زرینہ!......

غصے کے مارے کامل کی آواز گلے میں اٹک کر رہ گئی:

ہمارے خاندان میں......

اُور کامل جملے کو نامکمل چھوڑ کر شاہدہ کی چار پائی پر گر گیا۔ زرینہ مسکرائی۔ یک لخت اُس کی آنکھیں چمکیں۔ دوسرے لمحے کمرے کے ماحول پر دُھند سی چھاگئی۔ کامل کا سَراپا اُس میں تحلیل ہوگیا۔ دُھند کے غبار سے ایک نئے کامل کا ہیولا دھیرے دھیرے تخلیق کی سب منزلیں طے کر گیا۔ کامل کے ہونٹوں پر بانسری تھی اُور اُس سے نغمے ٹپک رہے تھے......ٹپ ٹپ جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ رہی ہو۔ یہ نغماتِ مسلسل، یہ راگنیوں کا جلوس، اُور زرینہ کا دُکھ نغموں کو تال دے رہا تھا......

کیوں؟ زرینہ! کوئی خواب دیکھ رہی ہو؟

زرینہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کے سامنے شاہدہ کھڑی تھی۔ اُس کے انگ انگ سے بہار کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ کامل کمرے میں موجود نہ تھا۔

نہیں تو شاہدہ!

زرینہ دِھیمے سے بولی۔

کیوں شاہدہ؟ یہ کیا مذاق ہے؟ امّی جان کہہ رہی ہیں، تم گاؤں سے جانے کے لیے پَر تول رہی ہو۔ ابھی تو چھٹیاں باقی ہیں۔ میں ابھی نہیں جانے دُوں گا۔

کامل برآمدے میں سے چہکے۔

زرینہ نے شال اوڑھی اُور کمرے سے باہر نکلنے کے لیے بڑھی تو کامل بھائی چپکے سے اَندر آگئے اُور اُس سے بے نیاز ہوکر آگے بڑھ گئے۔ زرینہ ایک لمحے کے لیے رُک گئی اُور سپنوں کا دریچہ کھٹ سے بند ہوگیا۔

چچی نے باورچی خانے سے پکار کر کہا:

لڑکیو! پانی اُبل رہا ہے۔ آجاؤ چائے تیار کرلو۔

شاہدہ اَندر سے بولی:

جاؤ زرینہ! پتّی ڈال آؤ چائے دانی میں۔ اُور رجو سے کہنا، وہ چائے کے لیے میز لگائے۔ آخر وہ اِس گھر کی نوکرانی ہے۔ اُسے کچھ تو سلیقہ آنا چاہیے!

زرینہ مسکرائی۔ بڑی پُراَسرار لطیف سی مسکراہٹ......سرما کے ڈُوبتے ہوئے سُورج کی ایک کِرن جو سیاہ اَبر پارے کی گرفت سے نکلنے کی کشمکش میں مصروف ہو!

☆☆☆

شاطی

پلیٹ فارم پر بڑی چہل پہل تھی۔

اِس کے باوجود اٰمِینہ بڑی اُداس تھی۔ سیاہ بُرقع میں لپٹی لپٹائی وہ بنچ کے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اُس کے پاس بیٹھی ہُوئی عورت بھی سیاہ بُرقع پہنے ہوئے تھی۔ دونوں کے درمیان ڈیڑھ دو سال کا بچّہ حائل تھا جو ماں کے ساتھ ٹیک لگائے سو رہا تھا۔ بنچ کے باقی ماندہ حصے پر تین چار بچّے بیٹھے تھے۔ بنچ کے سامنے فرش پر دوؔ سُوٹ کیس رکھے تھے اَور دو تین گٹھریاں بکھری ہُوئی تھیں۔ سُوٹ کیسوں اَور گٹھڑیوں پر بھی دو چار بچّے براجمان تھے۔ ایک بچّے کی سُوکھی سُوکھی ٹانگیں بُرقع سے باہر تھیں اَور بُرقع کے اَندر سے چسر چسر کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ سب بچوں سے بڑی ایک تیرہ چودہ سال کی لڑکی تھی جو اِن بچّوں کی نگرانی کر رہی تھی۔ کوئی بچّہ گٹھریوں اَور سُوٹ کیسوں کے حِصار سے دو قدم آگے بڑھتا تو یہ لڑکی بے زار سے لہجے میں پکار کر کہتی:

خالد! کہاں چلے؟ امّی! اِس خالد کے بچّے کو سمجھاؤ نا! یہ ایک منٹ کے لیے نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔

میں کیا کروں شمّو! تم اِنھیں سنبھال کر رکھو نا!

اُس کی امّی تھکی تھکی خواب آلود آواز میں جواب دیتی۔

پلیٹ فارم پر ٹیوبوں کی زرد زرد روشنی تھی۔ یہ زرد زرد روشنی بڑی اُداس سی تھی۔ اٰمِینہ کو اَپنے ساتھ کے بچّے کے معصوم چہرے پر زردی اَور اُداسی کا یہ اِمتزاج بڑا دِل گداز محسوس ہُوا۔ وہ کن اکھیوں سے بچے کو دیکھتی رہی۔ اُسے یہ بچّہ اَپنے باقی بہن بھائیوں سے کچھ انوکھا لگا۔ اُس کے چہرے سے ذہانت کا اِظہار ہو رہا تھا۔ اُس کی کشادہ پیشانی پر سیاہ سیاہ بال جھکے ہوئے تھے اَور اُس کی سُونی سُونی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اٰمِینہ کا جی چاہا کہ اُس بچّے کو اُٹھا کر اَپنی گرم گرم گود میں رکھ لے اَور جھکے جھکے بال ہٹا کر پیشانی چُوم لے!

اٰمِینہ کی آنکھ سے آنسو ٹپک پڑے۔

اُسے اَپنا اِکلوتا بچّہ یاد آیا جو اَپریشن کے بعد پَیدا ہُوا تھا۔ اٰمِینہ نے اَپنے پہلو میں لیٹے ہوئے اُس

گل گوتھنے بچّے کو ایک نظر دیکھا اور مامتا اُس کرب کو بھول گئی تھی جو اُس بچّے کی تخلیق کے ساتھ توَام بن کر آیا تھا اور وہ بچّہ جس کا ابھی نام بھی نہ رکھا گیا تھا' اُس کے پہلو میں لیٹے لیٹے دم توڑ گیا تھا۔

اُس کی کوکھ اُجڑ گئی تھی اور اُجڑی ہُوئی کوکھ دوبارہ آباد نہ ہوسکی تھی اور آج کاتبِ تقدیر نے تین سال بعد اِس شہر کی سب سے بڑی لیڈی ڈاکٹر کے الفاظ میں اُس کی تقدیر کا آخری فیصلہ سُنا دیا تھا:

یہ کوکھ اَب ہَری نہیں ہوسکتی!

اَمینہ نے احسن کو آتے دیکھا تو جلدی جلدی آنسو پُونچھ ڈالے۔

احسن نے اَمینہ کی طرف ایک لفافہ بڑھاتے ہُوئے کہا:

گاڑی ابھی دس پندرہ منٹ میں آیا چاہتی ہے۔

اَمینہ نے لفافہ بنچ کے ایک کونے پر رکھ دیا تو احسن نے مسکرا کر کہا:

جانِ من! یہ لفافہ سنبھال کر رکھنے کے لیے نہیں ہے۔ تم نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔ بس میری خاطر دو چار نوالے کھالو!

اَمینہ نے انگوروں کا ایک گُچھّا نکال کر ہاتھ میں لے لیا۔ آخر موسم کے رس بھرے انگور' زرد زرد روشنی میں بہت بھلے لگ رہے تھے۔ اَمینہ نے ایک دانہ مُنہ میں رکھ لیا تو احسن وہاں سے ہٹ گیا۔ اَمینہ نے دوسرا دانہ مُنہ میں رکھا تو اُس بچّے نے آنکھیں کھول دیں' سوئی سوئی آنکھوں میں بے داری کا احساس یُوں دھیرے دھیرے جاگا جیسے دُھند سے چاند نکل رہا ہو...... جاگی ہوئی پہلی نظر انگور کے سنہری خوشے پر پڑی اور چمک اُٹھی لیکن اُس چمک میں لالچ کی آلائش نہ تھی' اچانک مسرّت کا اُجالا تھا جو ہر خوب صُورت چیز کو دیکھ کر چھا جایا کرتا ہے۔ اَمینہ کو یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس کی کوکھ ہَری ہو رہی ہو اور اُس کی چھاتیوں میں دُودھ اُتر رہا ہو!

اُس نے انگوروں کا گُچھّا بچّے کی طرف بڑھاتے ہُوئے کہا:

ننھے لوگے؟

بچہ سکڑ سمٹ کر اپنی ماں کے کندھے سے چِپک گیا۔ اَمینہ کو دُودھ کا سرچشمہ خشک ہوتے ہوئے محسوس ہُوا۔

اُس نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا:

لے لو نا!

بچے کی ماں نے آواز سُنی اور اَمینہ کی طرف دیکھا۔ پھر اُس نے کہا:

شاطی لے لو!

بچے نے انگور کے گچھے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آمینہ نے ایک دانہ توڑا تو چند دانے فرش پر گِر کر لڑھکنے لگے۔ بچہ مسکرا اُٹھا۔ یہ بڑی دِل فریب مسکراہٹ تھی۔ آمینہ گچھے میں سے دانے توڑ توڑ کر بچّے کے مُنہ میں ڈالنے لگی۔ دوسرے بچّوں نے للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھا تو آمینہ نے لفافے کے باقی انگور اُن میں بانٹ دیے۔

شاطی آمینہ کے ہاتھ سے ایک ایک کر کے انگور کھاتا رہا اور تھوڑا تھوڑا اُس کی طرف سرکتا رہا۔ جب وہ سیر ہو گیا تو اُس کی آنکھیں مُندھ گئیں اور اُس کا سَر آمینہ کے پہلو سے لگ گیا۔ اُس ایک لمس پر مامتا جُھوم جُھوم گئی اور ایک لمحے میں سینکڑوں فردوس آباد ہو گئے۔

گرڑڑ...... گرڑڑ...... گرڑڑ۔

پلیٹ فارم لرز گیا۔ شورِ قیامت بپا ہو گیا۔ آمینہ چونک کر جاگ اُٹھی۔ پھر اُس بڑے کنبے کا مالک ایک قلی کو لے کر آ گیا۔ اُس کے آتے ہی ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ بچّے ہڑبڑا کر اُٹھے۔ اُس نے تیز تیز لہجے میں ہدایات اور احکام کی بوچھار کر دی:

جلدی کرو بھئی جلدی! اُٹھو شمّو، بچّوں کو سنبھالو۔ عائشہ! تم تو جہاں بیٹھو گی، سو جاؤ گی۔ ماں اور باپ دونوں کا فرض مَیں ہی ادا کرنے کے لیے باقی رہ گیا ہُوں۔ تم کہاں جا رہے ہو خلیل؟ عِرفان کے بچّے اِدھر آؤ! ارے بھائی اُٹھاؤ سامان، کھڑے مُنہ کیا تک رہے ہو! تمھیں جُوتیاں نہیں مِل رہی ہیں خالدہ! اَب تم پلیٹ فارم پر ٹاپتی رہو اور ہم گاڑی میں سوار ہوتے ہیں۔ لو جی! ننھے نے بھی چِیں چِیں شروع کر دی، ایک آپ ہی کی تو کسر باقی رہ گئی تھی۔ میں اِتنے بڑے اِس کنبے کو کیسے سنبھال سکوں گا! تم اَپنا بوجھ اُٹھانے کے قابل بھی نہ ہو سکیں جی! اِتنے بچّوں کا لاؤ لشکر اور اکیلی میری جان......

احسن نے کہا:

اُٹھو آمینہ!

آمینہ نے کہا:

بہن، ننھے کو سنبھالو!

اِنٹر کلاس کے زنانہ ڈِبّے میں تِل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔ قلی پلیٹ فارم کا سارا سامان اِسی ڈِبے میں پھینکتے رہے، اُوپر سامان؛ نیچے سامان؛ سانس لینا بھی دوبھر ہو گیا۔ گاڑی چلی تو ہَوا کے چند جھونکے آئے اور آمینہ کا سانس بحال ہُوا۔ اُس نے ڈِبے میں نظر دوڑائی۔ اُس کے قدموں پر گٹھریاں بکھری ہوئی تھیں۔ اُس کے پاس وُہی پلیٹ فارم والی عورت بیٹھی ہُوئی تھی اور اُن دونوں کے درمیان وہ بچّہ حائل تھا جو ماں کے بُرقع کو مٹھی میں پکڑے، اَدھ کھلی آنکھوں کے ساتھ خواب دیکھ رہا تھا۔

آمینہ کی خوشی کی کوئی اِنتہا نہ رہی!

گاڑی فرّاٹے بھرنے لگی۔ ہَوا کے جھونکوں میں خنکی آ گئی۔ اَمینہ کو کپکپی سی آئی تو اُس نے کھڑکی بند کردی۔ آہستہ آہستہ نیند پورے ڈبے پر چھانے لگی۔ وہ عورتیں جو مسلسل چڑچڑ کر رہی تھیں' اَب آہستہ آہستہ خاموش ہونے لگی تھیں۔ اُس کے ساتھ والی عورت اُونگھ رہی تھی اَور دم بہ دم بُرقع کو اَپنے گِرد لپیٹ رہی تھی۔ ننھا شاطی گہری نیند سو گیا تھا۔ اَمینہ کا جی چاہا کہ اُسے اَپنے بُرقع کی لپیٹ میں لے کر سینے سے چمٹا لے۔ ننھی جان کو سَردی لگ رہی ہوگی۔ شاطی اُن دونوں کے درمیان گُھٹ کر رہ گیا تھا۔ اَمینہ نے اَپنے بُرقع کی تہوں کو کھولا اَور پلّو بچّے کی ٹانگوں پر ڈال دیا۔

اَمینہ تھوڑا سا بچّے کی طرف سَرکی۔ بُرقع کی تہوں میں سے اُس نے بچّے کے جسم کے لمس کو محسوس کیا تو مامتا پھر بے دار ہوگئی۔

یہ کوکھ جلی مامتا!

اُس نے بُرقع میں مُنہ چھپالیا۔ آنسوؤں کی دُھند پھیلی اَور غم کے سایے گہرے ہوگئے۔ ڈِبے میں جلنے والے قمقمے گویا اَز خود بُجھ گئے۔ رات کے کھوکھلے اَندھیارے لپکے اَور اَمینہ نے محسوس کیا جیسے زندگی پر مَوت کی پرچھائیاں مسلّط ہو رہی ہوں!

موت کی بے چاند وادی میں برفانی ہَوا کے جھکّڑ چل رہے تھے!

برفانی ہَوا کے کندھوں پر تاریکیوں کے اَبر پارے دوڑ رہے تھے۔ اُن اَبر پاروں میں بجلیوں کی چمک نہیں تھی' بجلیوں کا لمس ضرور تھا اَور اَمینہ ایک ننھے سے خیمے میں قید تھی۔ اُس کے ساتھ مَوت' اُس کی ہمجولی بنے بیٹھی تھی۔ اَندر سَردی تھی' باہر سَردی تھی۔ خیمے کے پردوں میں بے آواز سرسراہٹ تھی۔ پردے کا ایک کونا ہِلا۔ ایک ننھی سی آواز نے پکارا!

میں اَندل آجاؤں امّی!

نہیں ......

اَمینہ نے کانپ کر کہا:

اندر مَوت ہے' تم باہر زندگی کی روشنی میں کھیلو!

نہیں امّیٔ باہل بوت سَلدی ہے۔ مجھے اَندل آجانے دو نا!

نہیں میرے لال۔

ایک ننھی سی اُنگلی نے پردہ سَرکایا۔ ایک چاند جیسی پیشانی پر جھکے جھکے کالے بال لہرائے اَور صبح کا ستارہ چمکا۔ موت ڈر کر بھاگ گئی۔ رات ڈر کر بھاگ گئی۔

...... بچّہ دوڑ کر آیا۔ اُس کی چھاتی سے چمٹ گیا اور گہری نیند بن کر اُس کے گوشت پوست اور خون میں تحلیل ہو گیا......

احسن نے اُسے کندھے سے ہلا کر کہا:

اُٹھو اٰمینہ! اپنا سٹیشن آ گیا۔

اٰمینہ نے آنکھیں کھولیں۔ چند لحظوں تک اُس کی نظریں خالی خالی سی رہیں۔ پھر بے داری کا ایک ریلا آیا۔ اِنٹر کا وہ ڈِبّا، جہاں پہلے تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی، اَب خالی تھا۔ دو چار مُسافِر عورتیں باقی رہ گئی تھیں جو اُونگھ رہی تھیں۔

اٰمینہ نے اُٹھنا چاہا تو اُسے جھٹکا سا لگا۔

خوابوں کا بچّہ اُس کی چھاتی سے لگ کر گہری نیند سویا ہُوا تھا۔

اٰمینہ کا رنگ زرد ہو گیا اور اُس کا رُواں رُواں تھر تھر کانپا۔

اٰمینہ بھئی! اِتنی گہری نیند۔ گاڑی چل پڑی تو چلتی گاڑی سے کیسے اُترو گی؟

اٰمینہ نے بیٹھے بیٹھے بُرقع دُرست کیا اور گاڑی سے اُتر گئی۔

....

تانگے والے کو رُخصت کر کے احسن نے گھر کا دروازہ کھولا۔ اَندر جا کر کمروں کی بجلی جلائی۔ اٰمینہ چار پائی پر بیٹھ گئی تو احسن نے کہا:

میں رستے سے پھل خرید لایا ہُوں۔ کچھ کھا لو اٰمینہ!

نہیں!

اٰمینہ نے عجیب سے لہجے میں جواب دیا۔

پھر بستر بچھا لو اور سو جاؤ! تم بہت تھک چکی ہو۔ میں جانتا ہوں تمھیں آج بہت بڑا غم ہے۔ میں......

نہیں!

نہیں؟

احسن نے حیران ہو کر پُوچھا۔

اٰمینہ نے مسکرا کر سَر ہِلا دیا۔ اِس مسکراہٹ میں احسن کو مسکراہٹ کا دُھندلا سا نقش نظر آیا جس نے حجلۂ عروسی میں تخلیق کی پہلی رات اُس کا خیر مَقدم کیا تھا۔ احسن نے مسرت سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا:

اٰمینہ! میں تمھارے غم کا ساتھی ہُوں، ہم دونوں مل کر اِس غم کی گردن توڑ دیں گے۔

احسن! مجھے کوئی غم نہیں۔

احسن پھر حیران ہوگیا۔ اٰمینہ مسکرائی اور مسکراتی رہی، حتیٰ کہ اُس کے زرد چہرے پر گلابی رنگ آ گیا اور اُس کے گالوں میں ننھے ننھے دیے روشن ہوگئے...... وہ روشن نقطے جو اٰمینہ کی دوشیزگی کی سنہری یادگاریں تھیں۔

احسن نے جھوم کر کہا:

اٰمینہ! مجھے کھوئی ہُوئی دولت مل گئی۔ اُٹھو! برقع اُتار دو۔ میں تمھارا بستر لگاتا ہُوں۔

اٰمینہ نے اُٹھ کر بُرقع اُتارا۔

احسن ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

یہ...... یہ...... بچّہ! ...... اٰمینہ......

اٰمینہ مسکرا مسکرا کر اُسے تکتی رہی۔

یہ بچّہ تمھیں کہاں سے مِلا اٰمینہ؟

اٰمینہ کے چہرے پر مسکراہٹ منجمد ہوگئی۔

تم اِس بچّے کو چُرا لائیں اٰمینہ؟ عالم پُور کے سٹیشن پر گاڑی اِتنا عرصہ کھڑی رہی۔ پولیس نے تمھارے ڈبے کا کونا کونا چھان مارا۔ تم اِس بچّے کو بُرقع میں چھپائے بیٹھی رہیں۔ اٰمینہ بولو! تم نے یہ بچّہ کیوں چرایا، کیوں چرایا؟ بولو اٰمینہ!

احسن نے اٰمینہ کو کندھے سے پکڑ کر زور سے جھنجھوڑا۔ اٰمینہ نے بچّے کو سینے سے چمٹا لیا اور کچھ نہ بولی۔ البتہ اُس کا چہرہ یک دم مُرجھا گیا۔ گالوں کے دیے ٹمٹما کر بُجھ گئے۔ وہ سُوکھے پتّے کی طرح کانپی اور بچّے کو لیے پلنگ پر گر پڑی۔ آہستہ آہستہ اُس کی آنکھوں میں بے حسی چھاگئی اور ہَولے ہَولے بچّے نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ کچھ لمحے خلا میں گھورتا رہا۔ پھر اُس نے احسن کو دیکھ کر بازو پھیلا دیے:

اَبّا!

نہیں، میں تمھارا اَبّا نہیں!

اَبّا...... اَبّا......

احسن نے کانوں میں اُنگلیاں دے لیں اور وحشت زدہ ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا سٹیشن پر پہنچا۔ اُس نے چھُوٹتے ہی سٹیشن ماسٹر سے کہا:

عالم پُور کے سٹیشن ماسٹر کو اِطلاع دے دیجیے گا کہ وہ بچّہ مل گیا ہے جس کی وہاں تلاش ہو رہی تھی۔

میں نہیں سمجھا۔ آپ گھبرائے ہُوئے ہیں۔ ذرا بیٹھ کر سکون سے بات کیجیے!

احسن کے حواس بحال ہُوئے تو اُس نے عالم پُور کے سٹیشن پر گاڑی کے رُکنے اور بچّے کی تلاش کا ذِکر کیا۔ پھر اَپنے بچّے کے مَرنے اور اٰمینہ کے بانجھ ہو جانے کی داستاں بیان کی اور آخر میں کہا:

معلوم ہوتا ہے کہ اَمینہ پاگل ہو چکی تھی جب اُس نے بچّے کو چرایا۔ میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔

احسن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

دیر بعد عالَم پُور کے سٹیشن ماسٹر نے اِطلاع دی کہ بچّے کے والدین کا کچھ اَتا پتا معلوم نہیں۔ البتہ یہ بچّہ عالَم پُور سے پچھلے سٹیشن نظام پُور پر گم ہُوا تھا۔

....

اَمینہ بچّے کو پہلو میں لِٹائے گہری نیند سو رہی تھی!

احسن نے دیکھا کہ اُس کے چہرے پر سرشار ممتا کا مدھ بھرا کیف چھایا ہُوا تھا۔ وہ اُسے جگانے کی جرأت نہ کر سکا۔ البتہ اُسے نیند نہ آ سکی۔ مُنہ اندھیرے اُٹھ کر اَمینہ نے بجلی جلائی۔ روشنی میں احسن نے محسوس کیا کہ یہ پہلے کی اَمینہ نہیں تھی۔ وہ اَمینہ مَر چکی تھی۔ ایک نئی اَمینہ زِندہ ہو گئی تھی۔ گویا زندگی نے مکمل طور پر اَپنی ہیئت تبدیل کر لی تھی۔

احسن نے بڑے نرم لہجے میں پوچھا:

امینہ یہ بچّہ تمھیں کیسے مِلا؟ سچ سچ بتا دو نا!

اَمینہ نے بڑے سکون سے مسکرا کر کہا:

میں اَپنے خیمے میں بیٹھی تھی۔ اَندر سَردی تھی۔ باہر برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میرے بچّے نے خیمے کا کونا سَرکا کر پوچھا: امّی باہر بہت سَردی ہے، مجھے اَندر آ جانے دو نا! میں نے اُسے روکا، پر میرا لال خود بہ خود اَندر چلا آیا۔

اَمینہ نے سوئے ہُوئے بچّے کی بلائیں لے کر کہا:

آپ کھڑے میرا مُنہ کیا تک رہے ہیں؟ جایئے نا، دودھ لایئے! میرا لال ابھی جاگے گا تو اُسے بھوک لگ رہی ہوگی۔

احسن نے مُنہ پھیر لیا۔ کمرے سے باہر نکل کر وہ خوب رویا۔ وہ دیر تک باہر کھڑا رہا۔ یکایک ایک خیال تیر کی طرح سَنسناتا ہُوا آیا اَور شبنم کی بُوند بن کر اُس کے دِل پر ٹپک گیا۔

اَمینہ نے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ بچّہ اُس نے چُرایا نہیں۔ اِس بچّے کو سَردی لگی تو اَمینہ کے بُرقع کا کونا اُٹھا کر خود بہ خود اُس میں گھُس آیا۔ اَمینہ اِس حقیقت کو خواب سمجھتی رہی اَور گہری نیند سو گئی۔

احسن نے ملک کے سارے اَخباروں میں اِشتہار دے دیے۔

....

اَمینہ دِن رات بچّے کی دیکھ بھال کرتی۔

اُس نے مشین پر کئی جوڑے سیے اَور دِن میں دو دو تین تین بار اُسے نئے کپڑے پہناتی اَور احسن کے آرام کا بھی پُورا پُورا خیال رکھتی۔

ایک دِن۔۔۔۔۔۔ دو دِن۔۔۔۔۔۔ تین دِن۔۔۔۔۔۔

بچہ امّی امّی کہہ کر اَمینہ کے پیچھے بھاگتا پھرتا۔ اَمینہ کے چہرے پر ہلکا ہلکا گلابی رنگ عَود کر آتا۔ اَمینہ کے انگ انگ سے ممتا کی شراب ٹپکتی محسوس ہوتی۔

احسن سوچتا: "اشتہار بچّے کے والدین کی نگاہ سے گزر گیا تو کیا ہوگا۔ اَمینہ کایا پلٹ کر اَب کبھی اپنی پُرانی جون میں نہ آسکے گی"۔

چوتھا دِن گزر گیا۔ پانچواں دِن بھی!

اَور چھٹے دِن جب احسن باہر جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا' بچّے نے اُسے پیچھے سے پکار کر کہا:

اَبّا!

بچے کی پیشانی پر جھکے جھکے بال مسکرا رہے تھے۔ احسن نے اُسے گود میں اُٹھایا اَور اُس کی پیشانی چوم لی۔ پھر اُس نے کانپ کر بچّے کو نیچے رکھ دیا۔ اَمینہ کے چہرے پر ایک گمبھیر کیف چھایا ہُوا تھا۔

یکایک دروازے پر کسی نے دستک دی۔ در و دیوار لرزے اَور احسن کا دِل کسی نے چٹکی میں لے کر مَسل دیا۔

کون صاحب ہیں؟

احسن نے اَندر سے پوچھا۔

کیا یہ احسن صاحب کا مکان ہے؟

جی ہاں! ٹھہریے میں ابھی حاضر ہُوا۔۔۔۔۔۔

احسن نے دروازہ کھول کر کہا:

میں احسن ہُوں' فرمائیے!

دستک دینے والے نے کہا:

تو آپ ہیں میرے محسن احسن صاحب۔ میرا نام جلال ہے۔

جلال صاحب نے احسن کے ساتھ مصافحہ کیا۔ پھر بڑی شفقت سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

احسن میاں! تمھاری بھابی بھی ساتھ ہیں۔ بے چاری ماں صبر نہ کر سکیں۔ اُنھیں اُن کے شاطی سے ملا دیجیے نا!

آیئے' تشریف لایئے! آپ کا شاطی بالکل خیریت سے ہے۔

احسن نے لرزتی، کانپتی آواز میں کہا۔

ایک اجنبی مرد اور ایک اجنبی بُرقع پوش عورت نے صحن میں قدم رکھا تو احسن نے طوفان سے پہلے کا سنّاٹا محسوس کیا۔

آپ کا شاطی روشنی اور زندگی بن کر اِس گھر کے ذرّے ذرّے میں بس گیا ہے جلال صاحب!

احسن میاں، اِس کی ماں قریب المرگ ہو چکی تھی۔

آپ اندر تشریف لائیے!

اُنھیں بیٹھک میں بٹھا کر احسن نے گلوگیر آواز میں کہا:

آمینہ کو جب سے یہ بچّہ مِلا ہے، اُس کی ایک زندگی ختم ہو گئی اور اب وہ ایک نئی زندگی بسر کر رہی ہے......خوشیوں کی زندگی!

نئی زندگی، خوشیوں کی زندگی؟

آپ بیٹھیے، میں آپ کو پورا قِصّہ سناتا ہوں!

جب جلال صاحب اور اُن کی بیوی بیٹھ گئے تو احسن نے آمینہ کی داستاں شروع کی۔ جب داستاں ختم ہوئی تو جلال صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

احسن نے اندر جا کر کہا:

آمینہ بھئی! کچھ مہمان آگئے ہیں۔

آمینہ نے مسکرا کر پُوچھا:

کون مہمان؟

اپنے شاطی کے......

آمینہ حیران ہو گئی تو احسن نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

آمینہ سنو!

آمینہ چونک گئی۔ احسن نے صاف صاف الفاظ میں اپنے مہمانوں کی آمد کا مقصد بیان کیا۔ آمینہ کا رنگ زرد ہو گیا؛ غم کے سایے لہرائے اور اُس کی آنکھوں میں ویرانی چھا گئی......ویرانی اور بے حسی!

احسن نے سہارا دے کر آمینہ کو پلنگ پر بٹھایا اور خود بیٹھک میں جا کر اپنے مہمانوں سے کہا:

آیئے!

تم جاؤ عائشہ!

آپ بھی آیئے۔ پردے کا خیال نہ کیجیے!

اندر آ کر جلال صاحب نے کہا:

عائشہ! اَب احسن میاں کوئی غیر نہیں، اِن سے کیا پردہ ہے!

عائشہ نے نقاب کا کونا سرکا دیا تو احسن نے پلنگ پر سوئے ہوئے شاطی کے چہرے پر سے لحاف ہٹا دیا۔ نیند میں سرشار شاطی کو دیکھ کر عائشہ کی آنکھیں مسکرائیں۔ اِن آنکھوں کے گِرد سیاہ حلقے تھے۔ یہ آنکھیں رو رو کر مدھم پڑ چکی تھیں۔

یہ اَمینہ ہیں اَور یہ ہیں آپ کے شاطی!

شاطی کی ماں نے گود کا بچّہ جلال صاحب کو دے دیا اَور خود لپک کر اُس نے شاطی کا مُنہ چُوم لیا۔

اَمینہ بُت بنے، اُسے بِٹر بِٹر دیکھتی رہی۔

اَمینہ! دیکھو تمھارے مہمان آئے ہیں۔ اُٹھو! اِن کو خوش آمدید تو کہو۔

اَمینہ اَپنے مہمانوں کو خوش آمدید نہ کہہ سکی۔

عائشہ نے سوئے ہوئے شاطی کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا اَور اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جَھڑی لگ گئی۔

اُس نے رُندھی ہُوئی آواز میں کہا:

میں کتنی بدبخت ماں ہُوں کہ اَپنے جگر کے ٹکڑے کو بھُول گئی۔ میں کتنی غافل ہوں، کتنی سنگ دِل! شاطی! جاگو اَور اپنی ماں کو مسکرا کر معاف کر دو شاطی ...... شاطی ......

شاطی نے اِس پکار پر آنکھیں کھول دیں۔

دھیرے دھیرے اِن آنکھوں میں بے داری کا احساس جاگا۔ عائشہ کو دیکھ کر یہ آنکھیں حیران ہو گئیں۔ ایک ایک چہرے پر باری باری یہ نگاہیں ٹکتی رہیں اَور پھر اَمینہ کو دیکھ کر کلی کی طرح چٹک اُٹھیں۔ اُس نے اَمینہ کی طرف ہُمک کر کہا:

امّی!

اَمینہ کی بے حِس آنکھوں میں ایک تھرتھری سی آئی!

عائشہ نے کہا:

شاطی! تم مجھ سے ناراض ہو۔ خُدا کے واسطے میری بھُول معاف کر دو! اَب میں تمھیں سینے سے چمٹائے پھِروں گی۔ میں تمھیں ایک لمحے کے لیے بھی گود سے نہیں اُتاروں گی۔ مجھے معاف کر دو شاطی، معاف کر دو!

لیکن شاطی اَمینہ کی طرف جُھکا رہا۔

جلال صاحب نے کہا:

عائشہ روؤ نہیں ...... شاطی تمھیں بھُولا نہیں ...... وہ بہت جلد تمھیں پہچان لے گا۔ احسن میاں! اَب

ہمیں اجازت دیجیے۔ میں بچّوں کو اکیلے گھر میں چھوڑ کر آیا ہُوں۔ مجھے وہم ہے کہیں ...... تم جانتے ہو دُودھ کا جَلا چھاچھ کو پھُونک پھُونک کر پیتا ہے۔ پھر اِس کے بہن بھائی بھی اِسے دیکھنے کے لیے بیتاب ہیں۔ احسن میاں! میں تمھارا شکریہ کن لفظوں میں اَدا کروں۔ اَمینہ بی بی! میں تمھارے احسان کا صلہ نہیں دے سکتا۔ مجھے اَپنا بڑا بھائی سمجھو! شاطی تمھارا بیٹا ہے۔ جب چاہو ناظم پور چلے آؤ اَور اپنے شاطی سے مل لو۔ ناظم پور میں، مَیں جانا پہچانا آدمی ہُوں۔ شاطی کے باپ کا گھر تلاش کرنا کچھ مشکل نہیں۔

....

جب دروازے پر احسن نے اُنھیں رُخصت کیا تو شاطی نے اُس کی طرف لپک کر کہا:

اَبّا!

احسن نے مُنہ پھیر لیا اَور گھر کا سُونا آنگن اُسے کاٹ کھانے کو دَوڑا۔ موت جو چند دِنوں کے لیے اُس کا گھر خالی کر گئی تھی، پھر اُس کے آنگن میں براجمان ہو گئی۔ اَمینہ پلنگ پر گُم صُم بیٹھی تھی۔ احسن نے اُس کے پہلو میں بیٹھ کر اُس کا ہاتھ اَپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ دھیرے دھیرے اُس کے ہاتھ کو سَہلاتا رہا اَور تسلی کے اَلفاظ سوچتا رہا اَور اَلفاظ اُس کے ہونٹوں پر آ کر بُلبُلوں کی طرح پھَٹ جاتے رہے۔

دیر بعد اُس نے کہا:

اَمینہ! اللہ کا شکر اَدا کرو کہ ہم نے اَمانت میں خیانت نہ کی۔ کسی کی چیز کو ہم کب تک اَپنے پاس رکھتے

امینہ! اَب آنے والی زندگی کا خیال کرو اَور ہمّت سے کام لو۔ میں تمھارے ساتھ ہُوں، ہم یہ زندگی کسی نہ کسی صُورت بِتا لیں گے۔

اَمینہ کی بے حسی دُور نہ ہوئی!

پھر یہ بے حسی ساری زندگی پر مُسلّط ہو گئی۔ اُن کی زندگی میں نہ صبح ہوتی نہ شام۔ اَمینہ رات کو جاگتی رہتی اَور ہر روز صبح اُٹھ کر آنگن میں کسی کو ڈھونڈتی پھرتی اَور مُنہ سے کچھ نہ بولتی۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں۔ کاش، اِن آنکھوں سے ایک قطرہ ہی ٹپک جاتا!

اَمینہ نے مُسلسل دو۲ دِن کچھ نہ کھایا تو وہ بازار سے انگوروں کا شربت لانے کے لیے چلا گیا۔ جب وہ لوٹا تو اُس نے اَمینہ کو گلی میں دیکھا۔ اُس نے بُرقع پہنا ہُوا تھا لیکن اُس کا چہرہ بے نقاب تھا۔ اُس کی آنکھوں میں عجیب سی جستجو تھی ...... ناکام و نامُراد تلاش!

اَمینہ! ......

احسن نے دھیمے سے پُوچھا:

تم گلی میں کسے ڈھونڈ رہی ہو؟

شاطی کو!

شاطی یہاں کہاں اَمینہ؟

گلی میں سے شاطی نے پکار کر کہا تھا: امّی!

احسن کو غصہ آ گیا۔ اُس نے اَمینہ کا ہاتھ پکڑا اور اُسے کھینچتے ہُوئے آنگن میں لے آیا۔ اُسے پلنگ پر پھینک کر کہنے لگا:

تم پاگل ہو گئی ہو اَمینہ!

نہیں ...... اُس نے مجھے پکارا اور میں نے دروازہ کھول دیا' پر نہ جانے شاطی کہاں چُھپ گیا!

جایئے نا! شاطی کو بُلا لایئے۔ وہ گلی میں رَستہ بھُول گیا ہوگا۔ جایئے نا!......شاطی ......

اَمینہ ٹوٹی ہُوئی بیل کی طرح اُس کی گود میں گِر گئی۔

میں اُسے کہاں سے لاؤں اَمینہ؟

احسن نے چیخ کر کہا۔

....

ڈاکٹر نے کہا:

اِنھیں کوئی ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔

ہاں ڈاکٹر صاحب!

مجھے پوری تفصیل سنایئے!

احسن کو ساری کہانی کہنا پڑی۔

ڈاکٹر نے کہا:

میں اِنھیں طاقت کا ٹیکا لگا دیتا ہُوں لیکن اِن کا علاج صرف ایک ہے۔ اِنھیں وہ بچّہ لا دیجیے!

ڈاکٹر! میں ماں باپ سے یہ بچّہ کیسے چھین سکتا ہوں!

کم از کم ایک بار اِنھیں بچّے سے مِلوا لائیں۔ شاید......

....

ناظم پور کے سٹیشن پر گاڑی سے اُتر کر احسن نے کہا:

اَمینہ! خوش ہو جاؤ۔ اَب ہم شاطی کے شہر میں پہنچ چکے ہیں۔

اَمینہ کی آنکھوں سے کسی مسرّت کا اِظہار نہ ہُوا۔

جلال صاحب اِس قصبے میں خاصے معروف آدمی تھے۔ اُن کا گھر تلاش کرنے میں کوئی دِقّت پیش نہ آئی۔ احسن نے دھڑکتے ہوئے دِل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ معاً دروازہ کھُلا۔ کھلے دروازے

میں جلال صاحب کہیں باہر جانے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ وہ چند لمحے حیران رہے' پھر اُبل پڑے :

اوفو! آپ ہیں احسن میاں؟ اَمینہ بی بی بھی ساتھ ہیں۔ عائشہ! شاطی! دیکھو توسہی تمھارے دروازے پر کون مہمان کھڑے ہیں۔ ارے بھئی! دوڑکر آؤ۔ احسن میاں! یہ تمھارا اپنا گھر تھا۔ چپکے سے اَندر چلے آتے۔

اَور دروازے پر بچّوں کا جمگھٹا لگ گیا! لیکن اُن میں شاطی نہیں تھا۔

عائشہ نے کہا:

امینہ بی بی! یہ تم نے کیا حال بنا رکھا ہے اپنا؟ یہ اُجاڑ اُجاڑ سا چہرہ...... یہ سُوکھے سُوکھے ہونٹ...... اِنھیں کیا ہوگیا احسن بھائی؟

بہن! ......

احسن کی آنکھوں سے قطرے ٹپک پڑے:

یہ اَپنے مُنہ سے کچھ نہ بولیں گی۔ مجھ سے سنو!

اندر بیٹھ کر احسن نے اَمینہ کا حال سُنایا تو جلال صاحب آب دِیدہ ہوگئے۔

عائشہ نے کہا:

احسن بھائی' اِنھیں پہلے کیوں نہ لے آئے آپ؟

بہن! ......

احسن نے سَر جُھکا کر کہا:

شاطی سے ایک بار مل کر اِن کا عارضی علاج تو ہو جاتا' پر اِنھیں مستقل صحت نصیب نہ ہوتی۔ اَب میں اِنھیں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس لے آیا ہُوں!

ہمیشہ کے لیے؟

جلال صاحب حیران ہوکر بولے۔

جی ہاں! یہ آپ کے گھر میں شاطی کی کِھلائی بن کر رہیں گی۔

میں سمجھا نہیں۔

بھائی جان! اَمینہ پھر موت کی اَندھی وادی میں پہنچ چکی ہیں۔ یہ پاگل ہوگئی ہیں۔ ایک بار یہ شاطی کی تلاش میں گلی تک بھی پہنچ گئی تھیں۔ یہ آپ کی چھوٹی بہن ہیں۔ اِن کی جان بچا لیجیے!

احسن نے تیز تیز سب کچھ کہہ ڈالا اَور پھر جلال صاحب کے قدموں پر جُھک گیا۔ جلال صاحب نے اُنھیں اُٹھاتے ہُوئے کہا:

یہ کیا کِیا آپ نے احسن میاں؟

اَور وہ ایک گہری سوچ میں کھو گئے۔ پھر اُنھوں نے پکار کر کہا:

شاطی کہاں ہے؟

دوسرے کمرے میں سو رہا ہے......

عائشہ بولیں۔

شمو! اُسے اُٹھا کر لے آوَ!

شمو نے سوئے ہُوئے شاطی کو اَمینہ کی گود میں ڈال دیا۔

اَمینہ کے ٹھَس چہرے پر ایک گداز سا پیدا ہُوا۔

عائشہ نے کہا:

جب سے ہم شاطی کو لے کر آئے ہیں' یہ امّی امّی کی رَٹ لگا رہا ہے۔ اُٹھو شاطی بیٹے ......شاطی ......شاطی ......

شاطی کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے بے داری کا احساس جاگا۔ اُس کی ذہین آنکھوں نے ایک ایک چہرے کا جائزہ لیا اَور آخر اَمینہ کے چہرے پر آ کر اُس کی نظریں ٹِک گئیں۔

پھر شاطی نے لپک کر کہا:

امّی!

برف کی سِل پگھل گئی۔

اَمینہ کے آنسو ٹپ ٹپ گِرے!

اگلی صبح جب احسن اَور اَمینہ رُخصت ہو رہے تھے تو شاطی' اُن کا تیسرا ہم سفر' اَمینہ کے سینے سے چمٹا ہُوا تھا اَور عائشہ رو رہی تھی شمّو رو رہی تھی۔ جلال صاحب کے چہرے پر ایک شہید کا جمال تھا۔

احسن نے کہا:

بھیا! میں ایک بات پُوچھنا تو بالکل بھُول گیا۔

کہو احسن میاں!

شاطی کا نام کیا ہے؟

شاطی کا نام؟......

جلال صاحب' احسن کے بھول پن پر مزاحیہ اَنداز میں مسکرائے:

شاطی کا نام شاطی ہے احسن میاں!

جی نہیں......میرا مطلب ہے' شاطی کا پورا نام۔

پورا نام!......

جلال صاحب پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اُونچی آواز میں سوچنے لگے:

خلیل ......جلیل، جمیل ......عثمان، غفران، عرفان ......شاطی ......شاطی...... شاطی ......نشاط احمد۔

نشاط احمد!

احسن نے مسکرا کر دُہرایا۔

ہاں ہاں! کوئی باپ اپنے بچّے کا نام کیسے بھول سکتا ہے احسن میاں۔ ہر بچّہ اُس کے جگر کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ پر شاطی پر آ کر یک دم پٹڑی بدل گئی تھی۔ عائشہ! سب سے چھوٹے کا کیا نام ہے بھلا؟

کس کا نام؟

عائشہ نے چونک کر پُوچھا۔

ننھے کا!

ننھے کا نام؟......

عائشہ نے سوچنے کے لیے گال پر اُنگلی رکھ لی!

☆☆☆

ڈاچی والیا موڑ مہار وے!

زمیندار کے ڈیرے پر شہداد پُور اَور جھوک کمال کے لوگ جمع تھے۔

مہمان خانے میں چارپائیاں بچھی ہُوئی تھیں۔ ایک پلنگ پر نُور پُور کا زمیندار بیٹھا ہُوا تھا۔ اُس کے منہ میں حُقّے کی نے تھی اَور اُس کی آنکھیں ایک نوخیز جوان کے چہرے کو ٹٹول رہی تھیں جو بڑی بے باکی سے اُس کے سامنے تن کر کھڑا تھا۔ اُس کے کانوں میں سونے کے مُندرے تھے اَور سیاہ پٹوں پر رنگین صافہ لپٹا ہُوا تھا۔ اُس کے اُوپر کے ہونٹ پر سُرمئی لکیر نے ابھی بانکی مُونچھوں کی شکل اِختیار نہیں کی تھی۔ اُس کا جسم گٹھا ہُوا اَور متناسب تھا اَور بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں دُھوپ اَور سایے ناچ رہے تھے۔ اُن آنکھوں میں بڑی گمبھیرتا تھی...... جنگلوں اَور وِیرانوں کی وسعت کہ دُور اُفق کی پہنائیوں سے جا ملی تھی۔

اَور دُور ایک کونے میں سانولے رنگ کی ایک لڑکی بیٹھی ہُوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں جھکی ہُوئی تھیں اَور اُس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔

اِن دونوں نے پیار کا بیوپار کیا تھا۔

یہ دونوں آج صبح صبح بھاگ کر زمیندار کے ڈیرے میں آئے تھے اَور اِنھیں پناہ مل گئی تھی۔ اِس لڑکی کا نام مریاں تھا۔ یہ شہداد پُور کے ایک کسان کی بیٹی تھی جو مَر چکا تھا۔ اَور سجاول' جھوک کمال کے ایک معمولی سے زمیندار کا بیٹا تھا۔

صبح کے پناہ گزیں ایک پہر دِن گزرنے کے بعد ملزم بن گئے تھے۔

شہداد پُور والے مریاں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے تھے کیوں کہ اُن کے ضابطۂ اخلاق میں غیرت کا تقاضا یہی تھا کہ بازو واپس کر لیے جائیں خواہ اِس کے لیے بیس برس کیوں نہ گزر جائیں اَور خون کی ندیاں کیوں نہ بہانا پڑیں! جھوک کمال والے جانتے تھے کہ نُور پُور کا زمیندار علاقے کا "راٹھ" ہے۔ وہ عدل و اِنصاف کے معاملے میں بڑا سخت ہے۔ اُنھیں یقیناً شکست ہوگی۔ اُن کے چہرے اُترے ہُوئے تھے۔

زمیندار' ڈھلی ہُوئی عُمر کا بارُعب آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر نرمی اَور ملائمت تھی لیکن اُس کی آواز

میں بڑی ہیبت تھی۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھوں کے گِرد سیاہ حلقے تھے، جن میں فولاد کی سختی تھی اَور چاندی کی سی چمک بھی تھی لیکن یہ آنکھیں کسی سے ہم کلام ہوتیں تو اِن میں چھید جانے والی شعاعیں بھی پیدا ہو جاتیں۔ اُس نے شہداد پُور اَور جھوک کمال کی کہانی بڑے غور و خوض سے سنی تھی۔ اُس نے اُنھیں آپس میں معاملہ طے کر لینے کا موقع بھی دیا تھا لیکن دونوں گاؤں کے لوگ اپنی اپنی بات پر اڑے ہوئے تھے۔

سجاول کے باپ نے کہا تھا:

سردار! میں نے جُوں ہی سجاول اور مَریاں کا قصہ سُنا، جھٹ شہداد پُور چلا گیا۔ میں نے اپنی پگڑی اُن کے پاؤں میں ڈال دی۔ اُنھوں نے میری عزّت کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ اَب ہم بازو کیسے واپس کریں؟

شہداد پُور کی طرف سے ایک بوڑھے نے غضب ناک ہو کر کہا:

ہم بازو واپس لیں گے سردار!

زمیندار نے بہت سوچا۔ اُسے کوئی حَل نہ سُوجھا۔ آخر اُس نے کہا:

اگر بازو واپس نہ ہُوئے تو شہداد پور اور جھوک کمال کے لوگ ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہیں گے۔ اگر بازو واپس کر دیے گئے تو بھی خون بہنے سے نہیں رُکے گا۔

اُس نے مَریاں اَور سجاول سے مخاطب ہو کر کہا:

لڑکی! تُو اَپنے گھر چلی جا۔ سجاول تُو جوان ہے، میں آج کہیں تیرا رِشتہ کروائے دیتا ہُوں؛ بول!

نہیں سردار!......

سجاول نے بڑے البیلے اَنداز میں کہا:

میں کوئی بنیا ہُوں کہ پیار کے ونجار میں مول تول کرتا پھروں؟

زمیندار کے ملائم چہرے پر غصے کی شکنیں پڑ گئیں۔ اُس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا:

بول! تُو کیا کہتی ہے؟

مریاں سَر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

اُس کے عشق کا اِمتحان تھا۔ اُس نے لرزتی ہُوئی نگاہوں سے اِرد گِرد بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھا۔ ہر آنکھ اُس کی طرف لگی ہُوئی تھی۔ کوئی اُس سے بھیک مانگ رہی تھی، کسی میں کچلے ہوئے سانپ بل پیچ کھا رہے تھے۔ مریاں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے سجاول کی طرف دیکھا، پر اُس کی آنکھوں میں صبح کے سِتارے کی روشنی تھی۔ مریاں نے ڈوپٹے سے آنکھیں پونچھیں، گال رگڑے اَور چہرے کی سنولاہٹ سانوری شام کی طرح جگمگا اُٹھی۔ آنکھیں دمکتے ہوئے تارے بن گئیں اَور پھر اُن میں ہیرے کی دو کنیوں کی صلابت آ گئی۔

اُس نے زمیندار کی آنکھ میں آنکھ ڈال دی اَور بڑی پُرسکون، شیریں آواز میں کہا:

میں پیار کے ونجار میں سجاول سے پیچھے نہیں رہوں گی۔ کوئی سسی پیار کے تھلوں سے لوٹ کر نہیں آئی۔

ایک لمحے کے لیے زمیندار کے اعصاب جھنجھنا اُٹھے۔ اُس کی ملائم پیشانی پر شکنیں پڑیں اَور پسینہ آ گیا۔ یہ اُس کی زندگی کا پہلا لمحہ تھا جب اُس نے شکست کھائی تھی، ایک لڑکی سے...... اُس نے مریاں پر چھلکتی ہُوئی نگاہ ڈالی اَور اُس نے دیکھا کہ یہ لڑکی وہ تو نہیں جسے اُس نے ایک لمحہ پہلے دیکھا تھا۔ یہ تو پیار کے تھلوں کی سسّی تھی...... ایک شہزادی جو ایک پُنوں کو دِل دے بیٹھی تھی، محلوں میں رہنے والی بے باک شہزادی جس کے چہرے پر الھڑ غرور اَور آنکھوں میں گستاخ اِرادے تھے کہ چٹانوں کو پاش پاش کر ڈالیں اَور زمیندار کے چہرے پر ایک جذبہ اُبھرا: "میں خود اِن نگاہوں کو زیر کروں گا"۔ اُس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اَور تلخ ہنسی ہنستے ہُوئے کہا:

شہداد پور والو! یہ سسی پنوں کا عشق ہے۔ مجھے درمیان میں کیوں لاتے ہو؟ پر میں شہداد پور اور جھوک بلوچاں میں دُشمنی کا بیج بھی نہیں بونا چاہتا۔ جاؤ! آج رات اپنے دِلوں سے کوئی فیصلہ کر لو۔ سجاول اَور مریاں میری پناہ میں رہیں گے۔

اَور اُس نے مریاں کو اَندر اپنے محل میں بھیج دیا جس کے گِرد اُونچی اُونچی فصیل تھی، جیسے کوئی قید خانہ ہو اَور سجاول کو باہر مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔

....

"رکڑ" زمین کے ایک وسیع ٹکڑے پر، جہاں اوکاں اَور وَن کے بوڑھے درخت بکھرے ہوئے تھے، آک، کریر اَور لانے کی جھاڑیاں دُور دُور تک پھیلی ہُوئی تھیں۔ سجاول اُونٹ چَرا رہا تھا۔ وہ تنہا تھا۔ اِرد گِرد بگولے اُٹھ رہے تھے اَور اُس کے سَر پر اوکاں کی جھالریں سرسرا رہی تھیں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ ابھی دُھوپ میں تیز چمک تھی کہ ہر طرف لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ ٹن ٹن ٹن۔ دُور کہیں گھنٹیاں بجیں۔ بنجر زمین کے ٹکڑے میں سے گزرنے والی پگ ڈنڈی پر، جو کلّر کی ایک سفید لکیر بن کر دُور تک چلی گئی تھی، دُھول کا غبار اُٹھا۔ سجاول نغمۂ کارواں کے اِستقبال کے لیے ہمہ تن انتظار بن گیا۔

یہ قافلہ کہیں بیاہ پر جا رہا تھا۔ ایک ایک کجاوے پر پورا پورا خاندان سوار تھا۔ کجاووں پر رنگین اَور چتکبرے کھیس بچھے ہوئے تھے۔ ڈاچیوں کو دُلھنوں کی طرح سنگارا گیا تھا۔ گلوں میں سُرخ سُرخ ہار، ماتھوں پر گانیاں، گھٹنوں میں گھنٹیوں کی پازیبیں۔ قافلے والے ایک ایک نگاہِ غلط اَنداز کا دان دے کر بڑی بے نیازی سے اُس کے پاس سے گزر گئے۔ اُن کے پیچھے دُھول کا ایک بادل فضا میں معلق ہو گیا۔ تب گرم لُو کا ایک جھونکا آیا اور مطلع صاف ہو گیا۔ ایک خواب گزر گیا۔ سجاول نے مُڑ کر دیکھا اَور ڈاچی کی گردن پر پیار

سے ہاتھ پھیرا اور یکایک دُور سے پھر گرد کا ایک بگولا سا اُٹھا۔

"کوئی قافلے سے پیچھے رہ گیا ہے"...... سجاول نے سوچا: "اکیلا سوار معلوم ہوتا ہے"۔

ایک لمحے غبار چھٹا۔ دوسرے لمحے سوار نے اُس کے قریب پہنچ کر راسیں کھینچ لیں۔ سوار نے گرد سے بچنے کے لیے منہ پر منڈا سا لپیٹا ہُوا تھا۔ صرف اُس کی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ سجاول کی حیرت اِن آنکھوں کی بولتی ہوئی چمک میں ڈوب گئی:

کوئی قافلہ گزرا یہاں سے؟......

آواز میں الھڑ چھنک تھی جیسے چوڑیاں بج اُٹھی ہوں۔ سجاول کی حیرت ایک سیاہ جھیل کے اتھاہ پانیوں میں ڈوب گئی۔ سطح پر ہلکا سا طوفان آیا اور ایک مسکراہٹ جس میں چمکیلی دُھوپ کا مدّو جزر تھا' اُس کی حیرت سے ہم کلام ہوئی:

کتنے فاصلے پر ہوگا؟

کون؟

وہی قافلہ جو ابھی اِدھر سے گزرا۔

یہی کوئی "سد پدھ" پر۔

سوار نے مرکب کو اِیڑ لگائی تو سجاول چیخ اُٹھا:

تیری کاٹھی کا تنگ ڈِھیلا ہے کمیت گھوڑی کے سوار!

سوار ایک زقند لگا کر گھوڑی سے نیچے اُترا۔ ایک جھٹکا لگا اور اُس کا منڈا سا کُھل گیا۔ بالوں کی سیاہ چوٹی پیٹھ پر سَو سَو بَل کھا گئی۔ سجاول کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔

اَور دُوسرے لمحے!

کائنات شرما لجا کر ایک دُلھن بن گئی۔ اُس کے آسمانی ڈوپٹے پر اماوس کی رات کے شوخ تارے جھل مل جھل مل کر رہے تھے۔ صندل کلائیوں پر چُوڑیوں کی چھَن چھَنا چھَن چھنک تھی۔ چہرے پر سنولائی ہوئی شام کی ڈوبتی' اُبھرتی سُرخیاں تھیں۔ صُراحی دار گردن میں چڑھتے سُورج کی کِرنوں کی مالا تھی اَور اُس پر چاند ٹکے ہوئے تھے۔ ناک میں چاندی کی کیل تھی اور اُس کا رنگ' صبح کا سِتارہ تھا کہ ٹھنڈی میٹھی روشنی کا لشکارا بن گیا تھا۔

سجاول کو میٹھی نیند آ گئی! جب اُس کی آنکھ کھلی تو کائنات مسکرا رہی تھی۔

اُس نے پُوچھا:

کمیت گھوڑی کے سوار! کہاں جاؤ گے؟

سوار نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس نے رِکاب پر پاؤں رکھا تو سجاول بول اُٹھا:

بانکے سوار! تیری گھوڑی کا تنگ ڈِھیلا ہے۔

سوار نے رِکاب سے پاؤں کھینچ لیا۔ سجاول نے آگے بڑھ کر گھوڑی کے پٹھے پر ہاتھ رکھا۔ حسّاس جِلد تھرتھرا کر لہروں کا جال بن گئی۔ اُس نے تنگ کسا۔ سوار نے ایک رِکاب میں پاؤں رکھا تو سجاول نے دوسری رِکاب تھام لی۔ زرتار سبک جوتی میں پھنسا پھنسا ننھا سا پاؤں اُس کے ہاتھ سے چُھو گیا تو اُس کے چہرے پر ایک روشنی چمک کر کانپی۔

اگلے لمحے کائنات کے بہروپیے نے اپنا سوانگ بدل ڈالا۔

آسمانی رنگ کا ڈوپٹا' منڈاسا بن گیا۔ حِنائی ہاتھ نے بڑے غرور بھرے انداز میں راس تھامی۔ کمیت گھوڑی نے کنوتیاں کھڑی کیں اور بڑھ کر ٹاپ ماری۔

سجاول نے پوچھا:

کمیت گھوڑی کے سوار! اِتنا تو بتادو' کہاں سے آئے ہو؟

شہداد پور سے......

سوار نے بڑی بانکی نخوت کے ساتھ گردن موڑ کر جواب دیا۔

اور کمیت گھوڑی کا رُکا ہُوا جوش تُند رو سیلاب کا ایک ریلا بن گیا اور نقشِ پا کے طَور پر غُبار کا ایک سنہری بادل چھوڑ گیا!

....

سنہری بادل!

سجاول سنہری بادلوں میں گِھرا ہُوا تھا۔ اُس نے آنکھیں مَلیں اور پلکیں جھپک جھپک کر اپنے اِرد گِرد دیکھا۔ مہمان خانہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ ڈوبتے سُورج کی آخری رُوپہلی کرنیں درختوں کی پھننگوں سے کھیل رہی تھیں۔ جھوک کمال اور شہداد پور کے لوگ جا چکے تھے۔

لیکن مریاں کہاں تھی؟

سجاول چَونک اُٹھا اور اُس نے سامنے موٹی موٹی دیواروں کے حِصار کو آسمان سے باتیں کرتے دیکھا اور اُس کی مسکراہٹ مَر گئی۔

سنہری بادل کو اندھیرے کے غار نے ہڑپ کر لیا تھا!

....

دُوسرے دِن سہ پہر کو سجاول پھر سفید کلّر سے اَٹے ہوئے راستے پر کھڑا تھا۔ آج کوئی قافلہ نہ گزرا اور

سنہری دُھول کا کوئی مرغولہ اُڑ کر پیغامِ حبیب نہ بنا۔ تیسرے دِن سجاول پھر وہیں کھڑا تھا۔ یکا یک ایک بگولے نے اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ دُھول میں اَٹ گیا۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو بیاہ سے لوٹنے والے اِکّا دُکّا لوگ اُس کے پاس سے گزر رہے تھے۔ پہلے کی طرح کمیت گھوڑی کا سوار سب سے بعد میں آیا۔ اِس دفعہ کمیت گھوڑی خود بہ خود اُس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ سجاول آنکھوں میں اِشتیاق کی روشنی لیے' آگے بڑھا تو کمیت گھوڑی کے سوار نے تنک کر کہا:

آج تنگ ڈِھیلا نہیں۔

سجاول کوئی جواب نہ دے سکا۔ کمیت گھوڑی کے بانکے سوار کی نسائیت پُراَسرار اَنداز میں مسکرائی۔ وہ جرأت کے پروں میں اُڑا اَور اُس نے گاؤدم بازو پر ہاتھ رکھا تو صندلیں کلائی کا گداز نغمۂ شباب کی لچک بن گیا۔

سجاول نے کہا:

دُور دیس کے راہی' میں کب سے تیرے اِنتظار میں کھڑا ہوں! تیرے پاؤں کا نقش میرے دِل پر پڑ چکا ہے۔ چل آج میرا مہمان بن! میں تیرے قدموں میں آنکھیں بچھاؤں گا۔ اُجلا کھیس ڈال کر تجھے رنگین پلنگ پر بٹھاؤں گا۔ تو پھُول ہے تو میں بھونرا بن کر تیرے گِرد منڈلاؤں گا۔

نہیں!

کمیت گھوڑی کے سوار نے دِھیمے سے کہا۔

سجاول بُجھ سا گیا: ''بھونرا اُڑ کر پھُول کے پاس جاتا ہے۔ کہیں پھُول بھی بھونرے کے پاس آتا ہے پگلے!''

سوار نے ایک پاؤں رِکاب میں رکھا تو سجاول نے دوسری رِکاب تھام لی۔ راس کو ایک ٹُنکا لگا۔ گھوڑی نے کنوتیاں کھڑی کیں۔ ایک ٹاپ نے دُھول کا مرغولہ اُڑایا تو سجاول کا جی بیٹھ گیا۔

کمیت گھوڑی کے سجیلے سوار نے کہا:

کبھی شہداد پور آؤ تو مریاں کے ڈیرے کا پتا پوچھ لینا! اُس ڈیرے پر مہمان کو سَر آنکھوں پہ بٹھایا جاتا ہے۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اوکاں کی جھالریں سرسرائیں۔ کائنات گنگنائی۔ وہ نغمۂ محبّت کی عظمت اَور گیرائی' اُس کی وسعت اَور گہرائی میں کھو کر غبار کا ایک ذرّہ بن گیا کہ ایک البیلی کِرن کی نوک پر رقص کر رہا ہو۔ اُس نے کان پر ہاتھ رکھا۔ آب شار کے دِھیمے نغموں کی ایک پھُوار پڑی۔

گوری کے کانوں میں بُندے جیسے چمکیں تارے
سر پر کالی زلفیں جیسے لرزیں رات کے سایے
آہ میں نے ناگوں کے سامنے اَپنا جگر اَور شعلوں کے درمیان اَپنا دِل پھینک دیا ہے!

....

کالے سایے!

اُسے زلفوں کے گمبھیر سایوں تلے نیند آ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو رات کے اَندھیرے چھا چکے تھے۔

دُور کونے میں ایک آدمی کھڑا تھا۔ سجاول نے پوچھا:

بھائیا! میں کہاں ہوں؟

نور پور میں!

نور پور!...... مریاں کہاں ہے؟

اُس آدمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ کانٹے کی ایک تیز چبھن نے اُس کے دِل سے سرگوشی کی:

"مریاں، تو اِن اُونچی اُونچی دیواروں کے پیچھے چُھپ چکی ہے!"

....

سجاول کو کھویا کھویا دیکھ کر اُس کے بڑے بھائی مراد نے کہا تھا:

سجاولے! اَیسا لگتا ہے جیسے تُو جوان ہو گیا ہو۔ کہو تو اَب تیرا بیاہ کر دیا جائے؟

سجاول جواب میں دِھیمے سے مسکرایا۔

ایک شام جب سُورج ڈوب رہا تھا، سجاول نے گھوڑے پر زِین کَسی اَور لگام سے پکڑ کر گھوڑے کو اُس جگہ لے آیا جہاں شہداد پور کی مَریاں اُسے مِلی تھی۔ اُس نقطے پر ایک زندگی ختم ہُوئی تھی اَور دُوسری کا آغاز ہو چُکا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے ٹھٹک کر کھڑا رہا۔ پھر اُچک کر گھوڑے کی پیٹھ پر جا بیٹھا۔ گھوڑا سرپٹ بھاگا۔ دُھول اُڑی۔ سُورج ڈوب گیا۔ سایے گہرے ہو گئے۔ ہَوا میں سایوں کی خنکی بھر گئی۔ پگ ڈنڈی کی لکیر ایک چوڑی سڑک میں کھو گئی۔ اُس کے اِرد گرد اوکاں، وَن اَور شیشم کے اُونچے اُونچے درخت تھے۔ سڑک کی طوالت طے ہوتی چلی گئی اَور تب اُس کے متوازی چند دیے ٹمٹمائے اَور اُس نے باگیں موڑ لیں۔ وہ شہداد پور میں داخل ہو گیا۔ شہداد پور، ایک دوسری کو کاٹتی ہُوئی سڑکوں کے دونوں کِناروں پر آباد تھا۔ سڑکیں خالی تھیں۔ گاؤں کے عَین درمیان چوک میں پہنچ کر اُس نے باگیں کھینچ لیں۔

ایک آدمی نے پُوچھا:

کہاں جاؤ گے؟

بہت دُور، پر اَب تو رات ہو چکی ہے۔ کوئی ٹھکانا مِل جائے تو یہیں رات گزار لوں!

تو چلے آؤ میرے ساتھ، مریاں کے ڈیرے میں!

مریاں کا ڈیرا خالی تھا۔ ایک کچّے کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ سجاول نے کھلے صحن میں ایک کھونٹے کے ساتھ گھوڑا باندھ دیا اُور صحن میں بچھی ہُوئی ایک چارپائی پر چُپ چاپ بیٹھ گیا۔

مسافر! کہاں سے آئے ہو؟

ایک آواز نے پُوچھا جس کے لہجے میں دُودھ کے ایک گھونٹ کی مٹھاس تھی۔

جھوک کمال سے۔

سجاول کی آواز میں لرزش تھی جیسے وہ سازِ دِل کے تاروں کو مضراب کی ٹھوکر سے بجا رہا ہو۔

جھوک کمال سے!...... کہاں جاؤ گے؟

میزبان کی آواز میں تھوڑی سی حیرت تھی۔

سسی کے دیس میں۔

سجاول کے ہونٹوں سے یہ لفظ یُوں چھلک پڑے جیسے ماہیے کا ایک بول ہوں۔

سسی کا دیس؟......

ایک تارا ٹوٹا اُور سربستہ راز کا پردہ چاک ہو گیا۔

تم؟

مریاں کی آواز میں تھوڑا سا خوف تھا:

مسافر! یہ لو دُودھ کا کٹورا۔ روٹی کے دو لقمے کھا لو اُور تازہ دم ہو کر اپنا سفر شرُوع کر دو!

میں اپنی منزل پر پہنچ چُکا ہُوں۔ مجھے سسی کا دیس مِل گیا ہے۔

نہیں! ابھی یہ دیس بہت دُور ہے۔

مریاں نے دِھیمے سے کہا۔

سجاول نے غٹ غٹ دُودھ کا کٹورا پی لیا۔ اُس کی نَس نَس میں ٹھنڈک رَچ گئی۔ مریاں اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سجاول کی جوانی نے بڑھ کر مریاں کے شباب سے معانقہ کرنا چاہا۔ اُس نے مریاں کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔ مریاں تھوڑا سا جھجک گئی۔ اُس کا سانس سجاول کے چہرے پر شبنمیں پھُوار بن کر گرا۔ اُس سانس میں بھینی بھینی خُوشبُوئیں تھیں۔ اُس نے کہا:

سسی کے دیس کے مسافر پنوں! سفر شرُوع ہو چُکا ہے۔ جھوک کمال سے شہداد پور دُور نہیں، پر کیچ مکران اُور کچھ کے فاصلے، کالے کوسوں کے پندھ ہیں۔ دیکھ، تیرے قدم نہ ڈگمگا جائیں!

نہیں مریاں!

اُس کی ہمت آسمان سے جا چھُوئی۔

ایک اَور تارا ٹوٹا۔ اُس کے پیچھے پیچھے تھلوں کی ریت بکھرتے چلی گئی۔ سجاول نے تھلوں میں سسی کے قدموں کے نشان دیکھے اَور اُسے راستہ مِل گیا۔

....

تھلوں کی ریت!

ٹیلے اَور بگولے۔ لو کے جھونکے۔ آگ کے بولے۔ رقص کرتے ہوئے شعلے! شہداد پور کی سسی تھلوں کے ایک "ٹبے" پر ننگے پاؤں آوارہ سرگرداں تھی۔ اُس کے پاؤں میں چھالے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ جھوک کمال کا پنوں زمیندار کے مہمان خانے میں اکیلا تھا۔ زمین پر تاروں کی چھاؤں تھی۔ آسمان پر تارے ٹوٹ رہے تھے۔ ذرّے بکھر رہے تھے اَور چنگاریوں کے جگنو اُڑ رہے تھے۔

لیکن مریاں!

زمیندار کے محل کی ایک ہیبت ناک دیوار اُس کے سینے پر آپڑی۔ اُسے اَپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

....

ایک شام پھر سجاول نے چپکے سے گھوڑے پر زین کسی تو اُس کا بھائی مراد آ گیا۔ اُس نے پوچھا:

کہاں جا رہے ہو سجاولے؟

شہداد پور۔

کیوں؟

ایک دوست سے ملنے کے لیے' کمیت گھوڑی کا سوار ہے۔

سجاول کے ہونٹوں پر ہنسی کی ایک لہر تھی۔

سجاول! مجھے مذاق میں ٹالنے کی کوشش کیوں کرتے ہو؟

سجاول نے ہنس کر کان پر ہاتھ رکھا۔ ایک ڈھولا گایا اَور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ آج سجاول نے شہداد پور سے کچھ فاصلے پر ایک گھنے جُھنڈ میں گھوڑا باندھ دیا۔ مریاں کے ڈیرے پر آج بھی کوئی نہیں تھا۔ رات اندھیری تھی۔ وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ تاریکی کے پردے گِرتے رہے اَور تب دبیز پردوں کے پیچھے سے ایک آواز نے پوچھا:

کوئی مسافر ہے ڈیرے میں؟

ہاں ایک مسافر جس کی منزل بہت دُور ہے۔

سجاول تم؟

مریاں کی ڈری سہمی آواز نے پُوچھا۔

ہاں مریاں! یہ میں ہی ہُوں۔

تم کیوں آئے سجاول؟ لوگوں کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا!

سفر شروع ہو چکا ہے۔اَب میں منزل پر پہنچے بغیر کیسے لَوٹ جاؤں؟

مریاں نے حسبِ معمول گھر سے لا کر دُودھ کا کٹورا پیش کیا اَور اُس کے پاس چارپائی کی پائنتی پر بیٹھ گئی۔ رات بیتنے لگی اَور یکایک صبح کا تارا اُبھر آیا جیسے اُس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اُس نے صبح کے اُجالے میں مریاں کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا۔ اُس میں صبح کی خنکی تھی اَور شبنم سے دُھلے ہوئے پھُولوں کی تروتازگی اَور مریاں کے ڈیرے سے بڑی سڑک تک کا فاصلہ پھُولوں کی سیج بن گیا جس پر وہ چل رہا تھا' خوابوں میں اُلجھا ہوا' سپنوں کی وادی میں مستِ خرام کہ کسی نے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُسے ایک جھٹکا لگا۔ اُس نے بازو چھڑاتے ہوئے کہا:

کون ہو تم؟

یہ بات تو میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ بتاؤ کون ہو تم؟ رات کے اَندھیرے میں شہداد پور کیوں آئے؟

اِتنی سویرے کیوں لَوٹ رہے ہو؟

میں شہداد پور کب آیا تھا؟ میں تو سسی کے دیس کا مسافر ہُوں۔

سجاول کے ہونٹوں سے یہ اَلفاظ خود بہ خود پھسل گئے۔

سسی کے دیس کا مسافر؟ ......

اُس نے حیرت سے دُہرا کر کہا:

تم کہاں سے آئے ہو؟

جھوک کمال سے۔

منہ زور جوانی جھوٹ نہ بول سکی۔

اُس نے پھر اَپنا ہاتھ سجاول کے بازو پر رکھ دیا۔ ہاتھ کی گرفت سخت ہوگئی تو سجاول کو غصہ آ گیا۔ اُس نے شعلے کے مانند بھڑک کر کہا:

میرا بازو چھوڑ دو!

تم نے رات کہاں گزاری؟

مریاں کے ڈیرے میں۔

سجاول پھر جھُوٹ نہ بول سکا۔

گرفت سخت سے سخت تر ہوگئی۔ سجاول نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑا لیا۔ دوسرے آدمی نے سجاول سے

لپٹ جانا چاہا تو اُسے پہلی بار خطرے کا شعوری احساس ہُوا۔ سجاول نے تڑپ کر اُس کی گردن پر زور سے مُکّا لگایا اور وہ آدمی تیورا کر گر پڑا۔ سجاول آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک آواز آئی: "اوہو......اوہو......اوہو"...... یہ خطرے کا بلاوا تھا اور سجاول اِس خطرناک پکار سے آگاہ تھا۔ وہ سَرپٹ دوڑا۔ اُس نے جھنڈ میں پہنچ کر گھوڑا کھولا' اُچک کر اُس کی پیٹھ پر بیٹھا اور ایڑ لگادی۔ سویا ہُوا شہداد پور بیدار ہُوا تو سجاول بہت دُور نکل چکا تھا۔ تعاقب بے کار تھا۔ شہداد پور کے جوان دانت پیس کر رہ گئے۔ جھوک کمال کا معمولی سا آدمی اُن کی عزت سے کھیل کر یُوں آسانی سے بچ نکلا تھا۔ مریاں گاؤں کی آنکھ کا تارا تھی۔ شہداد پور کے گبھروؤں نے بڑی ہتک محسوس کی۔

بڑے بوڑھوں نے کہا:

یہ مریاں بڑی خود سَر لڑکی ہے۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ جب سے اِس کا باپ مَر گیا ہے' اپنے ڈیرے کو یوں آباد رکھتی ہے جیسے گاؤں کے سب بڑے بوڑھے مَر گئے ہوں۔ جس مسافر کو رات پڑ جائے' وہ مریاں کے ڈیرے کا رُخ کرتا ہے جیسے شہداد پور کے باقی سب ڈیروں کے چراغ گُل ہو چکے ہوں۔ ہم نے مریاں کی ماں کو کئی بار منع کِیا کہ ایک جوان لڑکی کا ڈیرے کی خِدمت کرنا اچھا نہیں' پر اُس نے ہماری بات پر کان نہ دھرا۔ اَب بھگت لے خمیازہ!

دیہات کی خبریں ہَوا کے شہ پَروں پر اُڑتی ہیں۔

دھیرے دھیرے جھوک کمال کے ہر شخص کو پتا چل گیا۔ سجاول کے باپ نے ایک دِن مراد سے پوچھا:

یہ مریاں کون ہے مُراد؟ اس کے باپ کا کیا نام ہے؟

رحمو!

رحمو!...... خُدا بخشے مَرنے والے کے پاس زمین تو بہت کم تھی پر تھا بڑا سخی مَرد۔ شہداد پور میں اُسی کے ڈیرے سے مُسافِر کو کھانا پانی مِلتا تھا۔ یہ مریاں بڑی اچھی لڑکی ہے کہ باپ کا نام روشن رکھا' پر سجاولا تو پاگل ہے۔ سیدھی سی بات تھی' اُسے یُوں ہی ٹیڑھا کر دیا۔ رحمو زندہ ہوتا تو میری جھولی میں مَریاں کو ڈال دیتا۔ سجاول سے کہو دو چار دِن صبر کرے۔ شہداد پور والے میری سفید ڈاڑھی کا ضرور لحاظ کریں گے۔

سجاول کا باپ شہداد پور گیا۔

شہداد پور کے لوگوں نے کہا:

تیرے آنے کی ہمیں بڑی قدر ہے۔ تو کہے تو ہم تیرے پاؤں دھو دھو کر پئیں' پر تُو جس کام کے لیے آیا ہے' اُس کے لیے ہمیں مجبور نہ کر! ہم بڑے بدنام ہو چکے ہیں۔ تیرے بیٹے سجاول نے شہداد پور کو سسی کا دیس کہہ کر ہماری عزت خاک میں مِلا دی ہے۔

سجاول کے باپ نے ہر حربے سے کام لیا۔ منتیں خوشامدیں کیں۔ شہداد پوریوں کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی۔ اَپنی پگڑی اُتار کر زمین پر رکھ دی اور یہ کہا:

جھوک کمال کی عزّت ہے جو تمھاری ٹھوکروں میں ہے!

مگر شہداد پور کے لوگ ٹس سے مس نہ ہُوئے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ آیا۔

مراد نے کہا:

سجاول بڑا خود سَر ہے۔ اَب کیا ہو گا۔

کیا ہو گا؟ مجھ سے پوچھتے ہو؟......

بوڑھے جانگلی نے غصے سے کانپ کر کہا:

زمانہ بدل گیا ہے۔ نہر کے آنے سے جوانوں کے خون' پانی ہو گئے ہیں۔ تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے؟ اگر میرا زمانہ ہوتا تو......

بوڑھے نے بات پوری نہ کی۔ مُراد سمجھ گیا۔

اَور مراد کی تحریک پر ایک رات جھوک کمال کے جوان اکٹھے ہُوئے!

گئی رات تک صلاح مشورے ہوتے رہے۔ سجاول نے کئی بار کہا کہ یہ اُس کے عشقِ صادِق کا معاملہ ہے' کسی دوسرے کو اِس پرائی آگ میں کودنے کی کیا ضرورت ہے! لیکن جھوک کمال کے جوانوں نے اَپنی عزّت کا سوال بنا لیا تھا۔ ایک عورت کے ذریعے سجاول کی طرف سے مریاں کو پیغام بھیج دیا گیا کہ اُس کا پیار سچّا ہے تو وہ اگلی رات اُنھیں شہداد پور سے باہر درختوں کے جُھنڈ میں مِلے۔

دوسری رات جھوک کمال کے جوان مسلح ہو کر شہداد پور گئے!

گھنے جُھنڈ میں جوانوں کے دِل دَھک دَھک کر رہے تھے۔ لیکن سجاول بڑا خوش تھا۔ سسی کے دیس میں آج تک کوئی پنوں سہرے باندھ کر نہیں گیا تھا۔ اگر مریاں اُسے یُوں ہی مل جاتی تو عشق بدنام ہو جاتا۔ مریاں چُپ چاپ آئی۔ اُسے سجاول نے اپنے پیچھے گھوڑے پر بٹھا لیا اَور قافلہ جھوک کمال کی طرف لوٹنے لگا۔ تھلوں میں کوئی تُند بگولا نہ اُٹھا' بادِ سموم کا ایک خُوں خوار جھونکا بھی نہ آیا۔ ویران ٹیلوں پر سسی کے پاؤں بھی زخمی نہ ہوئے۔ سجاول بُجھ سا گیا جیسے اُس نے عشق و عاشقی کی بہت بڑی توہین کی ہو!

جب شہداد پور والے جاگے تو مریاں جھوک کمال پہنچ چکی تھی۔ لیکن شہداد پوریوں نے اپنی ہتک کو کڑوے نوالے کی طرح حلق سے بھی نہ اُتارا۔ وہ سجاول اَور مریاں کا کھوج نکال نکال کر سایے کی طرح اُن کا پیچھا کرتے رہے۔ سجاول اَور مریاں ایک ڈیرے سے دوسرے ڈیرے میں منتقل ہوتے رہے اَور آخر ایک ڈیرے پر شہداد پور کے لوگوں نے اُنھیں آ ہی لیا۔ جھوک کمال کے لوگ اُن کی مدد کو نہ پہنچ سکتے تھے۔ اِس لیے ڈیرے والوں نے سجاول اَور مریاں کو چپکے سے نکال کر ایک راستے پر لگا دیا۔

مریاں نے کہا:

سجاول! سسی کے دیس کا سفر اَب شروع ہو چکا ہے۔

سجاول کانپا۔ کہکشاں پر ریت کے غبار اُڑ رہے تھے۔ سفر شروع ہو چکا تھا...... شاید! رات کے اندھیروں نے اُنھیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ پگ ڈنڈی کے دونوں طرف گھنے سایوں کی گپھائیں تھیں۔

سجاول نے کہا:

مریاں! کون جانے، ہم ابھی سسی کے دیس کی کون سی منزل پر ہیں! پر اللہ کا شکر ہے کہ میں اکیلا نہیں، تم میرے ساتھ ہو۔

یکایک مریاں رُک گئی۔ سبک جُوتی کے نازک تلے میں سے ایک کانٹے کی نوک نے پاؤں کے تلوے میں چُبھ کر پہلی منزل کی خبر دی تھی۔ مریاں نے کانٹا نکالا اور ہنس کر کہا:

سجاول! میں نے تو سُنا تھا، تھلوں میں سسی اکیلی تھی۔ اُس کے پاؤں میں چھالے تھے، وہ پنوں کے قافلے کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

سجاول پھر کانپ گیا۔

تقدیر اَپنے رُوپ بدلتی رہتی ہے۔

نہ جانے سسی کے اِس سفر کا انجام کیا ہو!

وہ چلتے رہے۔ رات گزرتی رہی اَور یکایک رات کے اندھیروں نے بھی اُنھیں اپنی پناہ سے نکال دیا۔ صبح کا مٹیالا اُجالا چھا گیا۔ سجاول نے مریاں کا ہاتھ تھام کر کہا:

رات بیت گئی ہے مریاں!

مریاں پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

پگ ڈنڈی سے کچھ فاصلے پر مُرغوں نے اذانیں دیں۔ سجاول نے مریاں کو ایک جھاڑی کی اوٹ میں بٹھایا اَور گاؤں میں چلا گیا۔ گاؤں ابھی سویا ہُوا تھا۔ اُس نے در و دیوار پر نظر ڈالی۔ یہ نور پور تھا۔ اُس گاؤں کا زمیندار بڑا مہمان نواز تھا۔ اُنھیں یقیناً پناہ مِل جائے گی۔

اَور اُنھیں پناہ مِل گئی!

اَور جب اُس صبح کا سُورج بلند ہُوا تو شہداد پور والے بھی کھوج نکالتے نکالتے نور پور آ پہنچے اَور اُن کے پیچھے پیچھے جھوک کمال کے لوگ بھی۔ زمیندار کا ڈیرا لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا۔ صبح سے لے کر سہ پہر تک زمیندار عدالت کی مَسند پر بیٹھا رہا۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے اَور رات پڑ گئی۔

....

رات!

اَب ڈیرا خالی تھا۔ کھُلے صحن میں اندھیرا تھا۔ سائیں سائیں ہَوا چل رہی تھی۔ ہَوا کے سانسوں میں ٹھنڈک رچی ہُوئی تھی۔ سجاول حیران تھا۔ یہ سفر کی کون سی منزل تھی کہ یہاں پہنچ کر قافلہ اچانک رُک گیا تھا۔ یہ قافلے والے کہاں گئے؟ سجاول سَر جھکائے صحن میں اِدھر سے اُدھر پھرتا رہا اَور سوچتا رہا۔

آسمان پر ایک تارا ٹوٹا۔

اندھیروں میں روشنی کی ننھی سی پھُوار پڑی اَور سجاول کی نظر آسمان کی طرف اُٹھ گئی۔ تھلوں کی ریت اَور سجاول کو یاد آ گیا۔

سسی کا دیس!

وہ بے اِختیار پکار اُٹھا:

مریاں! دیکھو تو رات پڑ چکی ہے۔ آؤ' اگلے پڑاؤ کی طرف قدم بڑھائیں! نہیں تو شہداد پور والے ہمیں آ لیں گے۔

لیکن مریاں تو سامنے کی سَر بہ فلک دیواروں کے پیچھے قید ہو چکی ہے۔

سجاول کے سینے پر خوف کا کوڑیالا سانپ رینگا۔ وہ وحشت زدہ ہو کر چیخا:

مریاں! مریاں!

رات کی گہری خاموشی میں اُس کی چیخ اُبھر اُبھر کر ڈوب گئی۔ وہ اُونچی اُونچی دیواروں کے حِصار کی طرف بڑھا۔ اُس نے فصیل کے ساتھ ساتھ چکر لگایا۔ اندر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بڑے پھاٹک کے سامنے کھڑے ہو کر مریاں کو کئی بار پکار پکار کر بُلایا۔ اُسے پکار کا کوئی جواب نہ ملا۔ اُس نے زور زور سے کواڑ پیٹے:

مریاں! مریاں!!

اَور کواڑ کھُل گئے۔ سجاول نے دوڑ کر اَندر جانا چاہا تو پیچھے سے دو آدمی لپک کر آئے اَور اُنھوں نے سجاول کو اَپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ پھاٹک میں جو آدمی کھڑا تھا' اُس نے بڑی سنگ دِلانہ اَور ہیبت ناک آواز میں حکم دیا:

اِسے باندھ لو اَور اُونٹ پر لاد کر جھوک کمال کے نزدیک چھوڑ آؤ؛ دیکھو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو!

سجاول مچھلی کی طرح تڑپ کر اُن آدمیوں کی گرفت سے نکلا' پھاٹک کی طرف بھاگا اَور چشم زدن میں پھاٹک سے جا ٹکرایا لیکن پھاٹک بند ہو چُکا تھا۔ اُس نے دھکے دیے لیکن پھاٹک نہ کھلا۔ تب اُس نے سَر کے ساتھ پھاٹک کو ٹکریں لگائیں۔ اُس کے ماتھے سے خون کی ایک دھار بہ نکلی اَور پھاٹک نہ کھل سکا۔

دونوں آدمی بڑھے اور اُنھوں نے سجاول کو رسّوں میں جکڑ لیا۔

....

دِن چڑھے شہداد پور اور جھوک کمال کے لوگ زمیندار کے ڈیرے میں جمع ہو گئے۔ کافی دیر بعد زمیندار اپنے حرم سے برآمد ہُوا۔ اُس نے مسندِ عدالت پر بیٹھتے ہوئے پُوچھا:

تم نے کیا فیصلہ کیا؟

شہداد پوریوں نے کہا:

ہم اپنے بازو واپس لیں گے۔

جھوک کمال کے لوگوں نے پکار کر کہا:

سردار! ہم اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے، پر بازو نہیں لوٹائیں گے۔

زمیندار سر جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ جب اُس نے آنکھیں اُٹھائیں تو لوگوں نے دیکھا کہ اُن میں فولاد کی کُند چمک ہے لیکن اُس نے بڑے نرم لہجے میں کہا:

لوگو! میں جانتا تھا، تم کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکو گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہداد پور اور جھوک کمال ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جائیں۔ میں نے خود ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ مجھے یقین ہے تمھیں یہ فیصلہ منظور ہو گا۔

کچھ دیر رُک کر زمیندار نے ایک ایک تنے ہوئے چہرے کا جائزہ لیا۔ اُس کی نگاہیں لوگوں کے سینے چھید کر دِلوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اُس نے سپاٹ سی آواز میں، جس کے اندر کوئی مدّ و جزر نہیں تھا، کہا:

میں نے آج تک اپنی پناہ میں آئے ہوئے لوگوں کو واپس نہیں کیا۔ میں مریاں کو لوٹا نہیں سکتا۔ شہداد پوریو! تم خوش ہو جاؤ کہ میں نے تمھاری مریاں کو اپنے محل کے قابل سمجھ لیا ہے اور جھوک کمال کے لوگو! تم مطمئن رہو، اب تمھیں شہداد پور والے آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے تمھیں اُن کے خونیں اِنتقام سے بچا لیا ہے۔

زمیندار نے قہقہہ لگایا اور اُس کا قہقہہ بجلی کی چمک تھا کہ مجمع کو چاٹ کر رکھ گیا۔

ایک عرصے بعد سجاول کے باپ نے اُٹھ کر پوچھا:

سردار! تیرے ڈیرے میں سجاول نظر نہیں آ رہا۔

سجاول!

زمیندار نے حیرت کا اِظہار کیا۔

وہ تیری پناہ میں تھا سردار۔

میری پناہ میں تھا تو اُسے کوئی گزند نہیں پہنچ سکتا۔

زمیندار نے پھر قہقہہ لگایا۔

سجاول کا باپ کانپ گیا۔

توسنو! آج صبح ہم نے مجبور ہو کر اَپنے مہمان کو صحیح سلامت رُخصت کر دیا۔

کہاں؟ کس طرف؟

سجاول کے باپ کی آواز پھٹ گئی۔

سسی کے دیس میں!

زمیندار بڑی سرد مہری کے ساتھ مسکرا دیا۔

تو نے سچ کہا سردار!

سجاول کے باپ نے ٹھنڈی آہ بھری۔

تب اُس نے شہداد پور والوں پر ایک نگاہ ڈالی جس سے نفرت کا زہر ٹپک رہا تھا۔ اُس نے کہا:

شہداد پوریو! خوش ہو جاؤ کہ تمھاری عزّت محفوظ رہی۔ سجاول اَب سسی کے دیس میں پہنچا ہے۔ اِس سے پہلے صرف جوانی کا کھیل کھیلتا رہا۔

سردار!......

اُس نے زَہر خند ہنسی کے ساتھ کہا:

ہم تیرا اِحسان کبھی نہیں بھُول سکتے!!

☆☆☆

ایک ٹیڈی پیسا

آج سے چالیس بیالیس سال پہلے کی بات ہے، ہمارے گاؤں کا واحد ساہوکار 'لالہ برج لال' ہر پُورن ماشی کی شام کو دان دیا کرتا تھا۔ وہ اپنی دُکان تلے تھڑے پر تھیلی لے کر کھڑا ہو جاتا۔ اُس میں دھیلے اور پیسے ہوتے۔ دُکان کے اندر لالٹین جل رہی ہوتی۔ اُس کی روشنی میں اُس کا چھوٹا بھائی 'لچھورام' تکڑی ہاتھ میں لیے بوری کے فرش پر آلتی پالتی مار کر بُت بنے بیٹھا ہوتا۔

لالہ برج لال تھیلی ہاتھ میں لے کر ایک عرصے تک مُنہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا۔ اِس عرصے میں گاؤں کے بچّے تھڑے کے سامنے جمع ہو جاتے۔ جب پورن ماشی کے چاند کا اُجالا پھیلتا تو تھیلی کا منہ کھل جاتا۔ ایک بچّہ آگے بڑھتا، برج لال اُس کی ہتھیلی پر دھیلا یا پیسا رکھ دیتا۔ یہ اپنی اپنی قسمت کی بات تھی کہ کسے پیسا مِلتا ہے اَور کسے دھیلا۔ دان لے کر لڑکا لچھورام کے پاس جاتا اَور کھیل، ریوڑیاں یا پُھلیاں لے کر گھر کی راہ لیتا۔ لچھورام سَودا دیتے وقت ڈنڈی ضرور مارتا۔ جب تھیلی خالی ہو جاتی، تو لالہ مجھ سے پوچھتا:

تو سب سے پیچھے کیوں رہ جاتا ہے مُنّے؟ دیکھو، اَب تو تھیلی خالی ہو چکی ہے!

میں دان لینے تو نہیں آتا لالہ جی! میں تماشا دیکھنے آتا ہُوں۔

پتر منے! یہ دان تو نہیں۔ میری کیا مجال جو میں پِیروں اَور چودھریوں کے بچّوں کو دان دوں۔ گھڑی بھر کو دُکان پر بالک اکٹھے ہو جاتے ہیں تو من شانت ہو جاتا ہے۔

تب وہ عجیب طمانیت سے مسکراتا، جیسے اُس نے نِروان کی ایک کٹھن منزل کو طے کر لیا ہو۔ برج لال کے اِس رُوحانی سُرُور کو میرے ننھے سے ذہن نے یقیناً اُس زمانے میں بڑی شدّت سے محسوس کیا تھا کہ آج بھی، جب میں یہ اَفسانہ لکھ رہا ہُوں، لالہ برج لال کا چہرہ میرے سامنے موجود ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔

تاہم اَب افسانے کا جو حِصّہ شروع ہوتا ہے، اُس میں حسبِ معمول نام اَور مَقام سبھی فرضی ہیں؛ البتہ افسانہ سچّا ہے۔ اِس افسانے کی دو حقیقتوں میں ایک مَیں ہُوں اَور دوسری میرے دوست جن سے ملنے کے لیے مَیں گزشتہ جمعرات کو سڑک کے کِنارے رُک گیا تھا۔ وہ ایک قلعہ نُما دو منزلہ عمارت کی بالائی منزل

پر رہتے ہیں۔ عمارت سڑک کے کنارے واقع ہے۔ اُس کے باہر دُکانیں ہیں اَور ایک بڑا پھاٹک جس سے گزر کر ہم ایک کچّے صحن میں پہنچتے ہیں۔ اِس صحن کے اِرد گِرد مکانات بنے ہیں' اِنھیں میں سے ایک بالا خانے پر میرے دوست رہتے ہیں۔

میرے یہ دوست بڑے نستعلیق قسم کے نوجوان ہیں۔ وضع دار' شریف اَور علم دوست۔ اِنھیں اچھی کتابوں کا شوق ہے' اِن کی ذاتی لائبریری میں آئے دِن عمدہ کتابوں کا اِضافہ ہوتا رہتا ہے۔ چناں چہ میں جو صرف کتابوں کی زیارت کا شوقین ہوں' ہر ہفتے عشرے کو عمارت کے بڑے پھاٹک کے سامنے رُک جاتا ہُوں اَور ہر نو وارِد کتاب کی زیارت اَور ورق گردانی سے محظوظ ہو کر' گھر کی راہ لیتا ہُوں۔

اُس دِن پھاٹک بند تھا۔ پھاٹک کو بند دیکھ کر مَیں ٹھٹھک گیا تو ایک پوپلے مُنہ والے چھوٹے سے بوڑھے نے جن کے ہاتھ میں کیکر کی سُوکھی شاخ کی ایک بے ڈھنگی سی چھڑی تھی' مجھ سے پوچھا:

تم کِس سے مِلنا چاہتے ہو؟

معین صاحب سے!

وہ اَندر کیرات بانٹ رہے ہیں۔

خیرات بانٹ رہے ہیں معین صاحب؟

مہینے کی پہلی زمارات کو میاں چھاہب کیرات بانٹتے ہیں اِش وقت۔ بڑے نیک آدمی ہیں۔

میاں صاحب!......کون میاں صاحب؟

میں نے پوچھا۔

کون میاں چھاہب!......

پوپلے مُنہ والے بوڑھے نے ایک آنکھ بھینچ کر چِڑی ہُوئی آواز میں میری ہی بات کو دُہرایا:

اپنے میاں چھاہب ......اَور کون میاں چھاہب!

بابا جی' میں اُنھیں نہیں جانتا!

نہیں جانتے تو یہاں کیوں آئے؟......او! پیچھے ہٹو تم!

بوڑھے نے چھڑی لہرا کر ڈانٹا تو مَیں دو قدم پیچھے ہَٹ گیا۔

اَب آ گئے' ماں کے یار جب پھاٹک بند ہو چکا ہے۔ میاں چھاہب کسی کو اَندر نہیں جانے دیں گے۔

بابا جی! مجھے تو معین صاحب سے مِلنا ہے۔

ہٹو...... بھاگ چلو......نہیں جاتے تم؟

اُس نے میری طرف ایک جَست بھر کر کہا اَور چھڑی کو زور سے فُٹ پاتھ پر مارا تو مَیں واقعی خوف زدہ ہو گیا:

کوئی آگے بڑھا تو ٹانگ توڑ دوں گا حرامی کی۔

کھی...... کھی...... کھی......

میرے عقب میں ایک قہقہہ پھٹا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو سڑک پر درجن بھر ننگے بچے تھے۔ گداگر بچوں کو دیکھ کر مَیں سمجھ گیا کہ پوپلے مُنہ والے بوڑھے کے غصے کا باعِث مَیں نہیں تھا۔

بابا چڑا' بابا چِڑا......

بچوں نے پکارا۔

بوڑھا غضب ناک ہو کر بچوں کی طرف لپکا تو میں نے پھاٹک پر زور سے دستک دی۔ دو چار تھپتھپاہٹوں کے بعد پھاٹک ذرا سا کُھلا اور جھری میں سے سفید ڈاڑھی اَور ایک سُرخ سُرخ آنکھ کی جھلک دیکھ کر مَیں نے جلد جلد کہا:

میں معین صاحب سے مِلنا چاہتا ہُوں۔

گامے او گامے!

جھری میں سے ایک تحکمانہ آواز آئی۔

جی میاں چھاہب!

گامے نے سڑک پر سے پکار کر کہا۔

اِن کو اَندر نہ آنے دینا!

میاں صاحب! میں معین صاحب سے ضرور مِلنا چاہتا ہُوں۔

میں نے کہا۔

گامے او گامے!

جی میاں چھاہب......

اَب پھاٹک کے اَندر کوئی نہ آنے پائے۔ سنا؟

سن لیا میاں چھاہب' کسی کی مزال ہے جو اِس طرف کا رُخ بھی کرے۔

لیکن مَیں معین صاحب سے ضرور ملنا چاہتا ہُوں۔

کون معین صاحب؟ میں تو اُنھیں نہیں جانتا۔

جھری کے اَندر لال آنکھ بولی۔

وہ اِس عمارت کی بالائی منزل میں رہتے ہیں۔

رہتے ہوں گے۔ میں اُنھیں نہیں جانتا۔

پر مَیں تو اُنھیں جانتا ہُوں بزرگوارم...... مجھے آنے دیجیے!

نہیں جی...... آپ کو کیسے آنے دوں! پھاٹک کھل گیا تو یہ سارے حرامی بھی اَندر آجائیں گے۔ تم پھاٹک

بند ہونے سے پہلے کیوں نہ آئے؟

میاں صاحب! میں کوئی بِھک منگا تو نہیں کہ پھاٹک بند ہونے سے پہلے آتا؛ اَور اَندر کے کرایہ دار آپ کے قیدی تو نہیں کہ اُن سے ملاقات کا وقت پہلے سے مقرّر ہو!

بابُو!......

باباچِڑے نے میری پُشت پر سے کہا:

جانتے ہو کِس سے بات کر رہے ہو؟

نہیں۔

یہی تو میاں چھاہب ہیں۔ اِن شارے مکانوں کے مالک!

گامے!

میاں صاحب پھاٹک کے اَندر سے بولے۔

جی میاں چھاہب!

اِسے اَندر آنے دو...... یہ مِل لے اَپنے معین صاحب سے! تم اِن سُور کے بچّوں کو روکے رکھنا۔ کوئی اَندر آیا تو تمھاری آنکھ پھوڑ دوں گا۔

مزال ہے میاں چھاہب!

یہ کہہ کر وہ چھڑی ہِلاتے ہُوئے بِھک منگوں کے ہجوم کی طرف لپکا۔

باباچِڑا...... باباچِڑا......

بھک منگے بہ یک آواز بولے۔

ہاں ہاں، میں ہُوں باباچِڑا...... تمھاری ماؤں کا یار!

باباچِڑا، گالیاں بکتے ہُوئے بِھک منگوں کے ہجوم کو دُور بھگا لے گیا تو میاں صاحب نے بڑی احتیاط سے پھاٹک کو صرف اِتنا کھولا کہ ایک شخص اَندر داخل ہو سکے۔ میرے اَندر داخل ہوتے ہی پھاٹک کھٹ سے بند ہو گیا اَور میاں صاحب بولے:

جاؤ مِل لو اَپنے معین صاحب سے! اگلی نوچندی جمعرات کو کسی کرایہ دار سے ملنے آؤ تو چار بجے سے پہلے آنا، سمجھے؟

صحن میں گداگر عورتوں اَور بچّوں کے ہُجُوم میں کھو کر میاں صاحب کی بات کا جواب دینا بھُول گیا۔ میں نے کسی مقام پر بھک منگوں کا اِتنا بڑا ہجوم پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اِتنے مَیل، اِتنی بدبُو، اِتنی گندگی اَور اِتنے چیتھڑوں کی زد پر آ کر ناک پر رُومال رکھنا بھی بھُول گیا اَور میاں صاحب کی غضب ناک سفید ڈاڑھی اَور لال لال آنکھوں کے سِوا میرے ذہن پر اُن کے حُلیے کا اَور کوئی نقش مرتسم نہ ہو سکا۔

میں ہجوم میں رَستہ بناتے ہوئے معین صاحب کے مکان کی طرف لپکا۔ سیڑھیوں کے ایک گوشے میں لگی ہُوئی کال بیل پر میں نے اُنگلی رکھی ہی تھی کہ وہ بالکونی پر آ کھڑے ہوئے۔

کون؟...... اخاہ، آپ ہیں بھائی جان!...... اُوپر آجایئے!

میں کھٹ کھٹ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں جب معین صاحب کے پاس بالکونی پر پہنچا تو میرا سانس پھُولا ہُوا تھا۔ یُوں بھی میرا دم نہ جانے کیوں حلق میں رُک سا رہا تھا۔ یقیناً میرے چہرے پر غصے کی تمتماہٹ بھی ہوگی کیوں کہ معین صاحب مجھ سے ہاتھ مِلاتے ہی بولے:

یہ ظالم ہر نوچندی جمعرات کو یہ ڈراما ضرور رچاتا ہے۔

لیکن کسی شریف آدمی کو پھاٹک پر روکنے کا اِسے کیا حق حاصل ہے؟

میں تو حیران ہُوں بھیّا کہ اِس نے آپ کو اَندر آنے کی اِجازت کیسے دے دی! یہ ظالم تو اِس موقع پر کرایہ داروں کو اَندر نہیں گھسنے دیتا۔

اَور آپ اِس کے پاگل پن کو بطیّبِ خاطر برداشت کر لیتے ہیں!

جی ہاں، مجبوری ہے، مکان نہیں مِلتا۔ یُوں بطیّبِ خاطر نہیں، بڑی کراہت کے ساتھ بھیا! میں تو اِس وقت یہاں سے کھسک جایا کرتا ہُوں۔ میں تو اِس ایک گھنٹے کو جان بُوجھ کر اَپنے معمولات میں سے خارج کر لیتا ہُوں۔ ایک بار دیکھ کر اَب مَیں اِس ڈرامے کو دوسری بار دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتا۔ آج غالب کے نسخۂ عرشی کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ وقت کا احساس نہ رہا۔ آیئے اَندر چلیں۔ نسخۂ عرشی کی نئی سج دھج ملاحظہ فرمایئے کہ کس سلیقے اَور صحّت سے چَھپا ہے۔ آپ دیکھ کر خوش ہوں گے۔

نہیں......

کیوں بھیا؟

میں آج کا ڈراما دیکھنا چاہتا ہُوں!

اپنے وضع دار دوست کے حسّاس چہرے پر تلخی کی ایک کم محسوس لہر دیکھ کر مَیں رُک گیا۔ میں نے سمجھا وہ میرے اِنکار پر رنجیدہ ہُوئے ہیں۔ میں نے کہا:

عزیزم! معاف کرنا۔ میں نے آپ کے جذبات کو نادانستہ طور پر مجروح کیا۔ میں تو حسبِ معمول کسی نئی زیارت ہی کو آیا تھا، آیئے اَندر چلیں!

جی نہیں...... یہ بات نہیں...... آیئے، یہ ڈراما نیچے چل کر دیکھیں! ڈراما دیکھ کر آپ میرے جذبات کی تلخی کی وجہ سمجھ جائیں گے۔

ہم سیڑھیاں اُتر کر صحن میں آئے اَور ہجوم سے ذرا ہَٹ کر کھڑے ہو گئے۔ اُس وقت میاں صاحب ہجوم میں ترتیب پیدا کرنے میں مصروف تھے۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، ہجُوم بے ترتیبی کا شِکار تھا اَور سارے بھک منگوں کی نگاہیں خاکی زِین کی اُس تھیلی پر لگی ہُوئی تھیں جو میاں صاحب کے ہاتھ میں تھی اَور جس سے وہ ہجوم

میں ضبط قائم کرنے کا کام لے رہے تھے۔ وہ کبھی ایک بھک منگے کے پیچھے تھیلی لہراتے ہوئے دوڑتے، کبھی دوسرے کا تعاقب کرتے تھے۔ اِس سے قبل کہ میں اُس منظر کی تفصیل پیش کروں، میاں صاحب کا حُلیہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہُوں۔

وہ میانہ قد کے آدمی تھے، نہایت پراگندہ ڈاڑھی کی وجہ سے وہ محترم اَور مقتدِر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اُن کے کپڑے مَیلے تھے اَور کالی واسکٹ کی جیبیں پھٹی ہُوئی تھیں۔ سَر پر ایک مَیلی اَور چکنی رُومی ٹوپی تھی جس کا پُھندنا اُن کی ذراسی حرکت پر سَو سَو بَل کھا جاتا۔ میں اُن سے اگر ایسے ہی کسی ہجوم میں کسی اَور مقام پر مِلتا تو اُنھیں بھی بِھک منگا ہی سمجھتا۔ ایک بہت بڑی عمارت کے مالک کی حیثیت سے اُن کا پہچاننا اَب بھی میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ ایسے حُلیے کا آدمی پُھندنا لہراتے ہوئے صحن میں دوڑ لگاتا پھرے تو ہنسی کا آنا یقینی ہے۔ لیکن اِس پس منظر میں، مَیں اُن کی اِن حرکات سے بھی محظوظ نہ ہو سکا۔ اُن کی ٹُوٹی پھُوٹی چپّل سے پٹاک پٹاک کی آواز آتی اَور اُن کے دوڑنے سے صحن میں غبار کے مرغولے اُٹھتے اَور جب تھیلی کسی گداگر کے کندھے پر لگتی تو درد کی ٹیس میرے دِل سے اُبھر کر ہونٹوں پر آجاتی۔

وہ بار بار کڑک کر کہتے:

تمھیں ہر بار سمجھانا پڑتا ہے سُور کے بچّو! قطار باندھ کر اپنی اپنی جگہ پر کھڑے کیوں نہیں ہو جاتے!

او کانچو، تُو قطار سے باہر کیوں کھڑا ہے؟ لگاؤں تھیلی تیرے سَر پر!

وہ گداگر جس کی آنکھ میں بڑا ساز خم تھا، بولا:

میاں صاحب! یہ لنگڑُو مجھ سے آگے کیوں کھڑا ہو گیا ہے؟

او لنگڑ دین! اپنی جگہ پر آجا، نہیں تو دُوسری ٹانگ بھی توڑ دُوں گا تیری۔

لنگڑ دین کی ایک ٹانگ کسی اناڑی بڑھئی نے بنائی تھی۔ وہ چیختی چِلاتی ٹانگ کے ساتھ ایک نمبر پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔

مرد ایک طرف، عورتیں ایک طرف، بچّے ایک طرف!

مردوں کی صف پر ایک نظر ڈال کر میاں صاحب مطمئن ہو گئے۔ پھر وہ عورتوں کی صف کی طرف متوجّہ ہوئے۔ عورتوں کی صف میں کھڑی ایک بارہ تیرہ سال کی گداگر لڑکی کو دیکھ کر اُن کی جُنُونی آنکھ میں غُصّہ چمکا:

اُدھر جاؤ بچّوں کی صف میں!

دیکھو تو میاں جی! اَب مَیں کتنی بڑی ہو گئی ہُوں۔

لڑکی نے ٹھنک کر کہا۔

ٹرٹر کرتی ہو...... جاؤ اُدھر!

نہیں ...... میں نہیں جاؤں گی میاں جی! میں کوئی بچّہ تھوڑی ہُوں۔

نہیں جائے گی تُو؟

میاں صاحب اُس کی طرف لپکے۔

لڑکی اپنی جگہ سے نہ ہلی تو اُن کا غصہ آگ کا شُعلہ بن گیا۔ اُنھوں نے تھیلی ہَوا میں لہرائی۔ تھیلی چھن سے لڑکی کے کندھے پر پڑنے والی تھی کہ وہ پھُرتی سے وار بچاگئی۔

کھی...... کھی...... کھی......

بچّوں کی صف نے دبا دبا سا قہقہہ لگایا۔

نہیں جائے گی تُو؟ تیری میّا بھی جائے گی' تیری نانی بھی جائے گی' تیری دادی بھی!

ہر فقرے کے ساتھ وہ تھیلی ہَوا میں لہراتے۔ ہر بار لڑکی چوٹ سے بچ جاتی۔ تب ایک وار کو روکنے کے لیے اُس نے ہاتھ بڑھایا تو تھیلی چھَن سے اُس کے ہاتھ پر پڑی۔ لڑکی درد کی شِدّت سے بِلبِلا اُٹھی۔ چوٹ اُنگلیوں پر لگی تھی۔ اُس نے اُنگلیاں مُنہ میں دبالیں۔

ظالم!...... اِس سے پوچھو تو' یہ کیسا طریقہ ہے خیرات بانٹنے کا؟ بے چاری لڑکی کو زخمی کر دیا' اِس پاگل بوڑھے نے!

میرے دوست نے گلوگیر آواز میں کہا۔

جاؤ اُدھر!

میاں صاحب کڑکے۔

جاتی ہُوں میاں صاحب!

لڑکی نے جواب دیا۔

سب سے پیچھے کھڑی ہو جاؤ گستاخ' تیری یہی سزا ہے!

وہ لڑکی ہم سے قریب آکر بچّوں کی قطار کے آخر میں کھڑی ہوگئی۔ اُس کا مَیلا مَیلا چہرہ ابھی تک چوٹ کے کرب میں مبتلا تھا اور اُس کی بھیگی ہُوئی آنکھوں کا غرور کُچلے ہُوئے سانپ کی طرح بَل کھا رہا تھا۔ مجھے یُوں لگا جیسے ابھی اُس کا غصہ لاوا بن کر اُبلے گا اور ساری دُنیا اِس کی لپیٹ میں آجائے گی۔ میں خوف سے کانپ گیا لیکن اَب میاں صاحب نہایت مطمئن تھے۔ وہ شکست خُوردہ لڑکی کو فاتحانہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ گداگروں کا ہجوم خاموش تھا۔

میاں صاحب نے پھاٹک کی طرف مُنہ کر کے کہا:

گامے اَندر آ جاؤ!

گاما بڑی احتیاط سے پھاٹک کھول کر اَندر آیا تو بھکاری بچّے بے اِختیار بول اُٹھے:

بابا چڑا...... بابا چڑا......

چپ رہو حرام زادو!

میاں صاحب کڑکے اَور ہجوم پھر چُپ ہو گیا۔

تب وہ پھاٹک کے قریب کھڑے ہو گئے۔ آہستہ آہستہ تھیلی کا مُنہ کھلا۔ میاں صاحب نے اِشارہ کیا۔ پہلے مردوں کی صف حرکت میں آئی۔ سب سے اگلا بھک منگا آگے بڑھا۔ میاں صاحب نے ایک سِکّہ اُس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ بابا چڑے نے ذرا سا پھاٹک کھولا اَور گداگر باہر چلا گیا۔ پھر دوسرا آیا پھر تیسرا؛ مَردوں کے بعد عورتوں کی باری آئی، عورتوں کی قطار ختم ہُوئی تو بچّوں کی باری آئی۔ بچوں کی صف قریب الاختتام تھی کہ میں نے کہا:

معین بھائی! مجھے اِجازت دیجیے!

کیوں بھیا! نسخۂ عرشی ملاحظہ نہیں فرمائیں گے؟

نہیں بھائی!

کیوں؟

تماشائے اہلِ کرم دیکھنے کے بعد غالب سے آنکھیں مِلانے کی جرأت کہاں سے لاؤں!

ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ۔ اچھا خدا حافظ! لیکن ابھی رَستہ صاف نہیں ہُوا۔ چند لمحوں تک رُکنا پڑے گا۔

آیئے، پھاٹک کے قریب پہنچیں!

ہم پھاٹک کے قریب پہنچے تو میاں صاحب کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ اُنھوں نے ہمیں بڑے غور سے دیکھا اَور پھر لحظہ بھر کو مسکرائے۔ اُن کی نگاہوں سے چھلکتی ہُوئی طمانیت میری یادوں کے حِصار میں دُور تک چھید کرتے چلی گئی تو میں پریشان سا ہو گیا، جیسے خیرات لینے کے لیے ہر ہاتھ میری طرف سے بڑھا ہو اَور سفید رِیش مخیّر بزرگ کی خیرات کا سارا بار میرے کندھوں پر آ پڑا ہو اَور لالہ برج لال نے مسکرا کر کہا ہو:

منے اَب تو دان لیتے ہُوئے تمھیں لاج نہیں آئی ہو گی!

میں نے پھاٹک سے نکل جانے کے لیے ایک قدم بڑھایا تو میاں صاحب بولے:

یہیں ٹھہرو ذرا! جب تک صحن خالی نہیں ہوتا، پھاٹک نہیں کھلے گا۔

میاں صاحب کی آواز میں نرمی تھی، پر میرے پاؤں زمین سے چپک گئے تھے۔ اِس اثنا میں میاں صاحب کی تھیلی قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔ بھک منگے بچوں کی ہتھیلی پر کوئی سِکّہ رکھنے کے لیے اُنھیں کافی دیر تک تھیلی کو اَندر سے ٹٹولنا پڑتا۔ سب سے آخر میں لڑکی کی باری آئی تو اُس نے بے تابی سے ہاتھ پھیلا دیا۔ میاں صاحب نے

تھیلی اُس کے ہاتھ پر اُلٹ دی۔ اور ایک ٹیڈی پیسا اُس کی ہتھیلی پر ٹِک کر ایک لحظے کو چمکا تو میاں صاحب کھل کھلا کر ہنس پڑے جیسے تھیلی کا یہ مذاق اُنھیں بہت پسند آیا ہو۔ لڑکی چند لمحوں تک ہتھیلی پر ٹِکے ہوئے ٹیڈی پیسے کو غور سے دیکھتی رہی۔ دھیرے دھیرے اُس کی آنکھوں کا غصہ چمکا اور تب وہ زار و قطار رو پڑی۔

اُس نے سسکی بھر کر کہا:

ایک ٹیڈی پیسا!

تو اور پانچ کا نوٹ تیری ہتھیلی پر رکھ دُوں؟

میاں صاحب بولے۔

لڑکی نے ٹیڈی پیسا زور سے میاں صاحب کے مُنہ پر دے پھینکا۔ ٹیڈی پیسا اُن کے ماتھے پر لگا۔ اِتنے کم وزن سِکّے کی مار پر نہ چھن کی آواز آئی اور نہ میاں صاحب کو چوٹ لگی۔ البتہ وہ بوکھلا کر ماتھا سہلانے لگے تو لڑکی بابا چڑے کی مزاحمت کے باوجود بڑی پھُرتی سے پھاٹک کھول کر باہر نکل گئی اور چڑا اُسے دیکھتا رہ گیا۔

گامے، پکڑو اِس حرام زادی کو!

اُنھوں نے ماتھا سہلاتے ہُوئے چیخ کر کہا۔

چڑا لڑکی کے پیچھے بھاگا تو میاں صاحب نے اپنے پاؤں میں گِرے ہوئے ٹیڈی پیسے کو بڑی شفقت سے زمین پر سے اُٹھایا اور قمیص کے دامن سے پُونچھ کر اُسے تھیلی میں ڈال لیا۔ اِس کے بعد وہ ہماری موجودگی سے باخبر ہوئے۔ اُنھوں نے معین صاحب کی طرف دیکھ کر بڑے دُکھ بھرے لہجے میں کہا:

دیکھا تم نے! گشتی کی نظروں میں ایک ٹیڈی پیسے کی کچھ حقیقت نہیں۔ اَب یہ خیرات لینے آئی تو یہی ٹیڈی پیسا اِس کی...... پر داغ دُوں گا۔

بزرگوارم! خُدا نہ کرے، آپ کو یہ موقع ملے۔ البتہ فی الحال یہی بہتر ہے کہ آپ اِس ٹیڈی پیسے کو تپا کر اپنی پیشانی کو داغ لیجیے گا۔ اِنشاء اللہ یہ داغ قیامت تک نہیں مٹے گا!

معین صاحب نے بڑے اِطمینان سے کہا اور میرے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنے مکان کی طرف چلے گئے۔

☆☆☆

باپ بیٹے

بابو نبی بخش ظہور جب چھتری لگائے جدّت ہائی سکول کے پھاٹک کے قریب سے گزرے تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک گئے۔ اُن کا خیال تھا، اگر نجیب ارسلان ظہور کہیں مل جائے تو اُسے چھتری کے سایۂ عاطفت میں شریک کرلیں۔ پھر اُنھیں خیال آیا کہ اَب اڑھائی بج چکے ہیں۔ سکول کب کا بند ہو چکا ہے اَور نجیب گھر پہنچ چکا ہوگا...... یہ اُن کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ یہ نویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ اِس لڑکے سے اُنھیں بہت پیار تھا۔ یہ ہے بھی فطری بات کہ سب سے چھوٹی اَولاد بہت پیاری ہوتی ہے۔ بڑی اَولاد بلوغت کے دور سے گزرتے ہی اَپنے آپ میں گم ہو جاتی ہے۔ مہ وسال کا دھارا کچھ نہ کچھ رُخ ضرور تبدیل کر لیتا ہے اَور پیار کے سنگم پر ماں باپ اَور بیٹوں بیٹیوں میں تفرقہ پڑ جاتا ہے۔ یُوں بابو نبی بخش ظہور بچّوں کی محبّت میں نہایت معتدل واقع ہُوئے تھے۔

ابھی وہ اَپنے محلے کی گلی میں داخل نہ ہوئے تھے کہ نجیب سائیکل پر سوار اُن کے قریب سے گزر گیا۔ سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ تاہم نجیب جس اَنداز سے سائیکل چلا رہا تھا، وہ خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اِس انداز میں بڑا البیلا پن تھا، جیسے نجیب ساری سڑک کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہو۔ یہ سائیکل اُسے کہاں سے ہاتھ لگی؟ اُن کے گھر میں صرف ایک سائیکل تھی جو خالد ظہور کی تحویل میں تھی اَور خالد ظہور کسی کو اِجازت نہیں دیتا تھا کہ اُسے کوئی ہاتھ بھی لگائے۔ اُنھوں نے سوچا: "یہ معمہ گھر جا کر حل ہوگا"۔

مئی کی لُو اَور گرمی سے وہ خاصے پریشان تھے۔ دفتر وہ پیدل جاتے تھے اَور وہاں سے پیدل واپس آتے تھے۔ سردی ہو یا گرمی، اُن کے معمول میں کوئی فرق نہ آتا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اِس طرح صحت قائم رہتی ہے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے پُوچھا:

نجیب کے پاس سائیکل کہاں سے آئی؟

سائیکل؟

اُن کی بیوی نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہاں! ہاں! تم نے اُسے کہیں بھیجا ہے؟

نہیں تو...... اُس نے سکول سے واپس آ کر کھانا کھایا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں' وہ چھلاوا ہے چھلاوا...... گھر تو ایک لمحے کو نہیں بیٹھتا۔

کہیں خالد نے اُسے کسی کام کو نہ بھیجا ہو؟

خالد ابھی تک دفتر سے نہیں آیا۔

وہ کپڑے اُتارنے کے لیے بیٹھک میں چلے گئے تو اُن کی بیوی نے سوچا: ''آج نجیب کی خیر نہیں' اُسے کتنی بار کہا ہے کہ دوپہر کو باہر نہ نکلا کرے۔ وہ دوپہر کو نہ سوتا ہے' نہ پڑھتا ہے۔ برآمدے میں ٹاٹ بچھا کر بیٹھا رہتا ہے۔ جب تک دوپہر نہیں گزرتی' گھڑی گھڑی صحن کا دروازہ کھول کر باہر جھانک لیتا ہے۔ اُس کی رُوح کتنی بے چین ہے! پڑھنے میں اُس کا جی نہیں لگتا۔ بس کھیل کود سے رغبت ہے''۔

بابُو صاحب نے کھانا کھایا اور قیلولہ کرنے کو لیٹ گئے۔ لیٹتے ہی اُنھیں نیند آ گئی۔ اِس عرصے میں نجیب دبے پاؤں اَندر آیا تو ماں نے ہونٹوں پر اُنگلی رکھ کر اُسے خاموش رہنے کو کہا۔ اُس نے ماں کو بڑی شرارتی نظروں سے تک کر کہا:

کیا بات ہے ممّی ڈیئر؟

اُنھوں نے بُرا سا مُنہ بنا کر کہا:

تیرے ابّا اَندر سو رہے ہیں۔

ڈیڈی ساؤنڈ سلیپ......گُڈ!

کہاں جا رہے ہو نجے؟

ماں نے پوچھا۔

کہیں بھی نہیں۔ یہیں برآمدے میں بیٹھ کر پڑھوں گا سویٹ ممی!

کوئی بات تو سلیقے سے کرو نجیب۔

وَیری گڈ ممی۔

مجھے ممی نہ کہو......!

علی اپنی ماں کو ممی کہتا ہے۔

کہتا رہے' تجھے اِس سے کیا؟ وہ بھی تیری طرح نالائق ہو گا۔

نہیں تو......وہ تو انگریزوں کی طرح فر فر انگریزی بولتا ہے۔

بولتا رہے' پر ہے وہ کون؟

امی! وہ اِس کی انگریزی کی کتاب میں ہے۔

ثمینہ نے کہا۔

اَور نجیب کِھل کِھلا کر ہنسا۔
تو نے اُس سائیکل کا کیا کِیا؟
کون سی سائیکل؟......
نجیب نے مصنوعی حیرت کا اِظہار کرتے ہُوئے کہا۔
وہی جس پر سوار ہو کر تم سڑک کے بیچوں بیچ لفنگوں کی طرح چلتے رہے۔
وہ میرے فرینڈ اسلم کی سائیکل ہے۔
تمھارے ابّا نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔
وَیری بَیڈمی......اَب کیا ہو گا!
اَیسا کرو کہ اَب پڑھنا شروع کر دو، جب وہ جاگیں گے تو تمھیں پڑھائی میں مصروف دیکھ کر اُن کا غصہ اُتر جائے گا۔
ڈیڈی وَیری اینگری؟
میرے ساتھ انگریزی نہ بولو نجے، اُن کے ساتھ بول لینا!

نجیب برآمدے میں ٹاٹ بچھا کر بیٹھ گیا۔ اُس کی ماں اَور ثمینہ آرام کرنے کی غرض سے اندر چلی گئیں۔ برآمدے میں سرکنڈوں کی چِقوں کے باوجود گرمی تھی لیکن یہاں روشنی تھی اَور کمروں میں اندھیرا تھا، تاہم وہاں پنکھا تو چل رہا تھا اَور کچھ خنکی بھی تھی۔ یُوں بھی وہ دوپہر کو سو نہیں سکتا تھا، اَور اِتنی گرمی میں سکول کا کام کرنا بھی مشکل تھا۔ اُس سے بڑا بھائی طارق بالا خانے میں تھا۔ وہاں بھی شدید گرمی تھی۔ خالد بھائی ابھی دفتر سے نہیں آئے تھے۔ وہ صبح جاتے اَور شام پڑے گھر آتے۔ ڈیڈی اُنھیں کچھ نہ کہتے تھے۔ گھر کی واحِد سائیکل بھی اُن کے قبضے میں تھی۔ نجیب کو اِتنی بھی اِجازت نہیں تھی کہ اُسے ہاتھ ہی لگا سکے اَور آج ڈیڈی نے اُسے سائیکل چلاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ پتا نہیں، ڈیڈی کس زمانے کے آدمی ہیں! لاہور میں تو اُس سے بھی چھوٹے چھوٹے بچے سکوٹر چلاتے ہیں اَور اُسے سائیکل چلانے سے بھی روکا جاتا ہے، آخر کیوں؟ آج اُس کی شامت آئے گی اَور ضرور آئے گی۔

تب اُسے خیال آیا کہ پانچ بجے شام نجیب کلب اَور ناصر کلب کا کرکٹ میچ بھی ہے اَور بڑے معرکے کا میچ ہے۔ اگر آج ڈیڈی کو پتا لگ گیا کہ اُس نے اَپنے نام کی کلب بنالی ہے تو وہ ناراض ہوں گے اَور اُسے یُوں جانے کی اِجازت نہ دیں گے۔ دوستوں میں اُس کی بھدّ اُڑے گی۔ یوں بھی وہ دوستوں میں ڈرپوک مشہور ہے، کیوں کہ وہ اَپنے ماں باپ سے ڈرتا ہے اَور اُن کا کہا مانتا ہے اَور اُس کے دوسرے دوست گھریلو پابندیوں کی بالکل پروا نہیں کرتے اَور مار پیٹ سے بھی نہیں ڈرتے۔

یکایک دروازہ کھلا اور بابو جی باہر برآمدے میں آ گئے۔ نجیب فرش پر بیٹھا بیٹھا اُونگھ رہا تھا۔

نجیب!

اُس نے یکایک بے دار ہو کر کہا:

ڈَیڈ...... نہیں ابّا جان۔

تم اَندر کمرے میں کیوں نہیں سوتے؟

مجھے دو پہر کو نیند نہیں آتی جی۔

سکول کا کام کر رہے تھے؟

نہیں تو ڈَیڈ...... ابّا جان!

شاباش!

اُس نے ابّا جان کی طرف دیکھا تو وہ مسکرانے لگے۔ نجیب کی جان میں جان آئی تو اُس نے کہا:

ڈیڈ...... اَبا جان، شاباش کس کی؟

سچ بولنے کی۔ آج دو پہر کو تمھارے پاس کس کی سائیکل تھی؟

میرے ایک فرینڈ...... جی میرے ایک دوست کی۔

اِتنی دُھوپ میں تم بازار کے پھیرے لگا رہے تھے، تمھیں لُو لگنے کا بھی ڈر نہیں تھا؟

نہیں تو۔

دیکھو نجیب! اِن دِنوں سَن سٹروک کا ڈر ہوتا ہے۔ دو پہر کو باہر نہ پھرا کرو۔

وَیری وَیل ڈیڈ...... جی نہیں! بہت اچھا اَبا جان!

بابو جی پھر مسکرائے تو نجیب کو یقین ہو گیا کہ ڈیڈی خوش گوار مُوڈ میں ہیں۔ اُس کا حوصلہ بڑھا تو اُس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں آج سہ پہر کے کرکٹ میچ کی اِجازت ہی کیوں نہ طلب کرلوں اُن سے!

اُس نے کہا:

آج کرکٹ کا میچ ہے۔

تمھارے سکول میں؟

جی نہیں...... ہمارے سکول میں کوئی گراؤنڈ نہیں۔

پھر کہاں کھیلنے جاؤ گے؟

یہیں محلے میں۔

یہاں کوئی کھیل کا میدان ہے؟

ہے تو سہی...... ہم ایک کھیت میں کھیلتے ہیں جی!

وہ کھیت کہاں ہے؟

گندے نالے کے پرلی طرف، بند والی سڑک سے ذرا اُدھر ہٹ کر۔

وہاں تو بڑی بدبُو ہوتی ہے۔

یہ کہہ کر اُنھیں خیال آیا کہ بدبو کہاں نہیں ہے۔ میرے مکان کے ساتھ ہی تو گوجروں کا ڈیرا ہے۔ اِس محلّے کی کون سی گلی ہے جہاں گائے بھینسوں کا گوبر نہیں! ہر خالی پلاٹ گوجروں کے قبضے میں ہے۔ سڑک پر کہیں تانگے کھڑے ہیں، کہیں گھوڑے بندھے ہیں، سوکھے گوبر اَور لید کا مِلا جُلا سُفوف ہر طرف اُڑتا پھرتا ہے۔

اچھا بھئی اِجازت ہے۔

بابو جی نے خوش دِلی سے مسکرا کر کہا۔

ڈیڈی دی گریٹ!

نجیب نے نعرہ مارا اَور اُن کی پیشانی پر بل آ گیا۔

نجیب اُن کے سامنے سے کھسک گیا تو اُنھوں نے سوچا: ''نجیب کی گفتگو کا اَنداز بدل گیا ہے، حالاں کہ وہ جس سکول میں پڑھتا ہے، وہاں ذریعۂ تعلیم اُردو ہے''۔

نجیب ارسلان ظہور نے بابو جی کی وقتی اِجازت کو مستقل سمجھ لیا۔ وہ ہر سہ پہر کو بِلا کھٹکے، کھیلنے کے لیے چلا جاتا۔ چند دِنوں تک بابو جی کو اُس کی غیر حاضری ذرا نہ کھٹکی تو ایک دِن خالد ظہور نے کہا:

ابا جی! آپ نے نجیب کو بہت زیادہ آزادی بخش دی ہے۔

کیسے؟

وہ ذرا حیران ہُوئے۔

وہ شام تک گھر سے غیر حاضر رہتا ہے اَور آپ پریشان نہیں ہوتے؛ حالاں کہ جب مَیں اِس کی عُمر کا تھا، ایک دِن، صرف ایک دِن گھر لیٹ آنے پر آپ نے چھتری سے میری پٹائی کی تھی۔

سبحان اللہ، کتنا اچھا حافظہ ہے تمھارا!

بابو جی طنزیہ اَنداز میں بولے۔

جی ہاں! اَور اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں کتابی کیڑا بن گیا اَور کسی کھیل کی شُدبُد بھی حاصل نہ کر سکا۔

تم میری پہلی اَولاد تھے، میں نے تمھاری طرف زیادہ توجّہ دی۔ یہ فطری بات ہے۔

ابا جی! نجیب بھی آپ کی توجّہ کا مستحق ہے۔

یقیناً۔ آج جب وہ کھیل کر آئے تو اُسے مجھ سے ضرور ملوانا!

اُنھیں خالد ظہور پر ہلکا سا غصہ آیا۔ وہ اُنھیں اُن کے فرض سے آگاہ کرنے کی جسارت کر رہا تھا۔ غصے کی ہلکی سی لہر سے اُن کے ماحول میں تھوڑی سی ژولیدگی پیدا ہوئی۔ تب پیچ در پیچ سوچ کی ایک گنجلک کھلی تو وہ زیرِ لب مسکرائے۔ خالد ظہور ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ جب خالد ظہور اُن کے ہاتھ آیا تھا، تو وہ

اُس ظروف ساز کا رُوپ دھار چکے تھے جس نے چاک پر پہلی مرتبہ گندھی ہُوئی مٹی چڑھائی ہو اَور وہ اِس ظرف کو نہایت مکمل و اکمل بنانے کی سعی میں مصروف ہو گئے تھے‘ حالاں کہ یہ اُن کی غلطی تھی۔ فطرت تکمیل نہیں چاہتی۔ اُن کی تخلیق اُن سے مطمئن نہیں تھی‘ وہ مسکرائے۔

خالد ظہور کے بعد طارق ظہور وجود میں آیا تو اُن کا شوقِ تکمیل کچھ دِھیما پڑ چکا تھا اَور اَب جب نجیب کی باری آئی تو اُن کا شوقِ تکمیل کچھ بجُھ کر رہ گیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ میں نے گھر میں ایک سازگار ماحول پیدا کر دیا ہے۔ خالد ظہور کی صورت میں ایک نمونہ موجود ہے۔ خود کار چاک چل رہا ہے اَور تخلیق کا بُت اَپنے آپ ڈھلتا رہے گا‘ لیکن...... لیکن...... وہ اپنی سوچ کے سِروں کو اُلجھتے ہوئے دیکھ کر ذرا سا پریشان ہوئے تو خالد ظہور نے پوچھا:

اَبا جان‘ آپ کو پروموشن کب مل رہی ہے؟

مجھے؟ کون سی پروموشن؟ اپنے وقت پر مل ہی جائے گی۔ ابھی ابھی تو سپرنٹنڈنٹ ہُوا ہُوں اَور اللہ کا شکر ہے کہ درجہ دوم کا گزیٹڈ اَفسر ہُوں۔

میرا مطلب ہے کسی ایسی پوسٹ پر آیئے نا‘ جہاں آپ مجھے بھی کچھ فائدہ پہنچا سکیں!

میں تمھارا مطلب نہیں سمجھ سکا خالد میاں!

آپ کسی ایگزیکٹو پوسٹ پر ہوتے یا سیکشن آفیسر ہی بن جاتے تو آپ......

جہاں تک مجھے معلوم ہے‘ تمھاری ترقی کا اِنحصار محکمانہ اِمتحانات میں کامیابی پر ہے۔ میرا مطلب ہے تمھاری محنت......

محنت نہیں اَبا جان! پُش اینڈ پُل کام آتی ہے۔

میں نہیں سمجھا خالد بیٹا!

کوئی پیچھے سے دھکیلنے والا ہو اَور آگے سے کھینچنے والا‘ تو ترقی کی گاڑی چلتی ہے۔

یہ تو کوئی بات نہ ہوئی خالد میاں۔ دوسرے کے سہارے پر چلنا گویا......

وہ بات کہتے کہتے رُک گئے۔ اُن کی نظر اَپنے ماضی کی طرف چلی گئی۔ وہ اِس محکمے میں بی اے پاس کرنے کے بعد ملازم ہوئے تھے۔ وہ اَپنے محکمے کی ضلعی برانچ میں لگے تھے۔ انگریز کا دَور قریب الاختتام تھا۔ آزادی کا سُورج طلوع ہونے والا تھا۔ وہ دِل سے پکے مسلم لیگی تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان بنے گا تو مسلمان اَیسے معاشرے کی تعمیر کریں گے جہاں انصاف‘ مساوات‘ دیانت اَور صداقت کا دَور دَورہ ہو گا...... تقسیم کے وقت ہندو ملازموں کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہُوا تھا‘ وہ اُنھیں جیسے وطن دوست ملازمین کی خدمت اَور اَہلیت سے پُر ہُوا...... وہ بہت خوش تھے کہ اَب وہ آزاد وطن کے آزاد ملازم ہیں۔ کام بھی

اُنھوں نے نہایت تن دہی سے کیا۔ ایک اُصول، ایک نصب العین کی روشنی میں وہ منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ ضلعی دفتر سے ڈویژن کے دفتر میں آئے۔ تب سے اب تک وہ کچھوے کی چال چل رہے تھے۔ اُن کے کئی ساتھی آبادکاری کے محکمے میں چلے گئے۔ وہ اَفسر بنے۔ کسی کے پاس کوٹھی کار ہے، کوئی نوکری چھوڑ کر بزنس میں چلا گیا اَور لاکھوں میں کھیلتا ہے...... اُن سے کئی جونیئر لوگ اَب اُن کے اَفسر تھے اَور وہ دفتر کی چکّی میں پِس رہے تھے۔ اُنھیں اب تک اسسٹنٹ سیکرٹری تو ہونا چاہیے تھا۔ وہ کون سی چیز تھی جس کی کمی اُن میں تھی؟ محنت کی...... نہیں...... دیانت کی...... نہیں...... پش اینڈ پل کی؟...... شاید...... ممکن ہے، خالد ظہور ٹھیک ہی کہہ رہا ہو...... وہ جونیئر لوگ جو اُن کے اَفسر ہیں، اُن سے آنکھ نہیں مِلاتے...... ترقی کی گاڑی کے اِن دو۲ پہیوں کے ساتھ!...... نہیں...... وہ مجھ سے زیادہ موقع شناس تھے۔ موقع سے فائدہ اُٹھانے میں کیا ہرج ہے؟...... پر موقع بھی تو ہر ایک کو نہیں ملتا...... آج اُنھیں اچانک محسوس ہُوا کہ گزشتہ چوبیس برس کی دَوڑ میں وہ وہیں کھڑے تھے، جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے...... اُنھیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اُن کے حق کا استحصال ہوتا رہا ہے...... اَپنے اِس بے داغ کیریئر کے باوجود...... نہیں، نہیں...... اُنھوں نے اپنی چونکی ہُوئی حسِّ محرومی کو تھپک تھپک کر سُلانا چاہا تو وہ ایک کسک بن گئی اَور...... عین اُس وقت طارق ظہور بھی دبے پاؤں اُوپر سے نیچے اُتر آیا، اُن کی توجّہ اُس کی طرف مبذول ہوگئی۔

طارق میاں! تم سے تو ملاقات ذرا کم ہی ہوتی ہے۔

اُس نے صرف مسکرانے پر اِکتفا کی تو بابوجی نے کہا:

تمھاری والدہ کو شکایت ہے کہ تم کچھ عرصے سے باقی لوگوں سے الگ تھلگ رہنے لگے ہو۔

یہ چِلّہ کاٹ رہے ہیں اَبا جان!

خالد ظہور نے ہنس کر کہا۔

بابوجی نے طارق ظہور کے سراپے پر نظر ڈالی تو اُنھیں کچھ تبدیلیوں کا احساس ہُوا۔ ایک تو یہ کہ اُس کے کپڑے کچھ مَیلے مَیلے سے تھے اَور دوسری بات یہ کہ اُس کی قلمیں لمبی ہوگئی تھیں، مُونچھوں کا اَنداز بدل گیا تھا اَور سَر کی حجامت بڑھی ہُوئی تھی۔ اَب تو خیر وہ گھر کے کپڑے پہنے ہوئے تھا، لیکن آہستہ آہستہ یاد آیا کہ کالج کے لباس میں وہ صاف اَور اِستری شدہ کپڑوں سے کچھ بے نیاز سا نظر آنے لگا تھا۔ یہ تبدیلی اچانک نہیں آئی تھی۔ اچانک تبدیلی کو وہ فوراً بھانپ جاتے۔ ممکن ہے یہ گزشتہ برسوں کے بحران کا نتیجہ ہو جس میں پوری قوم گرفتار رہے۔ اُنھوں نے اَپنے خیال کی تلخی سے بچنے کے لیے پوچھا:

طارق! تم لباس اَور وضع قطع میں مجھے قدرے بدلے بدلے سے کیوں محسوس ہوتے ہو؟

نہیں تو۔

کچھ فرق تو ہے' لباس کے معاملے میں تم خاصے رکھ رکھاؤ کے قائل تھے' اَب یہ تمھاری بے نیازی کچھ کھَلتی ضرور ہے۔

اَبا جان! یہ ہپّی کبھی دیکھے آپ نے؟

خالد نے پوچھا۔

وہ غیر ملکی درویش سے لڑکے؟

بابو جی نے پوچھا۔

جی ہاں!

لیکن طارق میاں کا اُن سے کیا تعلق؟

یہ تو طارق سے پوچھیے۔

لیکن اِس اَثنا میں طارق ظہور اُن کے پاس سے اُٹھ کر بالائی منزل پر چلا گیا تھا۔ بابو جی صحن میں ٹہلنے لگے۔ خالد بھی چھت پر چلا گیا' کیوں کہ نیچے اُمس بڑھ گئی تھی۔ تب نجیب بلاّ اُٹھائے گھر میں یوں داخل ہُوا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ اُس نے صحن کا دروازہ اِس زور سے بند کیا تھا کہ بابو جی چَونک گئے تھے۔ صحن میں شام کا ہلکا سا اندھیرا چھا گیا تھا۔ اُس نے آتے ہی ٹِک برآمدے کا بلب سوِچ آن کر دیا تھا جیسے وہ اندھیرے سے گھبرا رہا ہو۔

کیوں بھئی کیا بات ہے؟

بابو جی نے جِھلاّئی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

نجیب کلب چار وِکٹوں سے جیت گئی۔

کون نجیب کلب؟

نجے!......

برآمدے کے اُس کونے سے' جہاں سَرکنڈوں کی چِق کے پیچھے تیل کا چُولھا جَل رہا تھا' اُس کی ماں نے ذرا خائف سی آواز میں اُسے پکارا:

یس ممی!

اِدھر آؤ۔

آیا۔

اماں نے سرگوشی میں نجیب سے کچھ بات کی تو سارے ماحول نے چُپ سادھ لی۔ تب وہ دبے پاؤں اَندر گیا اَور پیڈسٹل فین اُٹھا لایا۔ برآمدے کے سوِچ بورڈ میں پلگ لگا کر اُس نے پنکھا آن کر دیا۔

گھرر......گھرر......گھرر......صحن میں ہَوا کا پھراکا آیا تو بابو جی گرم جھونکے کے لمس سے چونک گئے۔

نجیب!

جی ڈیڈ......ابا جان!

اِدھر آؤ!

وہ من بھر کا ایک قدم اُٹھانے پر مجبور ہو گیا......دوسرا قدم......تیسرا قدم، اَور محلے سے اذان کا پہلا کلمہ گونجا تو نجیب کی جان میں جان آئی۔ بابو جی دروازہ کھول کر گلی میں چلے گئے۔ اُس وقت ثمینہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

ممی! اِسے کہو میرا مذاق نہ اُڑائے۔

نجیب نے احتجاج کیا۔

امی! آج آپ اِسے نہ بچاتیں تو اِس کی وہ پٹائی ہوتی کہ......ہا......ہا......ہا!

شٹ اَپ یُو ثمینہ اِیڈیٹ!

نجیب! تم شریفوں کی زبان بھی بھُول گئے ہو، ثمینہ تمھاری بڑی بہن ہے!

وہ مجھے مذاق کیوں کرتی ہے؟

اِدھر آؤ کھانا کھالو اَور چپکے سے کوٹھے پر چلے جاؤ، اپنے اَبا کے آنے سے پہلے پہلے!

نجیب نے اَپنا کھانا اُٹھایا اَور صحن میں بچھی ہُوئی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ سالن کی پلیٹ اُس نے زانووٴں پر رکھ لی اَور روٹی ہاتھ میں لے لی۔

ہاتھ دھو لیے؟

اماں نے پوچھا۔

اوہ! ساری ممی!

اُس نے پلیٹ چارپائی پر رکھی اَور اُسے روٹی سے ڈھانپ کر غسل خانے کی طرف لپکا۔ ہاتھ دھو کر اُس نے کھانا شروع کیا تو امی نے کہا:

ذرا تمیز سے بیٹھ کر کھاؤ تو کچھ ہرج ہے نجیب؟

نہیں تو ممی! مسٹر جمیل، مسز جمیل، علی اَور نسیمہ تو میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اَور ہم......

اُن کا کوئی نوکر بھی ہوگا نا؟

امی نے پوچھا۔

ہے تو سہی۔

یہ لوگ کون ہیں نجیب؟

بھولی امی! یہ اِس کی انگریزی کی کتاب کے لوگ ہیں۔

ثمینہ بولی۔

ممی! اَب وہ لندن اَور نیویارک کی سَیر کو جائیں گے۔

نجیب نے کہا۔

امی! یہ بالکل غلط کہہ رہا ہے۔دسویں کی کتاب میں صرف مسٹر جمیل لندن گئے تھے......

ثمینہ نے کہا۔

ممی وہ نیویارک بھی گئے۔

نجے! جھوٹ نہ بولو۔نیویارک تو مسٹر آفتاب' مسز آفتاب' ناصر اَور انجم گئے تھے۔

نہیں ممی! اِسے کیا پتا؟

شرط لگاتے ہو۔کتاب لا کے دِکھاؤں؟ امی! اِس نے ابھی دسویں کی کتاب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اَور یوں ہی اناپ شناپ بکے جا رہا ہے۔

نیویارک کہاں ہے نجیب؟

امی نے پوچھا۔

واہ ممی واہ! آپ کو اِتنا بھی پتا نہیں......امریکہ میں ہے۔

مجھے کیا غرض ہے امریکہ وریکہ سے......اِتنا پیسا تھا تو حج کو کیوں نہ گئے؟

امی نے ذرا جِھلّائے ہُوئے لہجے میں کہا۔

عین اُس لمحے بابوجی آ گئے۔اُنھوں نے پوچھا:

کون جا رہا ہے حج کو؟

کوئی نہیں......کوئی نہیں......نجیب کی کتاب کے لوگ تھے۔

نجیب کی امی نے جواب دیا۔

علی اَور نسیمہ کے ڈیڈی مسٹر جمیل......

نجیب ممیایا:

وہ لندن جا......

ہاں ہاں ٹھیک۔اُس دِن اُس سبق میں سے میں نے ایک پیراگراف کا ترجمہ نہیں لکھوایا تھا تمھیں نجیب؟

جی نہیں ڈیڈ......وہ علیز ٹی پارٹی کا تھا۔

میرا خیال ہے، مسٹر جمیل کوئی بڑے اَفسر ہیں۔

جی ہاں! اُن کے پاس کار بھی ہے۔

نجیب بولا۔

کن کے پاس کار ہے؟

خالد ظہور نے سیڑھیاں اُترتے ہی پوچھا:

نجیب کی انگریزی کی کتاب کی بات ہو رہی تھی، خالد میاں۔

ابا جان! مجھے اَب سکوٹر کی اَشد ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

کیوں بھئی! سائیکل تو آپ کے پاس ہے نا؟

میرا حلقہ دفتر سے کم از کم پانچ میل دُور ہے۔ دفتر کے اَوقات میں فائلیں جان نہیں چھوڑتیں۔ اِس کے بعد حلقے میں کسی نہ کسی انکوائری کے لیے ضرور جانا پڑتا ہے۔ سائیکل پر اِتنا سفر!

بس سے چلے جایا کرو!

وہ تو جاتا ہی ہوں ابا جان! تین سال سے سائیکل، بس یا رِکشا کا ساتھ ہے اَور تنخواہ کا بیشتر حصہ کرایوں پر خرچ ہو جاتا ہے۔

فرضِ منصبی کی ادائی کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔

اَبا جان! اگر گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کروں؟

کہو خالد میاں!

آپ نے اپنے گِرد کچھ سنہری اُصولوں کا جو حِصار قائم کر رکھا ہے، اُس سے ذرا باہر نکل کے دیکھیں تو آپ کو دُنیا بدلی ہوئی نظر آئے گی۔

کون سی دُنیا؟

یہی دُنیا جس میں آپ رہ رہے ہیں...... اَپنے ملک کی دُنیا!

ہاں بھئی! پاکستان نے گزشتہ چوبیس سالوں میں ترقی تو بہت کی ہے۔

میرا مطلب کچھ اَور ہے اَبا جان! اَب لوگ فرضِ منصبی سے زیادہ اپنی ذات کو مقدم سمجھتے ہیں۔ دیانت داری، فرض شناسی، اُصول پرستی، نظریات سے وابستگی، یہ سب باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔

بالکل غلط۔ تمھاری سوچ کا رُخ منفی ہو رہا ہے خالد میاں!

منفی ضرور ہے لیکن حقیقت پر مبنی ہے۔

اِس اَنداز کی سوچ تمھیں لے ڈوبے گی۔

نہیں اَبا جان! مطمئن رہیے۔ میں اُس نسل سے تعلق رکھتا ہوں جو سوچتی کچھ اَور کرتی کچھ اَور ہے۔ اِس لیے کہ میرا اَور آپ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں۔ وہ کیا کہتے ہیں...... وہ جو...... میرا مطلب ہے کہ ایک منزل برزخ کی بھی ہوتی ہے نا، میں وہاں ہُوں۔ میں تذبذب کا شکار ہُوں۔ پر جب میں اِنحراف کے متعلق سوچتا ہوں تو آپ میرے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مجھے خطرہ ہے، کہیں تم غلط روش پر نہ چل نکلو!

نہیں اَبا جان! کوئی خطرہ نہیں۔ میں بُزدِل ہُوں۔ مجھ سے ایسی توقع فضول ہے۔ کل ہی ایک

کیس میں ذرا جرأت سے کام لیتا تو آج میَں گلبرگ سے سکوٹر پر گھر آتا۔

لاحول ولاقوۃ!

بابوجی نے کپکپاتی ہُوئی آواز میں کہا۔

خالد بھئی! آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہر طرف confusion ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کے آشوب میں گرفتار ہے۔ ایک crises لِپنے اندر‘ اَپنے باہر disintegration کا process جاری ہے۔ ٹوٹ پھوٹ‘ شکست و ریخت‘ پرانے بُت ٹوٹ رہے ہیں۔ ایک decadent معاشرے میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ transitory سٹیج ہے۔ وہی جسے آپ نے برزخ کہا ہے‘ لیکن کون جانتا ہے کہ اِس کے بعد......

تم نے کیا فلسفہ آرائی شروع کر دی طارق میاں! کتنی سیدھی سادی باتیں ہو رہی تھیں!

طارق کو کسی نے کوٹھے سے اُترتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ دبے پاؤں آکر بحث میں شریک ہو گیا تھا۔

کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

نجیب کی امی بولیں۔

نجیب اِس بحث سے بور ہو کر چھت پر چلا گیا تھا اَور ہمسایوں کے گھر میں ٹیلی وژن کا پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ کھانا کھانے کے لیے بابوجی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ثمینہ نے اُن کے آگے چارپائی کے سامنے سٹول رکھ دیا۔ طارق کھڑا رہا تو بابوجی بولے:

تم کھانا نہیں کھاؤ گے طارق میاں؟

یہ بُوفے طرز پر کھانا کھائیں گے۔

خالد بولا۔

طارق نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنے حصے کا کھانا لیا اَور صحن کے دُور کے کونے میں بچھی ہُوئی چارپائی پر نجیب کی طرح بیٹھ گیا۔ یہاں بلب کی روشنی بہت دِھیمی ہو کر پہنچتی تھی۔

بزرگ کہا کرتے تھے کہ کھانا کھاتے وقت باتیں نہیں کرنی چاہئیں‘ لیکن طارق کو دیکھ کر مجھے ایک بات یاد آگئی۔ دفتری کاموں کے سلسلے میں یوں تو لاہور میں اکثر آنا جانا رہتا تھا‘ پر ۱۹۶۴ء میں جب میَں مستقل طور پر لاہور میں تبدیل ہو کر آیا تھا تو مجھے کچھ نیا نیا لگا تھا۔ اِتنی موٹریں کہ سڑک عبُور کرنا مشکل...... عالی شان عمارات...... مال روڈ کی خوب صُورتی اَور رونق پر سب سے زیادہ غیر مِلکی درویشوں نے میری توجّہ اپنی طرف مبذول کی تھی۔ میں نے ایک درویش کو فٹ پاتھ پر بیٹھے‘ نان پکوڑے کھاتے دیکھا تو حیران ہوا۔ اُس کی آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ لال بھبھوکا بنا ہُوا تھا۔ میں ہنسا اَور مجھے حیرت بھی ہُوئی۔

حیرت کس بات کی؟

دُور کے کونے سے طارق کی آواز آئی۔

اِس بات کی کہ حکیم مشرق کا فرمودہ کس قدر جلد درست ثابت ہو رہا ہے‘ یعنی مغرب کی تہذیب اپنے

ہاتھوں سے خودکشی کر رہی ہے!

یہ فرار کا راستہ تلاش کر رہے ہیں اور کسی منظم فلسفے کی عدم موجودگی میں بھٹک گئے ہیں اَبا جان!

خالد بولا۔

نو...... ناٹ سو سمپل خالد بھائی...... یہ ہی لَپنے معاشرے بلکہ اپنے عہد کے باغی ہیں۔ یہ اپنی زندگی کو بے معنی سمجھتے ہیں۔ یہ Absurd Situation کی پیداوار ہیں۔ Existentionalism کے مطابق فرد کا وجود اپنی ہی ذات کے گرد گھومتا ہے اور سوسائٹی کے متعلق سارتر نے کہا ہے کہ......

طارق میاں! تمھارا فلسفہ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ رومیؒ اور اقبالؒ کی بات کرو تو کچھ میں بھی سمجھ پاؤں۔

وہ فلسفے پرانے ہو چکے ہیں، دوسری جنگِ عظیم کے بعد......

معاذ اللہ! تم قرآن کے فلسفے کو متروک قرار دیتے ہو۔

اَبا جان! یہی تو مصیبت ہے نا کہ جب پرانی نسل کے کسی فرد سے فلسفے کی بات کی جائے تو وہ رومیؒ اور اقبالؒ میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے اور اُسے یوں لگتا ہے جیسے مسجد میں نقب لگ رہی ہو۔

خالد نے جِھلّائے ہوئے لہجے میں کہا۔

طارق میاں!......

بابو جی نے برتنوں کو ذرا پرے کِھسکاتے ہوئے کہا:

پاکستان کی عمارت رومیؒ اور اقبالؒ کے فلسفے کی بنیاد پر اُٹھی اور آپ اِس کی قطعی نفی کر رہے ہیں۔

طارق کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ خالد تنبیہی لہجے میں بول اُٹھا:

طارق! کم اَز کم اپنی پریشاں خیالیوں کو فلسفے کا نام تو نہ دو۔

جواب میں طارق کی بڑی بے نیاز سی ہنسی کی آواز آئی جیسے اُسے اَپنے آپ پر یقینِ کامل ہو اور اُن دونوں کی جہالت کا افسوس!

خالد بھائی! آپ جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں، وہ تذبذب کا شکار ہے۔

اُس نے کہا۔

میں اِسے تسلیم کرتا ہوں لیکن تمھاری اور میری عمر میں کچھ زیادہ فرق نہیں، یہ ایک نسل کا فرق کہاں سے آ گیا؟

خالد نے پوچھا۔

اِس فرق کا تعلق زمانے سے نہیں Attitude of Mind سے ہے۔ آپ کچھ اَقدار کو مقدس خیال کرتے ہیں، لیکن آپ کا عمل اِنھیں negate بھی تو کرتا ہے۔

اور آپ؟

خالد نے پوچھا۔

ہم اَقدار کے پھندے سے نکل چکے ہیں۔ اَقدار relative ہیں۔ ٹوٹتی پھوٹتی رہتی ہیں، مٹتی بنتی رہتی

ہیں اور دائمی نہیں۔

نہیں......

بابو جی کی آواز میں غصے کی لرزش تھی:

طارق میاں! آپ جس معاشرے میں رہ رہے ہیں' اُس کی اَقدار مستقل ہیں۔ اُن کا سر چشمہ......

آپ کس معاشرے کی بات کر رہے ہیں ابا جان!

طارق نے اُن کی بات کاٹ کر پوچھا۔

ابا جان!......

خالد نے کہا:

اِس بحث کو یہیں بند کر دیجیے۔ طارق کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے گی جس سے آپ کے جذبات مجروح ہوں گے۔ طارق صاحب کی قبیل کے لوگ حفظِ مراتب کی حد سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔

اِس لیے کہ ہم آپ کی طرح Hypocrite نہیں۔

طارق بولا۔

اِس گفتگو کے دوران میں نجیب کوٹھے سے اُتر کر صحن میں آ کھڑا ہو گیا تھا۔

تمھارا پڑھائی میں جی کیوں نہیں لگتا نجیب؟

اُس کی امّی نے پُوچھا۔

ڈَیڈی!

نجیب بولا اور اُس نے انگریزی لفظ کا اُردو میں ترجمہ بھی نہ کیا۔

کہو کیا بات ہے؟

بابو جی نے پوچھا۔

ہمارے ہمسایوں نے ٹیلی وژن لے لیا ہے۔

اِس خبر میں میرے لیے کون سی خوشی کی بات ہے؟

میں دیکھ آؤں؟

کیوں؟

آج نَو بجے فلم لگے گی۔

لگتی رہے' جاؤ جا کر پڑھو یا سو رہو!

پنجابی فلم ہے' اِس میں مظہر شاہ نے کام کیا ہے۔

کون مظہر شاہ؟

بابو جی نے جز بز ہو کر پوچھا۔

اُس دِن ریڈیو پر آپ نے اُس کا اِنٹرویو نہیں سُنا تھا؟ وہ جس نے بڑھک ماری تھی...... ہا آ...... نجیب نے مظہر شاہ کی نقل اُتاری تو بابو جی کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ اُسے چانٹا لگانے کو اُٹھے مگر وہ پھُرتی سے ایک طرف یوں ہٹ گیا جیسے لاٹھی کا وار بچا رہا ہو۔ طارق کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔

تم کیوں ہنسے طارق میاں؟

بابو جی شرمندہ سی آواز میں بولے۔

نجیب پاکستان کی نئی نسل کا نمائندہ ہے۔ رومیؒ اَور اقبالؒ کے فلسفے کی پیداوار۔

کم بخت!

بابو جی نے غصے کو چبا کر کہا۔

اَور تب محلے کی مسجد سے اذان کی گونج آئی اَور وہ لپک کر صحن کے دروازے کی طرف چلے گئے۔

....

عشا کی نماز میں وہ اُکھڑے اُکھڑے سے رہے اَور جب نماز کے بعد پیش امام نے حسبِ معمول اِتحادِ اسلامی، سر بلندیِ اِسلام اَور سالمیتِ پاکستان کی دُعا مانگی تو وہ خالد، طارق اَور نجیب کے متعلق سوچنے لگے۔ نماز کے دوران میں بھی اِس سوچ کا ہیولا اُن کے وجود، اُن کے ماحول پر غالب رہا تھا اَور جب وہ صحنِ مسجد سے باہر نکلے تو سوچ کے ایک نقطے پر چکا چوند ہُوئی۔ ایک خود کار کلاک چلا...... ٹِک ٹِک ٹِک...... اُس کے ڈائل پر مہ و سال گھوم رہے تھے اَور مہ و سال کے پردے پر تصویریں آ اَور جا رہی تھیں...... پاکستان کی تصویریں جس کا خواب اُنھوں نے دیکھا تھا...... لُٹے پُٹے، کٹے پھٹے قافلے...... خون کا دریا...... الاٹمنٹوں کا چکر...... عُہدے اَور منصب کے لیے گردن شکن دوڑ...... سمگلنگ اَور چور بازاری...... کارخانے اَور سربہ فلک عمارتیں...... فٹ پاتھ پر گداگروں کا ہجوم...... ٹوٹتی حکومتیں...... موٹریں اَور کاریں...... اَور ہر شخص کا دیوانہ وار اَپنے ہی وجود میں رخنے کرنا اَور نئی نسل کی محرومی اَور مایوسی...... اَور...... اَور...... یہ ایک لمحے کا فلیش تھا...... اَور خود کار کلاک چل رہا تھا...... ٹِک ٹِک ٹِک...... اُنھوں نے سب کچھ دیکھا اَور وہ سب کچھ جو اُن کے لاشعور میں تھا، شعور کی سطح پر آیا، وہ کانپ گئے...... ''اِس کلاک کو کون سی غیبی طاقت چلا رہی ہے؟'' اُنھوں نے سوچا...... میں نہیں جانتا...... جو قوم دینِ فطرت سے اِنحراف کرتی ہے، اُس کی جگہ دُوسری قوم مسلط ہو جاتی ہے...... نہیں...... میں شکست خوردہ لوگوں کی طرح نہیں سوچوں گا!

صحن میں اُن کا بستر لگا تھا، وہ چپکے سے لیٹ گئے تو اُن کی بیوی نے کہا:

نجیب کی بات کا غصہ نہ کریں، وہ ابھی بچّہ ہی تو ہے!

نہیں تو۔

اُنھوں نے کروٹ بدل کر کہا۔

اَور اُس لمحے ردِّعمل کے طور پر درد و غم کی ایک لہر سی آئی اَور وہ اِتنے اُداس ہوئے کہ غم زدہ اندھیرے کے رونے کی آواز اُن کے کانوں میں آئی...... اُداس، مایوس، دِل شکستہ آواز جیسے کوئی خوابِ وقت کی چٹان سے ٹکرا کر چکنا چُور ہو گیا ہو یا وقت کا دھارا کسی خواب کی مَوت پر سِسکیاں بھر رہا ہو اَور اُس موت کے ذِمے دار وہ خود آپ ہوں۔

اَور اُس سے اگلی صبح کو وہ نمازِ فجر پڑھ کر کوٹھے پر چلے گئے۔ چھت پر ہَوا میں کچھ خنکی تھی اَور خالد، طارق اَور نجیب گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ چھت پر ٹہلنے لگے۔ کمرے کا دروازہ کھُلا تھا۔ وہ اندر چلے گئے۔ آج وہ ایک مدّت کے بعد اِس کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ کمرے کی واحد اَلماری میں، جس کے پٹ نہیں تھے، خالد، طارق اَور نجیب کی کتابیں ٹھونس ٹھانس کر بھری ہُوئی تھیں، جنھیں خالد، طارق اَور نجیب سونے سے پہلے اَلماری میں نہ رکھ سکے تھے: چند ایک درسی کتابیں، انگریزی کا ایک پیپر بیک ناوِل جس کے پہلے صفحے پر ایک نہایت فحش تصویر تھی، پتا نہیں یہ ناوِل خالد پڑھ رہا تھا یا طارق...... جو بھی پڑھ رہا تھا، اُس کا فرض تھا کہ اُس کے اُوپر ورق تو چڑھا لیتا تاکہ نجیب کی نظر سے تو تصویر اوجھل رہتی...... اِشتمالی معاشیات پر ایک کتابچہ...... اُس کے سَرورق پر لینن کی تصویر تھی...... یہ کتاب یقیناً طارق کے زیرِ مطالعہ تھی اَور ایک فلمی رسالہ جس کے سَرورق پر کسی ایکٹریس کی رنگین تصویر تھی؛ اُنھوں نے رسالہ اُٹھایا، دو تین صفحے چھوڑ کر پنجابی فلموں کے نام وَر وِلن مظہر شاہ کی تصویر تھی اَور اُس سے اِنٹرویو بھی!

تب ایک لمحے کے لیے اُن کے اَندر کا آتش نفس نُصُوح جاگا اَور اُن کا جی چاہا کہ اِن کتابوں کو نذرِ آتش کر کے نئی نسل کی ژولیدہ روی کی اِصلاح کا آغاز کر دیں اَور تب اُن کی نظر پھر اَلماری کی طرف چلی گئی۔ سب سے اُوپر کی دراز میں خالد کی کتابیں تھیں جو پہلو بہ پہلو ذرا ترتیب سے لگی ہُوئی تھیں۔ محکمانہ کتابیں اَور چند انگریزی ناوِل اَور اُنھیں کے اُوپر مخمل کے غلاف میں لپٹی ہوئی حمائل تھی۔ اُنھوں نے حمائل اُٹھائی۔ ہاتھ کے لمس پر مخمل کے غلاف سے ہلکا سا غُبار اُٹھا۔ تاج کمپنی کی یہ حمائل اُنھوں نے طارق کو پچھلے سال تحفۂ پیش کی تھی جب اُس نے بی اے پاس کیا تھا اَور مخمل کا غلاف اُس کی ماں کا تحفہ تھا۔

اِن کتابوں میں اِس کا کیا کام! اُنھوں نے سوچا: ''میں اِسے نیچے لے جاتا ہُوں تاکہ اِس کی بے حُرمتی تو

نہ ہو۔ طارق نے یقیناً اِس حمائل کو ایک بار بھی کھول کر نہیں پڑھا...... نہ خالد نے ...... پر طارق کے دِل میں اِس کا احترام تو موجود تھا کہ اِسے الماری کے سب سے پہلے خانے میں کتابوں کے اُوپر جگہ ملی تھی"۔

اِس خیال پر ایک بھیگی بھیگی خنک سی لہر اُٹھی اَور اُن کی آنکھیں نم آلود ہوگئیں اَور آتشِ اِصلاح کا شعلہ شُوں شُوں بُجھ گیا۔

وہ دبے پاؤں کوٹھے سے نیچے اُتر آئے۔

☆☆☆

اَندھا کُنواں

جب گاؤں میں اِشتمال ہُوا تو رحیم بخش جاٹ کو زمین کا جو ٹکڑا مِلا' اُس میں کوئی دو اڑھائی کنال پر پھیلا ہُوا ایک وِیران ٹیلا بھی تھا۔

لوگ اُسے پکّا اَستھان سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا' یہاں بھُوت پریت کا ڈیرا ہے۔ ہر گاؤں میں کوئی نہ کوئی ایسی جگہ ضرور ہوتی ہے جہاں اِنسان کا تخیّل اَور اُس میں بسی ہُوئی صدیوں کی' جنگل اَور وِیرانے کی تنہائی اَور دہشت' چڑیلوں' بھُوتوں اَور جنّوں کا طلسم زار قائم کر لیتی ہے۔ اُس ٹیلے کے پاس سے گزرتے ہوئے لوگ' جی ہی جی میں کسی اَنجانی طاقت سے ڈرتے تھے۔ خاص طور پر گرمیوں کی دوپہر کو جب دُھوپ کے لہریے دُور دُور تک دہشت کا ایک سَراب تخلیق کرتے ہیں یا اماوس کی راتوں کو جب بے چاند کا اندھیرا، بھُوت پریت کی دُنیا آباد کر دیتا ہے۔

رحیم بخش جاٹ آٹھویں جماعت تک پڑھا ہُوا تھا۔ باپ کی بے وقت مَوت کی وجہ سے وہ آگے نہ پڑھ سکا تھا۔ پھر اُسے پٹوار نہ ملی اَور نہ وہ کسی پرائمری سکول میں ماسٹر لگ سکا تو اُس نے ہل اَور دھرتی سے ناتا جوڑ لیا۔ تاہم اُسے بھُوتوں اَور چڑیلوں پر زیادہ اِعتقاد نہیں تھا۔ البتہ اَپنے بچپن میں اُس نے بہت سی داستانیں اپنی بڑی بوڑھیوں سے سنی تھیں...... جنوں' پریوں اَور جادُوگرنیوں کی کہانیاں۔ اَب وہ خود بھی کبھی کبھار اَپنے بچوں کو ایسی کہانی سناتا تو اَپنے ہی تخیل میں خود رحیم بخش بھی ایک چھوٹا سا بچّہ بن کر آ بیٹھتا جو اَپنی ہی آواز پر کان لگائے ہوتا اَور کہانی کو بڑے غور سے سنتا۔ اِس سلسلے میں اُسے ایک مامُوں یاد آتا جس نے شادی نہیں کی تھی اَور اکثر اُن کے ہاں چک مُراد میں آتا تو ہفتوں ٹھہرا رہتا اَور غائب ہوتا تو مہینوں نظر نہ آتا۔

وہ ایک بے ضرر سا آوارہ اَور لااُبالی آدمی تھا لیکن اُسے کہانی کہنے میں بڑا کمال حاصل تھا۔ اکثر وہ اَپنی کہانی کا خود ہی ہیرو بن جاتا تھا۔ ایک کہانی میں اُس نے ایک اَندھے کنویں کا ذِکر کیا تھا جہاں ایک دیو نے ایک شہزادی کو قید کر کے اُوپر سے کنویں پر بڑا سا پتھر رکھ دیا تھا۔ وہ شہزادی اب تک وہاں موجود

تھی اَور اُس کے نیم دیوانے ماموں نے کہا تھا:

میں اُس کنویں کو جانتا ہُوں!

وہ کہاں ہے ماموں؟

رحیم بخش نے بڑے اِشتیاق سے پوچھا تھا۔

اُس ٹیلے پر جو چک مُراد اَور گُل بہار کے راستے میں ہے۔

وہاں تو کوئی کنواں نہیں۔

ہے...... وہ کسی کسی کو نظر آتا ہے اَور کبھی کبھار......

تمھیں نظر آیا ماموں؟

ہاں! کئی بار...... آج ہی اَور پھر دو پہر کو...... میں گُل بہار سے چک مُراد آ رہا تھا' ٹیلے پر دُھوپ کے لہریوں نے اُسے جنم دیا یا شاید ایک بگولا سا اُٹھا تھا اور میں اُس کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ پھر اُس کا بند دہانہ مجھے نظر آیا اَور پاتال سے آواز آئی: ''اجنبی! کیا تم مجھے اِس قید سے رہا نہیں کروا سکتے؟ میں ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یوں لگتا ہے جیسے اِس اچانک پکار پر میں اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ جب مَیں ہوش میں آیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا...... ہاں! کچھ بھی نہیں تھا......

اُس کے ماموں نے بھرّائی ہُوئی آواز میں کہا۔

وہ کنواں مجھے دِکھاؤ گے؟

رحیم بخش نے پوچھا تھا۔

نہیں! مجھے کیا پتا وہ کہاں ہے۔

نہیں ماموں......

اُس نے ٹھنک کر کہا تھا:

مجھے ضرور دِکھاؤ!

اَور اُس کی ماں نے دُور سے ڈانٹ کر کہا تھا:

کمالے! یہ کیا کہانیاں سناتے ہو اُسے...... جھوٹ مُوٹ کی باتیں!

نہیں بہن جنت بی بی! یہ جُھوٹ نہیں۔ وہ کنواں ہر جگہ موجود ہے۔ ہر اِنسان کے اَندر بھی ہے' پر وہ کسی کسی کو نظر آتا ہے۔ اُس کے اِرد گِرد کوئی نہ کوئی شہزادہ منڈلاتا ہُوا بھی نظر آتا ہے۔ لیکن بند کنویں کا بھاری پتھر اُس سے اُٹھ نہیں سکتا۔ وہ شہزادی کی تلاش میں آتا ہے اَور شہزادی اُسے پکارتی رہتی ہے اَور وہ پتھر سے سَر پٹکتا رہتا ہے اَور جِنّ بھُوت' قہقہے لگا کر ہنستے رہتے ہیں...... رحیم! کبھی کبھار وہ آواز بھی' جو کنویں کے اَندر سے آتی ہے' یوں لگتا ہے جیسے میری اَپنی ہی آواز ہو۔

اُس نے آخری بات نہایت رازداری سے اُس کے کان میں کہی تھی۔ دُور بیٹھی' اُس کی ماں نے

یہ سرگوشی نہیں سنی تھی لیکن اُس نے ٹھنڈی آہ بھر کر اَپنے بھائی کمال دین کی طرف یُوں دیکھا تھا جیسے اُسے پہلی اَور آخری بار دیکھ رہی ہو!

رحیم بخش نے کہا تھا:

ماموں، کمال کرتے ہو! ابھی ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ وہ اَندھا کنواں ٹیلے پر ہے اَور اَب تم کہہ رہے ہو کہ وہ ہر اِنسان کے اَندر ہوتا ہے۔

رحیم، نہ پوچھو! تم نہیں سمجھ سکو گے۔

اِتنے میں اُس کا باپ کنوئیں سے آ گیا۔ اُس نے آتے ہی کہا:

جی آیاں نُوں! چودھری کمال دین، کب آئے تم؟

اُس کا باپ کچھ مذاق، کچھ محبّت اَور کچھ احترام سے اُسے چودھری کمال دین کے نام سے پکارا کرتا تھا۔

آج دوپہر۔

کنوئیں پر کیوں نہ چلے آئے؟ وہاں شہتوت کی ٹھنڈی چھاؤں تلے دوپہر کاٹتے!

میں گل بہار کی طرف سے آیا۔ اُس طرف سے کنواں راستے میں نہیں پڑتا۔

ٹھیک ہے۔

بابا! آج ماموں کمال نے ٹیلے پر اَندھا کنواں دیکھا۔

ٹیلے پر اَندھا کنواں؟

اُس کے اَبّا نے حیران ہو کر پُوچھا۔

پھر اُس نے ہنس کر کہا:

چودھری کمال دین تو سَدا کا پاگل ہے...... اِسے یہ کنواں ضرور نظر آیا ہوگا!

ماموں کمال دین نے کہا:

ہاں بھائی، یہ کنواں پاگلوں ہی کو نظر آتا ہے!

ارے پگلے! تُو مہینوں بھلا چنگا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے، پھر تجھ پر پاگل پن کا دورہ پڑ رہا ہے۔

اُس کی بہن نے غم زدہ سی آواز میں کہا۔

ماموں کمالے نے اپنی بہن کی یہ بات سُن کر قہقہہ لگایا۔ پھر وہ قہقہہ اُس کے گلے میں پھنس گیا اَور وہ سِسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ ایک جوان آدمی کو روتے دیکھ کر رحیم کو بڑی شرم محسوس ہُوئی۔

جب وہ بڑا ہُوا تو ماموں کمالا اَیسا گم ہُوا کہ پھر کہیں نظر نہ آیا۔ لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے رہے۔ کسی نے کہا: ''سَر بھنویں اَور ڈاڑھی مُنڈوا کر اُس نے جوگ لے لیا ہے اَور اَب وہ کشکول ہاتھ میں لے کر چک مراد آئے گا اَور چودھری کے دروازے پر بھیک مانگتا نظر آئے گا۔'' کسی نے کہا: ''میں نے اُسے فلاں مزار پر دیکھا ہے۔'' کوئی

کہتا: "آوارہ گرد ہے، بن آئی موت مَر گیا ہوگا۔" اَور کوئی کہتا: "اُس نے اَپنے ہاتھوں سے اپنی جان لے لی ہوگی!"

"اپنے ہاتھوں سے کیوں؟"......اُس نے سوچا۔

ایک دِن اُس کی ماں نے چونک کر ٹھنڈی آہ بھری تو اُس نے پُوچھا:

کیوں ماں! کیا بات ہوئی؟

اُس نے جواب دیا:

کمالا یاد آ گیا۔ یاد کیا آیا، عین سامنے آ کھڑا ہُوا!

ماں کی یہ بات سُن کر وہ کانپ گیا۔

اُس نے کہا:

ماموں مجھے بھی یاد آتا ہے۔ وہ جو اُس نے اَندھے کنویں کی بات سنائی تھی، میں اُسے ابھی تک نہیں بھُولا۔

بے چارا اَپنے اَندھے کنویں میں ڈوب مَرا......

اُس کی ماں نے روتے ہُوئے کہا۔

کیوں ماں؟

اُس نے پوچھا۔

بیٹا! ہم جاٹوں کے ہاں ایسے آدمی پیدا نہیں ہوتے۔ وہ پتا نہیں کہاں سے آ گیا۔ تھا تو میری ماں کے پیٹ سے، پر ہم سے بالکل الگ اَور نرالا تھا۔ وہ جو سرداراں ہے نا، وہ اُس سے بیاہ کرنا چاہتا تھا۔

اُس کی ماں نے ڈَبڈبائی ہُوئی آواز میں کہا۔

کون سرداراں؟

وہی جو اَب چودھری جلال دین کی بیوی ہے۔

تم نے اُس کا بیاہ سرداراں سے کیوں نہ کر دیا۔ اُس کے گھر والوں نے رِشتہ دینے سے اِنکار کر دیا ہوگا؟

رحیم بخش نے پوچھا۔

نہیں تو، یہ بات نہیں تھی۔ کمالے نے کبھی اُس کا ذِکر ہی نہیں کیا تھا۔ ہمیں کیسے پتا چلتا؟ نہیں تو ہم اُس کا رِشتہ نہ مانگ لیتے!

پر چودھری بڑا آدمی ہے۔ گاؤں کی ایک تہائی پتّی کا مالک۔ اُس کے مقابلے میں تمھاری بات کون پُوچھتا؟

یہ چودھری کی دوسری شادی تھی۔ ادھیڑ عمر کے مقابلے میں سرداراں کے گھر والے کمالے کے حق میں ضرور فیصلہ کر دیتے۔ وہ کنوارا بھی تھا اَور گزارے کے لیے اُس کے حصے میں زمین بھی کافی آئی تھی۔

اُس کی ماں نے کہا۔

چودھری کو بڑھاپے میں کیا سُوجھی؟ سرداراں تو اُس کی لڑکیوں کے برابر تھی۔

تھی، پر چودھری کے سَر پر عشق کا بھوت سوار تھا۔

رحیم بخش کے بچپن میں سرداراں جوان تھی، پر بچپن لڑکیوں کو سرسری طور سے دیکھتا ہے۔ جب وہ لڑکپن کے دور میں آیا تو اُس وقت بھی سرداراں جوان تھی بلکہ جوانی پر بھری دوپہر کا سُورج چمک رہا تھا۔ وہ شہزادیوں کی طرح نازک بدن تھی اَور اُس کا بدن ریشم میں غرق ہوتا اَور اُس کے پاؤں میں زری کے جوتے ہوتے۔ چلتی تو شہزادیوں کی طرح، جیسے سارا زمانہ اُس کی ٹھوکر میں ہو۔ گاؤں کی دُنیا تو اُس کی نظروں میں جچتی ہی نہ تھی...... اِتنی چھوٹی سی دُنیا! اُسے تو کسی بادشاہ کے محل میں ہونا چاہیے تھا۔ چودھری کا بڑا بیٹا رحیم بخش کا ہم عُمر تھا۔ اَب وہ بھی اُس کی طرح لڑکپن کے دور میں تھا۔ وہ بڑا سجیلا جوان تھا، شہ زور اَور خوب صورت!

''سوتیلی ماں اَور سوتیلے بیٹے کا رِشتہ بھی بڑا عجیب ہوتا ہے''...... اُس نے سوچا۔ ''لوگ طرح طرح کی کہانیاں گھڑ لیتے ہیں''۔

آج جب وہ ٹیلے والے کھیت میں ہل چلا رہا تھا تو اُس کے من میں ایک عجیب سا گمبھیر اَسرار رچ رہا تھا۔ یہ صبح کا وقت تھا اَور ابھی اذانوں کی گونج فضا کی خنکیوں میں رچی ہُوئی تھی۔ اُس نے نماز تو نہ پڑھی لیکن وہ جانتا تھا کہ اُس لمحے وہ ہر بَلا سے محفوظ ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دو اَڑھائی کنال پر پھیلا ہُوا یہ ٹیلا میرے کس کام کا! اُس کے اِرد گِرد کی زمین کتنی زرخیز ہے...... بُھربُھری مٹی جس میں دانہ پڑے تو فوراً اُگ آئے۔ بس ذرا سی نمی چاہیے۔ پانی کے دو چھینٹے۔ یہ ٹیلا اُس کی چھاتی کا پتھریلا ناسُور تھا کہ جس پر نہ ہل چل سکتا ہے اَور نہ جسے پانی لگ سکتا ہے۔ اُس پر جھڑ بیری اَور پھُلاہی کی جو جھاڑیاں اُگتی ہیں، وہ کبھی کبھار سرسبز ہوتی ہیں۔ اکثر سُوکھی سَڑی، جھڑوکی سی نظر آتی ہیں اَور وہ گھاس جو اُس کے اُوپر کی مٹی کی ہلکی سی تہ پر اُگتی ہے، برسات ختم ہوتے ہی یُوں سُوکھ جاتی ہے جیسے اُسے آگ کی کوئی لپٹ چاٹ گئی ہو۔ جھلسی جھلسی گھاس، مجھے اِس سے خوف بھی آتا ہے اَور میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اِس ٹیلے کی بھی اپنی حیثیت ہے لیکن اِتنی زرخیز زمین میں یہ کنکر، روڑوں اَور ٹھیکریوں کا ڈھیر کہاں سے آ گیا! بہر حال مجھے اِس کا کیا نقصان؟ یہ ٹیلا اِشتمال والوں نے مجھے زائد میں دیا ہے۔ مجھے میری پوری زمین مِل گئی ہے۔ مفت میں مِلی ہُوئی بے کار چیز بھی اچھی لگتی ہے۔ کیا پتا کبھی وہ بڑی بڑی مشینیں میرے گاؤں میں بھی آ جائیں جن سے اُونچی نیچی زمینیں ہموار ہو سکتی ہیں! پھر میں اِس ٹیلے کو اُکھاڑ پھینکوں گا اَور اِس کے ملبے سے کھیتوں کی مینڈھوں کو پکّا کر لوں گا اَور اِس کے نیچے دبی زمین کا صدیوں پرانا کنوار پنا، ہل پھالے کی زد پر آیا تو اِس کی کوکھ سے نہ جانے کون کون سی فصلیں جنم لیں گی!

وہ اِن خیالوں میں گم ہل چلا رہا تھا کہ پھالا ٹیلے کے ایک کنارے کو چھونے لگا اور جس سیاڑ کے ساتھ اُس کے خیال کی لکیر چل رہی تھی، اُس کا سلسلہ ایک پتھر سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ ہل کا پھالا اُس پتھر کو اُلٹ نہ سکا اور بیل بھی یک دم رُک گئے۔ ایک بیل ڈری ہُوئی آواز میں ڈکارا اور دوسرے نے اُسے گھوم کر دیکھا۔ اُس کے گیلے گیلے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اُس نے بیلوں کو پچکار کر کہا: "کیا ہُوا بھورے! اوئے چنبے! تو کیوں تھر تھر کانپ رہا ہے؟" چنبے کی چکنی جِلد پر تھرتھراہٹ کی لہریں تھیں جیسے اُسے کسی مکھی نے کاٹ لیا ہو۔ اُس نے ہل کے پھالے کو، جو زمین میں بہت گہرا چلا گیا تھا، زور دے کر پتھر کی گرفت سے آزاد کرایا تو بیل چل پڑے۔ پھر پھالا زمین پر اُچٹتا ہُوا سا چلا تو وہ حیران ہو گیا۔ اُس نے ہل روک دیا اور بیلوں کو پچکار کر ٹھہرایا۔ اُس نے اُس جگہ کو ہاتھوں سے کھودا جہاں ہل کا پھالا پھنسا تھا اور اُس کا ہاتھ اُس پتھر سے ٹکرایا جس کے اُوپر سے پھالا اُچٹ گیا تھا۔ وہ دوڑ کر گیا اور کھیت کی مینڈھ پر پڑی کسّی اُٹھا لایا۔ اُس نے مٹی ہٹانا شروع کی تو ایک پتھر ننگا ہونے لگا۔ اچانک پورا پتھر اُس کے سامنے پڑا تھا...... بہت بڑا پتھر، خراس کے پاٹ سے بھی بڑا۔ اُس نے پتھر کو صاف کیا اور اُس کا سُرخ رنگ نکھر گیا۔ وہ ٹیلے کی آڑ میں پتھر کے اُوپر بیٹھ گیا۔ اور تب مشرق سے سُورج کی پہلی کرن نے جنم لیا تو ایک اَسرار اُس پر اُتر آیا!

کہتے ہیں کہ سیالکوٹ کا راجا، سالباہن ایک دن اپنے قلعے سے نکلا اور شکار کی دُھن میں جنگل میں راستہ بھول گیا۔ اَپنے ساتھیوں سے بچھڑ کر وہ کچھ پریشان بھی تھا اور کچھ خوف زدہ بھی کیوں کہ راجاؤں کے سینکڑوں دُشمن ہوتے ہیں اور نہ جانے کون سا دُشمن کہاں گھات لگائے بیٹھا ہو! پھر جنگل میں شام اُترے تو اُس کے ساتھ بُھوت پریت بھی جاگ پڑتے ہیں۔ اَب شام اُتر رہی تھی اور دُھوپ درختوں کی پھننگوں کو چُھو کر آسماں کی طرف اُڑنے کے لیے پَر تول رہی تھی۔ نہ جانے کیسے دُھوپ کی ایک کرن آسماں سے اُتری اور اُس تھرتھراتی کرن کے سامنے جنگل کا اَندھیارا سایہ بن کر پاتال میں اُترنے لگا۔ راجے کا گھوڑا بِدکا اور اُس کے نتھنے پھڑپھڑائے اور گردن کے بال کھڑے ہو گئے۔ راجا نے گھوڑے کو تھپکی دے کر آگے بڑھنا چاہا تو دُھوپ کی سنہری کرن اُس کے سامنے مجسّم ہو گئی۔ راجا کا تن بدن کانپ گیا۔ اُس نے سوچا: "آکاش سے اُترنے والی کرن، بُھوت پریت نہیں ہو سکتی۔ آکاش سے تو اَپسرائیں اُترتی ہیں"۔

اُس نے بڑے جلال سے پُوچھا:

تم کون ہو؟

اَور وہ کرن آواز کی ہَیبت سے لرز گئی اَور پھر چھلاوا بن گئی۔ راجا نے اُس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔

تب اچانک جنگل کا اندھیرا ختم ہو گیا اور راجا نے دیکھا کہ دُور دُور تک زرد دھوپ کی چادر پھیلی ہوئی ہے اور اُس کا ایک آنچل دُور پہاڑوں کی اُن چوٹیوں پر جا پڑا ہے اور اُنھیں آگ لگ گئی ہے جو سیال کوٹ کے قلعے سے صاف نظر آتی تھیں اور جن کے نیلے حاشیے سے اُدھر چناب اور توی کے کِنارے پر اُس کے راج کی حدیں ختم ہو جاتی تھیں۔

اُس میدان میں چند جھونپڑیاں تھیں اور اُن سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ گھوڑے کی ٹاپیں سُن کر مرد، عورتیں، بوڑھے، بچّے اور جوان جھونپڑیوں سے باہر نکل آئے اور کنویں سے پانی بھرتی عورتوں کے ہاتھ رُک گئے اور ڈول کنویں میں جا گِرا۔ لوگ اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ایک بوڑھا جس کی کمر کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی اور جس کی سفید ڈاڑھی اُس کی ناف تک لٹک رہی تھی، ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا اور کچھ فاصلے پر زمین پر گِر کر کہنے لگا:

اے گھڑ سوار! تُو کھشتری دِکھائی دیتا ہے اور یہ چماروں کی بستی ہے۔ اِس لیے آگے نہ بڑھنا۔ بتا، ہم تیری کیا سیوا کر سکتے ہیں!

راجا نے کوئی جواب نہ دیا اور لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں اُس ڈری سہمی کومل سی لڑکی پر گڑی ہوئی ہیں جس کے بالوں پر دُھوپ نے سارا سونا نچھاور کر دیا ہے اور جس کا ادھ ننگا جسم تپتے ہوئے کُندن کی طرح دمک رہا ہے۔ ادھیڑ عمر کے راجا کی آنکھوں میں نہ جانے کون سا جادُو تھا کہ وہ کومل سی لڑکی جو پہلے شرما رہی تھی، اب پسینے میں نہا گئی اور پھر غش کھا کر زمین پر گِر پڑی۔ لوگ لپکے، ساری بھیڑ اُس کے گِرد ہو گئی تو بوڑھے مکھیا نے کوئی حکم دیا۔ تب عورتوں نے اُسے مِل کر اُٹھایا اور ایک جھونپڑی کے اندر لے گئیں۔ مکھیا، راجا کے سامنے پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

بوڑھے! یہ لڑکی کون ہے؟

مکھیا جو سال ہا سال کی حکمت اور تجربے کی بِنا پر چہرے اور لہجے کی زبان پہچان سکتا تھا، سُوکھے پتے کی طرح کانپا۔ اُس نے لکنت زدہ آواز میں کہا:

اَن داتا! یہ آپ کی داسی لُونا ہے۔

تم نے مجھے پہچان لیا؟

جی اَن داتا! اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ لڑکی دو ۲ سِتاروں کے سنگم پر کھڑی تھی۔ اِس گھڑی اُن ستاروں کا میل ہو گیا ہے۔

بوڑھے! تم جوتش جانتے ہو؟

نہیں اَن داتا! یہ وِدّیا تو برہمنوں کو ملی ہے۔ ہم شُودر لوگ ایسی باتیں کہیں تو ہماری زبان نہ کھینچ لی جائے!

دیکھو! اِس لڑکی کو لوگوں کی آنکھوں سے چُھپا کر رکھو۔ اِسے چماروں کی کٹیا میں نہیں، راجاؤں کے

رنواس میں رہنا چاہیے!

اور راجا نے گھوڑے کی باگ کھینچ کر اُس کا رُخ موڑا ہی تھا کہ اُس کے گھڑسوار وہاں پہنچ گئے۔ راجا اُن کی جلو میں سیال کوٹ کی طرف مڑا اور جنگل کی تاریکی میں گم ہو گیا۔

جب چماروں کی بستی میں دیے ٹمٹمائے تو اُس لڑکی کو، جس کا نام لُونا تھا، ہوش آ گیا۔ اُس نے کٹیا کے اندر جلتے ہوئے دیے کی روشنی میں اپنی سہیلیوں کو دیکھا جو ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکرا رہی تھیں۔ لُونا نے آنکھیں مَل مَل کر اِس بھید بھری ہنسی کی ٹوہ لگانے کی کوشش کی؛ ناکام ہو کر اُس نے پوچھا:

اری! وہ کون تھا؟

ہمیں کیا پتا؟ ہو گا تیرا کوئی لگتا سا!

پر مجھے تو اُس سے بہت ڈر لگا۔ اُسے مَیں نے جنگل میں دیکھا تھا اور میں بھاگ کھڑی ہُوئی تھی۔

پھر وہ میرے پیچھے پیچھے بستی میں آ گیا۔

اُس کی سہیلیاں قہقہے لگانے لگیں تو وہ رو پڑی۔

وہ اِتنا روئی، اِتنا روئی کہ دیے کی جوت بھیگ کر بُجھ گئی۔

....

کیا سوچ رہے ہو؟

اُس کی بیوی نے اچانک پوچھا۔

وہ چونک گیا۔

کچھ بھی نہیں!

اُس نے سوئے سوئے لہجے میں کہا۔

میں کب سے کھانا دھرے، تیرے پاس بیٹھی ہُوں اور تجھے خبر ہی نہ ہُوئی!

اچھا!

اُس نے چھاچھ کے پیالے کو مُنہ لگاتے ہُوئے کہا۔

یہ تم جس پتھر پر بیٹھے ہو، پہلے تو یہاں نہیں تھا۔

ہاں!

یہ تو خراس کا پاٹ ہے۔ نہیں یہ تو پاٹ سے بھی بڑا ہے۔ اِتنا بڑا پتھر تو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔

دیکھ زینت! اِس کا ذِکر کسی سے نہ کرنا۔ آج ہل چلاتے چلاتے پھالا یہاں اٹک گیا تھا۔ میں نے اُوپر سے مٹی ہٹائی تو نیچے سے یہ پتھر نکل آیا۔

جب سے تم سوچ رہے ہو، یہ پتھر کہاں سے آیا؟

ہاں زینت!

تمھیں پتا ہے، اِس بٹے پر اَسرار بستے ہیں!

ہاں لوگ یہی کہتے ہیں، پر میرا تو کسی جن بھوت سے ابھی تک واسطہ نہیں پڑا......

پھر اُس نے کچھ سوچ کر کہا:

پر میں نے دِن کے وقت ایک خواب کیوں دیکھا اِس پتھر پر بیٹھ کر!

خواب؟

زینت نے پوچھا اَور اُسے جھرجھری سی آگئی اَور ماتھے پر پسینے کی نمی بھی محسوس ہونے لگی۔ اُس نے ڈوپٹے کے پلّو سے ماتھا پُونچھا۔

ہاں زینت! کبھی یہاں جنگل تھا اَور اِس جگہ چماروں کی بستی تھی اَور بستی کی ایک لڑکی کا نام لُونا تھا۔ کہتے ہیں، چماروں کے ہاں کبھی کبھار کوئی پدمنی جنم لیتی ہے...... وہ عورت جو لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔ تمھیں پُورن بھگت کا قصہ یاد ہے؟

ہاں کیوں نہیں؟ پورن بھگت کا کنواں یہاں سے کون سا دُور ہے؟......

زینت نے شمال کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا:

یہی ایک ڈیڑھ کوس۔ لوگ اَب تک اُس کا قصہ گاتے ہیں۔ میں کنویں پر کئی بار گئی ہُوں۔ لوگ اُس کا پانی پیتے ہیں۔ اَور کہتے ہیں، جن عورتوں کے ہاں بچہ نہ ہوتا ہو، وہ اِس کا پانی پئیں تو اُن کی گود ہری ہو جاتی ہے۔ لُونا، پورن کی سوتیلی ماں تھی نا جس نے اُس پر تہمت لگائی اَور......

ہاں! جانتی ہو، ہمارے علاقے میں اَب بھی چماروں کے ہاں کبھی کبھار کوئی پدمنی جنم لیتی ہے تو ہر طرف آگ لگ جاتی ہے۔ اَب راجے مہاراجوں کا زمانہ نہیں رہا کہ اُسے کوئی راجا رنواس میں لے جاتا۔ بے چاری اِدھر اُدھر بھٹک کر پھر چماروں کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔

ہاں اَیسا ہی ہوتا ہے......

زینت نے اُس کی بات کی تصدیق کی اَور پھر کہا:

اَب تم کھانا کھالو!

جب وہ لقمہ منہ میں ڈال کر پھر سوچنے لگا تو اُس نے پوچھا:

اَب کیا سوچ رہے ہو؟

کہتے ہیں، راجا سالباہن نے اپنے شہر سے دُور اُس کے لیے محل بنوایا تھا۔ ہوسکتا ہے، کھُلے جنگلوں میں کھِلنے والی کلی رنواس کی اُونچی اُونچی دیواروں کے پیچھے مُرجھا گئی ہو اَور یہ ٹیلا اُسی محل کا کھنڈر ہو جہاں راجا نے اُسے رکھا تھا۔

چھوڑو بھی اِس قصے کو! نُور پیر کے وقت لُونا کا نام بار بار لے رہے ہو۔ وہ بڑی منحوس عورت تھی۔ پورن سَوتیلا تھا تو پھر کیا ہُوا؟ اُس کا بیٹا ہی تو تھا آخر۔ اُس پر ڈورے ڈالنے والی ماں، ماں نہیں، ڈائن تھی۔

زینت کے چہرے پر شرم کے ساتھ غصے کی سرخی بھی تھی۔

نہ زینت' ایسا نہ کہو! راجے مہاراجے بہت ظالم ہُوا کرتے تھے۔ جو جی میں آتا کرتے۔ جو چیز پسند آتی' اُسے خزانے میں ڈال لیتے۔ راجا سالباہن نے لُونا کو گھر میں ڈالتے ہوئے یہ نہ سوچا کہ میں بوڑھا ہُوں اَور یہ ابھی جوانی کو بھی نہیں پہنچی۔ اُس نے کچی کلی کو شاخ سے توڑ لیا۔ پُورن' لُونا کا سگا بیٹا بھی تو نہیں تھا اَور کہتے ہیں' لاکھوں میں ایک تھا۔ بے چاری کا پاؤں پھسل گیا تو کون سا غضب ہو گیا! مجھے تو اُس پر ترس آتا ہے۔

کیسی بات کر رہے ہو؟

زینت نے احتجاجی انداز میں کہا۔

دیکھو! میں پھر کہتا ہوں' گاؤں میں پتھر کی بات کسی سے نہ کرنا۔ بات پھیل جائے گی اَور تم جانتی ہو' لوگ چھوٹی سی بات کو کتنا بڑا بنا لیتے ہیں!

نہیں!......

زینت نے ذرا سا چڑ کر کہا:

مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی سے بات کرنے کی! تمھیں پتھر کے نیچے سے کون سا خزانہ مِلا ہے؟ ہے تو پتھر ہی۔

رحیم بخش مسکرانے لگا۔ اُس نے سوچا: ''عورت ذات پیٹ کی ہلکی ہوتی ہے؛ اُسے جس بات کے چھپانے کے لیے کہا جائے' وہی زیادہ پھیلتی ہے۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے!

اگلے دِن رحیم بخش' ٹیلے والے کھیت میں ہل چلا کر ابھی فارغ ہی ہُوا تھا کہ اُسے گاؤں کی طرف سے بہت سے آدمی آتے دِکھائی دیے۔ وہ حیران ہُوا۔ جب وہ قریب آئے تو اُس نے دیکھا کہ سب سے آگے آگے چودھری جلال ہے۔ وہ سیدھے اُس کے پاس پہنچے۔

وہ پتھر کہاں ہے رحیم بخش؟

چودھری نے بڑے تحکم سے پوچھا۔

کون سا پتھر؟

دیکھو! بننے کی کوشش نہ کرو۔ کیا پتا' اُس پتھر کے نیچے خزانہ ہو۔ میں گاؤں کا نمبردار ہُوں۔ مجھے تحصیل تھانے میں اِس کی اطلاع دینی ہے۔ حکومت کو پتا چلا تو ہتھ کڑی لگ جائے گی۔

کس بات پر چودھری؟

خزانہ چھپانے کے جُرم میں!

رحیم بخش کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔ اُس نے کسّی پکڑی اَور پتھر پر سے مٹی اُتارنے لگا۔ چودھری چمکتی آنکھوں کے ساتھ آگے بڑھا۔ اُس نے زور لگایا لیکن پتھر کیسے ہلتا! اُس نے اَپنے آدمیوں کو ساتھ لگایا

لیکن پتھر اپنی جگہ سے نہ ہِلا تو رحیم بخش نے اُس پر مٹّی پھیلا دی اور کہا:

چودھری! جب جی چاہے پتھر ہٹا کر خزانہ اپنے قبضے میں کر لینا۔

چودھری کھِسیانی ہنسی ہنسا اور اپنے آدمیوں کو لے کر گاؤں کی طرف چلا گیا۔

کہتے ہیں کہ جوتشیوں کی ہدایت کے مطابق پورن کو پندرہ ۱۵ سال تک لوگوں کی نظروں سے دُور رکھا گیا۔ جوتشیوں نے کہا تھا کہ پندرھواں سال خاص طور سے اُس پر بھاری ہے، اُسے بھورے سے نہ نکالنا! ایسا نہ ہو کہ منحوس ستارہ اُس پر اپنی پرچھائیں ڈال دے۔ پر وُہی ہُوا جس کا خطرہ تھا کیوں کہ ہونی ہو کر رہتی ہے۔ اُسے بھورے سے ایک دِن پہلے نکال لیا گیا اور اُس دِن اپنے زمانے کی پدمنی وہ منحوس ستارہ بن گئی جس کا سایہ پُورن پر ضرور پڑنا تھا۔ اِس میں لُونا کا کیا قصور؟ راج کمار پُورن، بن سنور کر نکلا تو وہ پُورن ماشی کا چاند تھا اور پُورن ماشی کا چاند نکھرا ہو تو چکور اُس سے ملاپ کے لیے لمبی اُڑان لیتی ہے اور خود اِس میں گھایل ہو جاتی ہے۔ اِس میں نہ چاند کا دوش ہوتا ہے نہ چکور کا۔ راج کمار پُورن، اپنی سَوتیلی ماں سے مِلنے گیا تو وُہی معاملہ ہُوا جو چاند اور چکور میں ہوتا ہے۔ پورن نے جھک کر اُس کے چرن چھُوئے تو رانی لُونا نے اُسے اُٹھا کر چھاتی سے لگا لیا اور اُس کا ماتھا چُوم لیا۔ ماں کو سَوتیلے بیٹے سے جسمانی مِلاپ کا اِتنا حق تو حاصل ہے، پر اُس لمس نے لُونا کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ اُس کی جوانی پہلی بار ایک جواں لمس سے ہم کنار ہوئی تو ایک چنگاری گری اور سُوکھی لکڑیاں دھڑ دھڑ جلنے لگیں۔

لیکن پُورن اُس بھڑکی ہُوئی آگ سے بے خبر تھا۔ وہ راج کمار جسے پندرہ ۱۵ سال تک دُنیا کی آنکھوں سے اوجھل رکھا گیا تھا، اِس چھل کپٹ سے کیوں کر واقف ہوتا۔ اُس نے لُونا کو ماں کی حیثیت سے دیکھا اور ابھی اُس کی کم سِن جوانی عورت کی کسی دُوسری حیثیت سے آگاہ بھی نہیں ہُوئی تھی کہ عورت نے اُس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ رانی لُونا، راج کمار کو کسی نہ کسی بہانے اپنے محل میں بُلاتی رہی اور آخر اُس نے اپنے پیار کا بھید کھول دیا۔ پیار کا بھید کھُلے تو اس کی گونج دُور دُور تک سُنائی دیتی ہے۔ پُورن پیار کے اِس پھندے کو توڑنے کی کوشش کر رہا تھا کہ راجا سالباہن، لُونا کے محل میں آ گیا۔ اُس نے پورن کو رانی لونا کی آغوش میں تڑپتے کسمساتے دیکھا لیکن وہ اِس کا مطلب غلط سمجھا اور لونا نے تریا چلِتّر سے کام لیتے ہوئے اپنے کنول آنسوؤں سے بھر لیے اور کہا:

مہاراج! جو آپ نہ آتے تو...

پھر کیا ہوتا؟

راج کمار میری عزّت لُوٹ چکے ہوتے۔

راجا کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے حکم دیا کہ پُورن کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر اُسے دُور کسی جنگل کے غیر آباد کنویں میں پھینک دیا جائے۔ حکم کی تعمیل ہُوئی اور اُسے اُسی کنویں میں پھینک دیا گیا جہاں آج کل عورتیں اپنی کوکھ بھرنے کے لیے جاتی ہیں۔

"پر اس بڑے پتھر کے نیچے کیا ہے!" رحیم بخش نے سوچا: "کوئی کنواں، کوئی تہ خانہ، کیا پتا اِس میں کوئی خزانہ ہو! چودھری خزانہ نکال لے تو کیا ہرج ہے۔ میں اکیلا تو پتھر اُٹھانے سے رہا۔ ماموں کمال کو اِس ٹبے پر سے گزرتے ہوئے جو سسکیوں کی آواز سنائی دی تھی، کیا وہ اِسی کنویں سے آئی تھی! میں تو پتھر کے اُوپر بیٹھا ہوں اور مجھے کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی۔ کیا پتا، ماموں کمال کو قدرت نے ایسے کان دیے ہوں جو پتھر کے نیچے صدیوں سے بند سسکیوں کی آواز سن سکتے ہوں اور اُسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ جس کنویں کی وہ بات کر رہا ہے، وہ اِسی پتھر کے نیچے ہے۔"

اُسے اپنی سوچ کا کوئی حل نہ مِلا تو اُس نے ہل کی ہتھی پر ہاتھ رکھ کر بیلوں کو شُشکارا اور زمین کا سینہ چیرنے لگا۔ جب کسان کا ناتا زمین سے جُڑتا ہے، تو وہ شہزادیوں اور پریوں کی کہانیاں بھُول جاتا ہے۔ بھربھری مٹی سے جو بے نام گیلی گیلی خُوشبو اُٹھتی ہے، اُس کی لپیٹ میں آ کر تخیّل کی ہر اُڑان اپنا راستہ گم کر دیتی ہے۔ یوں بھی جن کا ناتا زمین سے جُڑا ہوا ہو، وہ خیالوں کی دُنیا سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ خیال تو پرندے ہیں اور پرندے زمین سے اُٹھ کر ہمیشہ آسمان کی طرف اُڑتے ہیں۔ پر آج، ہل کے سیاڑ سیدھے نہیں جا رہے تھے اور لکیریں آسماں کی طرف اُٹھتے ہُوئے نظر آ رہی تھیں...... تیز دُھوپ کے اُن لہریوں کی طرح جو زمین سے لگ کر آسمان کی طرف اُٹھتے نظر آ رہے تھے۔

پورن کا کنواں تو یہاں سے زیادہ سے زیادہ ایک ڈیڑھ کوس کے فاصلے پر ہے۔ کہانی میں تو یہی آیا ہے کہ اُس زمانے میں یہ کنواں غیر آباد تھا۔ ممکن ہے کہ وہاں تک جنگل پھیلا ہو اور جنگل میں سے جو راستہ گزرتا ہے، اُس پر مسافروں کے آرام کے لیے یہ کنواں کھودا گیا ہو۔ کنواں غیر آباد ہوتا تو گرو گورکھ ناتھ کے چیلے اُس سے پانی بھرنے کیوں آتے! اُنھوں نے رسّی سے ڈول باندھ کر کنویں میں لٹکایا تو اندر سے کراہوں کی آواز آئی۔ چیلے ڈر کر بھاگتے ہوئے گُرو کے پاس آئے: "گرو مہاراج! کنویں میں کوئی بھُوت پریت ڈیرا لگائے بیٹھا ہے۔" گرو نے مسکرا کر کہا: "نہیں! وہ تو ہمارا بھگت پُورن ہے، اُسے کنویں سے نکال لاؤ!" گرو نے ایک لمبی تپسّیا کے بعد جو طاقت حاصل کی تھی، اُس نے پورن کو ہاتھ پاؤں دیے اور وہ گرو گورکھ ناتھ کا چیلا بن کر بڑا مشہور ہُوا اور اُسے پورن بھگت کا نام مِلا۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اُس نے سیال کوٹ کا رُخ کیا۔ بھیک مانگتے مانگتے وہ راجا کے رنواس میں پہنچا۔ اپنی سگی ماں سے مِلا اور اُس پر اپنا آپ ظاہر کیا۔ راجا

سالباہن کو اصل حقیقت کا پتا چلا تو اُس کا غصہ جوالا مکھی کی طرح پھٹا اور اُس نے حکم دیا: "لُونا کو اُسی کے محل کے اندھے کنویں میں پھینک دو!"

خیالات کے اِس موڑ پر رحیم بخش اچانک چونک گیا! پورن بھگت کے قصے میں اِس کنویں کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ راس دھاریوں نے اِسے جس طرح ناٹک کا رُوپ دیا تھا' اُس کا انجام بھی تو یہ نہیں تھا؛ ہوا یوں کہ پورن بھگت کی بھگتی باپ کے غصے کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سوتیلی ماں کے چرنوں میں گِر پڑا۔ اُس نے کہا: "ماں مجھے آشیر باد دو!" اور اُس نے باپ سے کہا: "پِتا جی! ماتا پتر کا بندھن بڑا پوِتر ہوتا ہے' وہ اِن باتوں سے نہیں ٹوٹتا"۔

"پورن جو اپنی سوتیلی ماں کا گناہ معاف نہ کرواتا تو وہ پورن بھگت کیسے کہلاتا!"...... رحیم بخش نے سوچا: "لیکن اِس پتھر کے نیچے جو اَسرار چھپا ہے' وہ کیا ہے؟"......"کچھ بھی نہیں۔ اِس پتھر کے نیچے کچھ بھی نہیں"......"پر ماموں کمال نے یہیں کہیں کسی شہزادی کی سسکیوں کی آواز سُنی تھی"......"وہ تو سدا کا پاگل ہے"......"کیا ہی اچھا ہوتا' وہ اَب کہیں سے آجاتا اور پتھر کے نیچے کے اَسرار کا پردہ کھول دیتا!"

رحیم بخش کا ہاتھ ہتھی پر تھا اور اُس کے بیل دم بہ خود کھڑے تھے کہ زینت اُس کا کھانا لے آئی۔ اسُوج کی چمکیلی دھوپ میں تمازت تھی لیکن اُس کھیت کی مینڈھ پر کوئی درخت نہیں تھا۔ اُس کی بیوی نے ٹیلے پر اُگی ہُوئی ایک کیکری کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا:

آؤ! اُس کے نیچے بیٹھتے ہیں۔

نہیں! یہ پتھر ہی ٹھیک رہے گا۔

ٹھیک ہے۔ میں حیران ہوں' پتھر والی بات گاؤں میں کس طرح پھیلی۔ لوگ کہتے ہیں' رحیم بخش کو اپنے کھیت سے خزانہ مِلا ہے۔

زینت نے بڑی معصومیت سے کہا۔

رحیم بخش کھِل کھِلا کر ہنس پڑا۔

کون جانے' کس نے بات کی! یوں بھی ایسی بات چھپی تھوڑی رہتی ہے۔ اِسے خود بہ خود پر لگ جاتے ہیں......

اُس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا:

پر لوگوں کو یہ پتا نہیں کہ اِتنا بڑا پتھر میں اکیلا نہیں اُٹھا سکتا۔ خزانے میں سارے گاؤں کو شریک کرنا پڑے گا۔ یوں مجھے معلوم ہے کہ خزانہ کس کے ہاتھ لگے گا!

وہ کون ہے؟

زینت نے گھبرائی ہُوئی آواز میں پوچھا۔

چودھری اَور کون؟ اَپنا نمبردار...... وہ پتھر کو دیکھ گیا ہے۔

بڑا لالچی ہے وہ۔ خزانہ نکلا تو اُس میں سے ہمیں تو کچھ نہیں دے گا۔

نہیں! ہمیں پھُوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔

اِتنا لوبھی دُنیا بھر میں کوئی نہ ہوگا۔ دولت کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ اپنے گھر کی خبر بھی نہیں لیتا۔

کیا ہُوا اُس کے گھر میں؟

وہ تو اَندھا ہے یا اُس نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ اُس لُونا سے کچھ نہیں کہتا۔

لونا کون؟

رحیم بخش نے پوچھا۔

وہی سرداراں...... کنجری...... اَپنے ہی گھر میں چکلا کھول رکھا ہے۔

کیسی باتیں کر رہی ہو زینت! تم بھی لوگوں کی باتوں میں آگئیں۔ کسی کے متعلق کبھی بُرا نہیں سوچنا چاہیے!

آنکھوں دیکھی بات کو کون جھٹلا سکتا ہے! چودھری کی بہُو گلی گلی دُہائی دے رہی ہے کہ اُس کالے مُنہ والی نے اُس کا خصم اُس سے چھین لیا ہے۔

دیکھو زینت! اُسے کنجری کہو یا کچھ اَور، پر اُسے کالے مُنہ والی تو نہ کہو۔

کیوں؟

گاؤں میں ایک ہی تو چہرہ مُہرہ ہے جسے دیکھ کر دِلوں کا دُکھ درد تھکن تکان دُور ہو جاتی ہے۔

کیا کہہ رہے ہو؟

زینت نے گھبرا کر پوچھا۔

رحیم بخش کھِل کھِلا کر ہنس پڑا:

دیکھو زینت! دُنیا میں کوئی کوئی عورت ہوتی ہے جس کی جوانی سَدا بہار ہو۔ اَب بھی وہ چلتی ہے تو قدم قدم پر پھُول کھِلتے چلے جاتے ہیں۔ آنکھوں میں وُہی جوانی کا نشہ۔ کسی کو آنکھ بھر کر دیکھ لے تو بڑھا ہُوا قدم رُک جائے۔

ہاں وہ تو پَری ہے پَری! مانا چودھری بوڑھا ہے اَور وہ جوان ہے، پر اُس کالے مُنہ والی کو جو آگ لگی ہُوئی ہے، وہ پرائے چھینٹوں سے بھی تو بُجھ سکتی ہے۔ اُس نے تو اُسی جوہڑ کو گندا کر دیا ہے جس میں وہ رہتی ہے!

جھوٹ......

رحیم بخش نے کہا:

چودھری کا بیٹا میرا دوست بھی ہے۔ وہ اَیسا نہیں ہو سکتا۔

وہ پورن بھگت بھی تو نہیں۔

زینت نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

چودھری کو معلوم نہیں؟

اُس نے پوچھا۔

کون جانے! کچھ لوگ جنم جنم کے اندھے ہوتے ہیں اور کچھ سب کچھ دیکھ کر اندھے بن جاتے ہیں۔

کیوں؟

چھوڑو اِس قصے کو! کھانا کھالو تو میں گاؤں جاؤں۔ تم نے مجھے باتوں میں اُلجھالیا۔

وہ لقمے مُنہ میں رکھ رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا۔ کوئی لقمہ گلے میں پھنستا تو لسّی کے ایک گھونٹ سے اُتار لیتا۔ زینت چُپ چاپ اُس کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ پتھر جس پر وہ دونوں بیٹھے تھے، مٹی کے ڈھیلوں سے ڈھکا ہُوا تھا۔ پر دونوں کو معلوم تھا کہ وہ پتھر پر بیٹھے ہیں اور اُس پتھر کے نیچے کوئی اَسرار چُھپا ہے۔

زینت! یہ ٹیلا جو ہمیں اِشتمال میں مِلا ہے، یہاں کبھی رانی لُونا کا محل تھا۔ لُونا اِسی علاقے کی رہنے والی تھی اور یہ پتھر جس پر ہم بیٹھے ہیں، اِس کے نیچے اَندھا کنواں ہے۔ کیا پتا، جب پورن بھگت کی بے گناہی ثابت ہُوئی تو راجا سالباہن نے لُونا کو زِندہ سلامت اِس کنویں میں پِھنکوا دیا ہو اور اُس نے سِسک سِسک کر جان دی ہو!

نہیں ...... نہیں ......

زینت نے خوف زدہ آواز میں کہا۔

قصے والے تو کہتے ہیں، راجا سالباہن نے اَپنے اِکلوتے راج کمار کے کہنے پر اُسے معاف کر دیا تھا۔ پر کوئی ضروری نہیں کہ قصے والے ٹھیک کہتے ہوں۔ راجے مہاراجے اِتنے رحم دِل نہیں ہُوا کرتے تھے۔

پر پورن بھگت تو بڑا رحم دِل تھا۔

تھا...... لیکن راجا نے رانی کو معاف نہیں کیا ہوگا کیوں کہ وہ ذرا سی بے وفائی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

چلو چھوڑو اِس قصے کو!

ماموں کمال کو ٹیلے کے اِس اندھے کنویں کا پتا تھا۔ وہ یہاں سے گزرتا تو اُسے کسی شہزادی کی سِسکیاں سنائی دیا کرتی تھیں۔

ماموں کمال کون تھا؟

زینت نے پوچھا۔

میرا ماموں تھا۔ میرے بچپن کو بڑی اچھی اچھی کہانیوں سے بہلایا کرتا تھا۔

اُسے کیا ہُوا؟

اماں بتاتی تھیں، اُسے سرداراں سے پیار تھا۔ جب چودھری نے اُسے گھر میں ڈال لیا تو اُس کا جی

دُنیا سے اُچاٹ ہوگیا۔ وہ کبھی ویرانوں کی طرف نکل جاتا اور کبھی شہروں میں گم ہو جاتا، پر گاؤں سے اُس کا ناتا نہ ٹوٹتا۔ وہ سال چھ مہینوں میں ایک بار گاؤں میں ضرور آتا۔ اب وہ مدّتوں سے نہیں آیا۔

جب اُس نے کھانا کھا لیا تو زینت نے گڑوا سَر پر رکھا اور اُس پر چھابا ٹِکایا اور گاؤں کی طرف مُڑنے لگی تو اُس نے کہا:

دیکھو! ایسی عجیب عجیب باتیں نہ سوچا کرو۔ تم بھی اپنے ماموں کمال کی طرح کہانیاں گھڑنے لگ گئے ہو۔ بھلا اِتنے بڑے پتھر کے نیچے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو تو اُس کی آواز باہر کہاں آ سکتی ہے؟

ٹھیک ہے زینت!

پھر کچھ دِنوں تک رحیم بخش کو اِس کھیت کی طرف آنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ ابھی بوائی کا موسم نہیں آیا تھا۔ ایک دِن جب وہ اِس کھیت سے کچھ فاصلے پر ہل چلا رہا تھا تو ٹیلے کے پاس سے گزرتا ہُوا ایک آدمی یکایک اُس کی طرف مُڑا اور ہانپتا کانپتا اُس کے پاس پہنچا۔ وہ تھرتھر کانپتی آواز میں بولا:

اندھا کنواں!

کہاں؟

اُس پتھر کے نیچے جو تیرے کھیت سے نکلا تھا۔

تجھے کیسے معلوم ہُوا کرمو؟

میں تو اُس میں گِرتے گِرتے بچا۔

کیا کہہ رہے ہو؟ اِتنا بھاری پتھر کس جنّ نے ہٹایا؟

میں نہیں جانتا۔

چلو میرے ساتھ!

کنویں کا منہ کُھلا تھا۔ پتھر ایک طرف کو پڑا تھا۔ اِرد گِرد کی زمین پر یُوں لگتا تھا جیسے اکھاڑا لگا ہو اور کُشتی لڑی گئی ہو۔ بڑے بڑے ڈھیلے ٹوٹ گئے تھے اور ایک ٹوٹی ہُوئی بَلّی بھی وہاں پڑی تھی۔ پتھر کو بَلّیوں کے ذریعے ہٹایا گیا تھا۔ رحیم بخش ایک دو لمحے حیران رہا۔ پھر وہ کِھل کِھلا کر ہنسا۔ اُس نے اَپنے مُنہ پر ہاتھ رکھا کہ قہقہوں کا سیلاب رُک جائے، پر اَیسا نہ ہُوا اور ہنستے ہنستے اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمنڈ آئے۔

کرمو نے کہا:

تمھیں کیا ہُوا چودھری؟

کک...... کک...... کرمو...... خخ...... خخ...... خزانہ......

خزانہ؟......

کرمو حیران ہو کر بولا:

کہاں ہے خزانہ؟

اِس کنویں میں...... کبھی تھا، اَب نہیں...... چودھری خزانہ نکال کر لے گیا ہے۔ آہ، میرا خزانہ!

رحیم بخش نے جھوٹ مُوٹ غم کا اِظہار کرتے ہُوئے کہا اور اُس پر ہنسی کا دورہ پھر پڑ گیا۔ آخر ایک مدّت کے بعد اُس کے ہوش بحال ہُوئے تو اُس نے کہا:

دیکھو کرمو! یہ سب چودھری کی کارستانی ہے۔ دُنیا میں اِتنا لالچ بھی اچھا نہیں ہوتا۔ پتا نہیں، وہ رات کو کتنے آدمی ساتھ لایا اور اُنھوں نے کس طرح پتھر کو کنویں کے مُنہ پر سے ہٹایا۔ جب اُنھوں نے خالی کنویں کو مُنہ پھاڑے دیکھا ہوگا تو اُن کی مایوسی دیکھنے کی چیز ہوگی۔

کیا پتا، چودھری کو خزانہ مل گیا ہو!

مل گیا ہو تو اچھا ہے۔ آؤ! ذرا قریب جا کر دیکھیں۔ کوئی گِری پڑی اشرفی ہمیں بھی مِل جائے گی۔

رحیم بخش نے کہا۔

دونوں ڈرتے ڈرتے کنویں کی من تک پہنچے تو اُن کا رُواں رُواں کانٹوں کی نوکیں بن چُکا تھا۔ کرمو تو کانپ رہا تھا۔ پر جب کنویں کے اَندر اَندھیرے کے سِوا اُنھیں کچھ نظر نہ آیا تو اُنھیں عجیب سا اِطمینان محسوس ہُوا۔ کنویں کے اِرد گِرد اَشرفی تو کیا پھُوٹی کوڑی بھی نظر نہ آئی۔ کنواں زیادہ گہرا نہیں تھا۔ یہ اُس قسم کا کنواں نہیں تھا جو آب پاشی کے لیے کھودا جاتا ہے کیوں کہ اِسے پانی کی سطح تک نہیں کھودا گیا تھا۔ تاہم اِس سے سیلن اَور نمی کی بُو آتی تھی۔ اِس کی دیواروں کو چھوٹی چھوٹی اِینٹوں سے پختہ کیا گیا تھا اور اِس کی گولائی عام کنوؤں سے کہیں زیادہ تھی۔

رحیم بخش نے ٹھنڈی آہ بھری تو کرمو نے پوچھا:

چودھری کیا بات ہے؟ خزانے کے نہ ملنے کا افسوس ہے!

نہیں کرم دین!......

رحیم بخش نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا:

میں سوچتا ہوں، اِس کنویں سے پانی نکل آتا تو چلو دو چار کھیتوں کی سیرابی کا بندوبست ہو جاتا۔ بے کار کوئی چیز بھی ہو، اُسے دیکھ کر مجھے دُکھ ہوتا ہے۔

ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ سُوکھے اَور وِیران کنویں کس کام کے! اُلٹا اِن سے نقصان ہوتا ہے۔ کوئی اِن میں گِر جائے تو اَپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

کرمو نے کہا اَور سلام کہہ کر اَپنے کام پر چلا گیا۔

جب تنہائی ہُوئی تو رحیم بخش کو فضا خالی خالی سی محسوس ہُوئی۔ کنویں کا اَسرار اچانک ختم ہو گیا تھا۔

....

گاؤں بھر میں گویا ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ نہ جانے کس اُڑتی چڑیا نے مُنادی پھیر دی کہ شام تک اِکّا دُکّا لوگ کنویں پر آتے رہے اَور اَندھا کنواں دیکھ کر مُڑ جاتے رہے۔ رات کا اندھیرا چھاتے ہی لوگوں کا اِشتیاق ختم ہو گیا۔ اگلے دِن رحیم بخش نے ٹیلے پر سے بیری' پھلاہی اَور کیکر کی جھاڑیاں کاٹیں اَور کنویں کے اِرد گِرد باڑ لگا دی' کہیں کوئی بُھولا بھٹکا آدمی یا جانور اُس میں گِر نہ جائے۔

تب اسوج کا مہینہ گزر گیا اَور کاتک کے مہینے میں ایک دِن رحیم بخش ٹیلے والے کھیت میں گندم کی بوائی کرنے کے لیے آیا تو اُس نے دیکھا کہ کنویں کے اِرد گِرد کی باڑ اُکھڑی ہُوئی ہے اَور کسی نے پتھر کنویں کے مُنہ پر رکھ کر اُوپر سے اُس پر مٹی ڈال دی ہے۔ کنویں کا اَسرار پھر سے پردہ پوش ہو گیا تھا۔

"یہ بھی ضرور چودھری کی کارستانی ہے"...... اُس نے سوچا: "پر اُسے کنویں کا مُنہ بند کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"...... "کیا پتا؟ کون جانے؟ گاؤں میں کچھ دِن اُس کی خوب ہنسی اُڑی تھی! اَور اَب اِس کا ذِکر اَذکار بھی نہیں ہوتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ جب لوگ ہنستے تھے تو کنویں کا مُنہ کُھلا رہا اَور اَب لوگوں کا مُنہ بھی بند ہے اَور کنویں کا مُنہ بھی! نہ جانے اِس میں کیا بھید ہے۔ چلو رحیم بخش! تم بوائی کا کام شروع کر دو۔ دانہ بکھیرو اَور پھر کھیت میں پانی دے کر اللہ سے آس لگا کر بیٹھ جاؤ۔"

اَور جب دوپہر کے وقت زینت اُس کا کھانا لے کر گاؤں سے آئی تو رحیم بخش نے کہا:

چلو کنویں کے پتھر پر بیٹھتے ہیں!

اُس کے اِرد گِرد تو تم نے باڑ لگا دی تھی۔

زینت نے کہا۔

آؤ تو سہی!

جب زینت نے کنویں کے مُنہ پر پتھر پڑا دیکھا تو وہ حیران رہ گئی۔ رحیم بخش کھانا کھاتا رہا اَور زینت اُس کے پاس چُپ چاپ بیٹھی رہی۔ اچانک زینت نے کہا:

چک مُراد کی لُونا اَپنا مُنہ کالا کر گئی ہے۔

کیا کہا؟

اِتنے چھوٹے سے گاؤں میں بھلا اِتنی بڑی خبر چُھپ سکتی تھی! نمبردار کے گھر والوں نے لاکھ پردے ڈالے' پر لوگوں کو پتا چل ہی گیا۔

وہ کہاں گئی؟

کہتے ہیں' وہ مَولے بدمعاش کے ساتھ نکل گئی ہے۔

وہ جو کاہلو وال کا رہنے والا ہے؟...... نہیں زینت...... یہ جُھوٹ ہے...... وہ کبھی اِس گاؤں میں نہیں آیا...... وہ سمگلر تھا' وہ ڈاکو تھا' پر وہ عورتوں کو اِغوا نہیں کرتا تھا...... نہیں' مَولا اَیسا نہیں کر سکتا۔

رحیم بخش نے کہا۔

مولا ہو یا بھولا بدمعاش، کوئی بھی ہو، ہمیں اِس سے کیا! پر اِتنی بات سچ ہے کہ اَب سرداراں اِس گاؤں میں نہیں۔

پھر چک مُراد میں کیا رہ گیا زینت؟......

رحیم بخش نے پتھر پر سے اُٹھتے ہوئے کہا:

وہ ریشمیں تہ بند اَور زری کا جوتا پہن کر چلتی تو گاؤں کی زمین کو پھول بُوٹے لگ جاتے۔ سرداراں کیا گئی، اِس مٹی سے خُوش بُو جاتی رہی۔

زینت نے حیران ہو کر رحیم بخش کی طرف دیکھا۔ اُس نے سمجھا کہ وہ مذاق کی بات کر رہا ہے۔ جب اُسے اُس کے چہرے پر اَیسا کوئی تاثّر نظر نہ آیا تو اُس نے اَپنے لہجے میں رشک اَور جلن، حسد اَور نفرت کا سارا زہر جمع کیا اَور گڑوا اَور چھابا سَر پر رکھ کر کہا:

کچھ بھی ہو۔ وہ چک مُراد کی لُونا تھی۔

اُسی لُونا سے اِس گاؤں کی زینت تھی۔

رحیم بخش بولا۔

زینت کے جانے کے بعد وہ پتھر پر مٹی ڈالنے لگا، جیسے وہ قبر کو مٹی دے رہا ہے۔ پتھر مٹی کے نیچے چھُپ گیا تو اُسے یوں لگا جیسے اُس کا ماموں کمال اُس کے سامنے آ کھڑا ہُوا ہو۔ عین مَین ...... زندہ سلامت ...... اُس نے پُوچھا: ''رحیم! تم نے اَندھے کنویں کا اَسرار سمجھ لیا؟'' ...... ''نہیں تو!'' ...... ''تمھیں کسی شہزادی کی سِسکیاں سُنائی نہیں دے رہیں؟''

کھیت پر اَدھ کاتک کی مُلائم سی دُھوپ تھی اَور اُس کی کِرنوں میں، جو دانے کو زمین کے اَندر گرمی پہنچا کر اَنڈوں کی طرح سیتی ہیں، ہلکی سی حِدّت بھی تھی اَور منظر نہایت پُرسکوں تھا۔ کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی ...... اِتنا گمبھیر سنّاٹا کہ اُس میں پرندوں کے چہچہے بھی گم ہو چکے تھے۔ اَیسے سنّاٹے میں اگر کنویں کے اَندر سے کسی سِسکی کی آواز آتی تو وہ اُسے ضرور سُن لیتا۔

پر اِتنا بڑا پتھر!

اُس نے کہا: ''نہیں ماموں نہیں۔ اِس کے نیچے تو کوئی غضب ناک سمندر بھی موجیں مار رہا ہو تو اُس کی آواز بھی نہ آئے اَور کسی لُونا کی سِسکیوں میں اِتنی سکت کہاں کہ پتھر کا سینہ چیر کر باہر نکل آئیں!''

ماموں کمال کا ہیُولا اُس منظر میں تحلیل ہو گیا تو اُس نے سوچا: ''پتا نہیں، ماموں کمال کے پاس کون سا جادُو تھا کہ وہ پتھر پڑے اَندھے کنویں کی سِسکیاں سُن لیتا تھا!''

☆☆☆

نقطے سے نقطے تک

اُس نے اِنٹر پاس کیا تو اُسے فٹا فٹ ملٹری اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں نوکری مل گئی کیوں کہ جنگ لگی ہوئی تھی اَور نوکریوں کی بھرمار تھی۔ دو۲ سال نوکری کرنے کے بعد اُسے محسوس ہوا کہ اکاؤنٹس اُس کے بس کی بات نہیں، چناں چہ اُس نے نوکری چھوڑ دی اَور سوچا مجھے بی اے کر لینا چاہیے۔ کالج میں داخلہ لیتا تو اُسے دو۲ سال لگ جاتے۔ پرائی ویٹ طَور پر بی اے کرنے کے لیے ضروری تھا کہ کسی لائبریری یا سکول میں نو۹ مہینے مسلسل تجربہ حاصل کیا جائے۔ اُس نے اَپنے ضلع کے ڈسٹرکٹ اِنسپکٹر آف سکولز کو درخواست دی کہ اُسے کسی سکول میں اَن ٹرینڈ ٹیچر کی تقرری دی جائے۔ ڈسٹرکٹ اِنسپکٹر آف سکولز ہندو تھے، اُس سے بڑے اَخلاق سے پیش آئے، درخواست پڑھ کر بولے:

کاکا! مجھے بہت خوشی ہُوئی کہ تم بی اے کر کے پڑھنے پڑھانے کا پوتر پیشہ اِختیار کرنا چاہتے ہو، تو پھر رشیوں مُنیوں کی طرح شہر سے دُور چلے جاؤ! شہر میں رہو گے تو پھسلنے اَور بھٹکنے کے بہت سے مواقع ہوں گے اَور تم علم سے لَو لگا کر نہیں بیٹھ سکو گے۔

اَب بتایئے، اِتنی رَسان سے جو مشورہ دیا گیا، بھلا کاکا اُس کا کیا جواب دیتا! اِنٹرویو میں اِتفاق سے ایک مسلمان اے ڈی آئی بھی وہاں بیٹھا ہُوا تھا۔ ڈی آئی نے اُسے پوچھا:

کیوں شیخ جی! میرا مشورہ صائب ہے نا؟

شیخ جی بڑی مشکل سے غصے کو دباتے ہُوئے بولے:

ٹھیک ہے جناب!

کاکا! جاؤ دفتر سے تقرری آرڈر لے لو!

ڈی آئی بولا۔

ڈی آئی کو سلام کر کے باہر نکلا تو برآمدے میں شیخ جی نے اُسے آ لیا۔ ابھی تک اُن کا چہرہ غصے کی وجہ سے سُرخ تھا۔ کہنے لگے:

او بھائی لڑکے! کیا نام ہے تیرا؟

عبدالمجید۔

میاں عبدالمجید! جنگ زوروں پر ہے اور انگریز نے فوج میں افسروں کی بھرتی کے لیے دروازے چوپٹ کھول دیے ہیں۔ تم مجھے ہر لحاظ سے فِٹ نظر آتے ہو۔ جاؤ کمیشن کے لیے اپلائی کرو!

جی نہیں! میں فوج میں نہیں جانا چاہتا۔ میں انگریز کی بقا کے لیے توپ کا اِیندھن نہیں بننا چاہتا۔ میں ٹیچر بن کر قوم کی خدمت کروں گا۔

بکواس! قوم کی خدمت، نِری بکواس! لڑکے' ایم اے بی ٹی ہُوں! اِنٹر کرنے کے بعد میں نے بہت کوشش کی کہ مجھے کوئی معمولی نوکری مل جائے لیکن اُس زمانے میں بڑی کساد بازاری تھی۔ میں فوج میں جا سکا نہ پولیس میں۔ محکمہ مال میں بھی میرے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ مجبوراً بی اے کیا' پھر ایم اے کیا اور مقابلے کے ہر اِمتحان میں فیل ہونے کے بعد مَیں نے بی ٹی کر لی۔ پٹوار بھی مِل گئی ہوتی تو آج مَیں اگر نائب تحصیل دار نہیں تو گرداور قانون گو تو ضرور ہوتا!

جی میں نے فیصلہ کر لیا ہے......

وہ بولا:

کیا آپ مجھے کسی قصبے کے مڈل یا ہائی سکول میں نہیں لگوا سکتے؟

لگوا سکتا ہوں لیکن نہیں لگواؤں گا۔ ڈی آئی نے تمھیں ایک گاؤں میں اِس لیے بھیجا ہے کہ تم بی اے نہ کر سکو کیوں کہ تم مسلمان ہو اور میں بھی تمھیں مڈل سکول میں اِس لیے نہیں لگواؤں گا کہ تم مسلمان ہو اور وہاں بی اے کر لو گے۔ نتیجہ ایک ہی ہے لیکن نیّتوں میں فرق ہے۔

شیخ صاحب بولے۔

....

ایک دیہاتی نے کہا:

چک نمبر پندرہ! بس سمجھ لو "سِد پند" کے فاصلے پر ہے۔

سدپند کا مطلب اُس کی سمجھ میں نہ آیا تو اُس نے کہا:

یہ بتاؤ...... کتنے میل؟

یہ نہ پوچھو۔ بس یہاں سے آواز دو تو وہاں تک پہنچ جائے۔

دیہاتی بولا۔

وہ ایک نہر کے کنارے پر کھڑا تھا۔ چک نمبر پندرہ کے پُل پر اُسے اُتار کر ڈرائیور کنارے کی سڑک پر دُھول اُڑاتے ہوئے بس کو دَوڑا لے گیا تھا۔ وہ اُس سٹاپ کا اکیلا مسافر تھا۔ اُس کے سَر پر شیشم کا سایہ تھا اور قدموں میں اُس کا سُوٹ کیس پڑا تھا اور اُس کے اُوپر بستر۔ گرمی اور لُو میں اِتنا ڈھیر اُسے کنچن چنگا کی چوٹی سے بھی بلند نظر آ رہا تھا۔ وہ کچی سڑک جو چک پندرہ کو جاتی تھی' ہر قسم کے مسافر نواز سایے سے محروم تھی۔ کِناروں پر کچھ جھاڑیاں تھیں جو دُھول سے اَٹی ہوئی تھیں اور تیز دُھوپ کے لہریے اُن

اُس نے بات بدل کر کہا:

پھر سوہنی اپنے ہی گھر میں رہتی اَور چناب عبور کر کے کسی عزت بیگ سے تو ملنے نہ جاتی اَور ڈوب کر جان نہ گنواتی۔

معلوم ہوا کہ پنّوں نے اُس کی کسی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

وہ کہنے لگا:

منشی جی! نمبردار نے تمھیں لسّی پانی بھی نہ پوچھا۔کوئی پٹواری اِس کے ڈیرے پر آتا تو اُس کے آگے پیچھے بچھ بچھ جاتا۔تم پٹواری کیوں نہ بنے؟

آدمی وُہی کچھ بنتا ہے جو قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔

اُس نے کہا۔

منشی جی! پتا ہے، اِس نمبردار کا نام کیا ہے؟......

اُس کے جواب کا اِنتظار کیے بغیر خود ہی بولا:

ماں باپ نے اِس کا نام کرم چند رکھا تھا۔لوگوں نے اِس کا نام کھوتا رام رکھ دیا۔اَور اَب چک پندرہ کو لوگ "کھوتی پور" بھی کہتے ہیں۔

پنوں ہنسا تو وہ بھی بے اِختیار ہنس پڑا حالاں کہ نمبردار کے رویے سے وہ خاصا دِل شکستہ ہو گیا تھا۔

نمبردار مستقیم کا ڈیرا گاؤں کے اِنتہائی شمال میں تھا۔اُس نے چھُوٹتے ہی کہا:

اچھا، تو تم ہو نئے منشی!

جی ہاں!

وہ بولا۔

معلوم ہے، تم جس منشی کی جگہ آئے ہو، اُسے کس کی شکایت پر بدلا گیا؟

مجھے معلوم نہیں۔

میری شکایت پر! اَور پتا ہے کیوں؟

جی نہیں!

وہ بوڑے واہ کر گاؤں کی گلیوں میں پھرتا تھا اَور ہماری دِھیوں بہنوں کو تاڑتا تھا۔

نمبردار نے خضاب لگی مونچھ کو بل دے کر کہا۔

نمبردار مستقیم پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔سر پر رنگین صافہ، آنکھ میں کاجل اَور پاؤں میں زری کا کھُسا۔لگتا تھا کہ دو چار مربع زمین کا مالک ضرور ہے اَور اُن عورتوں کا شوقین بھی جو دُوسروں کی دِھییں بہنیں تھیں۔

منشی کو مدرسے لے جاؤ!

اُس نے کمہار کو حکم دیا۔ جب گدھا چل پڑا تو وہ بولا:

منشی! کوئی خدمت تواضع؟

شکریہ چودھری! اِتنی ہی خدمت کافی ہے۔

اُس کے لہجے میں جو طنز تھی، وہ نمبردار مستقیم نے محسوس کر لی کیوں کہ اُس کی مونچھ کے دو چار بال تھرتھرا گئے تھے۔

سکول کی عمارت گاؤں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔ دو کچے کمرے جن کے آگے برآمدہ تھا۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی سی کوٹھری اور ایک پھُونس کا چھپّر۔ گاؤں کا ماحول ہرا بھرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ زمین قابل ہے اور اُسے پانی وافر ملتا ہے لیکن زمین کے جس ٹکڑے پر سکول کی عمارت بنی تھی، اُسے کلر کھا گیا تھا اور پھُولی پھُولی مٹی میں پاؤں دھنستے تھے۔ سکول کی کچی چار دیواری گِری پڑی تھی، کہیں کہیں دیوار کے آثار باقی نظر آتے تھے اور اَب کچے کمروں کو بھی کلر کھا رہا تھا۔ سکول کے صحن کے وسط میں اوکاں کا ایک بوڑھا درخت کھڑا تھا اور اُس کے سایے میں ہینڈ پمپ لگا تھا۔ اوکاں کے سایے تلے زمین میں کلر نہیں تھا، البتہ بھیگی بھیگی سی دِکھائی دیتی تھی۔

وہ، پُنوں اور گدھا کوٹھری کے سامنے جا کھڑے ہُوئے تو اَندر سے ایک مَیلا سا دھوتی پوش برآمد ہوا۔ پوچھنے لگا:

آپ کون ہیں؟

میں منشی لگ کر آیا ہُوں۔

آپ کا نام؟

عبدالمجید۔

منشی عبدالمجید جی! میرا نام منسا رام ہے۔ آیئے، پدھاریے! پر آپ ایک ہندو کے ساتھ گزارا کر لیں گے؟

کیا مطلب؟

میرے ساتھ ایک کمرے میں رہ لیں گے؟

میں تو رہ لوں گا لیکن آپ کیا کریں گے؟ آپ کا دانہ پانی بھرشٹ ہو جائے گا۔

میرا بھی یہی مطلب تھا۔

لالہ منسا رام بڑی لجاجت سے بولا۔ تاہم اَز راہِ مہمان داری، اُس نے ایک کھاٹ اَندر سے نکال کر باہر بچھا دی۔ یہاں مکان کا سایہ کھاٹ کے برابر رہ گیا تھا۔

بیٹھیے!

اُس نے کہا:

پر اُڑ رہے تھے؛ کبھی کبھار کوئی ننھا سا بگولا بھی آتا اَور جھاڑیوں کو تھرا کر سڑک پار کر جاتا۔

اُس نے بستر کندھے پر رکھا اَور سُوٹ کیس ہاتھ میں لیا ہی تھا کہ گدھے پر سوار ایک جوان نے اُس سے پوچھا:

کہاں جاؤ گے؟

چک نمبر پندرہ!

چک نمبر پندرہ میرے رستے میں پڑتا ہے۔ میرے آگے صندوق اَور بستر رکھ دو اَور خود قدم سے قدم ملا کر چلتے رہو!

نوجوان بولا۔

چند گز چلنے کے بعد اُسے معلوم ہُوا کہ قدم سے قدم مِلا کر چلنا ہو تو گدھے اَور آدمی کی رفتار میں بہت فرق ہے۔ ایک لطیفہ بے اِختیار اُسے یاد آ گیا تو وہ کِھل کِھلا کر ہنسا۔

گدھے والے نے پوچھا:

بابُو! کیا بات ہے، بڑے خوش ہو۔

ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ اگر سُننا ہے تو گدھے سے اُترنا پڑے گا۔

گدھے والا بھی یقیناً حسِ ظریفانہ کا مالک تھا کہ فوراً گدھے سے اُتر آیا۔ لطیفہ سن کر وہ بہت ہنسا۔ کہنے لگا:

میرا ایک گدھا بہت اڑیل ہے، ایک چُٹکی اُس پر بھی آزماؤں گا۔

اَور اگر گدھا تم سے آگے نکل گیا تو کیا کرو گے؟

اُس نے پوچھا۔

گدھے والے نے شرما کر کہا:

پھر وُہی چُٹکی اَپنے آپ پر آزماؤں گا۔

لیکن دونوں صورتوں میں نتیجہ تو ایک ہی رہے گا۔ پہلے گدھا آگے نکل جائے گا پھر تم گدھے سے آگے نکل جاؤ گے۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ اِنسان اَور گدھا قدم سے قدم مِلا کر نہیں چل سکتے۔

چناں چہ گدھے والے نے ”چھَٹ“ میں ایک طرف بستر رکھا اَور دوسری طرف سُوٹ کیس۔ توازُن ٹھیک کرنے کے بعد وہ اُس سے ہم قدم ہو گیا۔ اَثنائے سفر میں ایک دوسرے سے پورا پورا تعارف ہو گیا۔ وہ چک پندرہ سے اگلے چک یعنی چک نمبر سولہ کا کمہار تھا۔ گاؤں والوں کو مٹی کے برتن مہیا کرنے کے علاوہ باربرداری کا کام بھی کرتا تھا۔ آج سے نصف صدی پہلے ہر گاؤں ایک اِقتصادی یونٹ ہُوا کرتا تھا۔ کسان اَناج پیدا کرتا تھا، ترکھان، لوہار، موچی، نائی، کمہار اَور تکیے کا فقیر، نظامِ معیشت

چلانے میں اُس کی مدد کرتے تھے۔ اَب بھی پنجاب اَور سندھ میں بہت سے گاؤں ایسے ہیں جہاں یہ نظامِ زندگی کسی نہ کسی صُورت میں چل رہا ہے۔

جس گاؤں میں وہ اُستاد لگ کر گیا تھا' وہاں ابھی تک اِس نظامِ زندگی میں کوئی رخنہ نہیں پڑا تھا۔

کمہار اُسے گاؤں کے نمبردار کے ڈیرے پر لے گیا۔ یہ نمبردار ہندو تھا۔ اُس نے پوچھا:

منشی جی! آپ ہندو ہیں یا مسلمان؟

میں مسلمان ہُوں۔

اُس نے کمہار سے مخاطب ہو کر کہا:

لگتا ہے' تُو اِس گاؤں کا رہنے والا نہیں۔

نہیں جی' میں چک سولہ کا رہنے والا ہُوں۔

منشی جی کو نمبردار چودھری مستقیم کے ڈیرے پر لے جا...... منشی جی! کوئی اَور ٹہل سیوا؟

بس جی شکریہ! اِتنی ہی ٹہل سیوا کیا کم ہے کہ آپ نے میری رہ نمائی کر دی!

وہ بولا' اَور نمبردار نے ہاتھ جوڑ دیے۔

چند قدم دُور جا کر اُس نے نوجوان کمہار سے کہا:

یار! میں تمھارا نام پوچھنا ہی بھُول گیا۔

وہ بولا:

میرا نام پُنّوں ہے۔

واہ وا! کیا اچھا نام ہے۔

اُس نے پہلی بار پنوں کے سراپے پر بھرپور نظر ڈالی۔ چھریرا بدن' گندمی رنگ' موٹی موٹی آنکھیں اَور اُوپر کے ہونٹ پر مونچھ کی پتلی سی لکیر جسے ابھی قینچی بھی نہ لگی تھی۔ اُس کے سراپے میں اُسے رانجھے' پنوں اَور مہینوال والی ہر وہ اَدا نظر آئی جو اُستاد اللہ بخش مصوّر نے دیکھی تھی اَور صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دی تھی۔

اُس نے پوچھا:

پُنّوں کو کوئی سسّی بھی ملی یا نہیں؟

پُنّوں نے شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

تمھارا نام تو مہینوال ہونا چاہیے تھا۔

اُس نے کہا اَور پھر اپنی بات پر خود ہی شرمندہ ہو گیا کہ سوہنی تو کمہارن تھی۔ کیا پتا' اِس بات پر نوجوان کمہار کو کتنا دُکھ ہُوا ہو!

کوئی جل پانی؟

اُس نے پُنّوں سے کہا:

یار تیرا بہت بہت شکریہ۔ اَب تُو جا‘ سامان اُتار کر کھاٹ پر رکھ دے!

پُنّوں بولا:

منشی! جب یہ گاؤں تجھے قبول نہیں کرتا تو میرے ساتھ میرے گاؤں کیوں نہیں چلتا؟

اَپنے گاؤں ہی لے جانا‘ پر اِنھیں پہلے بڑے منشی جی سے تو مِل لینے دے!

لالہ منسا رام نے خوش ہو کر کہا۔

وہ کہاں ہیں؟

اُس نے پوچھا۔

وہ چک ہی میں رہتے ہیں۔

لالہ جی بولے۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا تو پنوں بولا:

منشی! سوچ میں کیوں پڑ گئے ہو۔ چلو میرے ساتھ‘ کل صبح سکول لگے تو بڑے منشی سے مل لینا!

گاؤں نے اُس کے ساتھ جو سلوک کیا تھا‘ اُس سے بے چارے کا دِل پژمردہ ہو گیا تھا۔ گویا قومی خدمت کے بیج سے جو اَکھوا پُھوٹ رہا تھا‘ اُسے لُو کا ایک جھونکا جُھلَس گیا تھا۔ کلّر اُٹھی دُھول اُس کے ہونٹوں پر پپڑی جما گئی تھی اَور مُنہ کا ذائقہ حلق تک کڑوا ہو چُکا تھا۔ ہینڈ پمپ پر اُس نے اُوک سے پانی پیا اَور پنوں کو بھی پلایا۔ گدھا بڑے صبر شکر سے اُنھیں پانی پیتے دیکھتا رہا۔

چک نمبر پندرہ اَور سولہ کے درمیان ایک چھوٹا سا راج بہا حائل تھا‘ اُس پر پُلیا موجود تھی۔ یوں اُسے پھلانگا بھی جا سکتا تھا۔ اُس ایک پھلانگ پانی سے اُس علاقے کی سَرسبزی و شادابی قائم تھی بلکہ چرند‘ پرند اَور اِنسانوں کی زندگی بھی‘ جو اُس علاقے میں بس رہے تھے۔ چک سولہ میں داخل ہوتے ہی ایک احاطے میں اُسے چاک چلتا ہُوا نظر آیا۔ مٹی کے کچھ برتن دُھوپ میں سُوکھ رہے تھے۔ ایک کونے میں آوا سلگ رہا تھا۔ جُوں ہی وہ احاطے میں داخل ہوئے‘ چاک پر بیٹھا ہُوا آدمی اُٹھ کھڑا ہُوا اَور بولا:

پُنّوں‘ آج بہت دیر لگا دی؟

پھر اچانک اجنبی پر نظر پڑی تو پوچھا:

یہ مسافر اِسی چک کا ہے یا کہیں آگے جائے گا؟

آج رات یہیں رہے گا۔ چک پندرہ میں منشی لگ کر آیا ہے۔

پُنّوں بولا۔

کیا کہہ رہے ہو یہیں رہے گا؟ ہمارے گھر میں؟ پگلے! سوچ تو لیا ہوتا' ہمارا گھر اِس شہری بابو کے قابل بھی ہے کیا؟

پُنّوں کا باپ بولا۔

چک پندرہ نے اِسے قبول نہیں کیا تو بے چارہ کہاں جاتا؟

پُنّوں نے سارا قصہ سنایا تو باپ کہنے لگا:

چک پندرہ والے تو ازل سے کمینے ہیں۔ سنا ہے' اِن کے بزرگ' مہمان پر کُتّے چھوڑ دیا کرتے تھے۔

جا! منشی جی کو چھپّر تلے بٹھا۔

ایک رنگیل پلنگ چھپّر کے نیچے بچھ گیا۔ سرہانے تکیہ رکھا گیا اَور پائنتی پر کھیس بچھایا گیا۔ پُنّوں نے اُس کا سامان پلنگ کے پاس رکھ دیا۔ تکیے پر سَر رکھتے ہی اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پُنّوں نے اُسے کندھے سے ہِلا کر کہا:

منشی' اُٹھ! کچھ کھا پی لے۔

پہلے پُنّوں نے مٹی کے لوٹے سے اُس کے ہاتھ دُھلائے' پھر چھابا اُس کے آگے رکھ دیا۔ اُس نے دسترخوان میں لپٹی ہُوئی روٹیاں نکالنے سے پہلے پانی مانگا۔ پُنّوں نے ایک کوزے میں مٹکے سے لسّی اُنڈیلی۔ لسّی نمکین تھی اَور ٹھنڈی بھی اَور اُس سے کورے گھڑے اَور کوزے کی خُوش بُو آ رہی تھی۔ روٹیاں دیسی گھی سے چپُڑی ہُوئی تھیں اَور ایک پیالی میں اَچار تھا۔ لسوڑوں' ڈھیلوں اَور آم کے اچار سے وہ بڑی بڑی دو روٹیاں کھا گیا۔ اِتنی لذّت آج سے پہلے اُسے کسی کھانے میں نہ ملی تھی۔

اگلی صبح اُس نے پُنّوں کے مشورے پر سامان وہیں رہنے دیا اَور سکول جانے کے لیے اکیلا روانہ ہو گیا۔ راستے کی جھاڑیوں میں اُس نے تیتر کی بولی سُنی اَور قسم قسم کی چڑیاں دیکھیں۔ ایک سانپ بھی بجلی کا لہریا بن کر اُس کا راستہ کاٹ گیا۔ چک نمبر پندرہ کے کُتّے بھی اُس پر بھونکے۔

ابھی سکول میں ہُو کا عالم تھا۔ لالہ منسا رام نل پر نہا رہا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر اُسے پرنام کیا۔

سکول کب لگے گا؟

اُس نے پوچھا۔

جب لڑکے آ جائیں گے۔

اَور لڑکے کب آئیں گے؟

جب اُن کا جی چاہے گا۔

لالہ منسارام نے جواب دیا۔

پھر لڑکے اِکّا دُکّا آنا شروع ہو گئے اَور مدرسے کے صحن میں دُھول اُڑنے لگی۔ لڑکوں نے ٹاٹ جھاڑے، اِتنی دُھول اُٹھی کہ زمین آسمان ایک ہو گئے۔ کچھ لڑکوں نے بالٹیاں بھر بھر کر چھڑکاؤ کیا۔ مٹی اِتنی رُوکھی تھی کہ اُس سے خُوش بُو بھی نہ اُٹھی' البتہ دُھول بیٹھ گئی۔

جب چالیس پچاس لڑکے اکٹھے ہوگئے تو منسارام جی بھی اپنی کوٹھری سے نکل آئے۔ اُن کا کرتا دھوتی کچھ اُجلے سے نظر آئے اَور سر پر مختصر سی پگڑی میں بھی کچھ وَقار دِکھائی دیا' البتہ اُس میں سے اُن کی بودی' خاصی مضحکہ خیز اَنداز میں جھانک رہی تھی۔ اُنھوں نے لڑکوں کو قطار میں کھڑا کیا اَور دو لڑکوں سے نہایت بے سُری آواز میں حمد کہلوائی۔ اوکاں کے سایے تلے کچھ ٹاٹ بچھائے گئے اَور ایک کرسی رکھی گئی جس کی سیٹ پر نہایت کھردرا سا پھٹا لگا تھا۔ کچھ لڑکے کمرے کے اَندر چلے گئے' کچھ برآمدے میں بیٹھ گئے' ایک جماعت چھپر تلے چلی گئی اَور باقی لڑکے جو بچے' وہ اوکاں کے نیچے ٹاٹوں پر بیٹھ گئے۔

لالہ منسارام نے کہا:

منشی عبدالمجید جی! اوکاں کے نیچے جو جماعت بیٹھی ہے' وہ آپ کی ہے۔

وہ بولا:

لالہ جی! ابھی تو اپریل کا مہینہ ہے اَور سایے میں کچھ خنکی ہے۔ جون کی لُو اَور برسات کے حبس میں میری جماعت کہاں لگے گی؟

یکم مئی سے واڈھی کی چھٹیاں ہو جائیں گی۔ مئی کا پورا مہینہ چھٹیاں رہیں گی اَور جون میں واڈھی ختم نہ ہوئی تو مدرسے میں خود بہ خود چھٹی رہے گی کیوں کہ کوئی لڑکا پڑھنے کے لیے نہیں آئے گا۔ برسات اِس علاقے میں لگتی ہی نہیں۔ ایک آدھ بارش ہو بھی گئی تو چھٹی کر دی جائے گی۔

ابھی اوّل مدرّس نہیں آئے تھے۔ لالہ منسارام جی اپنی جماعت لے کر چھپر تلے چلے گئے۔ وہ کھردری سیٹ والی کرسی پر جا بیٹھا۔ لڑکے اُسے عجیب نگاہوں سے دیکھنے لگے' کچھ حیران' کچھ سہمی سہمی اَور کچھ منتظر نگاہوں سے کہ دیکھیے مداری کی پٹاری سے کیا نکلتا ہے! وہ اُن سے ہم کلام نہ ہُوا کیوں کہ وہ نہایت مایوس ہو گیا تھا اَور ایک نہایت کڑوے کسیلے پچھتاوے نے اُسے آلیا تھا کہ وہ شہر کی گہما گہمی چھوڑ کر اِس ویرانے میں کیوں چلا آیا؟ اَب ویرانے میں اُس کا دِل نہ لگا تو اِسے چھوڑ کر کہاں جائے گا؟ کیا اُس نے غلط فیصلہ تو نہیں کیا؟

اُس کے سامنے جو بچے بیٹھے تھے' کتنے مَیلے مَیلے اَور اجنبی سے تھے! مَیلے کپڑے اَور مَیلے چہرے!

سکول آنے سے پہلے کسی ماں نے اَپنے بچّے کا مُنہ نہیں دُھلوایا تھا۔ اُن کے کپڑوں سے پسینے کی بُو آرہی تھی۔ یہ بچّے سکول آنے پر مجبور تھے کہ یہاں لازمی تعلیم کا ایکٹ نافذ تھا اَور ہر بچّے کے لیے چار جماعتیں پڑھنا ضروری تھا۔ دیہات کی معیشت میں بچّے کی تعلیم منافع بخش بھی نہیں تھی کہ والدین بچّے کی خدمات سے محروم ہو جاتے تھے۔ جُوں ہی بچّے کے ہاتھ میں اِتنی سکت آتی کہ وہ کُھرپا درانتی پکڑ سکے، باپ کا مددگار بن جاتا۔ اَور کچھ نہیں تو مویشیوں کی دیکھ بھال تو کرسکتا تھا۔ بچّوں کو لازمی تعلیم سے بچانے کے لیے لوگ، افسر لازمی تعلیم کی خوشامد کرتے، سفارشیں کرواتے اَور رِشوت بھی پیش کرتے۔

اُس نے سوچا: ''اِس ماحول سے مَیں کیسے مطابقت پیدا کرسکوں گا!'' اِتنے میں اوّل مدرّس آ گئے اَور اُس کی سوچ کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

وہ درمیانی عُمر کے سفید پوش آدمی تھے، خشخشی ڈاڑھی میں کچھ سفید بال بھی تھے۔ سَر پر کُلّے والی پگڑی تھی جس میں طُرّہ تھا اَور بہ مقدارِ علم شملہ بھی ...... بڑی گرم جوشی سے ہاتھ مِلا کر بولے:

منشی عبدالمجید جی! کل آپ غریب خانے پر کیوں تشریف نہ لائے؟

اُس نے پُورا قصہ سُنا کر کہا کہ جس طرز کے اِستقبال سے مجھے واسطہ پڑا، اُس سے میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ کو نہ آزماؤں اَور پُتّوں کے ساتھ چک نمبر سولہ چلا جاؤں۔

بہتر تھا کہ آپ مجھے آزما لیتے ......

اوّل مدرّس نے ہنس کر کہا:

آپ کی رہائش کا اِنتظام یہیں ہو جائے گا۔ منشی فضل دین اکیلے رہتے ہیں۔ آپ اُن کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی پر ہیں۔ جب تک وہ نہ آئیں، آپ میری بیٹھک میں رہیں!

پھر اُنھوں نے پوچھا:

آپ نے یہ محکمہ کیوں چُنا؟

اِس میں قومی خدمت کے بہت سے مواقع ہیں۔

وہ بولا لیکن اُس کی آواز میں یقین، اعتماد اَور وثوق کی قوت مفقود تھی۔

لیکن اِس محکمے میں ترقی کے مواقع بہت کم ہیں بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں......

اوّل مدرّس نے کہا:

کم اَز کم آدمی افسر نہیں بنتا۔

ایک اُستاد بی ٹی کر کے ڈسٹرکٹ انسپکٹری تک تو ترقی کرسکتا ہے۔ کیا یہ افسری نہیں؟

اُس نے پوچھا۔

ہے......لیکن اِس افسری کا ایک لطیفہ آپ سنیں گے؟

فرمایئے!

ایک ڈسٹرکٹ انسپکٹر، ایک ایسے سکول کا معائنہ کرنا چاہتے تھے جس کے راستے میں ایک برساتی نالہ حائل تھا جو اکثر خشک رہتا......اتفاق سے اُس دِن پیچھے کے علاقے میں بارش ہوگئی اور نالے میں گھٹنوں گھٹنوں پانی بہ رہا تھا۔ اے ڈی آئی نے کہا: ''صاحب! چلیے واپس چلتے ہیں''۔ ایک دیہاتی بھی وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے صاحب کا لفظ سُنا تو آگے بڑھ کر کہا: ''میں صاحب کو دُوسرے کنارے پر پہنچا آتا ہوں''۔ چنانچہ اُس نے صاحب کو پیٹھ پر بٹھایا۔ جب نالے کے عین درمیان پہنچا تو پوچھا: 'صاحب جی! آپ خیر سے کس محکمے کے افسر ہیں؟'' وہ بولے: ''سکولوں کے محکمے کے''۔ دیہاتی بولا: ''یہ تم نے پہلے کیوں نہ بتایا؟'' اور دھڑام سے اُسے نالے میں پھینک دیا۔

قصہ سُنا کر وہ کہنے لگے:

میرا مطلب آپ کو مایوس کرنا نہیں۔

دوپہر تک اُس نے اپنی جماعت کے لڑکوں کا جائزہ لیا۔ یہ دُوسری جماعت کے بچّے تھے۔ اُنھیں پہلی کا قاعدہ بھی نہیں آتا تھا۔ ''بہرحال سال کا آغاز ہے، محنت سے کیا کچھ نہیں ہوسکتا''......اُس نے سوچا۔ ''لیکن تم یہاں پڑھانے کے لیے تو نہیں آئے، پڑھنے کے لیے آئے ہو!''......کسی نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

''پر ان بچّوں کا کیا قصور ہے جنھیں میری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ کیا مجھے اِنھیں پڑھانے کا معاوضہ نہیں ملے گا؟'' اُس کی سوچ نے جواب دیا۔

اِسی تذبذب اور بحث مباحثے میں پڑھائی کا ایک دِن ختم ہوگیا۔ دوپہر کا کھانا اُس نے اوّل مدرّس کے ہاں کھایا۔ جب وہ چک سولہ میں پہنچا تو سہ پہر کا وقت تھا اور پُنّوں اُس کے اِنتظار میں تھا۔

بہت دیر لگا دی مُنشی جی!

پُنّوں نے کہا۔

اُس نے دِن کی پوری رُوداد سُنا کر کہا:

یار پُنّوں! مجھے مُنشی جی کہہ کر نہ پکارا کرو، میرا نام مجید ہے۔

پُنّوں نے اُسے پھر بھی مجید کہہ کر نہ پکارا اور کہا:

یار مُنشی! میں نے بابا سے بات کرلی ہے۔ ہم اِس چھپّر کو ٹھیک ٹھاک کر دیں گے۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے یہیں رہو گے۔ یہاں تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

اُس نے اِقرار کیا نہ اِنکار، تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو!

ایک ہفتے کے اَندر اَندر چک سولہ سے مدرسے جانا اَور وہاں سے واپس آکر پُنّوں کی خدمت تواضع سے لطف اَندوز ہونا اَور رات کو لالٹین کی روشنی میں پڑھتے رہنے کا ایک معمول خود بہ خود قائم ہوگیا۔

منشی فضل دین کے چھٹی سے واپس آنے پر وہ تذبذب میں پڑگیا کہ چک نمبر پندرہ میں آجائے یا سولہ میں پُنّوں کے پاس رہے۔ وہ کچھ فیصلہ نہ کرسکا۔

اُس نے کہا:

منشی فضل دین جی! واڈھی کی چھٹیاں ہونے والی ہیں' اِس کے بعد میں آپ کے ہاں شِفٹ ہو جاؤں گا۔

چک سولہ کے قیام کا دسواں یا بارھواں دِن تھا۔ دوپہر کی دُھوپ میں خاصی چکا چوندتھی۔ سکول سے واپسی پر اُسے خاصی گرمی بھی لگتی تھی اَور چھپر کے سایے تلے اُسے بہت سکون محسوس ہوا تھا کہ اچانک اُسے یوں لگا جیسے دوپہر کی دُھوپ چھپر کے سایے پر غالب آگئی ہو اَور اُس کی آنکھیں چُندھیا گئی ہوں۔

....

پتا نہیں' وہ ایران کے کس شہر سے آیا تھا' اصفہان یا شیراز سے' اُس کا نام مرزا عزّت بیگ تھا اَور وہ گجرات شہر کی سَیر کرتے کرتے اُس بازار میں جا نکلا جہاں تُلّے کمہار کی دُکان تھی۔ وہاں وہ ٹِھٹک کر کھڑا ہو گیا کہ وہاں ایک نازک اَندام لڑکی' چندے آفتاب چندے ماہتاب' نازک نازک صُراحیاں اَور آب خورے بیچ رہی تھی۔

پھر عزت بیگ کا قدم اُس گلی سے آگے نہ بڑھ سکا۔

وہ اَپنے ہم وطن شیراز کے شاعر کی طرح اُس کے سیاہ تِل پر سمرقند و بخارا تو نچھاور نہ کرسکا لیکن اُس نے بانات و کمخواب کے تھان اُس کے قدموں تلے بچھا دیے اَور خود عزت بیگ سے مہینوال بن گیا۔

آج وہی لڑکی' شرمائی لجائی' چھابے میں روٹیاں اَور گڑوے میں نمکین لسّی بھرے اُس کے سامنے موجود تھی اَور چھپر کے سایے تلے دُھوپ کی چاندنی بچھ گئی تھی۔

وہ لڑکی چھابا اَور گڑوا چارپائی پر رکھ کر چند لمحے منتظر کھڑی رہی اَور وہ چناب کے اُس کنارے کھڑا عزت بیگ بن کر اُسے دیکھتا رہا اَور سوچتا رہا کہ اپنی آنکھوں کے سوا اُس کے قدموں تلے کیا بچھائے......

اچانک اُس کی نظر بپھرے ہُوئے چناب کے دُوسرے کنارے پر پڑی اَور وہ پکار اُٹھا:

نہیں! نہیں! میں مہینوال نہیں بننا چاہتا۔

اَور اگلے دِن اَپنے دوست' پُنّوں کی ناراضی کے باوجود وہ چک پندرہ میں منشی فضل دین کے ہاں منتقل ہوگیا۔

واڈھیوں کی چھٹیوں کے بعد سکول دوبارہ لگا تو شہر سے نصاب کی ساری کتابیں، شرحیں اور خلاصے خرید کر لے آیا۔ مصروفیت اِتنی بڑھ گئی کہ اُسے دُنیا جہان کا ہوش نہ رہا۔ وہ سکول میں بھی جی لگا کر کام کرتا۔ گندے مندے بچّوں سے اُس کی نفرت بتدریج کم ہونے لگی اور ایک دِن اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کے دِل میں اِن بچّوں کے ساتھ پیار کا بیج پھُوٹنے والا ہے تو وہ ڈر گیا: ''نہیں! نہیں! میں اِس بیج کو پھُوٹنے نہیں دوں گا مبادا یہ نشو و نما پا کر سایہ دار درخت بن جائے!''

ایک دِن اُسے اچانک محسوس ہُوا کہ اُسے پڑھانے میں لطف آ رہا ہے تو اُس کا ماتھا ٹھِنکا: ''میرے اَندر کوئی اُستاد چھپا بیٹھا ہے۔ اِس سے پہلے کہ یہ جنم لے، میں اِس بیج کو کچل ڈالوں گا!''

چناں چہ اُس نے واجبی سا کام شروع کر دیا کہ لڑکوں کا نقصان بھی نہ ہو اور اُس کی انرجی بھی محفوظ رہے اور بچّوں اور سکول کے ساتھ اُس کی جذباتی وابستگی قائم نہ ہو سکے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اُس نے معلّمی سے استعفیٰ دے دیا اور بی ٹی کے بجائے ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا اور ٹیوشنیں کر کے اپنا خرچ پورا کرتا رہا۔ تحریکِ پاکستان سے اُس کی وابستگی زبانی کلامی رہی۔ عملی طور پر اُس نے اپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے متعلق اُس کا رویّہ خاصا معروضی تھا۔ اُس نے تیسرے درجے میں ایم اے کیا ہی تھا کہ پاکستان وجود میں آ گیا اور کالج انگریزی کے اساتذہ سے قریب قریب خالی ہو گئے۔ تب اُسے پاکستان کی اِفادیت کا احساس ہُوا۔ اُسے فوری طور پر ایک کالج کی لیکچرر شِپ مل گئی۔ اَب اگر وہ کم زور دِل اور دماغ کا آدمی ہوتا تو اِسی پر قناعت کر لیتا لیکن اُس نے دِن رات ایک کر کے مقابلے کا اِمتحان دیا اور کامیاب ہو گیا۔

ایک اعلیٰ و اَرفع زندگی کا آغاز ہُوا تو وہ اپنا ماضی یک سَر بھُول گیا۔ اُس کی ساری توجّہ ترقی کے مدارج طے کرنے پر مرکوز رہی۔ ملک و قوم سے محبت کا اِظہار اُس کے پیشے کا لازمی جزو تھا لیکن اگر وہ ہندوستان میں بھی ہوتا تو اِسی قسم کے رویّے سے کام لیتا اور نظر اپنے ذاتی عروج پر رکھتا۔ اُس نے شادی بھی کی تو اُس میں محبت نہیں، صرف ذاتی عروج پیشِ نظر رہا۔ وہ جس محکمے میں بھی جاتا، وہاں کامیاب و کامران رہتا، اور اُس کی دیانت و امانت کے ڈنکے بجتے رہے۔ اگرچہ حلال کی کمائی میں برکت ضرور ہوتی ہے مگر اِتنی نہیں کہ بنگلوں اور کاروں تک رَسائی حاصل کر لے۔ یہ معجزہ بھی اُس کی ذات سے سرزد ہُوا کہ ایک نہیں دو۲ بنگلے اُس نے بنوائے اور ہر بچّے کو اُس نے کار لے کر دی کیوں کہ بچّوں کی تعداد دو۲ سے بڑھنے نہیں دی تھی ...... پر اِتنے عروج کے باوجود بھی اُسے کبھی کبھار افسوس ہوتا کہ اُس نے اے ڈی آئی

شیخ صاحب کا مشورہ کیوں نہ مانا اَور فوج میں کمیشن کیوں نہ لے لیا!

....

وہ کسی دورے کے سلسلے میں ایک نہر کے کنارے سروس روڈ پر سے گزر رہا تھا' پیدل نہیں ایک کار پر کہ اُسے ایک پُل نظر آیا جہاں ایک گدھے والا کھڑا تھا اَور ایک بابُو گدھے والے کی چھٹ میں اَپنا بستر اَور سوٹ کیس رکھوا رہا تھا۔ بغیر کسی اِرادے کے اُس کے منہ سے نکل گیا:

ڈرائیور! کار روکو......

ڈرائیور نے کار روک لی ۔ اُس نے سوچا کہ صاحب کوئی حاجتِ ضروریہ پوری کرنا چاہتے ہیں' لیکن جب صاحب دیر تک آنکھیں پُل پر جمائے اپنی سیٹ پر گم صم بیٹھے رہے تو اُس نے پُوچھا:

صاحب جی چلوں؟

نہیں' ذرا پُل تک جاؤ اَور پوچھ کر آؤ کہ وہ سڑک کہاں جاتی ہے؟

وہ کچی سڑک؟

ڈرائیور نے پوچھا۔

ہاں! ہاں! اَور اُس بابو سے بھی پوچھ کے آنا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

صاحب جی کون سا بابو؟

وہ جو گدھے کے پاس کھڑا ہے۔

اُس نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے واپس آ کر بتایا:

وہ سڑک چک نمبر پندرہ کو جاتی ہے اَور وہ بابو وہاں سکول میں اُستاد لگ کر جا رہا ہے۔

مجھے چک پندرہ لے چلو!

ڈرائیور چند لمحے حیران پریشان رہا۔ پھر کار میں بیٹھ کر اُس نے سٹیئرنگ ہاتھ میں لیا:

صاحب جی! سڑک کچی ہے' دُھول بہت اُڑے گی۔

صاحب نے کار کے شیشے چڑھا لیے۔

جب وہ گدھے کے پاس سے گزرے تو گدھے والا اَور بابُو' دونوں بہت حیران ہُوئے اَور دیر تک حیران رہے کیوں کہ کار سے اُڑنے والی دُھول نے اُنھیں بھُوت بنا دیا تھا۔

جب وہ دُھول اُڑاتے اَور ہچکولے کھاتے چک پندرہ پہنچے تو صاحب نے کہا:

ڈرائیور! مجھے سکول لے چلو۔

واڑھیوں کی چھٹیوں کے بعد سکول دوبارہ لگا تو شہر سے نصاب کی ساری کتابیں، شرحیں اور خلاصے خرید کر لے آیا۔ مصروفیت اِتنی بڑھ گئی کہ اُسے دُنیا جہان کا ہوش نہ رہا۔ وہ سکول میں بھی جی لگا کر کام کرتا۔ گندے مندے بچّوں سے اُس کی نفرت بتدریج کم ہونے لگی اور ایک دِن اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کے دِل میں اِن بچّوں کے ساتھ پیار کا بیج پھُوٹنے والا ہے تو وہ ڈر گیا: ''نہیں! نہیں! میں اِس بیج کو پھُوٹنے نہیں دوں گا مبادا یہ نشوونما پا کر سایہ دار درخت بن جائے!''

ایک دِن اُسے اچانک محسوس ہُوا کہ اُسے پڑھانے میں لطف آ رہا ہے تو اُس کا ماتھا ٹھنکا: ''میرے اَندر کوئی اُستاد چھپا بیٹھا ہے۔ اِس سے پہلے کہ یہ جنم لے، میں اِس بیج کو کچل ڈالوں گا!''

چناں چہ اُس نے واجبی سا کام شروع کر دیا کہ لڑکوں کا نقصان بھی نہ ہو اور اُس کی انرجی بھی محفوظ رہے اور بچّوں اور سکول کے ساتھ اُس کی جذباتی وابستگی قائم نہ ہو سکے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد اُس نے معلّمی سے استعفیٰ دے دیا اور بی ٹی کے بجائے ایم اے انگریزی میں داخلہ لے لیا اور ٹیوشنیں کر کے اَپنا خرچ پورا کرتا رہا۔ تحریکِ پاکستان سے اُس کی وابستگی زبانی کلامی رہی۔ عملی طور پر اُس نے اَپنے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے متعلق اُس کا رویّہ خاصا معروضی تھا۔ اُس نے تیسرے درجے میں ایم اے کیا ہی تھا کہ پاکستان وجود میں آ گیا اور کالج انگریزی کے اساتذہ سے قریب قریب خالی ہو گئے۔ تب اُسے پاکستان کی اِفادیت کا احساس ہُوا۔ اُسے فوری طور پر ایک کالج کی لیکچرر شِپ مل گئی۔ اَب اگر وہ کم زور دِل اور دماغ کا آدمی ہوتا تو اِسی پر قناعت کر لیتا لیکن اُس نے دِن رات ایک کر کے مقابلے کا اِمتحان دیا اور کامیاب ہو گیا۔

ایک اعلیٰ و اَرفع زندگی کا آغاز ہُوا تو وہ اَپنا ماضی یک سَر بھُول گیا۔ اُس کی ساری توجہ ترقی کے مدارج طے کرنے پر مرکوز رہی۔ ملک و قوم سے محبت کا اِظہار اُس کے پیشے کا لازمی جزو تھا لیکن اگر وہ ہندوستان میں بھی ہوتا تو اِسی قسم کے رویّے سے کام لیتا اور نظر اَپنے ذاتی عروج پر رکھتا۔ اُس نے شادی بھی کی تو اُس میں محبت نہیں، صرف ذاتی عروج پیشِ نظر رہا۔ وہ جس محکمے میں بھی جاتا، وہاں کامیاب و کامران رہتا، اور اُس کی دیانت و امانت کے ڈنکے بجتے رہے۔ اگرچہ حلال کی کمائی میں برکت ضرور ہوتی ہے مگر اِتنی نہیں کہ بنگلوں اور کاروں تک رَسائی حاصل کر لے۔ یہ معجزہ بھی اُس کی ذات سے سرزد ہُوا کہ ایک نہیں دو۲ بنگلے اُس نے بنوائے اور ہر بچّے کو اُس نے کار لے کر دی کیوں کہ بچّوں کی تعداد دو۲ سے بڑھنے نہیں دی تھی...... پر اِتنے عروج کے باوجود بھی اُسے کبھی کبھار افسوس ہوتا کہ اُس نے اے ڈی آئی

شیخ صاحب کا مشورہ کیوں نہ مانا اَور فوج میں کمیشن کیوں نہ لے لیا!

....

وہ کسی دورے کے سلسلے میں ایک نہر کے کنارے سروس روڈ پر سے گزر رہا تھا' پیدل نہیں ایک کار پر کہ اُسے ایک پُل نظر آیا جہاں ایک گدھے والا کھڑا تھا اَور ایک بابُو گدھے والے کی چھٹ میں اَپنا بستر اَور سوٹ کیس رکھوا رہا تھا۔ بغیر کسی اِرادے کے اُس کے منہ سے نکل گیا:

ڈرائیور! کار روکو......

ڈرائیور نے کار روک لی ۔ اُس نے سوچا کہ صاحب کوئی حاجتِ ضروریہ پوری کرنا چاہتے ہیں' لیکن جب صاحب دیر تک آنکھیں پُل پر جمائے اپنی سیٹ پر گم صم بیٹھے رہے تو اُس نے پُوچھا:

صاحب جی چلوں؟

نہیں' ذرا پُل تک جاؤ اَور پوچھ کر آؤ کہ وہ سڑک کہاں جاتی ہے؟

وہ کچی سڑک؟

ڈرائیور نے پوچھا۔

ہاں! ہاں! اَور اُس بابو سے بھی پوچھ کے آنا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟

صاحب جی کون سا بابو؟

وہ جو گدھے کے پاس کھڑا ہے۔

اُس نے جواب دیا۔

ڈرائیور نے واپس آ کر بتایا:

وہ سڑک چک نمبر پندرہ کو جاتی ہے اَور وہ بابو وہاں سکول میں اُستاد لگ کر جا رہا ہے۔

مجھے چک پندرہ لے چلو!

ڈرائیور چند لمحے حیران پریشان رہا۔ پھر کار میں بیٹھ کر اُس نے سٹیئرنگ ہاتھ میں لیا:

صاحب جی! سڑک کچی ہے' دُھول بہت اُڑے گی۔

صاحب نے کار کے شیشے چڑھا لیے۔

جب وہ گدھے کے پاس سے گزرے تو گدھے والا اَور بابُو' دونوں بہت حیران ہُوئے اَور دیر تک حیران رہے کیوں کہ کار سے اُڑنے والی دُھول نے اُنھیں بھُوت بنا دیا تھا۔

جب وہ دُھول اُڑاتے اَور ہچکولے کھاتے چک پندرہ پہنچے تو صاحب نے کہا:

ڈرائیور! مجھے سکول لے چلو۔

سکول؟......

ڈرائیور نے کہا:

کار کھڑی کر کے کسی سے پوچھ لوں؟

نہیں! ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر سکول آجائے گا۔

اَب تو ڈرائیور کی حیرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔

صاحب نے دیکھا کہ چک کی آبادی کافی بڑھ چکی ہے۔ بہت سے نئے مکان تعمیر ہو چکے ہیں اَور اُن میں کچھ پکے بھی ہیں۔ ایک پکے مکان کے احاطے میں کار بھی کھڑی تھی۔ ممکن ہے یہ نمبردار مستقیم کا گھر ہو۔ سکول کے قریب اُس نے کار رکوالی۔ اُس نے دیکھا کہ چار دیواری کے بچے کھچے آثار بھی مِٹ چکے ہیں۔ سکول کی عمارت میں کوئی اِضافہ نہیں ہوا، گویا سکول ابھی تک پرائمری درجے سے آگے نہیں بڑھا تھا۔

صحن میں اوکاں کا بوڑھا درخت اپنی جگہ پر کھڑا تھا، البتہ اُس کا تنا کھوکھلا ہو چکا تھا اَور سایہ بھی چھدرا پڑ گیا تھا۔ اُس کے نیچے نل کا پائپ موجود تھا لیکن ہینڈل غائب تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نلکا ایک عرصے سے نہیں چل رہا۔ اوکاں کے سایے میں جو بچے بیٹھے تھے، یا تو اُن کے پھٹے پرانے ٹاٹ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے یا وہ بوریوں کے ٹکڑوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر لڑکا اَپنا بوریا گھر سے لایا ہے۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے ماسٹر جی کھڑے ہو کر اُسے دیکھنے لگے اَور کچھ بچے اُس کی کار کے قریب ٹھٹک کر کھڑے ہو گئے۔

ابھی تک اُس نے لَپنے ماضی کو لَپنے اُوپر طاری نہیں ہونے دیا تھا۔ اچانک اَز خود ماضی اُمنڈ آیا جیسے سیلاب نے بند توڑ دیا ہو۔ یہ ایک فلیش تھا لیکن اِتنا بھرپور کہ اُس کے حال پر چھا گیا۔ پُنّوں، اُس کا گدھا، سوہنی کمہارن، چناب کا دُوسرا کنارہ کہ وہ مہینوال بننے سے ڈر گیا تھا اَور چک نمبر پندرہ میں گزرا ہوا ایک سال...... یہ سب کچھ ایک لمحے میں بیت گیا۔

اُس نے ڈرائیور سے کہا:

واپس چلو!

کلر اُٹھی دُھول کا ایک بگولا اُٹھا۔ اگرچہ شیشے چڑھے ہُوئے تھے، پھر بھی حلق تک اُس کا مُنہ کڑوا ہو گیا اَور آنکھوں میں تلخی بھر گئی۔

تب اُس کی آنکھوں سے کچھ آنسو ٹپکے جو کسی نے نہ دیکھے۔

کیا یہ آنسو ندامت کے آنسو تھے؟ ندامت، اِس بات پر کہ وہ ایک کوٹھری سے نکل کر بنگلے میں پہنچ گیا تھا اَور ایک تیز رفتار کار اُسے اِس سے بھی آگے کی منزل پر پہنچانے کے لیے مصروفِ سفر تھی اَور دُوسری طرف وہ سکول تھا، جہاں ایک قوم ایک نقطے پر ٹھہر گئی تھی...... اُس پرانے چھکڑے کی طرح کہ جس کے پہیے کچی سڑک کی ''گہل'' سے نکل کر دُھول میں پھنس گئے ہوں اَور قوّت والے بازوؤں کا اِنتظار کر رہے ہوں کہ جو اُنھیں پھر ''گہل'' میں ڈال دیں۔

اَور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اُس کی پوری زندگی میں وہ لمحہ پھر سے نہ آسکا ہو جو اُس نے پنوں کمہار کی دوستی میں بِتایا تھا اَور جسے اُس نے سوہنی کمہارن کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ لیکن وہ مرزا عزت بیگ سے مہینوال نہ بن سکا تھا!

کون جانے!

☆☆☆

سبز پوش

پُل کے اُوپر ایک جیٹ سُپر سانک طیّارے نے آواز کی حَد کو توڑا۔ ہَوائی توپ چلی۔ شہر کی طرف سے سائرن کی خوف ناک آواز آئی۔ اُس کے سارے جسم پر ایک جھرجھری سی طاری ہوگئی۔ پُل کے دونوں طرف بسیں، ٹرک، کاریں اَور سائیکل رُک گئے۔ وہ سائیکل سے اُترا تو اُس کے قدم ڈگمگا گئے۔

اِس پُل نے اُس کی زندگی کے دو۲ کِناروں کو جوڑ رکھا تھا اَور آج...... آج اُس نے یوں محسوس کیا جیسے وہ ایک لمبے خلا کے ایک سِرے پر کھڑا ہو اَور دو کناروں کو مِلانے والا کوئی پُل موجود نہ ہو۔ کیا یہ اُس کی نظر کا واہمہ تھا؟...... نہیں...... وہ بُزدِل نہیں تھا...... جنگ کے سولہ۱۶ دِن گزر چکے تھے۔ اَیسا کوئی لمحہ نہیں آیا تھا کہ وہ ڈر گیا ہو۔ اَب تو وہ اِس کا عادی بن چکا تھا۔ اِس دوران میں سُپر سانک طیّاروں نے کئی بار آواز کی حَد کو توڑ کر فضا کو لرزہ براَندام کیا تھا؛ اُس نے گھر میں بچّوں سمیت سیڑھیوں تلے پناہ لی تھی، دفتر میں وہ بڑے اِطمینان سے خندق میں جا کر بیٹھ گیا تھا اَور اُسے کبھی خوف محسوس نہیں ہُوا تھا۔

اَور آج......

آج یہ پُل موجود نہیں تھا۔

اُس نے سوچا ''زندگی کے خلا کو عُبُور کرنے کے لیے پُل کی ضرورت ہے۔ اَب میں کیا کروں؟ اَب میں کہاں جاؤں؟ میں جو شہر سے گھر جا رہا تھا۔ میری زندگی کا یہ خلا کیسے عبور ہوگا! میں تو اَپنی دُنیا سے کٹ کر رہ گیا ہُوں۔ میں نے ٹالستائی کی جنگ اَور امن پڑھی تھی اَور میں نے اپنے لیے امن کو چُن لیا تھا۔ اے فیئرویل ٹو آرمز میں، مَیں نے جنگ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اَلوِداع کہہ دیا تھا۔ آل کوائٹ آن دی ویسٹرن فرنٹ کے بعد ہیروشیما اَور ناگاساکی پر دو۲ ایٹم بم گرے تھے اَور مشرق کے محاذ پر بھی موت کی خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ موت اَور امن...... امن اَور مَوت......''

اَور وہ اُونچی سڑک کے ڈھلوان سے نیچے اُتر گیا۔

وہ ایک گڑھے میں بیٹھ گیا۔ اُس کے سَر پر شیشم کے درختوں کا گھنا سایہ تھا۔ اُس کا جسم دھرتی کی آغوش سے مَس ہو رہا تھا۔

دُوسری بار ہَوائی توپ چلی۔

وہ اوندھے مُنہ لیٹ گیا۔ دھرتی نے کوئی محبّت بھرا کلمہ کہا کہ اُسے نیند آگئی۔ دھرتی اِنسان کی ماں ہے......اُس کا ملجا و ماوا...... وہ اِسی کے رحم سے نکلا ہے' اِسی میں داخل ہو گیا۔

....

صبح صبح اُس نے نئی خبر سُنی تھی کہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔

اُسے اِس کا یقین نہ آیا تھا۔ اُس کی بیوی نے گھبرا کر پوچھا تھا:

جنگ شروع ہو گئی؟

سنا تو ہے!

پھر؟

پھر کیا؟ زندہ قوموں پر اَیسے وقت آیا ہی کرتے ہیں۔

اُس کے بچّوں نے اُس کی طرف حیران نگاہوں سے دیکھا تھا۔

اُس نے سوچا تھا: "وہ نسل جو جنگ میں سے گزر جائے، کُندن ہو جاتی ہے......کندن یا خاک؟"

اُس کے ضمیر نے اُسے ٹوک کر کہا: "جمود اَور امن نے تمھیں بُزدِل بنا دیا ہے۔ قومیں جنگ میں اَپنے آپ کو دریافت کرتی ہیں۔ امن تو مَوت کی نیند ہے!"

اَور اُس دِن جب وہ دفتر سے واپس اَپنے گھر آ رہا تھا تو پُل پر بڑا ہجوم تھا۔ عورتیں' بچے' بوڑھے' جوان' گائیں' بھینسیں' بکریاں' تانگے' چھکڑے' سائیکل' سَروں پر گٹھریاں' چہرے گرد آلود' آنکھوں میں تھکن!

تم کس گاؤں سے آئے ہو؟

اُس نے ایک بوڑھے کسان سے پوچھا تھا۔

ڈوگرائی سے۔

کس طرح؟

کس طرح!......

بوڑھے نے حیران ہو کر سوچا:

بھاگاں!

ایک گرد سے اَٹے' سفید بالوں والی عورت نے کہا:

کہو!

بھاگاں! میں تو غفلت کی نیند سویا ہوا تھا۔ وہ آواز تم نے سُنی تھی؟

ہاں! وہ آواز گاؤں کی مسجد کے مینار سے آ رہی تھی۔ لوگو! جنگ شروع ہو گئی۔ گاؤں چھوڑ دو۔

یہ آواز دینے والا کون تھا؟

اُس نے پوچھا۔

کوئی اللہ کا بندہ ہوگا۔ میں گنہ گار کیا جانوں اِس کے بھید! جب ہم گاؤں سے نکلے تو ہمارے پیچھے توپیں چنگھاڑ رہی تھیں اور گولیاں چل رہی تھیں۔

نوراں کہاں ہے؟

میرے ساتھ چل رہی ہے۔ فکر نہ کرو!

بھاگاں نے جواب دیا۔

"یہ نوراں کون تھی؟"......

وہ تو ایک شرمائی لجائی لڑکی تھی جس کی نگاہیں جھکی ہُوئی تھیں اور جس کی دوشیزگی رَستے کی دُھول میں اَٹ کر اور نکھر آئی تھی۔ اُس کا چہرہ دُھوپ میں تمتما رہا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے وہ آواز اُس کی آنکھوں کی چمک بن گئی ہو اور اُس کی پُشت پناہی کر رہی ہو۔

"میں نے یہ چمک پہلے کہاں دیکھی تھی؟"......اُس نے سوچا۔ "ڈوگرائی میں یا گلبرگ میں؟ کپاس کے کھیت میں یا سُرخ گلاب کی جھاڑیوں میں؟ وہ کپاس چُن رہی تھی یا گلاب کے پھُول توڑ رہی تھی؟ اُس کی اُنگلیوں میں کتنی پھُرتی، لچک اور توانائی تھی جیسے بجلی کی رَو تتلی بن کر اُڑ رہی ہو!"

وہ کپاس کے کھیت کی رانی تھی۔

دُور دُور تک سفید کپاس کِھلی ہُوئی تھی۔

اور گلاب کے پھُول!......

....

وہ گلبرگ کی ایک خوب صُورت کوٹھی کے لان میں کھڑی تھی۔

وہ اُس کا نام تو نہیں جانتا تھا لیکن گلاب کی جھاڑیوں میں وہ نور جہاں معلوم ہو رہی تھی کیوں کہ اُس کے ہاتھ میں گلاب کا پھُول، اُس کے رُخساروں کو چھُو رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں شاہانہ تمکنت تھی جیسے وہ کُل کائنات کی ملکہ ہو اور شباب نے اُس کے وجود میں آکر اِرتقائے حیات کی معراج پا لی ہو۔

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکا تھا۔ پھر اَپنے رَستے پر چل پڑا تھا کہ کہیں غیرتِ حُسن اُسے غیر نہ سمجھ لے حالاں کہ وہ اُس کا محرمِ راز تھا۔

اور اُسی پُل کے اِس سِرے پر وہ اُس کی کار کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا۔ سائیکل اُس کے گھٹنوں میں تھا۔ پُل اُس دِن خلا کے کناروں کو مِلا رہا تھا۔ ٹریفک رُکی ہُوئی تھی۔ کار لبالب بھری ہُوئی تھی۔

اُس کا چہرہ اُترا ہُوا تھا اور اُس کے ہاتھ میں گلاب کا پھُول نہیں تھا۔ اُس کی آنکھ میں چمک نہیں تھی۔

”کائنات کی ملکہ نہ جانے کیوں خائف ہے؟“...... اُس نے سوچا اور اُس کا دِل بھر آیا۔ تب اُسے اچانک غصہ آیا۔ ”وہ گلبرگ کا تختۂ گلاب چھوڑ کر کیوں جا رہی ہے؟ اُس کی آنکھوں میں چمک کیوں نہیں؟ کیا اُس نے وہ آواز نہیں سُنی تھی جو ڈوگرائی مسجد کے مینار سے بلند ہوئی تھی“۔

....

دشمن جوشن کلاں میں آدھی رات کو داخل ہُوا۔ لوگ بچ بچا کر نکل آئے۔ کچھ چونڈے میں آئے، کچھ سیال کوٹ میں۔ اللہ کا شکر ہے کہ سب محفوظ ہیں۔ اپنی خیریت سے مطلع کرو!

یہ اُس کے دوست کا خط تھا جو سیال کوٹ سے نو۹ تاریخ کو چلا تھا اور گیارہ۱۱ کو اُسے مِلا تھا۔ اُس خط میں اُسے اُس بم کی آواز نہ آئی جو سیال کوٹ پر گِرا تھا۔ نہ اُس میں چونڈے کی اُس لڑائی کا ذِکر تھا جس میں ٹینک آپس میں ٹکرائے تھے اور تاریخ کے صفحات گونج اُٹھے تھے؛ اُن میں ایک خوف ناک اور تاب ناک باب کا اِضافہ ہُوا تھا۔

اُس کا اپنا گاؤں بھی تو گولہ باری کی زد پر آ گیا تھا۔

اُس کے والد نے لکھا تھا:

ہم گاؤں چھوڑ کر اِدھر ڈسکے آ گئے ہیں۔ کوئی فکر نہ کرو!

اور وہ روز پُل پر سے گزر کر شہر آتا رہا کیوں کہ اُسے اپنا فرض ادا کرنا تھا۔ رات توپوں کی دن دناہٹ کے نغمے سننے میں گزرتی۔ نیند پھر بھی آ جاتی۔ ایک ایک رات میں تین تین بار خطرے کا سائرن بجتا اور وہ سیڑھیوں کے نیچے پناہ گاہ میں چلے جاتے اور ایک بار تو ایسا ہوا کہ سائرن بجتا رہا اور گھر میں کوئی بھی نہ جاگا۔ اُس نے سوچا تھا: ”میں اُنھیں جگا کر کیوں پریشان کروں...... موت سے کون بچ سکتا ہے!“

پھر ایک روز اِسی پُل پر سے گزر کر وہ اپنے گاؤں پہنچا کیوں کہ اُس دِن یہ پُل محفوظ تھا۔ اُس کے گاؤں پر ہُو کا عالم طاری تھا اور توپیں گرج رہی تھیں۔ اور گاؤں سے باہر کنویں رُوں رُوں چل رہے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے عورتوں اور بچّوں کو گولوں کی زد سے دُور محفوظ مقامات پر منتقل کر دیا تھا...... بس گاؤں سے یہی ایک دو میل آگے! مرد، دِن بھر کھیتوں میں کام کرتے، ہل چلاتے اور سرِشام کام چھوڑ کر خندقوں میں پناہ لے لیتے۔

سیال کوٹ شہر کی دُکانیں کھُلی تھیں۔

اقبال چوک میں بڑا ہجوم تھا۔

اُس نے پوچھا:

یہ ہجوم کیوں؟

ابھی ابھی قیدیوں کی لاریاں یہاں سے گزریں گی۔

اُسے غصہ آ گیا۔ یہ لوگ جنگ میں بھی تماشا دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ کتنی غیر سنجیدہ قوم ہے جو جنگ کو جنگ نہیں سمجھ رہی۔ یہاں سے محاذ ہے بھی کتنی دُور! رات کی خاموشی میں توپیں تو ایک طرف' رائفلوں اَور برین گنوں کی آوازیں بھی صاف سُنائی دیتی ہیں۔ توپوں کے گولے شہر کے اندر گِرتے ہیں۔ قوم کو تو پناہ گاہوں میں چلے جانا چاہیے تھا۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ سائرن بجا۔

اُس کے کانوں میں سَنسناہٹ سی ہُوئی اَور اُس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگنے لگے۔ یہ غیر سنجیدہ قوم...... جنگ کو بازیچۂ اَطفال سمجھ رکھا ہے اِس نے!

مجمع آہستہ آہستہ منتشر ہونے لگا۔ لوگ بادلِ ناخواستہ اَپنے اَپنے گھروں کو چلے گئے۔ اُس نے بھی ایک دُکان کے چھجّے تلے پناہ لے لی۔

تم یہاں؟

اُس کے دوست نے مسکراتے ہُوئے پوچھا۔

ہاں! میں تمھاری طرف آ رہا تھا۔

تم لاہور سے کب آئے؟

آج ہی...... گاؤں سے ہو کر آ رہا ہُوں!

ہم تو سمجھتے تھے کہ ہم سیال کوٹ والے بہت دلیر ہیں۔ اَب معلوم ہُوا کہ لاہور والوں کا دِل گردہ بھی فولاد کا بنا ہُوا ہے۔

سائرن بجا۔

فضائی حملے کا خطرہ دُور ہُوا تو وہ دونوں ٹرنک بازار کی طرف چل پڑے۔ سارے بازار کے دروازے ٹوٹے ہُوئے تھے اَور کھڑکیاں چُور چُور تھیں۔ گھاس منڈی سے ذرا آگے ملبے کے ڈھیر تھے اَور قلعے کی عمارتوں میں لمبی لمبی دراڑیں مُنہ کھولے کھڑی تھیں لیکن پیر مُراد کی قبر پر قرآن شریف یُوں پڑے ہُوئے تھے جیسے ابھی کسی نے اُنھیں غلافوں میں لپیٹ کر ترتیب سے رکھا ہو۔

اُن ڈھیروں کو دیکھ کر ایک غیر ملکی صحافی رو پڑا تھا۔

لیکن سیال کوٹ والے ہنستے رہے تھے۔

اُس رات بھی سائرن تو ہُوا تھا، لیکن ہوائی جہاز شہر کے اُوپر یوں چکر کاٹتا رہا جیسے وہ نشانہ لگانے کے لیے اپنی پسند کی جگہ کا اِنتخاب کر رہا ہو...... چند لمحوں بعد سارا شہر ہِل گیا اور دیر تک در و دیوار سے گڑگڑاہٹ کی آواز آتی رہی۔ میں گھر کی سیڑھیوں تلے کھڑا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ میں ہیروشیما میں ہُوں اور میرے ایٹمی ذرّات فضا میں تحلیل ہو چکے ہیں اور میں زمان و مکاں کی قید سے آزاد ہو چکا ہُوں۔ وہ ایک لمحہ تھا۔ اُس میں پوری زندگی تھی۔ اُس میں اَزل تھی اور اَبد تھی۔ میں نے موت کے بعد کی زندگی کو ایک نظر دیکھ لیا تھا۔ دوست! اِنسان مَرتا نہیں، کبھی نہیں مَرتا، بس لمحہ اپنی جُون بدل لیتا ہے۔ چلو گھر چلیں!

چائے کی پیالی سے چٹاگانگ اور سلہٹ کی مٹی کی خُوش بُو آئی حالاں کہ وہ سیال کوٹ میں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔

قرب اور فاصلے بھی تو محض تخیل کا ایک کرشمہ ہیں!

جوشن کلاں

جوشن کلاں، سیال کوٹ سے دس بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔ اِس کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اِس میں خوش بُودار دھان اُگتا ہے۔ اِیکھ کے کھیتوں سے رس کی خُوش بُو آتی ہے۔ کپاس کے کھیتوں میں رنگ برنگ پھول کِھلتے ہیں تو زمین کے دِل کی دھڑکنیں صاف سُنائی دیتی ہیں۔ اِس گاؤں کے پاس سے جو سڑک گزرتی ہے، اُس کے دو۲ رویہ شیشم کے بڑے بڑے درخت ہیں جن کے سایے تلے مسافر آرام کرتے ہیں۔

اُس کو جانتے ہو؟

اُس کے دوست نے پوچھا۔

کسے؟

وہ اِس اچانک سوال پر حیران رہ گیا۔

اللہ بخش کو۔

وہ کون ہے؟

وہ جو راولپنڈی میں ہمیں مِلا تھا۔

کب؟...... مجھے تو یاد نہیں آ رہا۔

اٹھارہ۱۸ سال پہلے کی بات ہے۔ وہ لمبا تڑنگا جس کی ابھی مَسیں بھیگ رہی تھیں۔

کچھ یاد نہیں آ رہا۔

اُس نے ابھی ابھی رنگ رُوٹی پاس کی تھی۔ وہ بڑا خوش تھا۔

خیر...... پھر؟

وہ میرے گاؤں جوشن کلاں کے ایک کسان کا بیٹا تھا۔

اُس نے دوست سے کہا۔

ماتا روٹی دو

جوشن کلاں ابھی اندھیرے کی لپیٹ میں نہیں آیا تھا کیوں کہ ابھی تک چاند چمک رہا تھا اُور ہلکی ہلکی چاندنی ہرسُو بکھری ہُوئی تھی۔ لوگ چھت پر سوئے ہوئے تھے، وہ چھت پر مصلا بچھائے بیٹھی تھی کیوں کہ وہ رات کو بہت کم سوتی تھی۔ اُسے پیاس لگی تو وہ نیچے صحن میں آئی۔ گاؤں خاموش تھا، اِتنا خاموش اُور پُرسکوں کہ کسی طوفان کی خبر ہَوا کے ہلکورے پر سرگوشی بن کر آتی تو ماننے کو جی نہ چاہتا۔ صحن میں مکان کا سایہ تھا اُور چاندنی کا ہلکا سا اُجالا اُور نیچی چاردیواری کے باہر اُسے پرچھائیں سی نظر آئی ...... دیوار سے پرے ہلکا سا سایہ، تو اُس نے اَپنے آپ سے ہم کلام ہو کر کہا: ''میرا وَہم ہے وَہم۔ میں بوڑھی ہُوں۔ میری آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں''۔

پھر بھی اُس نے پوچھ لیا:

کون ہو تم؟

میں ہُوں۔

آواز کانپ رہی تھی۔

وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔ یہ آواز مانوس بھی تھی اُور نامانوس بھی، پر اِس میں کپکپاہٹ کیوں تھی؟

کون ہو تم؟

اُس نے پھر پوچھا۔

ماتا! میں تیرا بیٹا ہُوں۔

تم اللہ بخش ہو؟

ماتا روٹی دو!

پھر تم کون ہو؟

ماتا میں جو کچھ بھی ہُوں، تم چِنتا نہ کرو۔ اَپنے ایک بیٹے کو روٹی دو۔ اُسے بھوک لگ رہی ہے۔

اُس کے لفظوں میں کتنا خلوص تھا!

ماتا...... ماتا......

پر وہ ڈر گئی تھی۔

اُس نے کہا:

ذرا ٹھہرو! تم اللہ بخش نہیں تو نہ سہی، تم نے مجھے ماتا کہا۔ میں تمھیں روٹی لاکر دیتی ہُوں۔

وہ کچے کوٹھے میں گئی۔ اُس نے روٹیوں کی چنگیر اُٹھائی اور ہنڈیا کی ساری دال ایک بڑے سے کٹورے میں اُنڈیل دی۔ پھر اُس نے چنگیر دیوار پر رکھ کر کہا:

لو کھاؤ بیٹا!

ماتا!......

گلوگیر آواز نے کہا:

گاؤں چھوڑ کر نکل جاؤ۔ پورب کے رستے نکلنا!

اُس نے اپنی بہُو کو جگایا اور وہ بچّوں کو لے کر گھر سے نکلیں تو سارا گاؤں اُن کے ساتھ تھا۔ لوگ چل رہے تھے، اُن کے پاؤں کی چاپ بھی نہیں آرہی تھی۔ گھُٹے گھُٹے سانس، گاؤں خالی ہو رہا تھا اور چاند ڈوب رہا تھا۔ اَب کوئی پرچھائیں نظر نہ آرہی تھی، پرچھائیاں تو اندھیرے اور اُجالے کے سنگم پر جنم لیتی ہیں۔

وہ اللہ بخش کی ماں تھی جو فوجی تھا۔ اُس نے ماتا کہہ کر اُسے پکارا، کیوں کہ وہ بھُوکا تھا۔ وہ جانتی تھی، یہ اللہ بخش نہیں، یہ کِرپا سنگھ ہے، پر وہ ماں تھی، ایک بیٹے کی پکار پر اُسے روٹی سے محروم نہ رکھ سکی......

اُس کے دوست نے کہا اور کہتے کہتے ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔ تب اُس کی طرف تکتے ہوئے اُس نے سلسلۂ کلام کو یُوں ختم کیا:

لوگ کہتے ہیں، وہ کوئی فرشتہ تھا جس نے گاؤں کو خطرے سے خبردار کر دیا۔

لیکن فرشتے کھانا نہیں مانگتے۔

اُس نے ہنستے ہُوئے جواب دیا تھا۔

راکٹ لانچر

اُس کے کندھے پر راکٹ لانچر تھا۔ اُس کی کمر سے تین ۳ راکٹ بندھے تھے۔ ابھی ابھی یہاں ٹینکوں کی خوف ناک لڑائی ہوئی تھی۔ وہ مورچا بند ہو کر بھی نہ لڑ سکتے تھے۔ وہ ایک راکٹ بھی نہ چلا سکا تھا کیوں کہ یہ جنگ کسی جنگی اُصول کے مطابق نہ لڑی گئی تھی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ اپنا ٹینک کون سا ہے اور بے گانہ کون سا! اَب وہ حیران تھا کہ اُس کے ساتھی کہاں گئے کیوں کہ چارسُو دُھواں چھایا ہُوا تھا اور غُبار اُٹھ رہا تھا۔ دھن دھن گولے برس رہے تھے اور دھرتی کا کلیجا کانپ رہا تھا۔ درخت سرِنگوں ہو گئے تھے۔ دھرتی پِس کر مہین دُھول بن کر رہ گئی تھی۔ اُسے کیا خبر کہ کل کو تاریخ میں ٹینکوں کی اِس لڑائی

کو کیا درجہ ملنے والا ہے! اُسے تو معلوم تھا کہ آج اُس کے پاس تین[۳] ٹینک توڑ راکٹ تھے اَور ابھی تک اُس نے ایک راکٹ بھی نہیں چلایا تھا۔

اُسے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے!

اُس کی آنکھوں میں مہین دُھول گھس گئی تھی۔ اُس میں بارُود کی بُو تھی، چبھن اَور تلخی تھی۔

چاچا اللہ بخش!

یہ کس کی آواز تھی؟ اُس نے گھوم پھر کر آواز کو پکڑنے کی کوشش کی۔

چاچا اللہ بخش!

تم کون ہو؟ تمھاری آواز مانوس ہے لیکن نہ جانے کس دُنیا سے آ رہی ہے!

چاچا!

تم نور خاں ہو؟

چاچا!

نور خاں! تم شرارت سے باز نہیں آؤ گے۔ سامنے آؤ۔ دیکھو تو سہی، میں اکیلا ہُوں!

نور خاں، اُس کی پلٹن کا کم عُمر سپاہی تھا۔ بڑا شریر اَور چُلبلا...... اَور وہ پینتیس[۳۵] برس کی عُمر میں ساری پلٹن کا چاچا تھا کیوں کہ اُس کے ہم عُمر ساتھی لانس نائک، نائک اَور حوالدار بن چکے تھے اَور وہ سپاہی کا سپاہی رہا تھا۔

اللہ بخش، تم ساری عمر گھامڑ کے گھامڑ رہے۔

نہیں صاحب۔ یس سَر...... نو سَر...... میں گھامڑ سپاہی ہُوں۔ اٹھارہ[۱۸] سال کے بعد بھی گھامڑ ہُوں۔ اَب تو میری مُونچھوں میں سفید بال آ گئے ہیں۔ صاحب! میں گھامڑ نہیں ہُوں۔

اللہ بخش! اُونٹ کے مافق مارچ نہ کرو۔

میں لمبا ہُوں، میں اُونٹ کے مافق مارچ کرتا ہُوں۔ میرے گھٹنے سیدھے نہیں رہتے، پر میں نے تیس تیس میل رُوٹ مارچ کی اَور میں نے تھکنے کا نام نہ لیا۔

راکٹ لانچر کو سیدھا رکھو۔ راکٹ ٹھیک طرح سے ڈالو۔ نشانہ سیدھا لگاؤ۔ شاباش جوان...... اللہ بخش! تم جیسا سپاہی تو تیر کمان سے لڑنے کے قابل ہے۔ اِدھر اَب نیا اسلحہ آ گیا ہے۔ جنگ کا طریقہ بدل گیا ہے۔ تم کیسے سیکھے گا؟ تُو تو گھامڑ کا گھامڑ رہے گا۔

گھامڑ سپاہی!

کل کے چھوکروں کے کندھوں پر تین تین بتّیاں لگ گئیں اَور وہ ابھی سپاہی تھا۔

گھامڑ سپاہی!

چاچا!

آیا نور خاں!

آج میں نے تمھیں شیر کی طرح لڑتے دیکھا۔ تم توپ کے منہ میں کود جانا چاہتے تھے اَور تم زخمی تھے۔ میں نے بوتل سے پانی کے چند قطرے تمھارے منہ میں ٹپکائے تھے اَور تم نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

تم نے پوچھا تھا: ''چاچا! میں کہاں ہُوں؟''

''جنگ کے میدان میں!''...... میں نے کہا تھا اَور تمھارے ہونٹ مسکرائے تھے۔ تم نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن کہہ نہ سکے تھے۔

نور خاں! اَب تم کہاں ہو؟ مجھے کہاں سے بلا رہے ہو؟

چاچا!

ہاں! ہاں! میرے پاس تین راکٹ ہیں۔ میں اپنی پلٹن سے بچھڑ گیا ہُوں اَور مجھے راستہ نہیں مِل رہا۔

تم!...... تم کہاں ہو؟...... اِتنے فاصلے پر! تم غبار پر اُڑ رہے ہو اَور تم بہت دُور ہو، پر میں نے بھی تیس تیس میل رُوٹ مارچ کی ہے۔ میں آیا نور خاں، میں آیا!

غبار، کائی کی طرح پھٹ گیا تھا۔ نیل کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ نور خاں دُوسرے کنارے پر تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ نور خاں پیچھے ہَٹ گیا۔ وہ بڑھتا رہا۔ نور خاں ہٹتا رہا۔

تم ٹینک کے پیچھے کیوں چھُپ گئے نور خاں؟

راکٹ ڈالو۔ راکٹ لانچر کو سیدھا رکھو۔ ٹھیک نشانہ لو۔ شاباش جوان!

دھن...... ٹینک میں ایک شُعلہ سا گھس گیا...... اَور پھر دُنیا تہ و بالا ہو گئی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے سارے جسم پر چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔

چاچا!

نور خاں تم!

غبار پھر کائی کی طرح پھٹا۔ وہ آگے بڑھا تو نور خاں پیچھے ہَٹ گیا۔ پھر وہ ایک ٹینک کے پیچھے چھپ گیا۔

راکٹ ڈالو، راکٹ لانچر کو سیدھا رکھو۔ ٹھیک نشانہ لو۔ شاباش جوان!

دھن...... ٹینک میں ایک شعلہ، سانپ کی طرح بَل کھا کر گھس گیا...... اَور اُس کے جسم پر بچھّو ڈنک لگانے لگے۔

چاچا!

دیکھو تو نور خاں! اَب مَیں چل کر نہیں آسکتا۔

چاچا!...... چاچا!...... چاچا!

تم بہت دُور ہو نور خاں۔ مجھ سے اَب چلا نہیں جاتا، پر میں آؤں گا۔ مجھے بلاتے رہو!

وہ پھر چل پڑا۔ نور خاں تیسرے ٹینک کے پیچھے ہَوا میں معلق تھا۔ اُس نے تیسری بار راکٹ چلایا اَور ٹینک سے شعلے لپکے۔

تین ۳ راکٹ ...... تین ۳ ٹینک۔

اُس نے راکٹ لانچر پھینک دیا۔

نور خاں غُبار کے بادل میں گم ہو گیا۔

تم چلے گئے نور خاں۔ میں اَب کہاں جاؤں؟

اُس کے چاروں طرف خلا تھے اَور وہ زمین پر رینگ رہا تھا۔

وہ گھامڑ سپاہی جس کے راکٹ پہلی بار نشانے پر لگے تھے۔

چاچا!

اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

میں کہاں ہُوں؟

اَپنے مورچے میں۔

اللہ بخش، تمھارا راکٹ لانچر کہاں ہے؟

حوالدار صاحب! تینوں راکٹ نشانے پر بیٹھے۔

راکٹ لانچر؟

وہ میں نے پھینک دیا صاحب!

تم گھامڑ کے گھامڑ رہے۔ وہ تو بہت قیمتی ہتھیار ہے۔

وہ لڑکھڑا کر اُٹھا۔

ٹھہرو!

اُس کی زخمی ٹانگوں نے اُس کے اِرادے پر لبّیک کہا۔ وہ دوڑا۔ جب وہ واپس آیا تو زمین پر رینگ رہا تھا۔ لیکن راکٹ لانچر اُس کے کندھے پر بندھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں زندگی اَور موت کی کشمکش نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔

وہ جب ہسپتال میں پہنچا تو بے ہوش تھا۔

جب اُسے ذرا ہوش آیا تو اُس نے پوچھا:

راکٹ لانچر؟

وہ محفوظ ہے اللہ بخش!

ڈاکٹر نے کہا' جو سارے قصے سے واقف تھا۔

اللہ بخش نے زیرِلب مسکرا کر کہا:

سر! اَب تو میں گھامڑ سپاہی نہیں۔

....

میں حیران ہُوں' اِتنا زخمی ہونے کے باوجود اُسے کون سی طاقت اَپنے مورچے تک کھینچ لائی!

اُس نے اَپنے دوست سے پوچھا۔

سبز پوش!

اُس کے دوست نے کہا۔

سبز پوش؟

وہ حیران ہو گیا تھا۔

اِس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟

اُس کے دوست نے کہا۔

یہی کہ معجزات کا زمانہ گزر چکا ہے۔

ایک لطیفہ سنو!

سناؤ!

ٹینکوں کی خوف ناک لڑائی کے بعد ایک بڑے فوجی افسر نے چوِنڈے کے محاذ پر لڑنے والے ایک سپاہی سے کہا: "جوان! قوم تمھاری بڑی ممنون ہے' تم نے اُس کی عزّت بچالی۔

صاحب! یہ سب اللہ کا فضل ہے' اُس نے ہماری مدد کی۔

نہیں صاحب! اللہ نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔

پاس کھڑے کمپنی کمانڈر نے کہا۔ سارے سپاہی کانپ گئے۔ یہ تو کفر کا کلمہ ہے۔

سر!

ہر سپاہی کے لہجے میں احتجاج تھا۔

دیکھو جوان! اللہ تو ہر محاذ پر خود لڑتا رہا ہے۔ البتہ ہم نے اُس کی مدد کی۔

سبز پوش

"سبز پوش......سبز پوش......" اِس قوم کے دماغ کو کیا ہو گیا ہے! یہ معجزات کا دَور نہیں۔ اَب تو سائنس کی حکم رانی ہے۔ ایٹم کی اِس دُنیا میں سبز پوش!

اللہ کی فوجیں تمھاری مدد کر رہی تھیں لیکن تم اُنھیں دیکھتے نہیں تھے۔

اَور اَب لوگ اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ ہر محاذ پر قید ہونے والے دُشمن کے سپاہیوں نے پہلی بات یہی پوچھی تھی:

تم تھوڑے سے آدمی ہو۔ تمھاری سبز پوش سینا کہاں گئی؟

سبز پوش سینا...... بس میں بیٹھو تو اُن کا تذکرہ، کسی چوک پر کھڑے ہو جاؤ تو اُن کا ذِکر۔ اِن باتوں سے اِیمان کم زور ہوتا ہے۔ اَپنے دست و بازو پر بھروسا نہیں رہتا۔ اُس کا دوست بھی اِسی وَہم میں مبتلا تھا اَور وہ بوڑھا بھی جو اُسے پُل پر مِلا تھا اَور جس کی بیوی نے ڈوگرائی کی مسجد کے مینار سے سُنا تھا: "لوگو! گاؤں چھوڑ جاؤ"۔ یہ آواز گلبرگ میں کیوں نہ پہنچی کہ لوگو! گلبرگ محفوظ ہے۔ لاہور چھوڑ کر نہ جاؤ' ورنہ وہ تختۂ گلاب کی ملکہ اِتنی خائف نظر نہ آتی اَور یہ تو اللہ بخش شہید کا جوشِ ایماں تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود وہ راکٹ لانچر لے کر مورچے میں پہنچ گیا۔

سبز پوش...... سبز پوش......

عجیب عجیب باتیں' اِیمان کی کم زوری...... میں اِن پر کیسے یقین کر لوں! جوشِ ایماں اَپنی جگہ لیکن عقل بھی تو کوئی چیز ہے!

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

میں عقل کا غلام بھی نہیں ...... لیکن میری پیشانی پر پسینہ کیوں ہے اَور میرا رُواں رُواں کانپ کیوں رہا ہے؟...... اِس لیے کہ پُل اُڑ گیا ہے اَور میں اپنی دُنیا سے کٹ کر رہ گیا ہُوں۔ پُل کے اُس پار میرا گھر ہے جہاں میرے بچے سیڑھیوں تلے دَبکے کھڑے ہیں!

اُس دِن وہ پُل پر سے گزرنا چاہتا تھا کہ ٹریفک رُک گئی۔

داتا کی نگری پر دُشمن کا قبضہ نہیں ہو سکتا۔

ایک خوش پوش سکوٹر سوار نے کہا۔

لیکن دُشمن بم تو گرا سکتا ہے۔

اُس کے پیچھے بیٹھے ہُوئے آدمی نے کہا۔

تمھارا اِیمان کم زور ہے۔ جانتے ہو پُل پر کتنی بار حملہ ہوا؟

نہیں تو......

دو۲ بار۔

پھر کیا ہوا؟

دونوں بار لوگوں نے دیکھا کہ جہاز نے بم گرایا۔

یہ نظر کا دھوکا ہوگا۔ ہمارے محکمۂ اطلاعات نے ایک بار بھی اِس کی تصدیق نہیں کی۔

بم ہَوا میں غائب ہو کر رہ گیا۔ وہ دریا میں بھی گِرتا ہوا نظر نہ آیا۔

سب کچھ ضعیف الاعتقادی کا کرشمہ ہے۔ اوّل تو پُل پر کبھی حملہ نہیں ہُوا۔ اگر ہُوا بھی تو نشانہ ٹھیک نہ پڑا ہوگا یا جہاز بم نہ گِرا سکا ہوگا۔ ارے بھائی! چھوڑو اِن قصوں کو۔ جنگ کے ایّام میں اِنسان کا تخیل بہت تیز ہو جاتا ہے، وہ عجیب عجیب کہانیاں تراشتا ہے!

کچھ بھی ہو۔ لوگوں نے ایک سبز پوش کو دیکھا کہ جھولی پھیلائے دریا کے پانی میں کھڑا ہے۔

سبز پوش!

دُوسرا آدمی کِھل کِھلا کر ہنس پڑا:

سبز پوش...... وَہم کا کرشمہ، تخیل کی کرامت، اِیمان کی کم زوری، چلو ٹریفک کھل گئی!

اَور آج تو واقعی پُل اُڑ گیا ہے۔

آج وہ سبز پوش کہاں گئے جو بم کو جھولی میں لے لیا کرتے تھے؟

ایک بار پُل ٹوٹ جائے تو شاید کوئی سبز پوش اِس خلا کو پُر نہیں کر سکتا۔

اُس کے سارے جسم پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے رینگنے لگے اَور پیٹ کے بَل لیٹے لیٹے اُس کی ٹانگیں سَرد اَور بے حس ہوگئیں اَور زمین مَر گئی۔ سایوں میں موت کی خنکی سما گئی...... موت جو زندگی کی دُھوپ سے پرچھائیں بن کر لپکی ہے، مایوسی کی موت، نا اُمیدی کی موت! وہ جسم سے عاری ہو گیا کیوں کہ جسم اَور رُوح کو مِلانے والا پُل اُڑ چکا تھا؛ پھر بھی سوچ کا سَرچشمہ جاری تھا۔ اُس کا منبع کیا تھا؟ کیا اُس کا ذہن زِندہ ہے؟ جسم کے ساتھ رُوح کیوں نہ مَر گئی؟ شاید میرے اِیمان کا پُل تباہ ہو گیا ہے...... اِیمان جس نے زندگی اَور موت کے رِشتوں کو مِلا رکھا تھا۔ اَب وہ خوف زدہ تھا...... بے اِنتہا خوف زدہ! خوف، موت ہی کا دُوسرا رُخ ہے لیکن نہایت بھیانک رُخ!

تب کسی نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔

ایک اِرتعاش...... ایک لہر...... ایک ننھی سی لرزِش...... کپکپی...... میرا تخیل کتنا حسّاس ہے...... تم کون ہو؟...... میں تو مَر چُکا ہُوں...... میری پیشانی پر نرم نرم اُنگلیوں کی لرزِش جیسے کوئی جسم اَور رُوح کے تار مِلا رہا ہو...... رُوح کے دروازے پر ہلکے ہلکے دستک دے رہا ہو...... اُٹھو تم صُورِ اِسرافیل کی آواز نہیں سن رہے؟...... تم نے دَم لے لیا ہے، اَب آگے چلو! یہ تو لامتناہی سفر کا نقطۂ آغاز ہے جہاں

تم ٹھہر گئے ہو...... اُٹھو!...... اُٹھو!!......

تم کون ہو؟

سبز پوش!

اُس کی رُوح چونک کر جسم میں حلول کر گئی۔ جسم تھرتھرایا جیسے کوئی برقی رَو اُس میں سے گزر گئی ہو۔ وہ لڑکھڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر دیکھا۔ وہ کون تھا جس نے اُسے موت کی نیند سے جگایا!

اِدھر دیکھو!

اُس نے پُل کی طرف دیکھا۔ جہاں پہلے پُل تھا' وہاں ابھی تک خلا تھا۔

یہاں کچھ بھی نہیں۔

اِدھر دیکھو......

وہ خلا میں معلق تھا۔ ایک سبز پوش۔ اُس کی پیشانی کے گرد نور کا ہالہ تھا۔ اُس نے اُنگلی سے اِشارہ کیا۔ ایک کِرن پھُوٹی اَور دونوں طرف سے پُل لپکتا ہُوا آیا اَور کھٹ سے اُس کے دونوں سِرے مِل گئے۔

صُورِ اِسرافیل گونجا:

زندگی کے دونوں سِرے مِل گئے ہیں' اَب زندگی کی شاہ راہ پر آجاؤ!

سبز پوش اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

جو لوگ زندگی سے بھاگتے ہیں' اُن کے پُل ٹوٹ جاتے ہیں۔

اُس نے کہا۔

اُس نے سبز پوش کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اَور شرما کر رہ گیا۔

اُس نے آئینے میں اَپنی صُورت دیکھ لی تھی۔

وہ خود سبز پوش تھا اَور اُس کی پیشانی سے نور پھُوٹ رہا تھا۔

اَور پھر سے زندگی کی شاہ راہ پر بے خوف کھڑا تھا۔

☆☆☆

جلی مٹّی کی خُوش بُو

پکّی سڑک اگرچہ اُس کے گاؤں تک نہیں جاتی تھی لیکن دس بارہ میل کا فاصِلہ لاری پر طے ہو جاتا تھا اور کوس دو کوس پیدل چل لینا کون سا مشکل تھا! آج اُسے سیال کوٹ سے بس نہیں ملی تھی کیوں کہ جنگ کے بعد ابھی تک اُس کا علاقہ آباد نہیں ہُوا تھا اور آمد و رفت شروع نہیں ہُوئی تھی۔

وہ اللہ کا نام لے کر پیدل چل پڑا۔ موسم بڑا خُوش گوار تھا' دُھوپ میں نرمی بھی تھی اور حِدّت بھی۔ سردیوں میں ایک دو اچھی بارشیں ہو گئی تھیں۔ سیال کوٹ سے نکلتے وقت اُسے کھیتوں کا سماں بہت بھلا معلوم ہُوا۔ ہریالی' لہریں لے رہی تھی اور گندم کے پودے دُھوپ میں نہا رہے تھے۔

جنگ سے لے کر اَب تک وہ ضلع گوجرانوالہ کے ایک گاؤں میں اپنے رِشتے داروں کے پاس رہا تھا۔ اُس نے گندُم کی بوائی میں اُن کا ہاتھ بٹایا تھا۔ نم دار مٹّی کی باس بھی سُونگھی تھی۔ یہ دھرتی بھی پرائی نہیں تھی، پر اُس مٹی کی خُوش بُو کچھ اور ہی تھی جس میں اُس کا اپنا خون پسینہ مِلا ہُوا تھا۔ جب اُسے پتا لگا تھا کہ اُس کا علاقہ دُشمن سے خالی ہو گیا ہے تو اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ اُٹھی تھیں اور اُس کے ہاتھ ہَل کی ہتھّی کو گرفت میں لینے کے لیے بے قرار ہو گئے تھے۔

پکی سڑک کے دونوں کناروں پر گھاس اُگ آئی تھی اور درختوں پر شگوفے پُھوٹ رہے تھے۔ گھاس میں بے نام سی خُوش بُو تھی۔ اُس نے خُوش ہو کر سوچا: ''میرے کھیت گھاس سے اَٹ گئے ہوں گے۔ گھاس کتنی لج پال ہے۔ وہ دھرتی کا ننگ نہیں دیکھ سکتی، پر جب ہم دھرتی کا سینہ اکھاڑتے ہیں......'' وہ سوچتے سوچتے رُک گیا: ''اَب میں ہل کہاں سے لاؤں گا اور بَیلوں کی جوڑی...... گورا...... اور...... لاکھا...... اور بھُوری جسے بچہ دیے ابھی ایک مہینہ بھی پورا نہیں گزرا تھا اور ابھی تک اُس کے دُودھ سے کچی کلیوں کی خُوش بُو آ رہی تھی...... شرر...... شرر...... شرر......'' وہ خود بہ خود مسکرا اُٹھا۔ اُسے یُوں لگا جیسے بھُوری کے تھنوں سے دُودھ کی دھارا پھُوٹ رہی ہو اور پیتل کی بالٹی کا پیندا دھاروں کی مضراب سے دوتارے کی طرح بج اُٹھا ہو اور دُودھ سے جھاگ اُٹھ رہا ہو...... سفید سفید جھاگ جس میں موتیے کی کلیاں اور چودھویں کی چاندنی گُھل مِل گئی ہو۔

''بھوری دُودھ اَور گھی کے لیے علاقے بھر میں مشہور تھی۔ مست پور کا ذیلدار تہمد کی ڈب میں ہزار روپے کے نوٹ باندھ کر آیا، پر میں نے کہا: چودھری! بھوری میری جان ہے، اَپنی جان کو کون بیچتا ہے بھلا؟''

پھر وہ یکایک اُداس ہو گیا۔

''نہ جانے اَب بھوری کس کے پاس ہے؟ اُس رات......'' اُسے جھرجھری سی آئی۔

اُس رات کا تصوّر بہت بھیانک تھا۔ نرم نرم چمکیلی دُھوپ میں وہ اُس اَندھیری رات کے متعلق کچھ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ اُس نے رفتار تیز کر لی لیکن اُس کے خیالات اُس سے بھی زیادہ تیز رفتار تھے۔ گورا، لاکھا اور بھوری، بار بار اُس کی آنکھوں کے سامنے آ رہے تھے۔ وہ اُنھیں چھو نہ سکتا تھا لیکن وہ گورے اَور لاکھے کے پسینے کی باس سُونگھ رہا تھا اَور بھوری کے دُودھ کی خُوش بُو......

''ہُوں! سڑک کے عین درمیان اِتنا بڑا گڑھا''...... وہ چونک گیا۔

''یہاں کوئی گولا گِرا ہوگا''...... اُس نے سوچا: ''اَب میں وہاں پہنچ چکا ہُوں جہاں جنگ ہُوئی تھی''۔

''جنگ!''

''جنگ کتنے چپکے سے آئی تھی جیسے اُس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں، جیسے رات کے اَندھیرے پر......''

وہ اُس دِن حسبِ معمول کنوئیں پر سو رہا تھا...... لاکھے، گورے اَور بھوری کے پاس کھاٹ بچھا کر۔ برسات بھر کر نہیں لگی تھی اَور دھان کے کھیتوں کو پانی دینے کے لیے لاکھا اَور گورا، سارا دِن کنواں چلاتے رہے تھے اَور اَب وہ تھک کر تھان پر لیٹ چکے تھے۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا۔ آسمان پر بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا اَور ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ کھاٹ پر لیٹتے ہی اُسے نیند آ گئی تھی۔ وہ سو رہا تھا کہ وہ دبے پاؤں آ گئی۔

....

سڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے وہ ایک مقام پر یک دم رُک گیا۔

یہاں سے ایک پگ ڈنڈی پھُوٹتی تھی جو بَل کھاتے ہُوئے سیدھی اُس کے گاؤں تک چلی جاتی تھی۔ اُس رستے میں کنوئیں تھے اَور گاؤں آباد تھے اَور ہر گاؤں کے باہر برگد یا آم کا درخت تھا جہاں لوگ بیٹھے حقّہ پی رہے ہوتے۔ تعارف کے لیے صرف السّلام علیکم کی ضرورت تھی۔ پانی یا لسّی کا ایک پیالہ پی کر، حقّے کے دو کش لگا کر، مسافر تازہ دم ہو جاتے اَور آگے بڑھ جاتے۔ جب سے سڑک پکی ہُوئی تھی، لوگ پگ ڈنڈی کو بھُول گئے تھے لیکن جب دُشمن نے سڑک پر قبضہ کر لیا تو لوگ اِس پگ ڈنڈی کی رہ نمائی میں امن کی جگہ تک پہنچ سکے تھے۔

اَب وہ پگ ڈنڈی غائب تھی۔

کھیتوں کی مینڈھیں ٹوٹ چکی تھیں اور کھلے میدان میں دُور دُور تک کوئی نشان ایسا باقی نہیں تھا جو پگ ڈنڈی کو واضح کرتا۔ تاہم سڑک سے کچھ دُور ہٹ کر درختوں کا وہ جھُنڈ موجود تھا جو تھکے ہوئے مسافر کے لیے پہلی مہمان سرائے کا کام دیتا تھا۔ وہ اُس طرف چل پڑا۔ درختوں میں گھِرا ہوا کنواں غیر آباد تھا اور وہ سوکھے پتّوں، گھاس پھُوس اور ٹوٹی ہُوئی خشک شاخوں سے اَٹ گیا تھا۔ جھُنڈ سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے مورچے ابھی تک موجود تھے۔ وہ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر اُس کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔

....

اُس دِن جب وہ رات کی پُراَسرار اور بوجھل خاموشی سے چونک کر بے دار ہُوا تھا تو ایک انجانا خوف، کوڑیالے سانپ کی طرح رینگ کر آیا تھا اور اُس کے لمس سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ تب سرحد کی طرف سے، جو کنویں سے بہت دُور نہیں تھی، گولیوں کے چلنے کی آواز آئی تھی۔ پکی سڑک پر ٹرکوں اور جیپوں کے چلنے کا شور بلند ہُوا تو وہ گاؤں کی طرف بھاگا۔ یہ فیصلہ اُس نے اچانک کیا اور اِس میں اُس کے اِرادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ وہ گورے، لاکھے اور بھُوری کو کنویں پر چھوڑ آیا تھا حالاں کہ اُسے گاؤں کی طرف جاتے دیکھ کر بھُوری تھان پر کھڑی ہو گئی تھی، جیسے پوچھ رہی ہو: ''کہاں جا رہے ہو؟''

گاؤں پہنچ کر اُسے معلوم ہُوا کہ وہ جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں۔ وہ سیدھا اپنے گھر گیا۔ اُس نے جیناں اور بچّوں کو ساتھ لیا اور اُسی پگ ڈنڈی پر آ پہنچا جو سڑک کے متوازی اُس سے دُور دُور چلتی تھی، اور اُس کے دونوں طرف کھیتوں اور درختوں کا حِصار تھا اور پگ ڈنڈی اُس کے کنویں کے پاس سے گزرتی تھی لیکن وہ اِس کے باوجود گورے، لاکھے اور بھُوری کو ساتھ نہ لے سکا۔ وہ نفسا نفسی کے عالَم میں اُنھیں بھُول گیا جو مدتوں سے اُس کے دُکھ سُکھ کے ساجھی تھے۔ اُس نے اپنی جان کو عزیز سمجھا۔ وہ کتنا بے وَفا نکلا تھا!

لیکن وہ رات قیامت کی رات تھی۔

اُس رات باپ بیٹے سے اور ماں بیٹی سے بچھڑ گئی تھی اور اُس کے ساتھ تو اُس کے بال بچّے تھے۔ یہ بھی کیا کم تھا کہ وہ اُنھیں نہیں بھُولا تھا۔ وہ ساری رات چلتے رہے اور جب پَو پھٹی تو وہ پگ ڈنڈی اور سڑک کے نقطۂ اِتّصال پر پہنچ گئے۔ اُس کنویں پر مورچے کھُد رہے تھے اور توپوں کے دہانے آسمان کی طرف کھلے ہُوئے تھے۔

''اَب ہم خدا کے فضل سے محفوظ ہیں''۔ اُس نے سوچا۔

لیکن ایک سپاہی نے اُونچی آواز میں کہا: ''یہاں مت رُکو! آگے بڑھ جاؤ! تم ابھی دُشمن کی زد پر ہو''۔

ابھی وہ دو چار قدم آگے بڑھے تھے کہ درختوں کے جھُنڈ پر پہلا گولا گرا اور اُن کے پاؤں کے نیچے

زمین کانپ گئی۔ پھر آسمان سے گھر گھر کی آواز آئی۔ ایک ہوائی جہاز تڑ تڑ گولیاں برساتے ہوئے اُن کے سر پر سے گزر گیا۔ سارے سپاہی دھم سے زمین پر لیٹ گئے۔ وہ اَور جیناں بچّوں کی اُنگلیاں پکڑے بت بنے کھڑے رہے۔

ایک جوان نے آواز دی:

لیٹ جاؤ، زمین پر لیٹ جاؤ۔ ہوائی جہاز ابھی پھر آئے گا۔

وہ زمین پر لیٹ گئے اَور چاروں طرف سے ڈز ڈز کی آوازیں آئیں۔ آسمان دُھواں دھار ہو گیا۔ پھر وہی جہاز اُن کے سَر پر سے گزرا تو ڈگمگا رہا تھا اَور اُس کی دُم سے گاڑھا دُھواں نکل رہا تھا۔ مورچے کے پاس لیٹے ہوئے سپاہیوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے جیناں کو بازو سے پکڑ کر اُٹھایا۔ جیناں بچّوں کو اُنگلی لگا کر چلنے لگی تو اُس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے اَور اُس کا چہرہ کورے کاغذ کی طرح سفید تھا۔ تب سُورج نکل آیا اَور سیال کوٹ شہر کی عمارتیں دُھوپ میں نہا کر نکھر آئیں۔

جیناں! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم بچ گئے۔ وہ دیکھو، سامنے شہر نظر آ رہا ہے!

اچھا!

جیناں نے بڑی دِھیمی آواز میں کہا۔

اَب ڈر کی کوئی بات نہیں۔

اُس نے جیناں کو تسلی دی۔

ڈر کی بات ...... نہیں تو ......

جیناں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چند لمحوں تک اُسے دیکھتی رہی، ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ۔ پھر وہ پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگی۔

واہ! اَب رونے کی کیا بات ہے بھلا؟ اَب ہمارا بال بھی بِیکا نہیں ہو سکتا۔ دُشمن اَب ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

بُھوری!

جیناں نے دبی دبی سسکیوں میں کہا۔

بُھوری!

وہ حیران ہو گیا۔

پھر اُس نے قہقہہ لگا کر کہا:

تمھیں بُھوری یاد آ رہی ہے۔ میرا گورا اَور لاکھا ......

تب قہقہہ اُس کے گلے میں پھنس گیا۔ اُس نے کہا:

جَیناں! جب میں کنوئیں سے گاؤں آیا تھا تو تینوں تھان پر بندھے تھے۔

گورا اَور لاکھا تو مُنہ زور ہیں۔ گولے پھٹیں گے تو اُن کی آواز سُن کر رسّے تڑا لیں گے، پر بھُوری اَور اُس کا بال تھان پر بندھے بندھے......

جَیناں!

اُس کا قہقہہ چیخ بن گیا۔

بُھوری میرا اِنتظار کر رہی ہو گی۔ میں نے رات اُس کے لیے بنولے اَور کھل بھگو کر رکھ دیے تھے۔ وہ مڑ مڑ کر گاؤں کی طرف دیکھتی ہو گی۔ اُس کا بال بھُوک اَور پیاس سے بِلک رہا ہو گا۔ وہ کھونٹے کے گرد چک پھیریاں لے رہا ہو گا۔

جَیناں چُپ رہو، مَیں مجبور تھا۔ برستی آگ میں سے کس کس کو بچا کر لاتا!

تم بُھوری کی گردن سے رسّا ہی نکال لاتے۔

مجھے کیا پتا تھا کہ اَب کنویں پر جانا نصیب نہیں ہو گا۔

جَیناں خاموش ہو گئی اَور وہ اَپنے خیالات میں ڈوب گیا۔ وہ بچّوں کو اُنگلی لگائے چلتا رہا اَور تھان پر بندھی بُھوری، جس نے اُس کی غلامی کا کلاوَہ اَپنے گلے میں ڈال رکھا تھا، اُس کی طرف معصوم آنکھوں سے تکتی رہی جیسے کہہ رہی ہو:

''میں دس سال سے تمھارے پاس ہُوں۔ میرے دم سے تمھارے گھر میں دُودھ کی نہریں بہ رہی تھیں۔ تمھارے گھر کی یہ رونق میرے قدموں سے ہے۔ میں تمھارے بچّوں کی دُوسری ماں تھی۔ میں تمھاری ماں تھی کیوں کہ تم نے میرے تھنوں سے دُودھ پیا۔ اَب وقت پڑنے پر تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ تم کتنے خود غرض ہو! میں تمھیں دُودھ نہیں بخشوں گی''۔

''نہیں، مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں...... قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے...

جَیناں!

اُس نے دھیمے سے کہا۔

کہو!

تم حمزہ غوث کا رستہ جانتی ہو نا؟ ...... اڈّا پسرور سے دھن کی طرف ...... نالہ ایک کا پُل ہے نا، اُسے پار کر کے......

کہو!

وہاں چودھری کرم دین ہے۔ وہ کئی بار ہمارے گاؤں آیا تو ہمارے ہاں مہمان بن کر رہا۔

ہاں میں اُسے جانتی ہُوں۔

تم اُس کے گھر چلے جانا!

پر تم ؟......

میں بھوری کو تھان سے کھول کر واپس آجاؤں گا......

اُس نے بڑے گمبھیر لہجے میں جواب دیا۔

جَیناں چند لمحوں تک اُس کو نہ سمجھ سکی۔ تب حقیقت' چڑیل کی طرح مُنہ پھاڑے آئی تو وہ اُس کے دامن سے چمٹ گئی۔

جَیناں! اگر میں نہ گیا تو بھوری تھان پر سِسک سِسک کر مَر جائے گی۔

نہیں!

جَیناں نے کانپتے ہونٹوں سے کہا۔

اَب تم محفوظ ہو۔ مجھے جانے دو!

دیکھو تو آسمان سے آگ برس رہی ہے۔ تم برستی آگ سے زِندہ سلامت کیسے نکل آؤ گے؟

میرا اللہ مجھے بچائے گا۔ فکر نہ کرو جَیناں!

جَیناں نے اُس کا دامن چھوڑ دیا اور بچوّں کو اُنگلی لگا کر سیال کوٹ کا رُخ کر لیا۔ وہ قدم قدم پر مُڑ مُڑ کر اُسے دیکھتی رہی۔ وہ چند لمحوں تک اُنھیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ ایک قافلے میں مل کر گم ہوگئے تو زمین اُس کے قدموں سے چپک گئی۔ وہ بے حسی کے عالم میں کھڑا رہا۔ تب اُس نے اَپنے گاؤں کی طرف مُنہ موڑ کر دیکھا۔ اُس وقت سیال کوٹ کی طرف سے ایک گولہ اُڑتا ہُوا آیا اور اُس کے سَر پر سے سیٹیاں بجاتے ہوئے گزر گیا۔ نہ جانے اُس گولے کی منزل کہاں تھی لیکن تھرتھراتی ہُوئی زمین نے اُس کے قدموں کو آزاد کر دیا۔

وہ اُسی پگ ڈنڈی کے متوازی چلتا رہا اور کھیتوں کی آڑ میں اَپنے کنویں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ گولے اُس سے دُور دُور پھٹ رہے تھے اور گھر رگھر ر ٹینک چل رہے تھے۔ پھر اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ نہ جانے کس طرف سے ۲ جہاز آئے اور سڑک پر اَفراتفری مچ گئی۔ ٹینک کھیتوں میں بدحواس ہو کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگے۔ وہ ایک گڑھے میں لیٹ گیا۔ جہاز غوطہ لگا کر اُس کے سَر پر سے گزرتے تو اُسے یُوں محسوس ہوتا جیسے وہ درختوں کی پھننگوں سے ٹکرا جائیں گے۔ تب گولیوں کی بارش ہوتی' درختوں سے شاخیں کٹ کٹ کر گِرتیں اور سڑک سے دُھواں اُٹھتا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ دُشمن کے ایک دوڑتے ہوئے ٹینک پر جہاز شِکرے کی طرح لپکا۔ جہاز سے ایک شُعلہ نکلا اور ٹینک بھک سے اُڑ گیا۔ اُس کا دِل دہَل گیا۔ وہ خواہ مخواہ جہنم کی آگ میں کود پڑا تھا۔ اُس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔

چند منٹوں بعد جہاز اُس کے سَر پر سے گزر کر دُور فضاؤں میں گم ہو گئے۔ لیکن دیر تک سڑک اور

اُس کے اِرد گرِد کئی مقامات سے دُھوئیں کے بادل آسمان کی طرف بلند ہوتے رہے۔ وہ گڑھے میں لیٹا رہا اَور اُسے یہ بھی نہ یاد رہا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اچانک اُسے اپنا فرض یاد آ گیا۔ تب رُوح کے کسی گوشے سے طمانیت کی ایک لہر اُبھری۔ اُسے یوں لگا جیسے اُن جہازوں نے اُس کے سَر پر اَپنے پَروں کا سایہ ڈال کر اُسے حفاظت کے حِصار میں لے لیا ہو۔ وہ دُشمن کے نرغے میں اکیلا نہیں تھا۔

وہ پھر کھیتوں کی آڑ میں چلنے لگا اَور سلامتی کا سایہ اُس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ وہ جب کنویں پر پہنچا تو شام پڑ چکی تھی اَور ہُو کا عالم طاری تھا۔ بُھوری تھان پر لیٹے' بڑی بے کسی کے عالَم میں گاؤں کی طرف نظریں لگائے ہُوئے تھی؛ لاکھا اَور گورا رسّے تڑا کر بھاگ چکے تھے۔ اُس کے قدموں کی چاپ سن کر بُھوری یک دم اُٹھ بیٹھی۔ اُس نے بڑھ کر اُس کی گردن میں بازو ڈال دیے۔ اُس نے کہا:

دیکھو بُھوری! میں آن پہنچا۔

اُس نے بُھوری کے گیلے گیلے مُنہ پر ہاتھ پھیرا اَور بُھوری اُس کا ہاتھ چاٹنے لگی۔ بُھوری کا بال اَپنے کھونٹے کے گِرد چک پھیریاں لینے لگا۔ بُھوری کا شِیردان دُودھ کے بوجھ سے اکڑ گیا تھا اَور تھن پُھول کر لٹک گئے تھے۔ اُس نے بال کے گلے سے رسّا نکال دیا۔ بال بُھوری کی طرف لپکا اَور اُس کے تھنوں سے دُودھ خود بہ خود ٹپکنے لگا۔ بال نے تھنوں پر مُنہ ڈال دیا۔ وہ چُسر چُسر دُودھ پیتا رہا اَور وہ پاس کھڑا دیکھتا رہا۔ جب وہ سیر ہو گیا تو اُس نے تھن ہاتھ میں لیے اَور دُودھ کی دھاریں شرر شرر اُس کے حلق میں گِرنے لگیں...... نیم گرم میٹھے دُودھ کی دھاریں!

تب اُس نے بُھوری کے گلے سے اَپنی غلامی کا کلاوہ نکال دیا اَور کہا:

بُھوری! یہ سب کھیت تیرے ہیں۔ جب تک تیرا دانہ پانی ہے' مزے سے چَر چُگ! تجھ پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یوں اللہ کے سِوا کون جانتا ہے کہ میری اَور تیری قسمت میں کیا لکھا ہے!

بُھوری دِن بھر کی بُھوکی تھی لیکن وہ تھان سے نہ ہلی۔ اُس نے اُس کے پٹھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اُس کے آگے آگے چَل پڑی۔ جوار کے کھیت میں پہنچ کر بُھوری نے نوخیز پودوں پر مُنہ ڈالا ہی تھا کہ وہ اَندھیرے کی آڑ لے کر بُھوری سے جُدا ہو گیا۔ اُس نے سیال کوٹ کا رُخ کر لیا۔ وہ تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ اُس کا انگ انگ دُکھ رہا تھا' پر وہ خوش تھا کیوں کہ اُس نے اَپنا فرض اَدا کر دیا تھا۔ اَب قیامت کے روز اُسے بے زبان بُھوری کے سامنے جواب دہ تو نہیں ہونا پڑے گا۔

....

وہ اُٹھا اَور پھر سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ سڑک پر جگہ جگہ گڑھے پڑ گئے تھے۔ اکثر مقامات

پر سڑک پِس کر چُورا ہو گئی تھی۔ کھیت وِیران تھے اَور اُن کی مینڈھیں ٹوٹ پُھوٹ چکی تھیں۔ قدم قدم پر وِیرانیاں بڑھ رہی تھیں۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے زمین جل گئی ہو۔ وہ یکا یک اُداس ہو گیا حالاں کہ اَب تک وہ کبھی مایوس نہیں ہُوا تھا۔ وہ اُس کٹھن وقت بھی خوش رہا تھا جب وہ گھر سے بے گھر ہو گئے تھے۔ جنگ کی خبریں سُن سُن کر اُس کا خون چلوؤں بڑھتا تھا بلکہ اَپنے سپاہیوں کی قربانیوں کی ایک ایک داستان پر اُس نے رگ رگ میں ایک نئے خون کو گردِش کرتے محسوس کیا تھا۔ وہ اَپنے گھر بار، ڈھور ڈنگر کی قربانی دے کر بہت مطمئن تھا کہ اُس نے بھی اَپنا فرض اَدا کر دیا تھا۔ وہ کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا۔

اَور اَب وہ اَپنے فرض کی تکمیل کے لیے اَپنے گاؤں جا رہا تھا کیوں کہ وہ ایک دلیر قوم کا جری کسان تھا جس کے کندھوں پر پوری قوم کا بوجھ تھا اَور اَب مایوسی دھیرے دھیرے اُس کے انگ انگ میں رِچتے چلے جا رہی تھی۔

''مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے''۔ اُس نے زیرِ لب کہا۔ لیکن مایوسی کا بوجھ بڑھتا گیا۔ جُوں جُوں وہ آگے بڑھتا رہا، بوجھ بھاری ہوتا رہا۔

اُس نے گاؤں تک کا فاصلہ اُس تھکے ہُوئے مزدور کی طرح طے کیا جس کے سَر پر منوں بوجھ ہو اَور منزل ابھی دُور ہو اَور ہر لمحہ بوجھ میں اِضافہ ہو رہا ہو۔

اُس کا گاؤں اُجڑا ہُوا تھا۔ گلیوں میں ملبے کے ڈھیر تھے۔ مکانوں کی چھتیں غائب تھیں۔ دیواروں پر آگ اَور دُھوئیں کے نشانات ابھی تک تازہ تھے۔ کِواڑ اَور کھڑکیاں جَل گئے تھے۔ راکھ اُڑ رہی تھی۔ وہ اَپنے جلے ہُوئے مکان کے سامنے چند لمحوں کے لیے رُکا۔ پھر وِیرانی مُنہ پھاڑ کر دوڑی تو وہ ڈر کر کھیتوں کی طرف بھاگ نکلا۔

کھیتوں میں دُھول اُڑ رہی تھی۔ درخت کٹ چکے تھے۔ اُس کے کنوئیں کے گِرد درختوں کا جو جُھنڈ تھا، وہ غائب تھا۔ کٹے ہُوئے درختوں کے ٹُھنٹھ دیکھ کر اُس کا جی بیٹھ گیا۔ اُس کی ڈھاری کی چھت گِر گئی تھی اَور ہر چیز سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں، جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو وہ تھان پر کھڑا تھا۔ گورے، لاکھے اَور بُھوری کے کھونٹے موجود تھے اَور ابھی تک رسّوں کے گلے سَڑے پیچ کھونٹوں کے گِرد حلقہ کیے ہوئے تھے۔ کنویں کی مُنڈیر ٹوٹ پُھوٹ گئی تھی۔ لوہے کے ڈھول اَور چرخ تُڑ مُڑ کر چُورا ہو گئے تھے۔ زنگ آلود ٹکڑے دُور دُور تک بکھرے ہُوئے تھے۔ ماہل، کنویں میں گِر گئی تھی۔

کٹے ہُوئے درختوں کے درمیان صرف ایک مُڑا تُڑا پودا سلامت تھا اَور اُس کی ایک شاخ سَرسبز

تھی اُور اُس پر بھُورے رنگ کی ایک چڑیا بیٹھی اُسے گول گول' حیران آنکھوں سے تک رہی تھی۔

یکا یک وہ بول اُٹھی: "چُوں......چُوں......چُوں"۔

جیسے پوچھ رہی ہو: "تم آ گئے؟ میں کب سے اکیلی تھی اَور تمھارا اِنتظار کر رہی تھی"۔

وہ چَونک کر جاگ اُٹھا۔ اُس نے آنکھیں ملیں۔ چڑیا کے نغمے سے روشنی کی ایک کِرن پھُوٹ نکلی تھی۔

پھر وہ ڈھاری کی پُشت پر کے کھیت میں چلا گیا۔ کھیت کی مٹّی کا رنگ سیاہ تھا۔ اُس نے مٹّی کی لَپ بھری اَور اُسے سُونگھا۔ ابھی تک اُس سے بارُود کی بُو آ رہی تھی۔ اُس نے مٹّی کو پھینک کر سوچا: "مٹّی راکھ بن گئی ہے۔ راکھ سے کوئی شے جنم نہیں لیتی"۔

تب وہ ڈھاری کے اَندر گیا۔ اُس نے ملبے میں ٹاپک ٹوئیے مارے۔ ایک کسّی پر اُس کا ہاتھ پڑ گیا۔ اُس کا دَستہ درمیان سے ٹوٹا ہُوا تھا اَور پھَل کو زنگ کھا گیا تھا۔ تاہم دستے پر ہاتھ کی گرفت خود بہ خود مضبوط ہو گئی۔ اُس کے بازو کی مچھلیاں پھڑک اُٹھیں۔ وہ کسّی ہاتھ میں لیے کھیت میں آ گیا۔ اُس نے اللہ کا نام لے کر کسّی کو ہاتھوں میں تولا۔ زمین پر پہلا ٹَپ لگا تو چڑیا نے چُوں چُوں چُوں کا مسلسل راگ چھیڑ دیا جیسے وہ خوشی سے پاگل ہو گئی ہو۔

ایک ٹَپ......دوسرا ٹَپ......اَور تیسرے ٹَپ پر سُرخ سُرخ مٹّی کے چند ڈھیلے باہر نکل آئے۔

اُس نے ایک ڈھیلا ہاتھ میں لیا اَور اُسے آہستہ آہستہ مٹھی میں پیسا۔ پھر اُس نے مٹھی کھول دی۔ بھر بھری مٹّی سے سوندھی سوندھی خوشبو آئی۔ اُس خوشبو میں پھاگن چیت کی بارِش کی نمی بھی تھی۔

اُسے یوں لگا جیسے مٹّی سے زندگی کا چشمہ پھُوٹ بہا ہو۔ "مٹّی زندہ ہے"۔ اُس نے خوش ہو کر آسمان کی طرف دیکھا جہاں بادلوں کے سفید ٹکڑے اُڑ رہے تھے۔ سوندھی سوندھی خُوش بُو چار کھونٹ بکھر گئی۔

ایک لہر کٹے ہوئے' جلے ہوئے درختوں سے ٹکرائی اَور اُس کے لمس سے شگوفے پھُوٹ نکلے اَور شاخیں ہَری بھَری ہو کر برگ و بار سے لد گئیں۔ تھان پر گورا اَور لاکھا جھومنے لگے اَور بھُوری کے تھنوں سے دُودھ کی نہریں بہ نکلیں۔ رُوں رُوں رَہٹ چلا۔ چاندی کی لکیر بل کھا کر کھیتوں کی طرف رِینگنے لگی اَور تب یکا یک کھیتوں میں سبزے کی چادریں بچھ گئیں اَور اُن پر سہ پہر کی سنہری دُھوپ لہرانے لگی۔

ایک لمحے کے اَندر اَندر اُس کا کنواں آباد ہو گیا تھا۔

وہ کسّی ہاتھ میں لیے کھیتوں کی لہر بہر دیکھ رہا تھا اَور مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

دھوپ کا سایہ

وہی شکل صُورت ہے، لیکن یہ امجد نہیں......

اَمجد کی ماں نے سوچا:

میری نظر بھی تو اِتنی اچھی نہیں جتنی پہلے تھی۔ ناک نقشے میں کچھ فرق تو ضرور ہوگا۔

اُنھوں نے اَمجد کے باپ سے کہا:

مجھے عینک دیجیے!

اَمجد کے باپ، حوالدار میجر اُلفت شاہ نے تھیلے سے عینک نکال کر دی۔

وہ قریب ہی پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ عینک آنکھوں سے لگی تو یکایک اُس کی شکل صورت بدل گئی۔ وہ کانپ گئیں۔ خط وخال کے اُس فرق کو جس نے مجموعی صورت کو بدل دیا تھا، امجد کی ماں صرف محسوس کر سکتی تھیں۔ اگر کوئی اُن سے کہتا تو وہ بیان نہ کر سکتیں۔ یہ فرق اخبار میں چھپنے والی دُھندلی سی تصویر میں بھی نظر نہ آیا تھا۔

عینک نے جھوٹ کیوں نہ بولا؟......

اُنھوں نے سوچا۔

گزشتہ دس دنوں سے وہ جس اُمید کے سہارے جی رہی تھیں، یکایک خاک میں مل گئی، تو وہ آنسو جو ڈیڑھ سال سے رُکے ہوئے تھے، طوفان بن کر سینے میں اُمنڈ آئے۔

اُنھوں نے عینک اُتار دی۔ پہیوں والی کرسی پر گُم صُم بیٹھے اَمجد کی نگاہیں خلا میں دیکھتی رہیں۔ اُن میں شعور کی کوئی کِرن نہ تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کر اُس کے پاس آگئیں۔ اُنھوں نے اُس کے سَر پر ہاتھ پھیرا تو وہ آنکھیں اُن کے چہرے پر ٹِک گئیں۔

اُنھوں نے کہا:

بیٹا! تمھاری شکل میرے اَمجد سے ملتی ہے، تمھارا نام بھی اَمجد ہے۔ اچھا ہُوا تم سے ملاقات ہوگئی۔ اللہ تمھیں جلد صحّت دے!

تب نرسنگ اَردلی نے مریض کی کرسی کا رُخ وارڈ کی طرف موڑ دیا۔ اَمجد کی ماں کی آنکھیں اُس کا پیچھا کرتی رہیں۔ وہ جالی والے دروازے کے پیچھے غائب ہو گیا تو اُن کی آنکھیں جلنے لگیں۔ اُنھوں نے ڈوپٹا آنکھوں پر رکھ لیا۔ حوالدار میجر اُلفت شاہ نے اُنھیں سہارا دیا۔ وہ ملاقات کے کمرے سے باہر نکلے تو تیز دُھوپ نے اُنھیں اچانک آ لیا۔

حوالدار میجر نے آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کرتے ہُوئے کہا:

دُھوپ کتنی تیز ہے!

اُن کے دِل میں خواہش پیدا ہُوئی کہ کاش، بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا آئے اَور تیز دُھوپ کی نوک کُند پڑ جائے...... یہ دُھوپ تو تیر بن کر چُبھ رہی ہے! دُھوپ تو زندگی ہے، پر نہ جانے کیوں، آج وہ تیز دُھوپ سے گھبرا رہے تھے۔ وہ دونوں گُم صُم، ایک دوسرے کا سہارا لے کر تیز دُھوپ کی پہنائی کو عبور کر گئے۔ ہسپتال سے باہر سڑک پر درختوں کا سایہ تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے ذرا بھر ستانے کے لیے رُک گئے۔ تانگوں کے اڈّے تک پہنچنے کے لیے اُنھیں، تیز دُھوپ کا ایک اَور میدان سَر کرنا تھا۔

وہ اَمجد نہیں تھا۔

اَمجد کی ماں نے کہا۔

میں تو پہلے سے جانتا تھا کہ اُس کی رجمنٹ کا نام اَور اُس کا نمبر اَمجد سے نہیں ملتا۔

مجھے آپ نے کیوں نہ بتایا؟ آپ کو ہسپتال والوں کی اِتنی مِنّت سماجت تو نہ کرنی پڑتی۔

اُس کی شکل صورت ہمارے اَمجد سے ملتی تھی۔

جب میں نے عینک نہیں لگائی تھی، تو وہ ہُو بہُو اَمجد نظر آتا۔ جب میں نے عینک لگالی، تو اُس کی شکل بدل گئی۔

اُنھوں نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا۔

میرے اَور تمھارے علاوہ کوئی اَور ہوتا تو فرق محسوس نہ کرسکتا۔ تصویر میں تو کوئی فرق نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے یہ سمجھا، ممکن ہے یہ ہمارا ہی اَمجد ہو، مشرقی پاکستان جا کر اُس کی رجمنٹ بدل گئی ہو، لیکن سپاہی کا نمبر تو نہیں بدلتا۔ اَور میرے دِل نے مجھے فریب دیا کہ ممکن ہے، وہاں جا کر نمبر بھی بدل گئے ہوں یا اَمجد خود ہی نمبر بھُول گیا ہو۔ سُورج کا چہرہ بادلوں کے پیچھے چھُپا ہو تو دیکھی بھالی دُنیا کچھ بدل نہیں جاتی کیا؟

حوالدار میجر نے پوچھا۔

بیگم کی طرف سے کوئی جواب نہ پاکر اُنھوں نے سوچا: ''آج ہسپتال سے نکلتے وقت تیز دُھوپ نے میری آنکھیں چُندھیا دِیں تو مجھے دُھوپ سے نفرت محسوس ہُوئی، کیوں کہ میری آنکھوں سے فریب کا پردہ یکایک اُٹھ گیا تھا۔

اِنسان فریب کھا کھا کر زندہ رہتا ہے۔

تب اُنھوں نے بیگم سے کہا:

ابھی دُھوپ تیز ہے، اَب چلیں نا کیا؟ ابھی ہمیں بہت لمبا سفر طے کرنا ہے۔

آپ اُس اَمجد کے گھر کا پتا تو پوچھ آتے!

کیوں؟

کبھی کبھار اُس کے گاؤں جا کر اُس کی شکل دیکھ کر اَمجد کو دیکھ لیا کروں گی۔

اچھا کوشش کرتا ہُوں...... پر اَب تو اُمید لگ چکی ہے کہ ہندوستان جلد ہی ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دے گا۔ ہمارا اَمجد بھی آجائے گا تو......

تو......

امجد کی ماں نے آنسوؤں کی آواز میں کہا:

میں اُسے ساتھ لے کر اُس اَمجد سے ملنے جاؤں گی۔

حوالدار میجر نے ہسپتال کا رُخ کیا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ درخت کے سایے میں خنکی نہیں تھی، تاہم دُھوپ بھی تو نہیں تھی...... ننگی دُھوپ، ظالم دُھوپ!

اُس دُھوپ پر اُن کے دِل کا غبار چھایا اَور گہرا ہُوا اَور تب برس پڑا۔

دُھوپ کا چہرہ تر ہو گیا۔ وہ اپنے خاوند کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھیں، کیوں کہ جب کبھی وہ آنسوؤں میں پناہ لیتیں تو اُن کا بیٹا، نائک اَمجد حسین، اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا اَور کہتا: ''ماں، میں زندہ ہُوں، بھلا زندوں کو کون روتا ہے؟''...... یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک کھُل کر نہ رو سکی تھیں۔

اَور آج، اُس درخت کے نیچے اَمجد پھر آیا...... چھریرے بدن کا اَمجد، سانولا رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، اُن آنکھوں میں مسکراہٹ تھی۔ اُس نے کہا: ''ماں! حوصلہ رکھو، زندوں کو کون روتا ہے بھلا؟

''نہیں تو اَمجد...... میں تمھاری جُدائی میں مغموم ہُوں، نہیں تو...... اُس اَمجد کے لیے جو ہسپتال میں ہے اَور کسی کو نہیں پہچانتا۔ ہسپتال والوں نے بتایا تھا کہ اُس کی ماں بھی اُسے ملنے اَور گھر لے جانے کے لیے آئی تھی، وہ اُسے پہچان نہ سکا تھا۔ ہسپتال والوں نے اُسے اُس کے ساتھ نہ جانے دیا، میں تو اُس کی ماں کے دُکھ پر رونا چاہتی تھی''...... اُنھوں نے ڈوپٹے سے آنکھیں پونچھ لیں۔

تیز دُھوپ سے بچنے کے لیے اُنھوں نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اَور تیز دُھوپ پر ہاتھوں کا سایہ ہُوا تو ماہ و سال کے پردے سرَکنے لگے اَور منظر تیز تیز بدلنے لگے۔

مامتا کی کوکھ سے اَمجد نے جنم لیا، یہ اُن کا پہلوٹھی کا بچّہ تھا۔ اُنھیں دنوں پاکستان وجود میں آیا۔

اَمجد اَور پاکستان ہم عُمر تھے۔ اَمجد کا باپ' نائک اُلفت شاہ' ریاست جموں وکشمیر کی فوج میں ملازم تھا۔ وہ پونچھ کے محاذ پر ڈوگرہ فوج کے خلاف لڑ رہا تھا اَور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ جب وہ چند دنوں کے لیے گھر آیا تو اُس نے اَمجد کو دیکھا اَور پھر کشمیر کی جنگ شروع ہو گئی' اُنھیں باپ بیٹے کی پہلی ملاقات کا منظر یاد تھا جیسے کل کی بات ہو۔ تب سالوں کی دُھندلاہٹ میں اَمجد پروان چڑھا۔ اُس کے دو بہن بھائی اَور آئے اَور جب گھر بھر گیا تو حوالدار میجر نے پنشن لے لی۔

اَور دیکھتے دیکھتے امجد جوان ہو کر بوائے کور میں بھرتی ہو گیا۔ اُس نے اَپنے گھرانے کی روایت کو ٹوٹنے نہ دیا۔ وہ تربیت کے دوران میں ایک دو بار چھٹی پر آیا تو ننھا سپاہی اَپنی وردی میں خوب سج رہا تھا۔ ابھی اُس کی مَسیں بھیگی ہی تھیں کہ وہ باقاعدہ سپاہی بن گیا' اَور تب ستمبر ۶۵ء کی جنگ شروع ہوئی۔ اُنھیں اَپنا گھر خالی کرنا پڑا' کیوں کہ اُن کا گھر سرحد پر واقع تھا...... جنگ ختم ہُوئی تو وہ گاؤں میں واپس آ گئے۔ امجد اُن سے آ کر مِلا' تو اُس نے بتایا کہ اُس کی رجمنٹ اُن کے گاؤں سے چند میل دُور مورچا بند تھی۔ وہ سترہ دِن اپنے گاؤں سے اِتنا قریب رہ کر بھی اِتنا دُور رہا تھا:

اماں جبھی تو میں نے اپنے گاؤں پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔

ہاں بیٹا' پہلے دِن دو گولے گاؤں پر گِرے تھے' پھر ہم نے گاؤں خالی کر دیا۔ تمھارے ابّا کو فوج سے بلاوا آ گیا تھا' وہ نہ جاتے تو ہم گاؤں کیوں چھوڑتے؟

ہمیں افسوس ہے' ہمارے چند گاؤں دُشمن کے قبضے میں چلے گئے۔

جنگ میں اَیسا ہی ہوتا ہے بیٹا! تم ایک گاؤں کی حفاظت کے لیے مقرر نہیں ہُوئے تھے' تم تو سارے پاکستان کی حفاظت کرتے رہے۔

اماں' جنگ اِتنی جلد ختم ہو گئی۔ ابھی تو جی بھر کر لڑنے کا موقع بھی نہیں مِلا تھا ہمیں!

شکر ہے بیٹا! جنگ ختم ہو گئی۔

نہیں ماں! ہمیں تو افسوس ہے کہ جنگ اِتنی جلد ختم ہو گئی۔ ابھی تو ہمارے ٹینک اَور ہوائی جہاز لڑے تھے' ہم نے دُشمن کا حملہ روک دیا تھا۔ ہم جوابی حملہ کرنے والے تھے کہ جنگ ختم ہو گئی۔ ہم اِنفنٹری والوں کو دِل کا غبار نکالنے کا موقع بھی نہ ملا۔

بیٹا! اچھا ہُوا جنگ ختم ہو گئی۔

جنگ کے خاتمے پر وہ لانس نائیک بن چکا تھا اَور آگ کی بارش سے زِندہ سلامت نکل آیا تھا اَور اُسے ذرّہ بھر آنچ نہ آئی تھی۔ گھرانے کی زندگی کا ٹوٹا ہُوا سِرا پھر سے جُڑ گیا تھا۔ دو سال بعد ماں نے اپنے ہاتھ سے اُس کے ماتھے پر سہرا باندھا تھا۔ دُلھن اُن کے اپنے ہی خاندان سے تھی۔ اُس کا سُسر بھی فوج میں نائب صوبیدار تھا۔ دُلھن آئی تو اَمجد نے اگلے ہی دِن اپنی بہن کو اَپنے ہاتھ سے ڈولی میں بٹھا دیا تھا۔ اُن کا داماد بھی فوج

میں ملازم تھا۔ یہ کتنا خوشیوں کا سال تھا۔ دُلھن بڑی خدمت گزار نکلی اَور داماد نے اُن کی بیٹی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ماں باپ کے لیے اِس سے بڑھ کر اَور خوشی کا کون سا موقع ہوتا ہے۔ ایک سال بعد خُدا نے اُنھیں پوتا عطا کیا اَور اَب اُن کے گھر کی رونق میں کتنا اِضافہ ہو گیا تھا!

"ننھی ننھی خوشیوں کے یہ سال کتنی جلد بیت گئے"...... اُنھوں نے سوچا اَور اُنھوں نے آنکھوں پر سے ہاتھ اُٹھا لیے، سامنے حوالدار میجر کھڑے تھے:

میں نے سمجھا تم سو گئیں۔

نہیں تو!

میں اَمجد کا پتا لے آیا ہوں، اَب چلیے، اگر یہ گاڑی نکل گئی تو آج رات ہم گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔

جب وہ تانگے میں سوار ہو کر سٹیشن کی طرف جا رہے تھے تو آسماں پر کالے بادل چھا گئے...... کالے کالے بادل جن کے دامن میں آنسوؤں کا سمندر بھرا ہُوا تھا۔ جب وہ گاڑی کے اِنتظار میں پلیٹ فارم پر کھڑے تھے تو ٹَپ ٹَپ بُوندیں برسنے لگیں۔ اُس وقت حوالدار میجر کا جی بھر آیا، اُن کا گلا رُندھ گیا۔

اُنھوں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا:

اَمجد کی ماں، ہم پپّو کو کیا جواب دیں گے؟

میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔

پوچھے گا، تم ابّو کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آئے دادا ابّا؟

کہہ دیجیے گا وہ بیمار ہے، ہسپتال والوں نے اُسے ہمارے ساتھ آنے نہیں دیا۔

نہیں!

کیوں؟

میں اُسے جھوٹی اُمید نہیں دلاؤں گا، میں کہوں گا وہ تمھارے اَبّا نہیں تھے۔ ابھی ہندوستان والوں نے اُسے رِہا نہیں کیا۔

ٹھیک ہے!

اُنھوں نے اَپنے اَندر کی دُنیا میں ڈوبتے ہُوئے کہا۔

میں اُسے مُردہ سمجھ لوں؟......

اُنھوں نے سوچا۔

نہیں!

امجد اُن کے سامنے آ کھڑا ہُوا۔

مجھے حالات سے سمجھوتا تو کر لینے دو اَمجد! میں کب تک اِس طرح زندگی بسر کر سکوں گی!

چلو بھئی گاڑی آ گئی!

حوالدار میجر نے اُنھیں سہارا دیا اور عورتوں کے ڈِبّے میں سوار کرادیا۔ اور سفر شروع ہوگیا۔

"پپو کو جب اپنے ابّو کی کوئی خبر نہ ملے گی تو وہ کتنا مایوس ہوگا!"......

حوالدار میجر نے سوچا:

"گزشتہ ڈیڑھ سال سے وہ کسی خوش خبری کا منتظر ہے۔"

جب اَمجد مشرقی پاکستان جانے سے پہلے گھر ملنے آیا تھا' اُس وقت پپّو تین۳ سال کا تھا۔ اُسے ابّو کی وردی بہت پسند آئی تھی' اُس نے ابّو کے ساتھ جانے کی ضِد کی تھی۔ اَمجد منہ اندھیرے اُس کے جاگنے سے پہلے پہلے رُخصت ہوگیا تھا۔ کئی دِن تک وہ دادا دادی سے رُوٹھا رہا تھا۔ اُس نے کہا تھا:

اَب ابّو چھٹی پر آئیں گے تو میں اُن سے نہیں بولوں گا۔

اَب اُس کی عُمر پانچ سال کے قریب ہے اَور اُس نے ابّو کو معاف کردیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

ابّو ہندوستان کی قید سے چُھٹ کر آئیں گے تو میں اُن سے لپٹ جاؤں گا اَور اُنھیں واپس نہیں جانے دوں گا۔

جب سے ریڈیو سے جنگی قیدیوں کے پیغام نشر ہونے لگے ہیں' وہ ٹرانسسٹر کے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ اُس نے ہزاروں پیغامات سنے ہیں' لیکن اُس کے ابّو کی آواز کہیں سے نہیں آتی تو وہ پُوچھتا ہے:

دادا ابّا! ابّو کیوں نہیں بولتے؟

ابھی اُن کی باری نہیں آئی بیٹے!

اُن کی باری کب آئے گی دادا ابّا؟

آئے گی......ضرور آئے گی......سوچو تو بیٹا! ترانوے ۹۳۰۰۰ ہزار قیدی ہیں' کیا پتا تمھارے ابّو کو سب سے آخر میں باری ملے!

ریڈیو پر اُس کے پھوپھا کا پیغام نشر ہوا' اُس دِن وہ بہت خوش تھا۔ اَب ابّو کی باری بھی آنے والی ہے۔ اُس کے نانا' صوبیدار صاحب بھی بولے۔ اُس کے ابّو کے چچا نے بھی خیریت کا پیغام بھیجا۔

لیکن اُس کے ابّو کی باری نہ آئی۔

ابھی تک وہ مایوس نہیں ہُوا۔ اَب بھی وہ جنگی قیدیوں کے پیغام ضرور سنتا ہے اَور اپنی امّی سے کہتا ہے:

امّی آج ابّو ضرور بولیں گے۔

اُس کی امّی بڑے غم زدہ اَنداز میں مسکراتی ہے۔

جب اَمجد مشرقی پاکستان گیا تھا' ننھے ٹیٹو کی عُمر صرف تین۳ مہینے تھی۔ پپّو دُودھ پینے کی منزل سے گزر گیا تھا' اِس لیے اُسے ٹیٹو سے زیادہ حسد محسوس نہ ہوا؛ یوں بھی وہ زیادہ تر دادی کی گود میں پلا تھا۔ جب سے

پپو نے ماں کا دودھ چھوڑا تھا' وہ جذباتی طور پر اُس سے الگ ہوتا چلا گیا۔ آہستہ آہستہ اُس نے ماں کی ساری محبت ٹیٹو کے لیے وقف کر دی۔ بہُو کو اِس مغائرت پر افسوس تو ضرور ہُوا ہو گا' آخر وہ ماں تھی نا!

اَمجد کی ماں نے کہا تھا:

بہو بیٹی' اَب پپّو کو میرا بیٹا بنا دو!

یہ ٹیٹو کس کا ہے ماں جی! یہ بھی تو آپ ہی کا ہے نا۔

اُس نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

اَمجد کی شادی کے بعد کچھ عرصے تک اَمجد کی ماں اَپنی بہُو سے کچھ دُور دُور رہی تھیں' اُن کا رویّہ کچھ سَرد سَرد سا تھا۔ بہُو نے ضرور محسوس کیا ہو گا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے اَمجد کے لیے اپنی کوئی بھتیجی یا بھانجی لانا چاہتی تھیں۔ لیکن اَمجد نے اُسے پسند کر لیا تھا' نہ جانے کیوں؟ وہ خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح شوخ و شنگ تھی نہ زیادہ باتیں بنانا جانتی تھی۔ دوسری لڑکیاں زبان سے بولتی تھیں' وہ آنکھوں سے بولتی ہے۔ ممکن ہے' اَمجد کو اُس کی یہی اَدا پسند آئی ہو۔ ہو سکتا ہے' اَمجد نے اُسے اِن آنکھوں کے اَسرار سے آگاہ کر دیا ہو۔ جب اُس نے پہلی بار اَپنی بولتی ہُوئی آنکھ کو آئینے میں دیکھا ہو گا تو وہ حیران رہ گئی ہو گی کیوں کہ دوسری لڑکیوں کے ہونٹ مسکراتے ہیں' اُس کی آنکھیں مسکراتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہُو اَپنے غم کا اِظہار اَپنے چہرے سے نہیں کرتی۔ جب اَمجد لام پر گیا تھا تو اُس کی ماں رو رہی تھی' اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے لیکن اُس کا سارا غم اُس کے چہرے پر لکھا گیا تھا۔ یہ چہرہ آج سے ڈیڑھ سال پہلے بوڑھا نہیں لگتا تھا؛ اَب اِس غم نے اُس پر کئی ندیاں بنا ڈالی ہیں' آنسوؤں کے دھارے آنکھ سے پھوٹتے ہیں لیکن چہرے پر غم کی سطریں لکھتے جاتے ہیں۔ چہرے کی کتاب کو پڑھنا کتنا آسان ہے' آنکھ کی کتاب کو پڑھنا مشکل ہے۔ لوگ کہتے ہوں گے کہ کتنی سخت دِل ہے' اُسے امجد کا کوئی غم نہیں: وہ بے چارے اِن آنکھوں کے اَسرار سے آگاہ نہیں۔

میں اِن آنکھوں میں غم کی ساری داستاں' الف سے لے کر "ی" تک' پڑھ سکتا ہُوں۔ بہُو کے سارے آنسو آنکھوں کے سوتوں میں چھپے ہیں۔ یہ سوتے پھوٹ بہے تو ایک دُنیا سیلاب میں ڈوب جائے گی۔

حوالدار میجر نے سوچا۔

وہ اِن آنکھوں میں جھلکتے غم کو دیکھ سکتے تھے۔ یہ آنکھیں ایک غم کو اَپنے اَندر جذب کرنے کے بعد دوسرے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ جب یہ غم بھی اُن میں نقش ہو جاتا ہے تو یہ اُنھیں تیسرے غم کے لیے تیار پاتی ہیں۔ یہ کتنی صابر و شاکر آنکھیں ہیں...... سمندروں سے بھی گہری اَور اِن میں ساون بھادوں کے سارے بادلوں کا پانی بھی موجود ہے۔

اَمجد کی جُدائی کے بعد اِن آنکھوں نے وہ دُوسرا غم اُس وقت دیکھا جب ٹیٹو چھ۶ مہینے کا ہوکر ذرا سا بیمار ہُوا؛ اِس سے پہلے کہ دوا میسّر آتی، وہ اُس کی گود میں دم توڑ گیا۔

سارا گھر رویا لیکن وہ نہ روئی۔ چند روز وہ بولائی بولائی رہی، گُم صُم۔ اُس کی آنکھوں میں شیشے کی بے جان سی چمک تھی۔ تب شیشہ گداز ہوا اَور یہ غم بھی اُن آنکھوں میں جذب ہوگیا۔

پھر قیدیوں کی طرف سے خط ملنے لگے: پپّو کے پھوپھا کا خط آیا، اَمجد کے سُسر کا خط آیا، حوالدار میجر کے چھوٹے بھائی نے خیر خیریت کی اِطلاع دی لیکن اَمجد کا خط نہ آیا، اُلٹا سب نے اَمجد کے بارے میں اُن سے پوچھا تھا۔

قیدیوں کی فہرستیں شائع ہوئیں، اُن میں بھی اَمجد کا نام نہ تھا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ دُور دُور کے مورچوں پر لڑنے والے سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں مل سکا ہوگا؛ ہوسکتا ہے، اُنھوں نے گوریلا فوج بنالی ہو اَور امجد اُن میں شامل ہوگیا ہو۔

اَب قیدیوں کی طرف سے جو خط آرہے تھے، اُن میں اَمجد کے متعلق مایوسی کا اِظہار ہونے لگا۔

اَمجد کے سُسر نے لکھا تھا:

میں پوچھ گچھ کررہا ہُوں، جس کیمپ میں مَیں ہُوں، وہاں اَمجد کی رجمنٹ کا کوئی آدمی قید نہیں۔

امجد کے چچا نے کیمپ سے اِطلاع دی:

بھائی جان! کیا اچھا ہوتا جو میں آپ کو کوئی نیک خبر سناتا، پر تقدیر کے آگے کس کی چلتی ہے! میں زیادہ تو نہیں لکھ سکتا۔ امجد کی کمپنی کا ایک صوبیدار زندہ بچا ہے، اُس کا کہنا ہے کہ میں نے اَمجد کو اَپنی آنکھوں سے شہید ہوتے دیکھا ہے۔ میری طرف سے بہن کو تسلی دیں!

حوالدار میجر نے سوچا:

اَب اَمجد کے لیے گھر میں صفِ ماتم بچھنی چاہیے!

بیٹے سبھی کے مَرتے ہیں، لوگ اُنھیں نہلا دَھلا کر کفن پہناتے ہیں اَور اَپنے ہاتھوں قبر میں اُتارتے ہیں۔ جنگ کے بعد ہزاروں گھروں میں صفِ ماتم بچھی ہے، اِس لیے اُنھوں نے اِس خط کو گھر والوں سے نہ چھپایا؛ چھپانا بہتر بھی نہ تھا۔ رِشتے دار اِکٹھے ہوئے، بَین ہوئے، لوگوں نے دردناک لفظوں میں پُرسے دیے۔ لاکھوں بار فاتحہ پڑھی گئی۔ سب روئے پر امجد کی ماں نہ روسکیں اَور بہُو کی آنکھوں میں یہ غم بھی جذب ہوکر رہ گیا۔

اَور دسویں دِن صفِ ماتم پر ڈاکیا ایک خط لے کر آیا۔

حوالدار میجر نے لرزتے ہاتھوں سے خط لیا اَور پڑھنا شروع کردیا:

آپ اَمجد کے ابّا ہیں' اِس لیے میرے بھی ابّا ہیں' تو ابّا جان! ہتھیار ڈالنے کا حکم ملنے سے ایک رات پہلے' میں اَور امجد ایک ہی مورچے میں تھے۔ اُس رات گولے آگ کی طرح برس رہے تھے۔ میں تو زخمی ہو گیا تھا' لیکن امجد صحیح سلامت تھا۔ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں ہسپتال میں تھا۔ پتا نہیں' بعد میں کیا ہوا! آپ کو اَمجد کا کوئی نہ کوئی خط مِلا ہوگا' مجھے اُس کا پتا لکھیے!

یہ روشنی کی ایک نئی کرن تھی۔ اُس دِن صفِ ماتم لپیٹ دی گئی۔

لیکن اَمجد کی طرف سے کوئی خط نہ آیا۔

پھر زخمی اَور بیمار قیدی رِہا ہونا شروع ہو گئے۔ وہ فہرستوں میں اَمجد کا نام تلاش کرتے رہے۔ قیدیوں کی ایک فہرست میں اَمجد کا نام مل گیا اَور زخمی اَور بیمار قیدیوں کی جو تصویریں چھپتی تھیں' اُن میں سے ایک تصویر اَمجد سے ملتی جلتی تھی...... اَمجد جو پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا۔

اَور اَب وہ تصویر والے اَمجد سے مِل کر آئے تھے؛ وہ اُن کا اَمجد نہیں تھا...... پر وہ جن ماں باپ کا اَمجد تھا' وہ اُنھیں بھی نہ پہچان سکا...... یہ کتنا بڑا اَلمیہ ہے! کاش ہمیں بھی اِسی طرح اَمجد مل جائے' وہ ہمیں نہ پہچانے' نہ سہی' ہم تو اُسے دیکھتے رہیں گے!

جب وہ گھر پہنچے تو رات پڑ چکی تھی' لیکن پپّو جاگ رہا تھا۔

وہ چارپائی سے کود کر اُترا اَور دادا ابّو کی ٹانگوں سے لپٹ گیا:

دادا ابّا! ابّو ملے؟

اُنھوں نے کوئی جواب نہ دیا تو دادی نے کہا:

نہیں بیٹا!

پپّو یک دم ساکت و صامت کھڑا ہو گیا۔ بہو برآمدے کے ایک کونے میں چُپ چاپ بیٹھی تھی...... حوالدار میجر نے لالٹین کی روشنی میں اُس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہا تاکہ اِس نئے غم کو بھی گہرے سمندر میں جذب ہوتے دیکھ سکے' لیکن مدھم روشنی میں وہ اِس غم کو نہ دیکھ سکے۔

اُنھوں نے سوچا:

یہ آنکھیں کب برسیں گی؟ اَب اِنھیں برسنا چاہیے!

تب اَمجد کی ماں نے کہا:

پپّو بیٹا! مجھے یقین ہے تمھارے ابّا صحیح سلامت ہیں۔ جب ہندوستان سے ہمارے قیدی چھوٹیں گے تو وہ بھی آجائیں گے۔

ہاں ہاں' ضرور آئیں گے۔ اَب تم سو جاؤ پپّو! پینا بیٹی' ہمیں بھوک نہیں ہے...... کھانے والے کا

اِنتظام نہ کرنا، اَب تم بھی سو جاؤ!

اَور عجیب بات تھی کہ اُس رات کی اَندھی کوکھ سے پہلی بار امن وسکوں کی ایک لہر پھوٹی اَور پپّو سو گیا۔ اُس کے ہلکے ہلکے خرّاٹوں میں نیند کی خُوش بُو گھل مل گئی تھی۔ صحن میں ہلکی ہلکی روشنی تھی...... تاروں کی روشنی...... اُس روشنی میں وہ بہُو کا چہرہ نہ دیکھ سکے، لیکن اُن کا خیال تھا کہ اَب بہُو کی آنکھ لگ گئی ہوگی۔

اَمجد کے ابّا!......

دوسری کھاٹ سے ایک سرگوشی اُن کے کان میں آئی:

آپ جاگ رہے ہیں؟

ہاں!

پپّو سو گئی ہے؟

ہاں!

میرا جی نہیں مانتا، مجھے یقین نہیں آتا کہ اَمجد ہمیشہ کے لیے ہم سے جُدا ہو گیا ہے۔ میں جب بھی اَیسا سوچتی ہوں، وہ میرے سامنے آکھڑا ہوتا ہے...... آخر کیوں؟

اِس لیے کہ شہید مرتے نہیں اَمجد کی ماں!

حوالدار میجر نے کروَٹ بدلتے ہُوئے کہا۔

صبح جب حوالدار میجر اُلفت شاہ، مسجد سے نماز پڑھ کر آئے تو اُنھوں نے بہُو کو مصلّے پر بیٹھے دیکھا۔ اُنھوں نے اُس کی آنکھوں میں ڈھلے آسماں کا منظر دیکھا...... وہ ٹھٹھک کر رہ گئے۔

"کیا بہُو نے رات ہماری سرگوشی سن لی تھی؟"......

اُنھوں نے اَپنے آپ سے پوچھا۔

"اچھا ہُوا، سن لی۔ اَب بہُو اِس آخری اَور بڑے غم کو آنکھ کے بجائے دِل میں جذب کر کے پہاڑ اَیسی جوانی کاٹ لے گی۔"

اُنھوں نے اَپنے سوال کا جواب دیا۔

"لیکن پپّو کا کیا بنے گا؟"

اِس دوسرے سوال کا جواب اُن کے پاس نہیں تھا...... اُنھوں نے آسمان پر ایک نظر ڈال کر آنکھیں مُوند لیں!

☆☆☆

یومُ الظُّلّہ

اُس دِن صبح کی اَذان، پوری طرح فضا میں نہ گونجی!

اُس بستی مین جتنی مسجدیں تھیں، اُن سب میں لاوڈ سپیکر لگے ہوئے تھے جو یک دم تو نہیں، ایک ایک دو دو لمحوں کے وقفے کے بعد اذان کی تشہیر کے لیے اپنا دہن کھول دیتے۔ پھر طرح طرح کے لحن اور لہجوں میں قرأت اور ترتیل کی پاکیزہ بارش شروع ہو جاتی۔ وہ اذان ضرور سنتا حالاں کہ اَذان کے کلمے آپس میں یوں گڈمڈ ہوگئے ہوتے کہ اُن میں تمیز ممکن نہ ہوتی۔ ایک ایک کر کے اَذانیں ختم ہو جاتیں تو وہ کلمہء شہادت پڑھ کر پھر سو جاتا۔ ایک عرصے سے اُس نے نماز نہیں پڑھی تھی حالاں کہ وہ مُلحِد تھا نہ کافر؛ زیادہ بے عمل بھی نہیں تھا کیوں کہ اَپنی ذاتی زندگی میں وہ حقوقُ العِباد کا بہت خیال رکھتا۔ مزدور کی مزدُوری، پسینہ خشک ہونے سے پہلے اَدا کر دیتا لیکن جب تک مزدُور کا پسینہ کھل کر بہ جاتا، وہ اُسے مزدُوری کا حق دار بھی نہ سمجھتا۔ اَپنے ہمسایوں کا خیال بھی رکھتا، یہ الگ بات کہ اُس کے ہمسایوں کو ہم دردی کی اِتنی ضرورت بھی نہ تھی: وہ سب محلّوں میں رہتے تھے اور اُنھیں کوئی ایسی اِحتیاج لاحق نہ تھی کہ وہ ہم سائیگی کا حق اَدا کر سکتا؛ اُنھیں جن معاملات میں ہم دردی اور غم گساری کی حاجت تھی، اُن کا تعلق ڈاکٹر سے تھا یا ماہرِ نفسیات سے اَور جو تھوڑے بہت محتاج اُس آبادی میں تھے، وہ اُن سے واقف نہیں تھا۔ اپنی ہی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹرز میں رہنے والے ملازموں کو وہ ہم سائیگی کا درجہ نہ دیتا؛ اُن کے ساتھ اُس کا رِشتہ آجر اَور اجیر کا تھا...... یہی اُس بستی کا دستور بھی تھا۔

اَذان کی آواز پوری طرح گونج نہیں رہی تھی!

وجہ اِس کی یہ تھی کہ پچھلے کچھ دِنوں سے بہت حبس تھا۔ ہَوا نہیں چلتی تھی اَور پتّے بھی نہیں ہلتے تھے۔ اِس کے ساتھ گرمی بھی شدید تھی، دُھوپ تو بہت ہی تیز تھی کہ گھر سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ دیر تک چُندھیائی ہُوئی آنکھوں کو کچھ دِکھائی نہیں دیتا تھا۔ صبح قدرے خنک ہوتی لیکن حبس اَور گھٹن کا وُہی عالَم ہوتا جو گزشتہ رات سورج غروب ہونے کے بعد ہوتا تھا۔ ہَوا چل رہی ہو تو آوازیں گونجتی ہیں۔ ہَوا میں لرزِش نہ ہَو تو آواز کی لہروں میں تھرتھراہٹ کیسے پیدا ہو اَور تھرتھراہٹ کان کے پردوں سے ٹکرا کر نہ لَوٹے تو گونج کی آواز کہاں سے آئے!

فطرت کا یہ مظہر پہلے پہلے اُسے کچھ زیادہ عجیب معلوم نہ ہُوا۔ گرمیوں میں اَور خاص طور پر برسات سے قبل یا مابعد ایسی ہی فضا وجود میں آتی تھی لیکن اِس فضا میں بھی اَذان کی آواز ضرور گونجا کرتی تھی اَور یہ فضا عارضی ہوتی، اِتنا طُول نہ کھینچتی؛ پھر اِتنی جامد بھی نہ ہوتی کہ اِس سے آواز کی گونج بھی سَلب ہو جائے۔

آج وہ فضا کی اِس غیر معمولی تبدیلی سے پہلی بار شعوری طَور پر آشنا ہُوا تو اُس کے دِل کی ایک دھڑکن سے ایک مبہم سا خوف برآمد ہُوا...... ایک سایہ سا لپکا۔ یہ خوف جو مہیب سایے کی طرح سامنے نہیں آتا اَور جو عقب میں دبے پاؤں چلتا ہے اَور یُوں لگتا ہے کہ وہ ابھی دبوچ لے گا...... اپنے بازوؤں میں...... عفریتی بازوؤں میں...... جو خطرہ نظر آئے' اُس کا خوف کانٹے کی نوک کی طرح تیز ہوتا ہے: ممکن ہے یہ اُس کا واہمہ ہو۔ بستی کے دوسرے لوگوں میں اُس نے خوف و ہراس کا کوئی نشان نہ دیکھا۔ سب لوگ اَپنے اَپنے کاروبار میں لگے ہوئے تھے اَور بستی میں پہلے کی طرح روپے پیسے کی ریل پیل تھی...... وہی رونق' وہی ہماہمی! سارا خوف اُس کے دِل میں تھا۔ ابھی تک کسی نے اُس کے خوف کی تائید نہ کی تھی۔ لوگ گھٹن اَور حبس کی شکایت ضرور کرتے لیکن یہ بھی ایک معمول تھا۔ سال کے اِس حصے میں اَیسا ہی موسم ہوتا۔ کیا واقعی اَیسا موسم ہوتا؟ نہیں...... سال کے اِس حصے میں بہت گرمی پڑتی اَور لُو چلتی۔ اُس بستی کے اکثر مکان اَور دفاتر ایئرکنڈیشنڈ تھے۔ لُو اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکتی۔ لوگ اکثر کمروں میں بند رَہ کر اَپنا کاروبار کرتے۔ اُنھیں گرمی کی شِدّت کا سامنا ہوتا نہ سردی سے پالا پڑتا۔ سردیوں میں اُن کے مکانوں اَور دفتروں میں مرکزی گرم کاری سے کام لیا جاتا۔ وہ اَندر ہی سوتے' اَندر ہی کام کرتے' کبھی کبھار باہر نکلتے تو سردیوں میں گرم اَور گرمیوں میں سَرد کاروں میں بیٹھ کر۔ لُو اَور حبس میں اُن کا اِحساس اَب کوئی تمیز نہ قائم کر سکتا تھا۔

اِس لحاظ سے وہ قدامت پسند واقع ہُوا تھا۔ اُس کے دِل میں ابھی تک وہ اَزلی و اَبدی خوف موجود تھا جو سورج' چاند اَور سِتاروں کے' آنکھوں سے چھپ جانے کے وقت محسوس ہوتا ہے۔ گھنا جنگل ہو یا اَندھا گپھا' اِنسان دونوں سے ڈرتا ہے کیوں کہ یہاں سورج' چاند اَور سِتاروں کی روشنی نہیں آتی۔ اِسی لیے وہ ابھی تک اَپنے بنگلے کے ایئرکنڈیشنڈ کمرے سے کوئی لگاؤ پیدا نہ کر سکا تھا۔ دِن کو تو وہ اُس کمرے میں کافی وقت گزار سکتا تھا لیکن رات کو جب بجلی کی مدھم روشنی میں بھی آنکھ نہیں لگ سکتی' اُسے اِس کمرے میں اَندھے گپھا کا احساس ہوتا۔ اِس بستی کی روایت کے بَرعکس وہ بنگلے کے لان میں پلنگ بچھواتا اَور پیڈسٹل فین لگوا کر رات بسر کرتا۔ اِسی سبب وہ صبح کی اَذان ضرور سنتا۔ اُس وقت اَپنے آپ اُس کی آنکھ کھل جاتی۔ آج سے پانچ سال پہلے وہ صبح کی نماز ضرور پڑھا کرتا تھا۔ اُن دِنوں وہ ابھی اِس بستی میں نہیں پہنچا تھا' وہ ابھی

اَعراف میں تھا یعنی جہنم اَور جنّت، دونوں کے نظارے اُس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ وہ محنت و مشقت کے اُس دوزخ سے نکل آیا تھا جہاں دِن رات اَپنے خون پسینے کی آگ میں جلنا پڑتا ہے۔ جب وہ اَعراف میں پہنچا تو یک دم جذبۂ عبودیت سے سرشار ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ جنت اَب میری زد سے دُور نہیں۔ چناں چہ اُس نے صبح کی نماز کو اَپنے اُوپر لازم کر لیا۔ جب وہ جنت میں پہنچا تو اُس نے خود نماز کو نہ چھوڑا مگر نماز نے اُسے چھوڑ دیا کیوں کہ جنت کا ایک ایک لمحہ، نماز اَور عبادت تھا۔

لیکن آج جب اَذان میں گونج پیدا نہ ہُوئی تو اُس کا جی چاہا کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھ لی جائے۔ یوں صبح کی خنکی میں بھی حبس تھا اَور خوف کا عفریتی سایہ اُس کا پیچھا کرنے لگا تھا۔ ممکن ہے کہ نماز میں یہ خوف کم ہو جائے یا بالکل مِٹ جائے۔ جہاں نماز، فواحش و منکرات کو روکتی ہے، وہاں یہ مسلمان کو اَنجانے خوف سے بھی ضرور نجات دِلاتی ہے۔ مسجد اُس کے بنگلے سے، تھی بھی کون سی دُور...... چند قدم، اَور وہ مسجد کے اَندر تھا۔ یہ مسجد اِس بستی میں سب سے پہلے تعمیر ہُوئی تھی۔ ابھی یہ بلیو پلین سے پوری طرح اُتر کر زمین پر نہیں آئی تھی کہ بڑے مولوی صاحب نے اِس پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بات اُس نے حاجی سلطان کی زبانی سنی تھی جو اِس بستی کے پہلے آباد کاروں میں نمایاں اَور ممتاز مقام رکھتے تھے۔ اُنھوں نے کہا تھا:

بڑے مولوی صاحب نے اِس جگہ ایک تھڑا سا بنایا، ایک دو صفیں ڈالیں، دو چار مٹی کے لوٹے اَور ایک مٹکا لا کر رکھا اَور اللہ اکبر کہہ دیا۔

مولوی صاحب نے مسجد کی تعمیر میں بہت محنت کی۔ گھر گھر جا کر چندہ مانگا۔ ایک ایک کے سامنے جھولی پھیلائی حتیٰ کہ بسوں کے اڈّوں پر جا کر چندہ مانگنے سے بھی گریز نہ کیا۔ مولوی صاحب اَور چندے کی صندوقچی، لازم و ملزوم ہو گئے اَور یہ اُن کے حُسنِ نیّت کا پھل تھا کہ اِتنی شان دار مسجد تعمیر ہُوئی جو اِس بستی کے معیار اَور مرتبے کے عین مطابق تھی۔ اِس کے دو۲ مینار ہیں، نہایت نازک اَور باتمکین...... اِرد گرد کے خوب صورت بنگلوں کے تناظر میں یہ مینار اَور بھی شان دار اَور خوب صورت نظر آتے ہیں۔ اِس بستی میں اَور کوئی مسجد اِس شان کی نہیں۔ یہ سب سے بڑی مسجد ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اِسے بڑی مسجد یا جامع مسجد کہا جائے لیکن لوگ اِسے بڑے مولوی صاحب کی مسجد کہتے ہیں۔ جس نے مسجد کی بنیاد رکھی اَور اِس کی تعمیر پر خون پسینہ بہایا، اُس کے نام سے مسجد کا منسوب ہونا کون سی قیامت کی بات ہے! لیکن اُسے یہ بات عجیب معلوم ہوتی تھی۔ مسجد اللہ کا گھر ہے، کیا اِسے اللہ ہی سے منسوب نہیں ہونا چاہیے؟

مسجد کے اَندر پنکھے چل رہے تھے، پھر بھی حبس تھا۔ جماعت میں اِس مسجد کے چند طلبا شامل تھے یا

کچھ نوکر پیشہ لوگ جن کے کپڑوں سے پسینے کی بُو آ رہی تھی اور قریشی صاحب جو کسی محکمے میں بہت بڑے افسر تھے، وہ ابھی ابھی ائیر کنڈیشنڈ کمرے سے نکل کر آئے تھے کیوں کہ اُن کے کپڑوں سے جلی ہُوئی آکسیجن کی بُو آ رہی تھی۔ ممکن ہے، یہ اُس کا اپنا احساس ہو۔ مسجد کی وسعت کے تناسب سے جماعت اِتنی کم تھی کہ مسجد بہ دستور خالی خالی اور سُونی سُونی سی نظر آ رہی تھی۔ جماعت کی امامت ایک نوجوان مولوی صاحب نے کی جو اِس مسجد کے مدرسے کے سینئر طالب عِلم تھے۔ اُن کی قِرأت ٹھیک ٹھاک تھی لیکن بڑے مولوی صاحب کا سا لحن، وہ کہاں سے لاتے جو عید بقر عید کے موقع پر اُس نے سُنا تھا اور ابھی تک وہ اُس کے نہاں خانۂ دِل میں جادُو جگا رہا تھا۔ پھر وہ بھری بھری ڈاڑھی جس پر خضاب نے شبِ دیجُور کا سا سماں پیدا کر دیا تھا، اُس طالب علِم کو کہاں نصیب! اِس کے کلِوں پر ابھی بال نہیں آئے تھے اور ٹھوڑی پر جو اِکا دُکّا بال اُگ آئے تھے، وہ اتنے گنے چنے تھے کہ ڈاڑھی کے معصوم بچپن پر پیار تو آتا تھا لیکن احترام کا جذبہ نہ اُبھرتا۔ اِس اِمام کی قیادت میں نماز پڑھ کر اُسے یُوں لگا جیسے نماز سے کوئی چیز غائب کر لی گئی ہو۔

نماز ختم ہونے پر اُس نے پوچھا:

آج بڑے مولوی صاحب نہیں آئے؟

چھوٹے مولوی صاحب کے بجائے قریشی صاحب بولے:

حضرت صاحب آج کل صبح کی نماز میں کم ہی آتے ہیں۔

کیوں؟

اُس کے منہ سے بے اِختیار نکل گیا۔

آپ کی کیوں سے مجھے رعونت کی بُو آئی ہے۔

قریشی صاحب نے کہا۔

نہیں تو...... نہیں تو......

اُس نے گھبرا کر کہا۔

آج آپ بھُولے سے مسجد میں آ گئے اور آپ کو بڑے مولوی صاحب سے جواب طلب کرنے کی سُوجھی۔ صاحب! وہ آپ کے اجیر نہیں۔ اِس بستی کے آجر اور کارخانہ دار حضرات کی ذہنیت ہی ایسی بن چکی ہے کہ وہ ہر آدمی کو اپنا اجیر جانتے ہیں۔

قریشی صاحب لیکچر جھاڑنے کے مُوڈ میں تھے۔ اِس لیے اُس نے مسکرا کر اُن کی بات کو ٹالنا چاہا۔

اُس نے کہا:

قریشی صاحب! بعض باتیں یُوں ہی پوچھ لی جاتی ہیں...... محض ذوقِ تجسّس کے لیے۔

لیکن بزرگوں کی ذات کو مُوردِ تحقیق و جستجو نہیں بنانا چاہیے!

قریشی صاحب ناصحانہ اَنداز میں بولے۔

وہ فطرتاً صلحِ کُل واقع ہُوا تھا۔ دوسروں کے متعلق حُسنِ ظن رکھنا اُس کی فطرت میں داخل تھا۔ وہ سبھی کو اچھا جانتا تھا لیکن نہ جانے کیوں قریشی صاحب کی ذات میں اُسے "دو۲ آدمی" آپس میں لڑتے جھگڑتے اور کشمکش کرتے نظر آئے! یُوں تو ہر آدمی کے اَندر کئی آدمی ہوتے ہیں لیکن بظاہر ہر آدمی کا چہرہ ایک ہی ہوتا ہے؛ اِن متعدد آدمیوں کا وجود' دوسروں کو کم ہی نظر آتا ہے...... نہ جانے کیوں قریشی صاحب کے چہرے پر جو نقاب تھا' اُس کے پیچھے کا چہرہ بھی صاف نظر آتا تھا! قریشی صاحب مزاجاً پکے مسلمان تھے: نماز روزے کے پابند' زکوٰۃ بھی دیتے تھے' حج بھی کر آئے تھے' ڈاڑھی بھی رکھ لی تھی اور سُوٹ پہننا ترک کر دیا تھا' شلوار ٹخنوں سے اُوپر ہوتی' صحیح موقعوں پر قرآن کی موزوں آیات بھی پڑھتے تھے لیکن دوسرا چہرہ کچھ اور ہی کہتا ہُوا نظر آتا۔ جب کبھی حکومت بدلتی' وہ معطل ضرور ہوتے؛ جب نئی حکومت میں اِستقلال آتا تو وہ بحال ہو جاتے اور اُن کے عہدے میں اِضافہ ہو جاتا۔ وہ اَپنی معطلی اور بحالی دونوں کو اَپنی دیانت' راست روی اور راست گوئی کا نتیجہ جانتے۔ اِس بستی میں وہ اَپنے شان دار بنگلے میں رہتے تھے۔ اُن کے پاس دو۲ کاریں تھیں۔ اُن کا رہن سہن نہایت ماڈرن تھا۔ اُن کے بچے اعلیٰ درجے کے انگریزی سکولوں میں پڑھتے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک اعلیٰ ملازم تھے لیکن کرایے کے مکان سے شان دار بنگلے میں' جو خود تعمیر کیا گیا ہو' پہنچنا اور بس سے کار تک آنا ایک معجزے سے کم نہیں۔ قریشی صاحب اِس معجزے سے دوچار تھے اور اِسی لیے کشمکش میں مبتلا تھے۔ وہ دونوں چہروں کو مِلا کر ایک ہی چہرے کے ساتھ لوگوں سے ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ تاہم یہ دوسرا معجزہ اُن کے لیے ابھی ممکن نہ ہُوا تھا۔

قریشی صاحب تسبیح پھیرتے ہُوئے مسجد سے چلے گئے تو طالبِ علم نے اَز راہِ ہم دردی کہا:

بڑے مولوی صاحب سے مِلنا ہو تو آج ظہر کی نماز میں آجایئے گا!

بہت اچھا!......

اُس نے کہا:

اور ہاں! چھوٹے مولوی صاحب! آج صبح اَذان سُنائی تو دی لیکن اُس میں وہ گونج نہیں تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ کہیں لاؤڈ سپیکر تو خراب نہیں؟

نہیں صاحب! ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں بیٹھ کر تو مجھے اِس بات کا احساس نہیں ہُوا کہ...... ہاں! دُور سے شاید آپ کو آواز میں کوئی کمی محسوس ہُوئی ہو۔

بڑے مولوی صاحب کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ جب وہ اِس بستی میں آئے تو اُن کے ذاتی اثاثے میں ایک کرتے اَور ایک دھوتی کے علاوہ ایک مصلاّ اَور ایک لوٹا بھی تھا۔ یہ مصلّے اَور لوٹے کی برکت تھی کہ آج وہ اِس بستی میں ایک درمیانے درجے کے بنگلے کے مالک تھے اَور ایک فیئٹ کار اُن کے نیچے تھی۔ شروع شروع میں وہ فرش نشیں تھے، پھر حجرہ نشیں بنے، اَور اَب وہ بنگلہ نشیں تھے۔

جب وہ گھر پہنچا تو صبح، نمی اَور خنکی سے محروم ہو چکی تھی۔ مشرق کا دامن یکایک شعلوں کی لپیٹ میں آ کر دھڑ دھڑ جلنے لگا تھا۔ سُورج کی پہلی کرن نے اُس کی پیشانی پر آتشیں بوسہ دیا تو وہ کانپ گیا۔ جنّت میں آگ کا یہ بپتسمہ اُسے نہایت خوف ناک محسوس ہُوا۔

اُس نے ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں بیٹھ کر چین کا ایک سانس لیا لیکن ماتھے کا آتشیں بوسہ پھر سے جلنے لگا۔ ایئر کنڈیشنڈ کمروں کو اکثر ہَوا بند رکھا جاتا ہے۔ بہت سے آدمی ایک کمرے میں بیٹھ جائیں تو آکسیجن کے جلنے اَور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے بڑھنے کا اِمکان زیادہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے کثیر المنازِل عمارتوں اَور سینماؤں میں اکثر آکسیجن کے جلنے کو محسوس کیا تھا اَور اُس کا دم گھٹتا رہا تھا۔ آج اِس ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں وہ اکیلا تھا۔ ابھی اُس کے کلرک اَور دفتری نہیں آئے تھے اَور ابھی سے کمرے کی فضا میں گھٹن پیدا ہو رہی تھی۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے اِس کی آکسیجن جل رہی ہو۔ یہی کیفیت باہر فضا میں تھی۔ بظاہر یہ بات ناممکن معلوم ہوتی تھی کہ کرۂ اَرض کے کسی حصے کی آکسیجن جل جائے۔ یہ حادِثہ نظام قدرت کے خلاف تھا، تاہم کیا اِنسانوں نے ایسے بم اِیجاد نہیں کر لیے تھے جو ایک خاص جگہ کی آکسیجن کو جلا کر وہاں سانس لینے والی مخلوق کا قلع قمع کر دیتے ہیں...... نظامِ قدرت میں بھی کوئی ایسی تبدیلی آ جائے، تو کیا یہ ممکن نہیں؟ اِس خیال سے اُسے اِتنی وحشت ہُوئی کہ اُس کا ہاتھ بے اِختیار اَپنے گلے پر چلا گیا۔ اُسے گلا گھٹتا ہُوا محسوس ہونے لگا۔

پھر یکایک کتابِ زندگی کا ایک ورق اُلٹ گیا!

وہ اُس زمانے میں ابھی جہنّم زار میں تھا۔ نہیں...... نہیں...... جس بستی میں وہ پَیدا ہُوا تھا، اُس کے مکیں اُسے جہنّم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اُس بستی کی ایک غریبانہ سی مسجد میں مولوی صاحب سے درس لیا کرتا تھا؛ اُس کے والدین کا اِرادہ تھا کہ وہ اُسے عالمِ دِیں بنائیں گے۔ اُس زمانے کی یادیں تلخ تھیں۔ وہ اُنھیں بُھول چُکا تھا۔ لیکن آج اِضطراب اَور سکون کے دو۲ متضاد سِروں کا اتّصال ہُوا تو ایک یاد نے اُس کے شعور کے دروازے پر دستک دی۔

اُس نے سُنا:

ایک بستی تھی جو بَن والوں کی بستی کہلاتی تھی کیوں کہ یہ جنگل کے کِنارے ایک تجارتی شاہ راہ پر آباد تھی' اِس لیے یہاں کے لوگ بہت خوش حال تھے۔ اُنھیں اپنی دولت مَندی پر بڑا گھمنڈ تھا۔ اُس کی اِصلاح کے لیے حضرت شعیب علیہ السلام کو بھیجا گیا۔

یکایکِ یہ آواز بند ہوگئی۔ اِضطراب اَور سکون کے دونوں سِرے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے۔

اُس لمحے اُس نے دیکھا کہ اُس کے سامنے اُس کی سیکرٹری کھڑی ہے۔ اُس کے ہاتھ میں نوٹ بک ہے اَور وہ اُس کا آج کا اہم پروگرام نوٹ کرنا چاہتی ہے۔

سر!

سیکرٹری نے کہا۔

مس صوفی ...... تم ؟ ...... آج کوئی پروگرام میرے ذہن میں نہیں۔ ہاں یہ دیکھ لیجیے کہ آج میری کوئی اپوائنٹمنٹ تو نہیں؟

نہیں سَر!

بہت اچھا ہُوا' ورنہ مجھے یہ کینسل کرنی پڑتی۔

کیوں سَر! طبیعت تو ٹھیک ہے؟

پریشانی کی کوئی بات نہیں مس صوفی ...... ہاں! ایک بات ہے...... تم نے اِن دِنوں فضا میں کوئی خاص تبدیلی محسوس نہیں کی؟

نہیں تو سَر!

لیکن آج صبح کی اَذان' گونج سے کیوں محروم رہی؟

سر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ صبح کی اَذان ...... گونج...... نہیں سَر! میں کچھ نہ بتا سکوں گی۔ اِس لیے کہ میں اِتنی جلد سو کر نہیں اُٹھتی کہ اذان سُن سکوں۔

کچھ نہیں ...... کچھ نہیں ...... یُوں ہی ...... حبس اَور گھٹن ہو تو میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہو جاتا ہُوں!

مس صُوفی ٹائپ اَور شارٹ ہینڈ جانتی تھیں اَور اِس صلاحیت کی بنا پر اُنھیں ایئر کنڈیشنڈ دفتر کی جنت میں کچھ وقت بسر کرنے کا موقع ملتا تھا۔ وہ مس صُوفی سے مس صوفی (Sophey) بن چکی تھیں۔ نام میں ایک اِعراب کی تبدیلی سے وہ جدیدیت کا جامہ اوڑھ چکی تھیں۔ اُن کی شکل وصورت ویسی ہی تھی جیسی اِس قسم کی لڑکیوں کی ہونی چاہیے۔ وہ اَپنے گھر میں ہوتیں تو ڈوپٹا اوڑھ لیتیں' دفتر میں آتیں تو سَر سے چادر اُتار لیتیں۔ چار دیواری اُنھیں کہیں بھی میسر نہ تھی۔

جب اُس کا ہیڈ کلرک اُس کے پاس ایک فائل لے کر آیا تو اُس نے کہا:

مسٹر نظام! کچھ دِنوں سے حبس بہت ہے۔

یہ موسم کا تقاضا ہے سَر! مون سون آگئیں تو موسم بہتر ہو جائے گا۔

کیا تمھاری بستی میں بھی اِسی قسم کا موسم ہے؟

مسٹر نظام کچھ دیر جواب سوچتے رہے تو اُس نے خود وضاحت کی:

موسم تو ہر جگہ ایک جیسا ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فضا میں آکسیجن کی مقدار بتدریج کم ہو رہی ہے۔

سر! اَب سے پہلے تو مجھے اِس کا احساس نہیں ہُوا تھا۔ اَب آپ نے کہا ہے تو مجھے بھی اپنا گلا گھٹتا ہُوا محسوس ہو رہا ہے۔

نظام نے اَپنے گلے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

اُس نے کاغذات پر دستخط کرنا شروع کر دیے اَور مسٹر نظام گلے پر ہاتھ رکھے کاغذات اُس کے سامنے پیش کرتے رہے۔

ظہر کی نماز کے لیے کرسی سے اُٹھنا بہت بڑا جہاد ہے۔ شاید اِسی لیے صلوٰۃ الوسطیٰ کے لیے قرآنِ مقدس میں بہت تاکید کی گئی ہے۔ اُس نے ایک عرصے سے یہ نماز نہیں پڑھی تھی۔ آج جب لنچ کا وقفہ ہُوا تو اُس کے قدم خود بہ خود مسجد کی طرف اُٹھ گئے۔ اُس نے ابھی وضو بھی مکمل نہ کیا تھا کہ جماعت کھڑی ہوگئی، تاہم وہ پہلی رکعت میں شامل ہو گیا۔ نماز میں صبح سے بھی کم لوگ شریک تھے حالاں کہ امامت بڑے مولوی صاحب کر رہے تھے۔ سلام پھیرنے کے بعد اُنھوں نے نمازیوں کی طرف رُخ بدل لیا۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکرائے۔ بڑے مولوی صاحب کی مسکراہٹ بڑی پُراَسرار تھی۔ یہ مسکراہٹ منبر کی سب سے اُونچی سیڑھی کی پیداوار تھی جو نیچے بیٹھنے والوں کو بڑی مربیانہ شفقت سے اَپنے سایۂ عاطفت میں لے لیتی ہے۔

دُعا سے فارغ ہونے کے بعد اُنھوں نے پوچھا:

اِس سے پہلے آپ سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہُوا۔

یہ میری بدنصیبی ہے کہ میں مسجد میں حاضر نہیں ہوتا رہا، البتہ عید بقرعید کی کئی نمازیں مَیں نے آپ کی امامت میں پڑھی ہیں۔

آپ کا اِسمِ شریف؟

کسی بھی نام سے پکار لیجیے۔ میں جس بستی میں پَیدا ہُوا، وہاں میرا نام کچھ اَور تھا۔ جب میں زینے کی دوسری سیڑھی پر پہنچا تو نام بدل گیا۔ اَب اِس بستی کے لوگ مجھے صرف دِین صاحب کہتے ہیں۔

کون سا دِین؟

مولوی صاحب نے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

دِینِ اسلام۔

اُس نے ہنس کر جواب دیا۔

تو آپ اِسلام الدین ہیں۔ کبھی آپ ایکسپورٹ اِمپورٹ کے کاروبار میں حاجی سلامت بھائی کے پارٹنر تھے؟

جی ہاں! پارٹنر بننے سے پہلے اُن کا جنرل مینجر تھا لیکن حضرت! آپ کو میرا نام اَور کاروبار کیسے معلوم ہُوا؟

آپ فجر کی نماز میں میرے بارے میں کچھ پُوچھ رہے تھے؟

آپ کے بارے میں؟ نہیں...... نہیں...... میں ایسی گستاخی نہیں کر سکتا...... میں تو موسم کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

موسم کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟

موسم میں بڑی گھٹن ہے!

اُس نے کہا۔

جہاں تک میرا تجربہ ہے اَور جو کچھ میں نے بزرگوں کی زبانی سُنا ہے، جب اَیسا موسم آتا ہے تو یہ برسات کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

مولوی صاحب بولے۔

آسمان پر کوئی بادل نظر نہیں آتا۔

پھر آیئے، دُعا کریں! زمین تشنہ ہے اَور عرصے سے بادلوں کے سایے سے محروم ہے، وہ رحیم و کریم ہے، پیاسوں کو پانی سے محروم نہیں رکھے گا۔

مولوی صاحب نے نہایت درد بھرے اَلفاظ میں دُعا کی۔ دُعا کے اَلفاظ اِتنے پُراَثر تھے کہ بے اِختیار اُس کی نگاہیں آسماں کی طرف اُٹھ گئیں۔ آسماں اَور اُس کے درمیان مسجد کی منقّش چھت حائل تھی۔ مسجد کے باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ مولوی صاحب نے مصلّے سے اُٹھتے ہُوئے کہا:

حاجی سلطان تشریف لے آئے ہیں، مجھے اِجازت دیجیے!

وہ اُن کے ساتھ مسجد سے باہر نکلا۔

حاجی صاحب اللہ کے نیک بندے ہیں۔ دُنیا کی جو آزمائش ہے، وہ حاجی صاحب کی ذاتِ بابرکات کا احاطہ کر لیتی ہے۔ نہ جانے کیوں؟ اَپنی مصلحتیں وہ خود ہی جانتا ہے۔ اِن دِنوں کچھ شرپسندوں نے اُن کی مِل میں ہڑتال کر دی ہے۔ میں اُن کے ساتھ مِل میں جا رہا ہُوں۔

آپ کیوں جا رہے ہیں؟ یہ حاجی صاحب اَور اُن کے مزدُوروں کا معاملہ ہے۔

اِسلام الدین صاحب! معاف کیجیے گا، آپ ابھی تک اَپنے نام کی معرفت سے محروم ہیں۔

میں نہیں سمجھا۔

اُس نے کہا۔

اِسلام نے ہمیں درسِ اخوّت دیا ہے۔ حاجی صاحب کی تکلیف، میری تکلیف ہے اَور وہ مزدُور بھی تو مسلمان ہیں جو اَپنے نفع نقصان سے خود بھی آگاہ نہیں۔ میں اِن بھائیوں کے درمیان صُلح و آشتی کا پیغام لے کر جاؤں گا۔

کار کے اَندر بیٹھے حاجی صاحب کو بڑے مولوی صاحب نے جھک کر سلام کیا۔ اَب اُن کی مسکراہٹ

کا انداز بدل گیا تھا۔

اُس کے ماضی سے آواز آئی:

حضرت شعیب علیہ السلام نے اَصحاب الایکہ سے کہا: لوگو! پیمانے ٹھیک بھرا کرو' اَور کسی کو گھاٹا نہ دو۔ صحیح ترازو سے تولو اَور لوگوں کو اُن کی چیزیں کم نہ دو!

صحیح ترازو کس کے پاس تھی؟ کسی کے پاس نہیں تھی۔ لوگوں کو اُن کی چیزیں کم مِل رہی تھیں۔ اِسی لیے تو مِل میں ہڑتال ہُوئی تھی۔ حاجی صاحب نے ترازو کا پلڑا ہمیشہ اَپنے حق میں رکھا تھا۔ اُنھوں نے اَپنے مزدُوروں کو وہ نہیں دیا تھا جو اُنھیں مِلنا چاہیے تھا۔

اُس دِن حاجی صاحب کی مِل میں لاٹھیاں اَور ڈنڈے برسے' بیسیوں مزدُوروں کے سَر پھُوٹے۔ حاجی صاحب نے مولوی صاحب کی معیّت میں ہر زخمی مزدُور سے ملاقات کی۔ اُنھیں علاج معالجے کے لیے کچھ رقم عنایت کی۔ مولوی صاحب نے کہا:

دیکھو لوگو! رُوئے زمیں پر فساد نہ پھیلاتے پھرو۔ اللہ فسادیوں کو عذاب کی بشارت دیتا ہے۔

اَور اُس سے اگلے دِن مِل کی چھتوں سے دُھواں نکلنے لگا۔ پھر یہ دُھواں فضا میں معلق سا ہو گیا۔ یوں لگا جیسے زمین سے اُوپر کی فضا بھی حرکت سے محروم ہو گئی ہو۔ اُس دِن خوف کا عفریتی بازو اُس کے گلے میں حمائل ہو گیا۔

سورج کا آتشیں گولا سارا دِن آگ برساتا رہا اَور لوگ ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں دَبکے بیٹھے رہے۔ اگلے دِن اُسے اذان کی آواز سُنائی ہی نہ دی۔ تب بھی وہ مسجد پہنچ گیا۔ آج صبح نماز کی امامت بڑے مولوی صاحب نے کی' نماز کے بعد اُس نے پوچھا:

آج مسجد میں اذان نہیں ہُوئی؟

مسجد کے نوجواں موَذّن نے کہا:

صاحب! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟ اذان ہُوئی' اذان مَیں نے دی' سب لوگوں نے سُنی۔ کل آپ کہہ رہے تھے کہ اذان کی آواز گونج سے محروم رہ گئی ہے۔ آج آپ اذان ہی سے اِنکار کر رہے ہیں!

موَذّن کے لہجے میں احتجاج تھا جیسے بڑے مولوی صاحب کے سامنے اُس کی ناجائز شکایت کی گئی ہو۔

بڑے مولوی صاحب نے اُس کی طرف متوجّہ ہو کر کہا:

اِسلام الدین صاحب! آپ بیمار تو نہیں؟

جی نہیں۔

آپ کے حواس میں اِختلال کی کیفیت صاف نظر آ رہی ہے۔
شدید گرمی اَور گھٹن کے باعث میرے حواس کچھ پریشان ضرور ہیں۔
کسی ڈاکٹر سے رُجوع کیجیے!
ڈاکٹر مجھے اعصابی سکون کی گولی دے دے گا۔ کیا اِس سے میرا اضطراب دُور ہو جائے گا؟
میں تو آپ کے لیے صرف دُعا کر سکتا ہُوں۔

مولوی صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے:

یا اَرحم الرّاحمین! اَپنے اِس بندے پر رحم کر، اِسے سکونِ قلب عطا فرما!

نمازیوں نے آمین کہی۔

نہیں!......

اُس نے قدرے اُونچی آواز میں کہا:
آپ صرف میرے لیے نہیں، سب لوگوں کے لیے دُعا کیجیے! کیا آپ نے اَخبار نہیں پڑھا، دریاؤں میں پانی سُوکھ گیا ہے اَور کنوئیں خشک ہو گئے ہیں! فصلیں مُرجھا رہی ہیں۔ ہَرے بھرے باغات میں خاک اُڑنے لگی ہے۔ کئی لوگ گرمی کے مارے دم توڑ گئے ہیں۔ مویشی سبز چارے اَور تازہ پانی کو ترس رہے ہیں۔ آپ اِس عذاب سے بے خبر کیوں ہیں؟
اسلام الدین صاحب! اُمّتِ مرحومہ پہ عذاب نہیں آسکتا۔ اِس موسم میں زمین مردہ ہو جاتی ہے۔ بارانِ رحمت کے چند چھینٹے پڑیں گے تو زمین زندہ ہو جائے گی۔ آپ اِن دِنوں کو ایئرکنڈیشنڈ کمروں میں بیٹھ کر کیوں نہیں گزار دیتے؟
وہ لوگ کیا کریں گے جن کے پاس ایئرکنڈیشنڈ نہیں ہیں؟

اُس نے پوچھا۔
میں اَور آپ اُن کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟ اُنھیں بھی کوئی شجرِ سایہ دار مل جائے گا۔
لیکن سایہ بھی تو خنکی سے محروم ہو چُکا ہے۔ ہَوا میں آکسیجن کی مقدار بتدریج کم ہو رہی ہے، کاربن ڈائی آکسائیڈ بڑھ رہی ہے۔ اِس کے اضافے سے گرمی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ کے سَر کے اُوپر پنکھا چل رہا ہے۔ ذرا محسوس تو کیجیے، کیا اِس سے ہَوا حرکت میں آ رہی ہے؟
مولوی صاحب نے پریشان سا ہو کر چھت کی طرف دیکھا۔ کندھے پر پڑے رُومال سے آنکھوں میں گِرنے والا پانی صاف کیا۔ پنکھا گھرر گھرر چل رہا تھا۔ ایک نہیں، کئی پنکھے حرکت میں تھے لیکن مسجد کی فضا گویا پلاسٹک کی بنی ہوئی تھی کہ ہَوا کی کوئی جنبش اُسے حرکت میں نہ لا سکتی تھی۔ تب مولوی صاحب نے اپنے عقب سے ایک عفریتی سایے کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس کیا۔ اُنھوں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا:
دیکھیے، اسلام الدین صاحب! آپ نے مجھے بھی پریشان کر دیا۔ میں گھر جانا چاہتا ہُوں۔ حجرے میں بیٹھ کر خُدا سے لَو لگاؤں گا۔ وہ رحیم و کریم ہے، ضرور مجھے ہدایت فرمائے گا۔
اُس دِن بستی کی سڑکوں پر بہت کم رونق تھی۔ اِکّا دُکّا کاریں چل رہی تھیں۔ کچھ بسیں بھی رینگتے ہوئے

نظر آرہی تھیں، لیکن یُوں لگ رہا تھا جیسے یہ کھلونے ہوں جن کی چابی آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہو۔ اِس کے باوجود کہ ایئر کنڈیشنر چل رہا تھا، اُس کے دفتر میں ہر چہرہ مُرجھایا ہُوا تھا۔ مس صوفی کے چہرے سے میک اَپ اُتر رہا تھا۔ ہونٹوں کی سُرخی پھَٹ رہی تھی اَور مسکراہٹ ہونٹوں سے چپک سی گئی تھی...... کلّر اَور شور کے اُس دھبّے کی طرح جو خشک زمین کے ہونٹوں پر نمودار ہو جاتا ہے۔ اُن پژمُردہ چہروں نے اُسے اَور بھی پریشان کر دیا۔ اُس نے کہا:

مس صوفی! گرمی شدید ہے۔ کیوں نہ دو چار دِنوں کے لیے دفتر میں چھٹی کر دی جائے؟

سر! کام بہت ہے۔

مس صوفی نے خشکی زدہ سُرخ ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

کام تو ہوتا رہتا ہے۔ آج کا ضروری کام نپٹ جائے تو سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے جائیں!

نہ جانے کیوں وہ آج اِتنے لوگوں کی ذمّے داری کا بوجھ اَپنے کندھوں سے اُتار ڈالنا چاہتا تھا! کیا وہ اِس طرح ہلکا پُھلکا ہو جائے گا...... کون جانے! کندھوں کا بوجھ کبھی اُترتا بھی ہے یا نہیں؟ کوئی اِنسان دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔ ہر شخص کو اَپنی صلیب آپ اُٹھانا پڑتی ہے۔ یہ بھی اچھا تھا کہ زندگی کی گردن توڑ تگ و دَو نے اُسے اِتنی فرصت ہی نہ دی تھی کہ وہ بیوی بچوں کا بوجھ اَپنے کندھوں پر لاد لیتا، ورنہ آج یہ بوجھ اُس کی کمر کو دُہرا کر دیتا۔

دفتر خالی ہُوا تو ایک سنّاٹا سا ہر طرف سے آیا اَور اُس کے ماحول پر چھا گیا، جیسے اُس کے اِرد گِرد قناتیں سی لگ گئی ہوں۔ اُس کی دُنیا پہلے سے کہیں زیادہ چھوٹی ہو گئی اَور سمٹنے سکڑنے لگی تو اُسے جسم و رُوح کے بھنچنے کی کیفیت سے دوچار ہونا پڑا؛ گویا وہ محدود سے محدود تر ہو گیا...... اندر باہر، ہر طرف دبنے اَور بھنچنے کی کیفیت تھی؛ خوف کا عفریتی سایہ اُسے بھینچ رہا تھا۔ وہ کبھی اَندر جاتا، کبھی باہر نکل آتا۔ اُس نے سوچا تھا کہ تنہائی اُس کے اِضطراب کو کم کر دے گی لیکن اَیسا نہ ہُوا۔ اصل میں وہ کبھی تنہائی کا خواہش مَند نہیں رہا تھا کیوں کہ وہ مردم بیزار نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اَپنے عذاب میں کسی کو شریک نہ ہونے دے۔ اُن لوگوں کا اِس بستی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تب اُس نے اَپنے مالی اَور خانساماں کو بھی چھٹی دے دی لیکن اُسے فوراً خیال آ گیا کہ وہ تو اُسی کے بنگلے کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے ہیں، وہ اِس بستی کو چھوڑ کر کہاں جائیں گے!

مالی لان میں کام کر رہا تھا۔ وہ پلاسٹک کی نالیوں سے کیاریوں میں پانی لگا رہا تھا۔ دوپہر کے وقت پودوں کو پانی نہیں دیا جاتا۔ اُس نے اِشارے سے مالی کو اَپنی طرف بلایا اَور پوچھا:

آج تم نے پانی دینے میں بہت دیر کر دی؟

نہیں تو صاحب...... پتا نہیں، کیا وجہ ہے کہ پودوں کی پیاس بہت بڑھ چکی ہے! صبح پانی دیتا ہوں تو

ذرا سی دیر کے لیے پَودا تازہ دم رہتا ہے اَور پھر مُرجھا کر جھک جاتا ہے۔ تب مجھے اُس پر ترس آتا ہے۔
میں اُسے پیاسا نہیں دیکھ سکتا۔

وجہ یہ ہے کہ گرمی بہت سخت ہے اَور پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔

اُس نے کہا۔

اِس موسم میں گرمی اِتنی ہی سخت ہوتی ہے مالک! پر مَیں ایک بات پر حیران ہُوں۔ زمین سارا پانی خود پی جاتی ہے اَور پَودوں کی جڑ تک ایک دو قطرے ہی پہنچ پاتے ہیں۔ اگر یہی حال رہا تو لان کا ہر پودا سُوکھ جائے گا۔ گھاس تو پیلی پڑ چکی ہے۔ ایک دو دِنوں میں جھلس کر رہ جائے گی۔ میں پودوں کو نہیں بچا سکوں گا مالک! دو چار دِن اَور بارش نہ ہوئی تو لان میں دُھول اُڑنے لگے گی۔ کسی طرف ہریالی نظر نہیں آئے گی۔

بارِش!

اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ زمین سے لے کر آسمان تک تیز دُھوپ لہرا رہی تھی اَور آسمان کا رنگ زرد تھا۔ کیا بارِش ہو گی...... کون جانے! محکمہ موسمیات نے ہر رات یہی اعلان کیا کہ گرمی بڑھ جائے گی اَور موسم خشک رہے گا۔ ابھی ہَواؤں نے بخارات کا رُخ اُن پہاڑوں کی طرف نہیں موڑا جو اُنھیں روک کر مَیدانوں کی طرف مُڑنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ سمندروں اَور پہاڑوں کا ابھی تک رابطہ قائم نہیں ہُوا۔ اُس کی سوچ نہ جانے کہاں کہاں پہنچتی کہ مالی نے کہا:

جناب! میں نے اِس سے بھی سخت گرمی میں پودوں کو پنپتے دیکھا ہے، پر یہ عجیب بات ہے کہ ماں نے اَپنے بیٹوں کو دُودھ پلانے سے اِنکار کر دیا ہے۔

مالی! کیا مطلب ہے تمھارا؟

جناب، زمین ماں ہے! اَور ماں خود پیاسی رہتی ہے لیکن بچوں کو اُس وقت تک دُودھ ضرور پلاتی رہتی ہے جب تک اُس کی چھاتیاں سُوکھ نہیں جاتیں اَور جب ماں، بچوں کو پیاسا رکھ کر اَپنی پیاس بجھانے لگے تو سمجھیے قیامت نزدیک ہے!

مالی کی اِس بات پر وہ لرز گیا۔ اُس پر اِتنا خوف طاری ہُوا کہ وہ بھاگتا ہوا اَپنے ٹھنڈے کمرے میں پناہ گزیں ہو گیا۔ یہاں خنکی ضرور تھی لیکن آکسیجن کی مِقدار بہت کم تھی...... اِتنی کم کہ اکیلے آدمی کے لیے بھی کافی نہیں تھی۔

اُس دِن ظُہر، عَصر، مغرب اَور عشا، سب نمازیں، اُس نے مسجد میں پڑھیں۔ عشا کی نماز کے بعد مولوی صاحب نے اعلان کیا کہ کل نمازِ اِستسقاء پڑھی جائے گی؛ لاؤڈ سپیکر پر بھی اِس کا اعلان کر دیا گیا کہ کل دس بجے بستی کی بڑی گراؤنڈ میں یہ نماز اَدا ہو گی اَور ہم اُس کے گناہ گار بندے بارانِ رحمت کے لیے دامن پھیلائیں گے۔

اُس رات اُسے نیند نہ آئی کیوں کہ اُسے اندھیرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اَندھیرا اِتنا دبیز اَور ساکِت تھا کہ اُسے بلیڈ سے چیرا جا سکتا تھا۔ یہ بے چاند کی رات تھی اَور آسماں پر دُھندلے دُھندلے تارے چمک رہے تھے......

مدھم، بجھی بجھی آنکھوں کی طرح، جو پلک بھی نہیں جھپک رہے تھے ...... ستاروں کی ٹمٹماہٹ کو کیا ہُوا، بے چاند کی رات میں تارے کھِل کھِلا کر ہنستے ہیں اَور آج اِن کی روشنی سے مسکراہٹ کی لرزِش غائب تھی! سڑکوں پر مرکری بلب روشن تھے؛ اُن کی دُودھیا روشنی میں بھی ایک غم زدہ مایُوسی کا عالَم تھا...... غم زدہ نہیں، خوف زدہ...... مرجھاہٹ اَور پژمُردگی کا خوف! بستی کے کسی بنگلے کی کسی کھڑکی یا کسی روشن دان سے روشنی کی کوئی مُردہ سی شعاع نکل کر سڑکوں کی تنہائی کا مداوا کرنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ یہ بستی جو دِن میں سوتی تھی، رات کو جاگتی رہتی تھی، آج اِس پر نیند کا اِضمحلال کیوں طاری تھا؟

"میں نہیں جانتا"......

اُس نے اَپنے آپ سے کہا:

"اِس پوری بستی میں، مَیں ہی وہ اکیلا آدمی ہُوں کہ جاگ رہا ہُوں۔ اِس کا سارا عذاب میری ہی ذات میں کیوں اُتر آیا ہے؟"

یہ رات اُس نے جاگ کر کاٹی۔ جب صبح ہُوئی تو وہ اِتنا تھک چکا تھا کہ مسجد کی طرف اُٹھنے والا ایک ایک قدم اُسے بھاری پتھر لگ رہا تھا۔ نمازِ فجر میں بڑے مولوی صاحب موجود تھے۔ آج اُن کی قرأت میں جوش اَور وَلوَلہ بہت کم تھا۔ دُعا کے بعد اُنھوں نے نمازِ اِستسقا کے آداب بیان کیے۔ اُنھوں نے کہا:

ایک دِل سے بھی خلوص کے ساتھ دُعا نکل گئی تو بارانِ رحمت ضرور ہو گی۔

اُس نے پوچھا:

حضرت! کیا اِس نماز میں بستی کے سب لوگوں کو شریک نہیں ہونا چاہیے؟

آپ کسی پر پابندی نہیں لگا سکتے اِسلام الدین صاحب!

مولوی صاحب نے کہا۔

حاجی سلطان اَور قریشی صاحب تو ضرور آئیں گے؟

اُس نے پوچھا۔

میں نہیں جانتا۔ اِس سلسلے میں میری اُن سے بات نہیں ہُوئی۔

کہتے ہیں، گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتا ہے۔

مولوی صاحب کو اِس فقرے کا، باقی گفتگو سے ربط پانے میں کچھ دیر لگی۔ تب اُن کی آنکھوں میں غصہ چمکا:

گیہوں کون اَور گھُن کون؟ میں اِس اِمتیاز کا قائل نہیں اِسلام صاحب!

مولوی صاحب نے دُرُشت لہجے میں کہا۔

اُس دِن جب سورج عین سر پر تھا اَور اُس کی عمودی شعاعوں میں تیر کی نوک اَور نیزے کی اَنی کی

تیزی تھی اَور ہَوا سے حرکت غائب تھی‘ لوگ بڑے مَیدان میں جمع ہُوئے۔ اُس مَیدان کی گھاس سُوکھ چکی تھی اَور پاؤں کے تلوے جل رہے تھے۔ بڑے مولوی صاحب نے جو بہت بیزار بیزار سے نظر آرہے تھے‘ امامت کے فرائض اَنجام دیے۔ نماز کے بعد اُنھوں نے دُعا کی۔ سب نے آمین کہی۔ اُس کا خیال تھا کہ دُعا‘ آسماں کا رُخ کرے گی تو دُھوپ کی ساکن چادر مُرتعش ہو جائے گی اَور فضا میں خاموش بھونچال کی سی کیفیت محسوس ہوگی۔ لیکن اَیسا نہ ہُوا تو وہ لرز کر رہ گیا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ وہ اِس مَیدان میں اکیلا ہے اَور کوئی اُس کا ساتھی نہیں۔ وہ لوگ جو اِس نماز میں شریک ہوئے تھے‘ اِس بستی کے نہیں تھے۔ اِس بستی کے سارے لوگ خنک کمروں میں پناہ گزیں تھے۔ اُس نے حاجی سلطان کو دیکھا نہ قریشی صاحب کو۔ اُس نے سوچا‘ یہ لوگ جانتے ہیں کہ اگر بادل چھائے‘ بارِش ہُوئی‘ ٹھنڈی ہَوا چلی تو وہ بھی اِس سے مستفید ہوں گے اَور اگر اَیسا نہ ہُوا تو اِنھیں سَرد خانوں کی خنکی سے کون محروم کر سکتا ہے! اِتنی تیز دُھوپ میں کون میدان کی خشک گھاس پر تلوے جلائے اَور پھر وہ لوگ جو نماز میں شامل ہُوئے‘ اِن کے اجیر ہیں۔ نماز پڑھ کر اِن کا حقِ نمک اَدا کر دیا تو اُن کی اپنی عاقبت سُدھرے گی‘ احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے!

مولوی صاحب نے اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک جلی پھنکی نگاہ اُس پر ڈالی۔ اُس کا چہرہ پسینے سے تر تھا اَور ہونٹ سُوکھے ہوئے تھے: ”اسلام الدین صاحب! یہ سب آپ کے خوف کا نتیجہ ہے۔ آپ نے اَپنے عذاب میں ہم کو خواہ مخواہ شریک کر لیا“۔ اُن کی آنکھوں نے اُس سے گِلہ کیا۔

جب وہ میدان سے رُخصت ہُوا تو اَچانک دُھوپ دُھندلا سی گئی! اُس کے مالی نے‘ جو اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا‘ کہا:

صاحب! معلوم ہوتا ہے‘ مولوی صاحب کی دُعا قبول ہوگئی ہے۔

وہ کیسے؟

دیکھیے! سُورج گہرا سا ہوگیا ہے۔

کیا مطلب؟

سورج پر ایک غُبار سا چھا گیا ہے۔ آپ کو محسوس نہیں ہوتا؟

ممکن ہے‘ یہ اُن لوگوں کے دِل کا غُبار ہو جو نماز میں شامل تھے۔

صاحب! کیا مولوی صاحب کی دُعا میں کوئی اثر نہیں تھا؟

میں نہیں جانتا...... وہ بزرگ آدمی ہیں...... ہاں! وہ کچھ بیزار بیزار سے نظر آرہے تھے۔ حاجی سلطان اور قریشی صاحب آجاتے تو شاید وہ اِتنے بیزار نظر نہ آتے۔

میں بھی حیران تھا۔ اِتنی بھری پُری بستی میں سے آپ اکیلے اِس نماز میں شامل ہُوئے!

مالی نے کہا۔

تو کیا تم اِس بستی کے رہنے والے نہیں؟

اُس نے پوچھا۔

نہیں صاحب! میرا اِس بستی سے کیا تعلق؟......

اُس کے احتجاج میں تھوڑا سا خوف تھا:

آپ جانتے ہیں، میں سولہ آنے پورا کام کرتا ہُوں۔ جتنا کام کرتا ہُوں، اُتنا ہی آپ سے لیتا ہُوں۔ میں نے تکڑی کے دونوں پلڑے ہمیشہ برابر رکھے۔

اُس نے حیران ہو کر مالی کی طرف دیکھا۔ یہ بھی اُس راز سے آگاہ ہے جو اِلہام کی طرح اُس کے دل پر اُترا تھا۔ مالی نے نظریں چُرائیں نہ اُس کی آنکھ میں آنکھ ڈالنے کی ضرورت محسوس کی۔ اُسے لگا کہ مالی نے جو کچھ کہا تھا، وہ اُس کے نزدیک ایک عام مشاہدے کی بات تھی۔

جب وہ بنگلے میں پہنچا تو آسماں پر غبار کچھ اَور گہرا ہو گیا تھا۔

لیکن اِس غبار کا سایہ نہیں تھا۔ سایے میں خنکی ہوتی ہے اَور اِس غبار تلے کوئی خنکی نہیں تھی۔ ایک بے حد گرم، تپتی ہوئی گھٹن تھی۔ اُس نے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پناہ لی۔ ساری بستی اِنھیں کمروں میں چھپی بیٹھی تھی۔

اُن پر سخت گرمی مسلّط کر دی گئی تو وہ تہ خانوں میں گھس گئے۔

صرف نوکر پیشہ لوگ اِس خنک پناہ گاہ سے محروم تھے۔ وہ بھی گرمی اَور حبس سے دوچار تھے لیکن وہ مصنوعی خنکی کی تلاش میں سرگرداں نہیں تھے۔ حبس اَور گھٹن کی جس شِدّت سے وہ دوچار تھا، اُس کی شکایت ابھی تک اُس کے ہونٹوں پر نہیں آئی تھی۔

"کیا ایک جیسے حالات میں ایک جیسے دو انسانوں کے لیے دو مختلف فضائیں قائم ہو سکتی ہیں؟"...... اُس نے سوچا اَور سوچ کی شِدّت اُسے پناہ گاہ سے باہر لے آئی۔

باہر غبار اَور بھی گہرا ہو گیا تھا!

ظہر اَور عصر کی نمازیں اُس نے اِسی غبار کے سایے تلے پڑھیں۔

ابھی سُورج غروب بھی نہیں ہُوا تھا کہ بستی کی روشنیاں جل اُٹھیں۔

مغرب اَور عِشا کے درمیان اُسے کچھ لوگ سڑکوں پر نظر آئے۔ ممکن ہے، یہ لوگ بھی اُسی کی طرح گھبرا کر تہ خانوں سے نکل آئے ہوں۔ سڑکوں پر کچھ کاریں بھی رینگتی ہوئی نظر آئیں۔ اِتنی گہری خاموشی تھی

کہ کاروں کی آواز بھی اُس میں جذب ہو کر رہ گئی تھی۔

ظہر سے لے کر عشا تک کسی نماز میں بڑے مولوی صاحب شریک نہ ہُوئے۔ نمازِ اِستسقا کی بے پناہ گری نے اُن کی طبیعت ناساز کر دی تھی۔

ایک سوال اُسے پریشان کر رہا تھا۔ اِس کا جواب اُسے مولوی صاحب ہی دے سکتے تھے۔ سوال تھا: اصحاب الایکہ (بَن والے) جس بستی میں وہ رہتے تھے، وہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ اُس زمانے میں بہت سی دُنیا خالی تھی لیکن اِس کے باوجود اِسی زمین پر اُس سے بھی بڑی بڑی بستیاں آباد تھیں...... یمن میں، صنعا میں، بابل میں، نینوا میں، مصر اَور فلسطین میں۔ اُس بستی کو سائبان کے عذاب نے آلیا تھا لیکن دوسری کسی بستی کی فضا پر عذاب کا سائبان نہ تنا...... کیوں؟

افسوس کہ سوال لفظوں میں نہ ڈھل سکا اَور غبار بن کر اُس کے دِل پر چھا گیا۔

جب اگلی صبح اُسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ آج کا سُورج طلوع ہُوا ہے یا نہیں تو اُسے یُوں لگا کہ آج صبح کی نماز مسجدوں اَور مصلّوں پر سے اچانک اُچک لی گئی ہو۔ آج کوئی ہاتھ آسماں کی طرف نہ پھیل سکے گا کیوں کہ آسمان اَور زمین کے درمیان غبار معلق تھا۔ آج کسی کی دُعا آسماں تک نہ پہنچ سکے گی۔

وہ ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں مصلّا بچھا کر نماز کے لیے کھڑا ہُوا تو اچانک کمرے میں فضا باقی نہ رہی۔ اُس کا دم گھٹنے لگا تو وہ اَپنے ہی ہونٹوں سے نکلے ہُوئے نماز کے اَلفاظ سننے سے محروم ہو گیا۔ ضروری نہیں کہ اَلفاظ آواز کی صورت میں ڈھل کر کانوں تک پہنچیں۔ خاموش اَور بے آواز دُعائیں اَپنے کانوں کے لیے کبھی گنگ نہیں ہوتیں لیکن آج اُس کی آخری دُعا اُس کے لیے گنگ ہو چکی تھی۔

تب گھٹن اُس کی رُوح میں سرایت کر گئی!

وہ لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں سے باہر آیا۔ پلاٹ کی مُردہ گھاس اُس کے قدموں تلے چُرمُر ہو کر رہ گئی۔ درختوں کے پتّے مُردہ ہو کر شاخوں پر لٹک گئے تھے۔ اَور کسی درخت پر کوئی پرندہ موجود نہیں تھا۔ اُس بستی کی سڑکیں خالی تھیں اَور اُن پر مُردہ جنگل کا مُہیب سنّاٹا طاری ہو گیا تھا۔

اُن پر اَبر نے سایہ کیا۔ غنیمت سمجھ کر سب اُس کے نیچے جمع ہو گئے۔

تب اُس نے دیکھا کہ بستی کے سارے لوگ گھبرا کر تہ خانوں سے نکلے اَور میدانوں میں اَور سڑکوں پر آ گئے۔ اُن کے مُنہ کھلے تھے اَور اُن کے ہاتھ گلوں پر تھے۔ اُن کی نگاہیں آسماں کی طرف لگی تھیں جہاں اَبر گہرا ہو رہا تھا۔

پھر اُس سے آگ برسنے لگی...... سب کو جلا دیا۔

نہیں ...... اِس اَبر سے آگ نہیں برسے گی۔ آگ برسی تو ہم سب جل کر بھسم ہو جائیں گے۔

بے شک یہ بہت بڑا عذاب ہوگا لیکن آگ ہمارے لیے نجات بن جائے گی ......

ایک لمحے کا عذاب ...... اَبد تک کی نجات ...... نہیں ......

یہ تو ایک بڑے دِن کا عذاب ہے جو صدیوں پر محیط ہو جائے گا!

☆☆☆

یومُ الظُلّہ : سائبان والا دِن

زرد پہاڑ

اُس چوک پر پہنچتے ہی لمحہ، دو۲ دھاروں میں بٹ گیا۔

دھارے اُلٹی سمت میں بہنے لگے۔ وہ ہَیولا جو ازل سے اُس کے ذہن کے اُفق پر مُرتسم تھا، یک دم جدا ہُوا اَور زرد پہاڑ بن گیا۔ ایک دھارا زرد پہاڑ سے دُور ہٹتا گیا۔ دُوسرا دھارا اُسے زرد پہاڑ کی طرف کھینچنے لگا اَور ہجوم چوک پر رُکا کھڑا تھا کیوں کہ لال بتّی اُس کا راستہ روکے ہُوئے تھی۔

ناگاہ زرد پہاڑ کی چوٹی سے ایک نِدا آئی:

یا اخی! یا اخی!

سڑک کے پار سے ایک لمبا سائرن ہُوا۔ سبز بتّی جلی اَور ہجُوم بے تاب ہو کر چوک عُبُور کرنے لگا۔ تب دو۲ دھارے اچانک مِل گئے۔ زرد پہاڑ نظروں سے اچانک اوجھل ہو گیا۔ دُھوپ میں ڈھلے ہوئے زرد پتھروں کے سِوا اَب اَور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

دیکھتے نہیں آپ؟ لال سگنل ہو گیا ہے!

وہ اِس تحدید پر عین چوراہے میں رُک گیا۔ اُس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے سڑک کے پار کا منظر دیکھا۔ اُونچی اُونچی چھتوں والی ہَیبت ناک عمارتوں نے ہجوم کو اَپنے اَندر جذب کر لیا تھا۔ گڑڑ...... گڑڑ...... مشینوں کے گھومتے ہُوئے پہیوں کی آواز اُس کے کانوں میں آئی تو اُس نے کہا:

اگر میں نے یہ چوک عبور نہ کیا تو پھاٹک بند ہو جائے گا اَور میں اِدھر رہ جاؤں گا!

جب سبز سگنل ہُوا، آپ فُٹ پاتھ پر کھڑے رہے اَور لال سگنل پر آپ نے چوک عبور کرنا چاہا۔ اَپنی جان کی پروا نہیں تو کم از کم ٹریفک میں تو خلل نہ ڈالیے!

یہ کوئی پاگل ہے۔

شکل سے تو اَیسا معلوم نہیں ہوتا۔

جب سبز بتّی ہُوئی تھی تو وہ میرے پاس کھڑا تھا۔

پھر کیا ہُوا؟

ہونا کیا تھا' میں نے دیکھا کہ وہ خلا میں گھور رہا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کسی نظر نہ آنے والی چیز کو دیکھ رہا ہے۔

رات بھر جاگا ہوگا۔ اَب عین چوراہے میں اُسے نیند آگئی ہوگی۔

جی نہیں وہ جاگ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اُس کی نظریں دُور اُفق پر لگی تھیں۔ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ کم از کم مجھے تو یُوں محسوس ہُوا جیسے اُس کا جسم اِس دُنیا میں ہو' اُس کی رُوح اِس دُنیا میں موجود نہ ہو۔

....

وہ ایک بیمار سی لڑکی تھی۔ وہ چوک سے اُس طرف اُسے فٹ پاتھ پر اکثر نظر آیا کرتی تھی۔ وہ ہجوم سے الگ تھلک نظر آتی۔ سر جُھکا کر کھڑی رہتی تھی۔ اُس کے ہاتھ میں ایک ننھا سا بریف کیس ہوتا۔ ہجوم کا ہر شخص اُس پر ایک نظر ضرور ڈالتا۔ وہ اُن کی نظروں سے یُوں بچتی جیسے یہ زہر میں بجھے ہُوئے تیر ہوں۔ پر دیکھنے والا بھی مجبور تھا۔ اُس کے زرد زرد بیمار چہرے پر ایسی کیفیّت تھی جو ہر نظر کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے...... ایک جستجو ایک جائزے کے لیے کیوں کہ یہ چہرہ ہزاروں میں منفرد تھا اور چہروں کے ہجوم میں کوئی کوئی چہرہ ایسا اُبھرتا ہے جو تجسّس بھری نظروں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے۔

پھر ایک دِن جب لمحے کا دھارا دو۲ حصوں میں بٹنے والا تھا' وہ فُٹ پاتھ پر اُس کے قریب آ کر رُک گئی۔ چوک پر ہجوم بے تاب کھڑا تھا۔ لمحہ دو۲ حصوں میں بٹ گیا۔ زرد پہاڑ فضا کا سینہ چیر کر اُبھرا۔ اُس کی ہر دیوار آسمان سے لگ گئی۔

اِتنے میں ایک آواز اُس پہاڑ کی طرف سے آئی:

یا اَخی! یا اَخی!

ہر ایک نے یہی سمجھا کہ "کوہِ ندا" سے اُس کی طلبی ہُوئی ہے۔ چوک کی سبز بتّی روشن ہُوئی تو ہجوم زرد پہاڑ کی سربہ فلک چوٹیوں کی طرف رواں دواں ہوگیا۔ لیکن اُس کے قدم زمین سے چمٹے رہے۔ جب تلک کوہِ ندا سے طلبی نہ ہو' اُس کے قدم زمین سے آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔ ہجوم نے چوک عبور کیا تو زرد پہاڑ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ابھی لمحہ گزرا نہیں تھا کہ کھَٹ سے سُرخ بتّی روشن ہوگئی۔ اُس نے ایک قدم بڑھانا چاہا تو زرد چہرے والی بیمار سی لڑکی نے کہا:

رُک جایئے!

وہ رُک گیا۔

معاف کیجیے' ابھی سبز بتّی روشن ہوگی۔ پھر ہم دونوں چوک عبور کرلیں گے!

اُس لڑکی نے جھکی جھکی آنکھیں اُٹھا کر اُس کے چہرے کا اُڑتا سا جائزہ لیا۔

یہ خواب آلود بیمار سی آنکھیں تھیں۔ پر اُن سے ہم دردی اَور شفقت کی جو پھوار برسی تھی، اُس نے اُس کی رُوح کو دھو کر صاف و مُنزّہ کر دیا تھا۔

اُن دونوں نے پہلو بہ پہلو چوک کو عبور کیا۔ اُس نقطے پر، جہاں اُن کے رستے جُدا ہوتے تھے، اُس نے پُوچھنا چاہا: ''کیا آپ بھی زرد پہاڑ سے آنے والی ندا کو سنتی ہیں؟ کیا آپ کو زرد پہاڑ کا راز معلوم ہے؟''

پھر اُس نے سوچا: ''مجھے یہ راز اَپنے طور پر معلوم ہونا چاہیے!''

وہ لڑکی خاموشی سے اَپنی راہ پر چلی گئی۔

یہ لڑکی کون ہے یار؟

مجھے تو معلوم نہیں۔

فٹ پاتھ پر چلتی ہے تو کسی کو نہیں دیکھتی۔

بیمار بیمار سی معلوم ہوتی ہے۔

مجھے حُسنِ بیمار میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں کتنی اُداس ہیں! یہی اُن کی کشش کا راز ہے۔

پھر کرو پیچھا اُس کا! کبھی تو اُسے دفتر سے دیر ہوگی یا گھر جانے کی جلدی ہوگی، کار پر لِفٹ کی پیش کش کر دینا!

نہیں...... وہ بدک جائے گی۔ یُوں وہ کسی فیکٹری میں ٹائپسٹ ہوگی۔ کبھی پتا چل ہی جائے گا۔ وہ اُس کے ساتھ دُوسرا کون تھا؟

کل والا فلسفی...... پہچان نہیں سکے تم؟

کبھی کسی ٹریفک کے حادِثے کا شکار ہو جائے گا۔

تمھیں اِس سے کیا؟

ہاں مجھے اِس سے کیا!

....

بیٹی، جاگ رہی ہو؟

جی ہاں، اَبّا جان!

آج چھت پر لے چلو گی مجھے؟

آپ بیمار ہیں۔ اِتنی سیڑھیاں چڑھ کر آپ تھک جائیں گے۔

مدّت سے مَیں نے کوہِ ندا کو آفتاب کی سُرخ کِرنوں سے جنم لیتے نہیں دیکھا۔

کوہِ ندا؟......

اُس کی کٹوراسی آنکھیں جن میں بیماری کی زردی جِھل مِلا رہی تھی، حیران ہو گئیں۔

کوہِ ندا وہ ہے جس کے قلعے کی ہر دیوار آسماں سے لگ رہی ہے اور اُس سے خود بہ خود آواز آتی ہے۔ کچھ لوگ اِسے "دِن کا زرد پہاڑ" کہتے ہیں۔ میں وقت کا حاتم ہُوں، پر ابھی تک اِس کا راز نہیں پا سکا۔

ابّا جان! یہ آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں؟

زرد پہاڑ سے کبھی کبھار کسی کی طلبی ہوتی ہے۔ آواز سب سنتے ہیں، پر ہم اِس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ اکیلا اُس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر غائب ہو جاتا ہے۔ اُدھر کا حال کسی کو معلوم نہیں بیٹی! مجھے چھت پر لے چلو گی؟ شاید وقت کے اِس حاتم کو آج کوہِ ندا سے بُلاوا آجائے!

بیمار جوانی نے بڑھاپے کا ہاتھ پکڑا کیوں کہ وُہی اُس کا واحِد سہارا تھی۔ بیمار آنکھوں کے کنول، شبنم سے لبریز تھے۔ چھت پر صبح کا دُھندلا اُجالا تھا مشرق کا دامن لرزا۔ ایک آتشیں تیر چلا اور مشرق کے دامن میں آگ لگ گئی۔ تب سُورج نکلا۔ بڑھاپے کے ہونٹ کانپے:

مجھے نیچے لے چلو بیٹی! ابھی میری طلبی نہیں ہُوئی۔

بیمار جوانی بڑھاپے کا ہاتھ پکڑ کر اُسے نیچے اُتار لائی۔

بیٹی! تُو جب شام کو آتی ہے تو تھک کر چُور ہوتی ہے، پھر بھی تجھے کھانا پکانا پڑتا ہے۔ چھوٹے بھائیوں کی دیکھ بھال کرنی ہوتی ہے۔ تیری تنخواہ سے دو وقت کی روٹی مشکل سے چلتی ہے۔ تُو میرے بڑھاپے کو کب تک سہارا دیتی رہے گی...... مجھے میرے حال پر چھوڑ دو! اپنی تنخواہ کا وہ حصہ جو تم میرے بیمار بڑھاپے کی نذر کر دیتی ہو، اُسے اپنے آپ پر صَرف کرو!

نہیں ابّا۔

....

آپ پھر رُکی رہیں؟

اُس نے پوچھا۔

جی رش بہت زیادہ تھا۔ میں نے چاہا کہ ہجوم گزر جائے تو چوک عبور کروں۔

کوہِ ندا سے آنے والی آواز کو آپ نے بھی سُنا؟

کوہِ ندا؟

وہ لڑکی حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔

جی ہاں...... دِن کا زرد پہاڑ! وہ ابھی اُفق کے کِناروں سے اُبھرا تھا۔

دِن کا زرد پہاڑ؟

لڑکی نے حیرت سے دُہرا کر پُوچھا۔

میں اُس لمحے اُسے ہر روز اُبھرتا ہُوا دیکھتا ہُوں۔

آپ نے وہ آواز سنی؟

میں ہر روز آواز سنتا ہُوں۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ آواز اُس کے لیے ہے۔ جبھی تو سارا ہجوم اُس کی طرف لپک اُٹھتا ہے۔ اب کون جانے کہ اِتنے بڑے شہر میں وہ آواز کس کے لیے تھی اَور کس کے لیے آئی تھی اَور کون اُس کی چوٹی پر پہنچ کر دُوسری طرف گیا تھا! ہجوم اُس پہاڑ تلے پہنچتا ہے تو پہاڑ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے!

اَور آپ؟

میں نے جب بھی آواز سنی' لال بتّی نے میرا راستہ روک لیا۔ ایک دِن آئے گا کہ میں لال بتّی کی پروا نہیں کروں گا۔ اُدھر کی طلب دھیرے دھیرے میرے خون میں رَچ بس رہی ہے۔

وہ پہاڑ مجھے تو نظر نہیں آتا۔

آپ اُسے ہر روز دیکھتی ہیں' پر وہ آپ کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔

میں نہیں سمجھی۔

میں بھی نہیں جانتا۔ ایک لمحہ دو دھاروں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک دھارا کوہِ ندا سے اُلٹی سمت میں چلتا ہے۔ دُوسرا اُس کی سمت سے بہتا ہے۔ وہ لمحہ آئے گا تو......

ایک کار اُن کے قریب آ کر فٹ پاتھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

خاتون' آپ کس فلسفی سے اُلجھ گئیں؟

ایک اِنتہائی مہذّب آواز نے کہا۔

آپ کون ہیں؟

میں راہ گیر ہُوں۔ اِس فلسفی کو روز فٹ پاتھ پر دیکھتا ہُوں۔ یہ دُوسروں کو گمراہ کرتا ہے!

مجھے میرے حال پر چھوڑیے۔ شکریہ!

میں دیکھتا ہُوں کہ آپ بیمار ہیں' پھر بھی آپ کام کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی اُنگلیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ٹائپ کرتی ہیں۔ ٹائپ کرنے سے پھیپھڑے کمزور ہو جاتے ہیں۔ یُوں بھی آپ اچھی خوراک نہ ملنے کی وجہ سے خون کی کمی میں مبتلا ہیں۔ میرا مشورہ ہے......

مجھے آپ کا مشورہ درکار نہیں۔ شکریہ!

پھر بھی کبھی ضرورت محسوس ہو تو مَیں اِس سامنے کے کونے میں ہر روز کار کھڑی کر کے آپ کا پانچ منٹ تک اِنتظار کیا کروں گا۔ میں مشورہ دینے میں صبر سے کام لینے کا عادی ہُوں۔

اُس لڑکی نے دونوں کان بند کر کے کہا:

نہیں...... نہیں...... مجھے آپ کا مشورہ درکار نہیں۔

یہ کون تھا؟

اُس نے لڑکی سے پُوچھا۔

ایک راہ گیر......

معلوم ہوتا ہے، اِسے ابھی زرد پہاڑ کا نظارہ نصیب نہیں ہُوا۔

سبز بتّی ہو گئی ہے!

....

ابّا جان، زرد پہاڑ کے اُس طرف کیا ہے؟

اُس نے اچانک سوال کیا۔

میں اِس راز سے واقف نہیں ہُوں بیٹی!

اُس دِن آپ کہہ رہے تھے کہ آپ وقت کے حاتِم ہیں۔

میں وقت کا حاتِم ہُوں۔ ہر شخص وقت کا حاتِم ہے۔ پر جب تک اُس کی ذاتِ دِگر کی کوہِ ندا سے طلبی نہ ہو، وہ اِس کے راز سے واقف نہیں ہو سکتا۔

وہ ذاتِ دِگر کون سی ہے؟

مجھے اِس کا شعور نہیں ہے۔

کسی کو اِس کا شعور ہُوا؟

کہتے ہیں کہ یمن کے ایک شہزادے حاتم کو ہُوا۔ وہ کوہِ ندا کی تلاش میں اُس کے دامن تک پہنچا تو اُسے اپنی ذاتِ دِگر مل گئی...... داستانوں میں یُوں آیا ہے! غرض چھ[۶] مہینے حاتِم کو اُس شہر میں گزر گئے اور اس عرصے میں اِس طرح سے پندرہ[۱۵] آدمی اُس پہاڑ کی طرف گئے اور پھر نہ پھِرے۔ اِتفاقاً ایک شخص حاتم نامی وہاں تھا۔ حاتم میں اور اُس میں نہایت دوستی تھی اور محبّت از بس کہ ہو گئی تھی۔ اِس ڈھب سے وہ دونوں دِن رات ایک جگہ رہتے تھے......

پھر کیا ہُوا؟

اُس حاتم کو جو اُس کی ذاتِ دِگر تھا، کوہِ ندا کے قلعے سے بلاوا آیا۔ وہ چوٹی کی طرف لپکا۔ تب حاتم اپنے جی میں کہنے لگا کہ یہ بھی اُس طرف چلا جائے گا۔ افسوس ہے کہ مجھ کو اِس سے محبّت و اُلفت بہت سی ہو گئی تھی۔ اَب یہ بھی جُدا ہوتا ہے، میں اِسے ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ اِس بات کو ٹھہرا کر کمر کَس کر باندھی اور اُس کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی طرف دوڑا۔ دونوں گرتے پڑتے پہاڑ کے اُوپر جا پہنچے۔

اُس کے باپ نے رُک کر اُس پر نظر ڈالی۔ بیمار لڑکی کی آنکھوں کے کنول حیرت کی جھیل میں ڈوب ڈوب کر اُبھر رہے تھے۔

پھر کیا ہُوا؟

لڑکی نے پوچھا۔

بوڑھے باپ کو اُس کی آواز بڑی پُر اَسرار سی محسوس ہُوئی...... کسی اَن جانے سفر پر روانہ ہونے والے مسافر کی آواز جس کی نظروں کے سامنے عجائبات کی کوئی کھڑکی ذرا سی وا ہو گئی ہو!

جوں ہی وہ نزدیک قلعے کے گئے' ایک کھڑکی دکھائی دی۔ یہ دونوں لپٹے لپٹائے اُس کے اندر چلے گئے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہُوئے۔ کھڑکی سے آگے' محلّہ خموشاں تھا۔ ایک سبزہ زار نظر پڑا کہ گویا فرشِ زمرّدی چار طرف بچھا ہے۔ پر تھوڑی سی زمین اُس میں خالی تھی۔ وہ جوان اُس پر پاؤں رکھنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی جھٹ گر پڑا۔ زمین تڑق گئی۔ وہ جوان اُس میں سما گیا۔ دوں ہی وہ جگہ سبز ہو گئی۔

حاتم کی ذاتِ دِگر کو سبزہ زار میں جگہ مل گئی تو حاتم کا کیا بنا؟

لڑکی نے پوچھا۔

اَب اُس کی آواز میں فلسفۂ زندگی کے آسماں سے نازل ہونے والی ایک ننھّی مُنّی کِرن لرز رہی تھی۔

بوڑھا باپ بولا:

حاتم وہاں سے چل کر ایک پہاڑ' بلند عظیم الشّاں' کے نیچے جا پہنچا۔ جس پتھر کو اُٹھا کر دیکھا' اُس کے نیچے لہُو ہی پایا۔ بارہ۱۲ دِن کے بعد اُس پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا۔ ایک مَیدانِ کفِ دست دِکھائی دیا کہ وہاں کی خاک اَور جانور' چرندے پرندے بیر بہُوٹی سے لال ہو رہے ہیں۔ چھے۶ کوس اَور چلا تو دیکھتا ہے کہ ایک دریا لہُو کا لہریں مار رہا ہے۔ گھبرایا کہ اِس دریا سے کیوں کر پار ہُوں گا!

اُس نے دریا پار کر لیا؟

لڑکی نے پوچھا۔

بات دراصل یہ ہے کہ ذاتِ دِگر کی رہ نُمائی سے محروم ہو کر اِنسان پھر زرد پہاڑ کے اِس طرف آ جاتا ہے۔ اُس طرف جہاں کفِ دست مَیدان ہیں' لہُو کے دریا لہریں لیتے ہیں۔ سُراغِ راہ نہیں مِلتا؛ آب و دانے کا نشان بھی نہیں پایا جاتا، کوئی سایہ دار درخت بھی نہیں کہ جس کی چھاؤں تلے اِنسان چند لمحوں کے لیے سستا لے!

لڑکی کے زرد چہرے پر اُمّید کی جو کِرن ٹمٹمائی تھی' بُجھ گئی۔

بیٹی! جب کوہِ ندا سے طلبی ہو گی تو مَیں سبزہ زار کی تمنّا میں چوٹی عبور کر جاؤں گا۔ پھر وہ راز میرے ساتھ دفن ہو جائے گا کیوں کہ اُس وقت مَیں نہیں رہُوں گا۔ البتہ میں زرد پہاڑ کے اِس طرف کے راز سے پورا پورا آگاہ ہُوں!

اِس طرف کا راز کیا ہے؟

اِس طرف مشینوں کا شور ہے' پسینوں کی باس ہے' خُوں خوار بیماریوں کا تعفن ہے۔ سَڑے ہُوئے جسم اَور مضمحل اَعضا ہیں۔ باسی ہونٹ اَور مَسلے ہُوئے پھُول ہیں۔ کِرم خُوردہ لاشیں ہیں......

ابّا جان!......

وہ کانوں میں اُنگلیاں دے کر چیخی۔

میں بڑا ظالم ہُوں۔ میں نے زرد پہاڑ کے راز سے تجھے آگاہ کیوں کیا۔ میرا کرم خوردہ بڑھاپا' جوانی پر رحم کیوں نہ کھا سکا...... میں نے کیا کیا! میں نے وقت کا حاتم بن کر کوہِ ندا کے اَسرار سے پردہ کیوں اُٹھایا؟

اِس اَن جانی منزل کی طرف ہر ایک کو اَپنے اَپنے شعور کے مطابق خود بڑھنا چاہیے تھا۔

اَور دُوسرے دِن جب پَو پھٹی اَور صبح ہُوئی تو اُس بیمار سی لڑکی کے سامنے زرد پہاڑ سینہ تانے آکھڑا ہوا۔ اُس کے کنول نین صبح کی اُداس شبنم کے بجائے زرد دُھوپ کے کوڑیالے خوف سے لبریز ہو گئے۔

بیٹی، میں محسوس کر رہا ہُوں کہ مجھے بلاوا آنے والا ہے۔

اَیسا نہ کہیے ابّا جان!

....

ہجوم زرد پہاڑ سے آنے والی ندا کا اِنتظار کر رہا تھا کہ وہ دونوں فٹ پاتھ پر اکٹھے ہو گئے۔

آیئے! چوک عبور کر جائیں۔

لڑکی نے کہا۔

ایک قدم آگے بڑھ کر اُس نے چونکی ہُوئی آواز میں کہا:

ٹھہریے!

وہ ٹھہر گئی۔

اُس نے پوچھا:

آپ کی آنکھوں کی وہ بیمار سی اُداسی کیا ہُوئی؟

مجھے نہیں معلوم۔

میں نے ابھی ابھی آپ کی آنکھوں میں خوف کے کوڑیالے سانپ کو کُنڈلی مارے، بیٹھے ہُوئے دیکھا تھا۔

کیا میرا واہمہ تھا؟

نہیں۔

تو گویا آپ نے بھی زرد پہاڑ کا نظارہ کر لیا ہے؟

اُس لڑکی کے لب، بات کرنے کے لیے کھلے ہی تھے کہ نِدا آئی:

یا اَخی! یا اَخی!

ہجوم زرد پہاڑ کی طرف لپکا۔ لڑکی کے ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔

اُس نے سہم کر نوجوان کا ہاتھ تھام لیا اَور پوچھا:

یہ نِدا کس کے لیے تھی؟

میں نہیں جانتا۔ اِتنے بڑے ہجوم میں سے مَیں اُسے کیسے پہچان سکوں؟

میں نے اِس نِدا کی کپکپاہٹ میں ایک ہیُولے کو دیکھا۔ وہ ہجوم میں کھڑا تھا۔ جب نِدا آئی تو اُس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ زرد پہاڑ کی طرف لپکا۔ وہ کون تھا؟

میں نے اُسے نہیں دیکھا۔ کوئی وقت کا حاتم ہو گا۔

اَب مَیں اُسے پہچان گئی ہُوں۔

وہ کون تھا؟

وہی جو مدّتوں سے زرد پہاڑ کی چوٹی کے اُس طرف جانے کے لیے بیتاب تھا۔ آج صبح صبح اُس نے مجھ سے کہا تھا: ''بیٹی مَیں محسوس کر رہا ہُوں، آج مجھے کوہِ ندا سے بلاوا آنے والا ہے۔''

پھر تو یہ نِدا اُسی کے لیے تھی۔

جی ہاں! آج مَیں چوک عبور نہیں کروں گی۔ آپ جایئے!

وہ لڑکی فٹ پاتھ پر مُڑ گئی۔ لال بتّی کے بعد ہَری بتّی ہُوئی۔ اُسے چوراہے کو عبور کرنے کا اِذن مل گیا تھا لیکن اُس کے قدم آگے نہ بڑھ سکے۔

وہ اُس لڑکی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

....

خاتون! آپ بہت پریشان ہیں۔

وہ خاموش رہی۔

آپ بہت جلدی میں ہیں۔ رُک جایئے!

نہیں!

اُس نے دھیمی آواز میں کہا۔

مجھے خدمت کا موقع دیجیے۔ دیکھیے! میری کار حاضر ہے۔ دُھوپ تیز ہے اور آپ کا گھر یہاں سے دُور ہے۔

دُور تو ہے......

اُس کے جلتے ہُوئے تلووں سے آواز آئی۔

پھر آیئے نا میری کار میں...... میں آپ کو گھر تک پہنچا دُوں!

ذرا رُک جایئے!

ایک آواز نے اُسے دُور سے پکارا۔

اِس فلسفی کی بات نہ سنیے خاتونِ مکرّم! یہ آپ کو باتوں میں اُلجھائے گا۔ یہ آپ کو منزل پر نہیں پہنچنے دے گا۔ آپ تھکی ہُوئی ہیں۔ فٹ پاتھ تپ رہا ہے۔ آپ کے تلوے جل رہے ہیں۔

ذرا رُک جایئے! میں آپ کا ساتھ دُوں گا۔ اِس سفر میں آپ کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ ابھی ابھی ایک لق و دق میدان آئے گا جہاں نہ سبزہ ہے نہ سایہ۔ پھر لہُو کا لہریں لیتا ہُوا دریا!

نوجوان بولا۔

میری کار بہت تیز رفتار ہے۔ میں اِسے سَو میل کی سپیڈ پر بھی چلا سکتا ہُوں۔ ایک منٹ کے اندر اندر......

لڑکی فٹ پاتھ پر رُک گئی۔

آپ کی کار لہُو کے دریا کو عبور کر لے گی؟

لڑکی نے بڑے سکون سے پوچھا۔

جی!.....کیا کہا آپ نے؟

زرد پہاڑ کی چوٹی سے اُس طرف لہُو کا دریا ہے۔

میں کسی زرد پہاڑ سے آگاہ نہیں ہُوں۔

میں نے ٹھیک کہا تھا نا! ابھی اِسے زرد پہاڑ کا نظارہ نصیب نہیں ہُوا۔

چپ رہو فلسفی کہیں کے! اِس لڑکی کو بہکا رہے ہو۔ خاتون! اِس کے فریب میں نہ آیئے گا۔ میں دیکھ رہا ہُوں، آپ بہت دُکھی ہیں۔ میں دُوسروں کے دُکھوں کو فوراً پہچان لیتا ہُوں۔ مجھ پر اِعتماد کیجیے، میں آپ کو سُکھ دے سکتا ہُوں!

لیکن لہُو کا دریا؟

لہو کا دریا.....کون سا لہُو کا دریا؟ آپ پر اِس فلسفی کا جادُو چل گیا ہے۔ یہاں کوئی لہُو کا دریا نہیں۔ میرے گھر تک جو سڑک جاتی ہے، وہ سیدھی اَور صاف ہے۔ اُس کے دونوں طرف یُوکلپٹس کا سایہ ہے۔ میرے پاس ائیر کنڈیشنڈ کوٹھی ہے۔ لان بڑا سَرسبز ہے۔ میرے ڈرائنگ رُوم میں بڑی خوب صُورت تصویریں ہیں۔ ہر تھکا ہُوا مُسافِر، ہر دُکھی رُوح یہاں آکر آرام وسُکھوں سے آشنا ہو جاتی ہے۔

لیکن میری منزل زرد پہاڑ کے اُس طرف ہے۔ وہاں لہو کا دریا لہریں لیتا ہے۔ کیا آپ وہاں تک میرا ساتھ دیں گے؟

میں.....نہیں تو.....پاگل لڑکی! تُو نے میرا بڑا وقت ضائع کیا۔ یہ پہلی بار ہے کہ میں نے یُوں اپنی ہم دردیوں کو پامال ہوتے دیکھا ہے۔ جاؤ، لہُو کے دریا میں ڈوب مَرو! مین.....میں.....

اُس نے غصے میں آکر کار سٹارٹ کی تو وہ ہَوا سے باتیں کرنے لگی۔

اَور لڑکی کی اُداس اَور خوف زدہ آنکھیں دِیے کی طرح ٹمٹما گئیں۔ تب اُداس آنکھوں نے اُس کی طرف دیکھا جو وقت کا حاتم تھا اَور کوہِ ندا کا راز پانے کے لیے اُس کا ساتھ دینے کو تیار تھا.....کوہِ ندا، جہاں سے ابھی وقت کے ایک حاتم کو بلاوا آیا تھا اَور وہ زرد پہاڑ کی چوٹی کو عبور کر گیا تھا۔ کوہِ ندا کے اُس طرف سبزہ زار تھا جس کے ایک خالی قلعے میں وہ سما گیا تھا اَور اُس پر زمَرّدیں سبزہ اگ آیا تھا اَور اُس کے آگے لہُو کا دریا.....لڑکی کانپ گئی، اُس کا رنگ زرد پڑ گیا! وہ آگے بڑھا۔ اُس نے لڑکی کا ہاتھ تھام لینا چاہا تھا کہ لمحہ دو۲ دھاروں میں بٹ گیا۔

....

زرد پہاڑ فضا کا سینہ چیر کر بلند ہُوا۔

وہ رُک گیا۔ اُس نے کہا:

ہم آج سے اپنا سفر شروع کر دیں گے ...... ان جانی منزل کی طرف۔ آپ میرا ساتھ دیں گی نا!

لڑکی نے چند لمحوں تک کوئی جواب نہ دیا تو اُس نے یاس بھری آواز میں کہا:

یہ سفر ہر ایک کو اکیلے میں طے کرنا ہوتا ہے۔

نہیں ......

لڑکی نے دھیمی آواز میں کہا۔

نہیں ......

اُس نے لڑکی کی بات کو دُہرایا۔

یہ سفر اکیلے میں طے نہیں ہوگا۔ اِس کے لیے ذاتِ دِگر کی رہ نمائی درکار ہے۔

ذاتِ دِگر؟

اُس نے لڑکی کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

اُداس چہرہ، آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہُوا۔ زرد دُھوپ کا اَسرار گہرا ہو گیا۔ پھر اُسے یُوں لگا جیسے وہ فٹ پاتھ پر اکیلا ہو اور لڑکی کا سَراپا اُس کی رُوح میں سما گیا ہو۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے، زرد پہاڑ کے دامن میں کھڑے تھے۔

☆☆☆

پِک نِک

دریا کے کِنارے ایک تنہا سا کونا تلاش کر کے پِک نِک کا سامان رکھ دیا گیا۔ بہار کی وجہ سے زمین صحت مَند تھی اَور سبزے کی جوانی پر نکھار تھا۔ درختوں کے سایوں میں خنکی تھی، حالاں کہ دُھوپ میں تیز چمک تھی اَور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ آج چھٹی کا دِن نہیں تھا اَور دریا کے کِنارے لوگوں کا ہجوم نہیں تھا۔

وہ ایک مختصر سا کنبہ تھا۔ ڈیڈی، ممّی، دو بیٹے اَور ایک بیٹی...... بیٹی دونوں بیٹوں میں عُمر سے بڑی تھی اَور بڑی معلوم بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اُن لڑکیوں میں سے تھی جن کی خواب آلود معصومیت، بچپن اَور جوانی کی حَدوں کو جُدا نہیں ہونے دیتی۔ اُس کا لباس نہ کَسا کَسا تھا اَور نہ ڈِھیلا ڈھالا، تاہم اُس کے نیم پُختہ جسم پر یہ لباس خُوب سج رہا تھا۔ یہ کنُبہ ابھی مشرق اَور مغرب کے سنگم پر تھا کیوں کہ ممی نے اَپنے گھرے سیاہ بلکہ نیل گُوں بالوں کو گیند نما سٹائل میں ترتیب دے کر جدید فیشن کو اَپنا لیا تھا اَور لڑکی کے بالوں کے درمیان مانگ کی سیدھی لکیر تھی اَور ایک چوٹی اُس کی بھری بھری پُشت پر بَل کھا رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ایک سکون آمیز متانت تھی...... ایک رُوحانی سا سکون جیسے ابھی گلاب کی کلی کی دِھیمی خُوشبو بکھرنے نہ پائی ہو۔

سامنے دریا تھا، دریا میں پانی بہت کم تھا اَور وہ کِناروں سے دُور ہَٹ کر بہ رہا تھا۔ کِناروں اَور پانی کی پُرسکُوں سطح کے درمیان، ریت چمک رہی تھی۔ ابھی ہَوا کا کوئی تیز جھونکا نہیں آیا تھا اَور سطحِ آب پر کوئی لہر نہیں اُبھری تھی۔ درختوں کے سایے خاموش تھے۔ سبزہ خاموش تھا۔ کوئی پرندہ بھی تو نہیں چہچہا رہا تھا۔ ذرا دُور پُل پر سے گزرتی ہُوئی کاروں اَور بسوں کے ہَیُولے کچھ یُوں لگ رہے تھے جیسے ساکِن دُھوپ کی سکرین پر کچھ تصویریں بڑی نرم خرامی سے حرکت کر رہی ہوں۔

ممی کو کسی کا اِنتظار تھا کیوں کہ وہ بار بار دُھوپ کی سکرین پر ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی تھیں۔

راحت! تم نے منصور کو فون کر دیا تھا؟

ممی نے پُوچھا۔

جی ہاں!

کیا تمھیں یقین ہے؟

ممی نے پوچھا۔

جی!

پھر وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟ لڑکو! تم ذرا بھاگ کر سڑک تک چلے جاؤ۔ اُسے کیا پتا کہ ہم کہاں چھپ کر بیٹھے ہیں!

ممی اِس کنبے کی سردار تھیں کیوں کہ ڈیڈی خاموش طبع اِنسان معلوم ہوتے تھے۔ وہ ایک درخت کے ساتھ لگ کر دُور اُفق پر نظریں جمائے کھڑے تھے، گویا اُنھیں اَپنے ماحول سے قطعاً کوئی تعلق نہ ہو۔

لڑکے سیٹیاں بجاتے ہُوئے سڑک کی طرف لپکے۔

راحت!

ممی بولیں۔

جی!

منصور نے دیر کیوں کر دی؟

مجھے کیا معلوم؟

راحت بولی۔

تم نے فون بھی یُوں ہی سَرسَری طور پر کیا ہوگا۔ وہ بڑا احسّاس لڑکا ہے۔ شاید تمھارے لہجے کی سردی سے اُس کی خودداری کو ٹھیس لگی ہو!

مجھے کیا معلوم ممی!

راحت نے جواب دیا۔

میں جانتی ہُوں۔ مجھ پر اِعتماد کرو۔ وہ بڑا خوددار لڑکا ہے۔

ممی نے کہا۔

اَور اُس کے پاس رولز رائس ہے۔

راحت نے دِھیمے سے کہا اَور اُس کی آنکھوں میں ایک چمک تھِرک گئی۔ ممی کچھ حیران ہُوئیں۔ پھر مسکرا کر بولیں:

ہاں! ...... اَور "منصور منزل" کو دیکھ کر یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم محلوں کے مقابلے میں جھونپڑیوں میں رہتے ہوں۔

راحت نے کوئی جواب نہ دیا۔

راحت اگر یہ زمانہ پریوں کا ہوتا اور لال پری رستہ بھول کر منصور منزل کی طرف آنکلتی تو اُسے پرستان سمجھ لیتی۔

ممی! آپ اِس عُمر میں بھی بہت رُومانٹک ہیں۔

راحت نے کہا۔

اور اُس کی آنکھیں پہلی بار مسکرائیں اور یُوں معلوم ہُوا جیسے اُس کا سَراپا ایک نئے سانچے میں ڈھل گیا ہو، جیسے بادل چھائے ہوں، ...... گھرے بادل، اور ایک نرم خیز کِرن نے ایک کونے سے جھلک کر دم بھر میں سارے منظر کو بدل دیا ہو!

ممی بڑی خوش ہُوئیں۔ اُنھوں نے سوچا، راحت بہت اچھی لڑکی ہے۔ اِس کی طبیعت میں اِتنی مٹھاس ہے کہ مَیں نے اِس کی پیشانی پر کبھی بل نہیں دیکھا: اِتنی نرم رَو دِھیمی، تاہم ضرورت سے زیادہ متین؛ یہ کھیل کر ہنستی نہیں لیکن کبھی کبھار مسکراتی ہے تو یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے ...... یعنی ...... دُور سے پوم پوم کی آواز آئی اور اُن کے خیال کا سِلسِلہ ٹوٹ گیا۔ یہ منصور کی رولز رائس ہے ...... کتنی میٹھی آواز ہے اِس کی، جیسے راحت کی مسکراہٹ! ممی کی سوچ کا رُخ یکایک بدل گیا: اِس کار میں بیٹھ کر مجھے یُوں لگتا ہے جیسے زمین پر نہیں، آسمان پر اُڑی چلی جا رہی ہُوں؛ اور وہ ہماری پھٹیچر سی کار ...... یُوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمین پر نہیں، پاتال میں چل رہی ہو ...... اور راحت عجیب لڑکی ہے ...... اِس کی جگہ پر اگر مَیں ہوتی تو ...... اُن کے جسم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُنھوں نے راحت کے ڈیڈی کی طرف دیکھا جو درخت سے ٹیک لگائے گُم صُم کھڑے تھے۔ نہ جانے مَیں نے اِنھیں کیوں منتخب کر لیا؟ ...... پر مَیں نے اِنھیں کہاں چنا ...... وہ زمانہ اَور تھا؛ میر اپلّو اِن کے دامن سے بندھ گیا۔ وہی میری دُنیا میں سب سے پہلے آئے ......

منصور بھیّا آ گئے۔

اکرام نے جوشِ جذبات سے چیخ کر کہا۔

ممی بے اِختیار ہو کر آگے بڑھ گئیں۔

ڈیڈی اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلے۔

اور راحت اپنی دِھیمی مسکراہٹ کی آڑ لے کر دُھندلکوں میں کھو گئی۔

پھر کسی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

راحت!

وہ چَونک گئی۔ اُس نے منصور کو دیکھا اور ذرا سا مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو:

میں نے تمھیں پہچان لیا۔

تم نے فون کیا اَور دیکھو مَیں پہنچ گیا۔ ڈیڈی بڑے خوف ناک قسم کے باس ہیں اَور آج چھٹی بھی نہیں تھی۔ کام کا رَش بھی تھا۔

شکریہ!

تم نے بڑی اچھی جگہ کا اِنتخاب کیا ہے...... سکون اَور تنہائی۔

مجھے خوشی ہے کہ آپ کو یہ جگہ پسند آئی۔

آو' ذرا درختوں کے اُس جُھنڈ کی طرف چلیں!

چلیے!

موسم کتنا پیارا ہے...... یہاں آکر معلوم ہُوا کہ بہار آئی ہُوئی ہے۔

ممی جب کبھی منصور منزل سے آتی ہیں تو کہتی ہیں کہ بہار اگر آئی ہے تو منصور منزل کے چمن پر......

آنٹی ٹھیک کہتی ہیں۔ ہر طرف پھُول کِھلے ہیں۔ تم کبھی منصور منزل آو تو سہی' چاندنی رات میں فوارے کے پاس بیٹھ کر پھُولوں کی بہار دیکھنا!

لیکن آپ ابھی ابھی کہہ رہے تھے کہ یہاں آکر معلوم ہُوا' بہار آئی ہُوئی ہے!

منصور نے قہقہہ لگایا۔

پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ بہار اگر آئی ہے تو منصور منزل پر لیکن اب یہاں آکر میرا خیال بدل گیا ہے۔

گفتگو کا ایک موضوع ختم ہو گیا تو راحت اَپنے آپ میں ڈوب گئی!

منصور بھی سوچ رہا تھا کہ اَب کس موضوع پر بات کی جائے! وہ ایک معمولی شکل وصُورت کا نوجوان تھا جس نے باقاعدہ ٹینس کھیل کر اَپنے جسم کو' جو فربہی کی طرف مائل تھا' قابُو میں رکھا ہُوا تھا۔ اُس کے کپڑے قیمتی تھے لیکن اُن کے رنگ اَور قطع میں شوخی اَور تیزی نہیں تھی اَور سوچتے سوچتے اُس کی پیشانی پر چند شکنیں نمودار ہو گئی تھیں جن کی وجہ سے اُس کے چہرے پر یک گُونہ وَقار پَیدا ہو گیا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ سبزہ خنک تھا اَور سَردی کی ایک لہر دھیرے دھیرے اُن کے احساس میں رَچ رہی تھی۔ یکایک وہ جُھنڈ میں داخل ہو گئے۔ یہاں پرندے دِھیمی دِھیمی آوازوں میں چہچہا رہے تھے اَور سایوں کا طلسم دُھوپ کی لرزِش میں رَچ رہا تھا۔

راحت! یہاں سبزے پر بیٹھ جائیں؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم وہ سبزے کے نرم فرش پر بیٹھ چکے تھے۔

راحت!

منصور نے کہا۔

کہیے!

کیا کہوں؟ میں کہنے اور نہ کہنے کی منزل پر آ کر رُک گیا ہوں!

منصور نے کہا۔

یہ کون سی منزل ہے؟

راحت نے سوچا۔

زندگی عجب گورکھ دھندا ہے۔ میں وہ بات کیوں نہیں کہہ سکتا جو میرے نطق پر دستک دے رہی ہے!

منصور نے کہا۔

آپ کے پاس رولز رائس بھی تو ہے۔

راحت کی آنکھ کے اُفق پر مسکراہٹ کا ایک ننھا سا تارا ٹمٹمایا۔

رولز رائس ...... ہے تو سہی ...... لیکن ......

منصور حیران ہو کر اپنی بات ختم نہ کر سکا۔

پھر آپ کہنے نہ کہنے کی منزل پر کیوں رُک گئے؟

راحت بولی۔

میں تمھاری بات نہیں سمجھا راحت!

امّی رولز رائس کی ہر وقت تعریف کرتی رہتی ہیں۔

ہاں بڑی اچھی کار ہے۔

امّی کہتی ہیں کہ یہ کار ہوا میں تیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔

منصور کھِل کھِلا کر ہنسا:

میں تو زمین پر رہتا ہوں راحت! ہوا میں تیر کر کیسے خوش رہ سکتا ہوں!

اگر پرستان کوئی خیالی چیز نہ ہوتا تو کوئی لال پری آپ کے محل پر پرستان کا دھوکا کھا جاتی۔

بڑا اچھا خیال ہے۔

منصور نے ہنس کر کہا۔

یہ بھی امّی کا خیال ہے۔

آنٹی ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟

منصور نے پُوچھا۔ اُس کی پیشانی پر غُصّے کا ہلکا سا غبار چھا گیا۔

راحت خاموش رہی۔

راحت! میں صرف منصور ہوں۔ میں رولز رائس اور پری محل سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ آنٹی نے کبھی میری بات بھی کی؟

نہیں تو......

پھر تو اپنی بات مجھے آپ ہی کرنی چاہیے اور میں تمھارے سامنے موجود ہوں' میں جو منصور ہوں!

راحت پھر بھی خاموش رہی تو منصور نے سوچا: ''نہیں تو...... میں ابھی اپنی زبان سے کہنے کے قابل نہیں ہُوا'' اور اپنی خاموشی میں خود گُم ہو گیا۔ راحت کے گوشہ دِل سے مسکراہٹ کی لطیف کِرن پھُوٹی جو ہونٹوں پر آئی تو اُس کا سَراپا بدل گیا۔ منصور حیران ہو گیا۔ حیرت کی دُھند میں اُس کا ہاتھ بڑھا اور اُس نے راحت کا ہاتھ اَپنے ہاتھ میں لے لیا۔ راحت نے ہاتھ نہ کھینچا حالاں کہ اُس پر خود سپردگی کی حالت بھی طاری نہ ہُوئی تھی۔ تاہم اُس کے ہاتھ میں ہلکا سا اِرتعاش تھا' جیسے سایے لرز رہے ہوں اور بہار کے سایوں میں اَن دیکھے پھُولوں کی خُوش بُو کانپ رہی ہو۔

وہ چند لمحوں بعد اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ وہ سب اُن کا اِنتظار کر رہے تھے...... ڈیڈی' ممی' اکرام اور اسلام۔ ممی پکنک لنچ کی ٹوکریاں سامنے رکھ کر بیٹھی تھیں۔ وہ آئے تو ممی بڑے عجیب انداز میں مسکرائیں۔ وہ دائرے میں اپنی اپنی جگہ پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے تو امّی نے ٹوکری سے بھُنے ہُوئے چُوزے نکالے۔ اُنھیں چھُری سے کاٹا اور پلیٹوں میں ڈال کر ایک ایک کی طرف پلیٹ بڑھا دی۔ ساتھ میں سینڈ وِچ تھے اور مچھلی کے کباب جو راحت نے تیار کیے تھے' اَب وہ زیادہ گرم نہیں رہے تھے؛ تاہم منصور نے اُن کی بہت تعریف کی۔ راحت بڑی آہستگی سے کھا رہی تھی؛ اُس کی عادت تھی کہ وہ بہت کم کھاتی اور آج تک اُس کی آنکھوں میں کسی نے بھُوک کی چمک نہ دیکھی تھی۔ ممی سارے کنبے میں جدید طرزِ زندگی کی سب سے بڑی مُوَیّد تھیں لیکن کسٹرڈ کے معاملے میں بڑی اولڈ فیشنڈ واقع ہُوئی تھیں۔ کسٹرڈ مٹّی کی اَن گھڑت پرچ نُما پیالیوں میں جمایا گیا تھا اور ایک کے اُوپر اُلٹی ہُوئی دُوسری مٹّی کی پلیٹ کچھ عجیب سی لگ رہی تھی' تاہم یہ بہت ٹھنڈا اور خوب جما ہُوا تھا اور اِس میں آگ میں پکی ہُوئی مٹی کی خُوش بُو رَچی ہُوئی تھی۔

ممی نے کہا:

بچّو' جاؤ کھیلو کُودو!

ایک ملّاح نے قریب آ کر جھجکتے جھجکتے کہا:

صاحب' کشتی کی سَیر ہو گی؟

دو کشتیاں لاؤ!

منصور بولا۔

ملاح بہت خوش ہُوا۔ اُس نے کہا:

آپ کِنارے پر آیئے، میں کشتیاں لے آتا ہُوں!

منصور نے کہا:

اکرام اَور اِسلام ایک کشتی میں جائیں گے۔ میں اَور راحت دُوسری میں۔ کیوں آنٹی؟ اَور آپ؟

بھئی میں اَور ڈیڈی یہیں آرام کریں گے، تم جاوَ!

وہ چاروں دریا کی طرف گئے تو ممی نے کہا:

دیکھیے تو، راحت اَور منصور اکٹھے چلتے ہُوئے کتنے بھلے لگ رہے ہیں!

ہاں!

اُنھوں نے درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر سوئے ہُوئے انداز میں جواب دیا۔

میرا خیال ہے، منصور راحت کو پسند کرتا ہے۔

اگر اَیسا ہے تو بہت اچھی بات ہے۔ مجھے منصور پسند ہے۔

آپ نے کبھی جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اِن دو چار گھنٹوں میں آپ نے منصور سے ایک بات بھی تو نہیں کی۔

میں نے دِل ہی دِل میں اُسے خُوش آمدید تو کہا تھا۔

لیکن مُنہ سے بھی کچھ کہنے کی ضرورت تھی۔

کوئی موقع ہی نہیں آیا۔

آپ نہیں جانتے، منصور کے پیچھے کتنے لوگ پڑے ہیں! وہ ہاشمی اَور پراچے، وہ تو اُس کے آگے بچھے چلے جاتے ہیں۔ اُس دِن منصور منزل کی پارٹی میں غزالہ ہاشمی نے منصور کو اَپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ وہ اُس کے چُنگل سے نکلا تو نرگس پراچہ نے اُس پر قبضہ جما لیا اَور راحت ایک کونے میں کھڑی نہ جانے کیا سوچتی رہی! اُس کے ہونٹوں پر میں نے مسکراہٹ بھی نہ دیکھی جو خود بہ خود منصور کو اَپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ یہ سب لاتعلقی اُس نے آپ سے وَرثے میں پائی ہے۔

ممی کے لہجے میں کچھ خشونت آ گئی تھی۔

اَور ڈیڈی نے ایک آہ بھری اَور کہا:

کیا زمانہ آ گیا ہے! وہ پُرانے دِن ہوتے تو منصور کے ڈیڈی میرے پاس آتے اَور کہتے، ...... دیکھو مرزا، راحت کو میری بیٹی بنا دو!

اچھا ہُوا وہ دِن گزر گئے۔ اِتنا بُرا زمانہ تھا کہ لڑکیوں کو لڑکوں کے ہاتھوں بیچ دیا جاتا تھا۔ نہ پسند کا سوال نہ محبّت کا خیال!

اَور اَب بھی رولز رائس کاریں اَور منصور منزل کے پری محل' سارے سودے طے کرتے ہیں بیگم!

نہیں......

بیگم بولیں:

تم بہت پُرانے خیال کے آدمی ہو۔ اِس لیے سوسائٹی میں تم اپنا کوئی مقام نہ بنا سکے۔

مرزا جواب میں مسکرائے۔ ایسی مسکراہٹ جس میں نہ طنز تھی نہ نفرت...... بے تعلق سی مسکراہٹ......

بیگم مرزا کے چہرے پر غصے کی شکنیں اُبھریں اور آہستہ آہستہ اُس دھیمی مسکراہٹ کی ہلکی ہلکی لہروں میں جذب ہوگئیں۔ یہ مسکراہٹ اُن کے رُوئیں رُوئیں میں رچ کر اُنھیں عجیب سے کیف میں ڈبو گئی اور اُنھیں نیند آگئی۔

"تمھاری اِس مسکراہٹ نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا' ورنہ میرے ذہن میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے منصوبے تھے! تم یہ افیون جیسی مسکراہٹ کا حربہ لے کر پیدا نہ ہوتے تو مَیں سوسائٹی کے زینے پر تمھیں بہت اُونچا اُٹھالے جاتی...... رولز رائس کاریں...... پری محل......"

دریا کے پانی پر دُھوپ کی ساکن چادر بچھی ہُوئی تھی اور اُس میں دُھلے دُھلے آسمان کی بے داغ نیلاہٹیں جھلک رہی تھیں اور پانی کی سطح سے منعکس ہوتی ہُوئی تیز شعاعوں میں حِدّت نہیں تھی' بہار کی چمک دمک تھی۔ راحت نے گاگلز پہن لیے تھے اَور منظر پر نیلاہٹ چھاگئی تھی اَور چمک میں ایک عجیب سی نرمی آگئی تھی۔

منصور خود کشتی چلا رہا تھا۔ اُس نے قمیص کی آستینیں اُلٹ رکھی تھیں اور اُس کے بازوؤں کی مچھلیاں چپّوؤں کے ساتھ ساتھ حرکت کر رہی تھیں۔ چند لمحوں بعد وہ ایک ٹاپُو پر پہنچ گئے تھے۔ یہ ایک ننھا سا عارضی جزیرہ تھا جو برسات میں یقیناً پانی کی لہروں میں ڈوب کر مِٹ جانے والا تھا لیکن اَب یہ ایک حقیقت تھا...... خواب کی طرح اٹل حقیقت!

منصور نے کنارے کے ساتھ کشتی لگا دی تھی۔ اُس نے کہا تھا:

راحت اُترو!

راحت نے کنارے پر قدم رکھا تو کائنات کا اَسرار بدل گیا تھا۔ ٹاپُو میں کائی کے پَودے تھے اَور بہت گھنے بھی نہ تھے۔ البتہ اُن میں تازہ تازہ شباب کی لچک تھی۔ یہ پَودے قد آور بھی نہیں تھے۔ ان کے نیچے بُھربُھری مٹی تھی جس میں ریت مِلی تھی اَور ریت میں نمی تھی۔ کچھ بیلیں تھیں جو کائی کے پودوں سے لپٹی ہُوئی تھیں اَور اُن پر ننھے ننھے سفید پھُول لگے تھے۔ اَور پھُولوں کی کثرت بھی نہیں تھی' اِکّا دُکّا پھُول

جو اَپنے ماحول سے الگ الگ تھے۔ ٹاپو پر قدم رکھتے ہی راحت کو یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ اَپنی دُنیا سے کٹ گئی ہو اور نئی دُنیا میں وہ اکیلی بھی نہ ہو۔ یہاں کوئی آواز نہیں تھی۔ کوئی چڑیا بھی تو چوں چُوں نہیں کر رہی تھی اَور دُور کے لوگ ہیُولے بن گئے تھے ...... خوابوں کے ہیُولے! راحت نے سینڈل اُتار دیے۔ گیلی ریت نے اُس کے تلووں میں گُدگُدی کی اَور اُس کی آنکھیں مسکرا اُٹھیں اَور مسکراہٹ اُس کی آنکھوں کی خواب آلود چمک میں کھوگئی تھی۔ اُس نے گاگلز اُتار دیے تو بہار کی چمک، لہروں کا عکس لے کر لپکتے ہوئے آئی اَور ٹاپو پر ڈھلے ڈھلے آسماں کی نیلاہٹ اُتر آئی اَور کائی کی سبزیوں میں گھل مل کر ایک نئے رنگ کی تخلیق کر گئی ...... یہ نیا رنگ جس نے اُس کے اِحساس سے جنم لیا اَور تصوّر کے کینوس پر غیر مرئی تصویروں کے سانچے میں ڈھل گیا۔

پھر پُھول پر سے ایک تتلی اُڑی۔

وہ تتلی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگی۔ تتلی اُڑی اَور ٹاپو کے دُوسرے کِنارے پر پہنچ گئی اَور پانی کی چمکتی لکیر حائل ہُوئی تو وہ لَوٹ آئی اَور اُس کے پاس سے گزر کر ایک پھُول پر بیٹھ کر جھپکنے لگی۔ رنگ کے دھبّے دُھوپ میں اُڑنے لگے۔ راحت بڑی آہستگی سے وہاں پہنچی تو تتلی لپک کر اُونچا اُٹھ گئی۔ وہ پھر اُس کے پیچھے بھاگی اَور جب اُس کے قریب پہنچی تو پانی کی ساکن دُھوپ نے اُن دونوں کا راستہ روک لیا۔ آنکھ مچولی کا یہ کھیل بہت مزے دار تھا۔ اُن کی دُنیا کتنی چھوٹی سی تھی! ہر طرف پانی کی چادر حائل تھی۔ اَور اِس دُنیا کے باسی صرف دو تھے۔ وہ اَور رنگ کا ایک چھینٹا جو وُفورِ زندگی سے تھِرک رہا تھا۔ ایک بار اُس کا ہاتھ رنگ کے چھینٹے تک پہنچ چُکا تھا کہ پھر پانی کی لہر حائل ہوگئی اَور تتلی یک دم مُڑی۔ اُس نے اُس کے گِرد ایک دو چکّر کاٹے۔ راحت نے اَپنا ہاتھ پھیلا دیا اَور تتلی اُس کے ہاتھ کے گلاب پر آ بیٹھی اَور پَر جھپکنے لگی اَور وہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑی۔ منصور، جو ٹاپو کے وسط میں کھڑا اِس تماشے کو دیکھ رہا تھا، اِس قہقہے پر دم بہ خود رہ گیا۔ اِس قہقہے میں ایک نِرالا نغمہ تھا۔ یہ نغمہ اُس نے پہلے نہیں سُنا تھا، جیسے ساز کے تار پہلی بار جھنجھنائے ہوں۔

وہ آہستہ آہستہ راحت کے قریب پہنچا۔ اُس نے چاہا کہ راحت کے کان میں وہ بات کہہ دے جو اُس کے سازِ دِل میں مقیّد لَے بن کر تھرتھرا رہی تھی لیکن راحت اَپنے قہقہے کی بازگشت میں گم تھی اَور قہقہے کا نغمہ ہر طرف بکھرا ہُوا تھا اَور یکا یک منصور کو یُوں محسوس ہُوا کہ وہ اِس ماحول میں اجنبی ہے ...... تیسرا آدمی ...... اَور اُسے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ اُس ننھی سی دُنیا کا نغمہ منتشر کر دے اَور یہ خواب چکنا چُور ہو جائے!

وہ چپکے سے پیچھے ہٹ آیا اَور کشتی کے پاس راحت کا اِنتظار کرنے لگا۔ اکرام اَور اِسلام کشتی میں بیٹھے ہُوئے، جزیرے تک آ پہنچے۔

اکرام نے آواز دی:

راحت باجی ...... آؤ چلیں!

راحت چَونکی اَور لرزی۔ تِتلی پھر سے اُڑ گئی۔

اَور وہ کشتی کی طرف لَوٹ آئی۔

اَب اُس کے ہونٹوں پر وہ بے تعلق سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔

لیکن اُس کا چہرہ تَم تَما رہا تھا۔

....

ممی اَور ڈَیڈی اُن کے اِنتظار میں کھڑے تھے۔

ممی کے ہاتھوں میں پھلوں کی ٹوکری تھی۔

وہ کشتیوں سے اُتر کر سیدھا اُن کے پاس پہنچے۔ راحت کے چہرے پر جھلکتی ہُوئی سُرخی دیکھ کر ممی بہت خوش ہوئیں۔ ممی نے سب کو پَھل پیش کیے۔

ڈرائیور سامان لپیٹ چُکا تھا۔

پس خُوردے کے پاس ایک کُتّا بیٹھا ہڈّیاں چِچوڑ رہا تھا۔ ایک طرف ایک ٹھگنا سا لڑکا تھا۔ اُس کے سامنے مٹّی کی پِرچوں کا ڈھیر لگا تھا اَور مُرغ کے سینے اَور ٹانگوں کی ہڈیاں تھیں جن پر ابھی تک گوشت کے ریزے چِپکے ہُوئے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں مٹّی کی پِرچ تھی اَور اُس میں سے وہ کرید کرید کر کسٹرڈ نکال رہا تھا اَور وہ بڑا خُوش تھا کیوں کہ وہ اِتنے شاہانہ دسترخوان پر اکیلے بیٹھا تھا۔ اُس کا رنگ کوئلے کی طرح سیاہ تھا اَور اُس کی لال لال آنکھوں میں بُھوک کی حِرص آلود چمک بھی نہیں تھی ...... ایک عجیب سی سیر چشمی کیوں کہ وہ اِس سب مال پر بِلا شرکتِ غیرے قابض تھا!

اَور کُتّا اَپنے حصے پر مطمئن تھا۔

دونوں میں کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

راحت نے یہ منظر دیکھا تو اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اَور زردی جھلک اُٹھی۔

ڈَیڈی یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے لیکن راحت نے فوراً اُن کی طرف سے مُنہ پھیر لیا۔

ممی نے چہکتے ہُوئے کہا:

بچو، میرا خیال ہے کہ تم نے پک نک سے خوب لطف اُٹھایا ہوگا۔

ممی شکریہ!

اکرام اَور اِسلام پھل کھاتے ہُوئے بولے۔

منصور بیٹا تم؟

ممی نے پوچھا۔

میں بہت خوش ہُوں آنٹی!

راحت! راحت تم؟......

ممی نے پوچھا۔

ممی! وہ ٹاپو بہت خُوب صُورت تھا۔

راحت نے پُرسکوں لہجے میں کہا۔ منصور نے اُس کی آواز میں کچھ تبدیلی سی محسوس کی، جیسے کسی جھرنے کا رِستا ہُوا پانی ایک لحظے کے لیے رُک گیا ہو......صرف ایک لحظے کے لیے!

منصور کی رولز رائس میں راحت اَور ڈَیڈی پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔ ممی نے اِصرار کر کے اُنھیں رولز رائس میں بیٹھنے پر مجبور کیا تھا، شاید اِس لیے کہ وہ بھی زمین پر چلتی ہُوئی رولز رائس میں بیٹھ کر آسمان پر تیَرنے کا لطف اُٹھا لیں!

راحت بیٹی!

ڈَیڈی نے حسبِ معمول اُسے محبّت آمیز لہجے میں پکارا۔

جی ڈَیڈی!

کشتی کی سَیر خُوب رہی؟

وہ ٹاپو ایک ننھی سی دُنیا تھا۔ میں بڑی خوش تھی اَور میرے ہاتھ پر وہ تتلی آکر بیٹھ گئی تھی۔ ڈَیڈی!...... جیسے رنگ کا چھینٹا لرزتا کانپتا ہُوا۔

اَور تم وہاں اکیلی تھیں؟

نہیں ڈَیڈی!

نہیں......

ڈَیڈی یہ کہہ کر سوچ میں گم ہو گئے۔

وہ تتلی بھی تو میرے ساتھ تھی۔

اَور منصور؟......

ڈیڈی نے بے خیالی میں پوچھا اور پھر اُنھیں اپنی بھول پر افسوس ہُوا۔

منصور؟......ہاں......نہیں تو......

اور ڈیڈی نے دیکھا، راحت کی آنکھوں کے دونوں کونے بھیگ گئے ہیں اور اُس کی آواز میں آنسو کی ایک بُوند کپکپا رہی ہے۔

راحت!......

ڈیڈی دِھیمے سے بولے:

تم اپنی ممی کی باتوں کا کوئی خیال نہ کرو! اپنی خوشیوں کو سامنے رکھو، ہماری طرف سے کوئی مجبوری نہیں۔

نہیں ڈیڈی یہ بات نہیں تھی۔

راحت نے کہا۔

آنسو اُس کی پلکوں کو بھگو چکے تھے۔

پھر کیا بات تھی؟

ڈیڈی نے درد آمیز لہجے میں پوچھا۔

کچھ بھی نہیں ڈیڈی! شاید مَیں کسی بڑی خوشی کو برداشت کرنے کی......

ہو سکتا ہے......تم ٹھیک کہتی ہو راحت!

اُنھوں نے کہا اور اُن کی نگاہوں کے سامنے سارا منظر پھر گیا۔

بہار کی پُرسکوں دُھوپ......کشتی کی سَیر......سرسبز ٹاپو اور تتلی کے تعاقب میں راحت کی معصوم دَوڑ......جب وہ کشتی سے اُتری تھی تو اُس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا، پر جُوں ہی اُس کی نظر اُس کالے بھجنگ لڑکے پر پڑی جو مٹی کی پرچوں سے بچا کُھچا کسٹرڈ کرید رہا تھا اور چِچوڑی ہُوئی ہڈیوں کا ڈھیر اُس کے سامنے لگا تھا تو اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا......

راحت ایک حسّاس لڑکی ہے جو ابھی خوب صُورتی اور بدصُورتی کے پہلوؤں میں مفاہمت کا نقطہ تلاش نہیں کر سکی......یہ منزل آئی تو وہ اپنی ممی کی طرح رولز رائس اور پری محل سے آگے نہیں جا سکے گی......اور وہ کانپ گئے!

☆☆☆

ایک بُوند لہو کی

سنا ہے کہ ایران کی بلبل پھُولوں سے مخاطب ہو کر اپنا دردِ دل کہتی ہے تو شیراز کے حافظ' نغمہ سَرا ہو جاتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ یہی بلبل پھُولوں کی پتّیاں نوچتی ہے تو باغ باں' صیّاد بن جاتے ہیں اَور اَپنے قفس لے کر باغ میں آجاتے ہیں۔ اگر بلبل، قفس میں گرفتار ہونے سے اِنکار کر دے تو اُس کا آشیاں برباد کر دیتے ہیں۔ کبھی کبھار اَیسا بھی ہوتا ہے کہ بلبل، قفس رنگ بنتی ہے نہ آشیاں برباد ہوتی ہے لیکن آسماں کو اُس کی یہ سلامتی ایک آنکھ نہیں بھاتی اَور وہ اُس کے آشیاں پر بجلی گرا کر اُسے خاکِ سیاہ کر دیتا ہے۔

یہ سب شعر و شاعری کی باتیں ہیں۔

میں نے ایران کی بلبل دیکھی ہے نہ اُس کا آشیانہ۔ اُس کی نغمہ سَرائی سے بھی محظوظ ہونے کی خوش بختی نصیب نہیں ہُوئی۔ البتہ پاکستان کی بلبل کو اکثر دیکھا ہے اَور اُس کی نغمہ سَرائی سے بھی لطف اُٹھایا ہے لیکن اُسے پھُولوں سے ہم کلام ہوتے نہیں سُنا۔ اکثر اُسے کسی درخت کی شاخ پر بیٹھے دیکھا ہے۔ ممکن ہے کہ اُسے پھُولوں کا قُرب عزیز ہو لیکن میرے چلتے پھرتے مشاہدے نے اُسے پھُولوں پر منڈلاتے کبھی نہیں دیکھا۔ پاکستان کی اِس بلبل کو گُل دُم کہتے ہیں۔ ہمارے کالج کے لان میں جو درخت ہیں' اُن کے نیچے سے گزرتے ہُوئے کئی بار گُل دُم کے سیّال نغموں کی بارِش مجھ پر ہُوئی ہے۔

پچھلے مارچ کی بات ہے' میں لان کے ایک درخت کے نیچے بنچ پر بیٹھا تھا کہ میں نے اُس کی چہکار سنی۔ اُس درخت کی ہر شاخ ننھّے ننھّے کاسنی پھُولوں سے لدی پھندی تھی اَور کلیوں کا ایک ڈھیر میرے قدموں کے نیچے تھا۔ اُس چہکار پر کاسنی پھُولوں کی بارِش ہُوئی تو مَیں نے ایک طالبِ علم کو' جو ساتھ کے بنچ پر بیٹھا تھا' اپنے پاس بلایا اَور پُوچھا:

تم اُردو پڑھتے ہو؟

جی سَر! آپ ہی کی کلاس میں تو ہُوں۔

کبھی بلبل کا نغمہ سُنا؟

نہیں تو سَر۔

دیکھو، اُس درخت کی ایک شاخ پر ایک بلبل بیٹھی ہے! وہ ابھی گائے گی، تم خاموش بیٹھے رہو۔

طالبِ علم نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ یہ مسکراہٹ کچھ مشکوک سی تھی۔ اچانک شاخ سے نغمے کے قطرے ٹپکنے لگے۔ طالبِ علم نے شاخ کی طرف نظر اُٹھائی اور ہشت کی آواز مُنہ سے نکالی۔ گل دم پھُر سے اُڑ گئی۔ کچھ کلیاں گریں۔ طالبِ علم نے قہقہہ لگا کر کہا:

یہ چڑیا...... سَر! یہی وہ بلبل ہے، جس کی تعریف میں ہمارے شاعر رطبُ اللّساں ہیں اور جس کی وجہ سے ہمیں اشعار کی تشریح و توضیح میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا پڑتا ہے۔

اِسے گل دُم کہتے ہیں۔ یہ پرندوں کا مغنّی ہے۔ اِس کی دُم کے نیچے روپے کے برابر ایک گول دھبّا ہوتا ہے۔ اِس کے سَر پر کالے پَروں کی ایک کلغی سی ہوتی ہے۔ یہ بڑا بھولا بھالا، لااُبالی سا پرندہ ہے۔ اِس کی فطرت میں مغنّی اور شاعر کی سی بے نیازی ہوتی ہے۔ تم زوآلوجی پڑھتے ہو۔ کیا مجھے بتا سکتے ہو کہ اِس پرندے کا اصطلاحی نام کیا ہے، اور اِس کا تعلق پرندوں کی کس نسل سے ہے؟

میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو لڑکا مجھ سے ذرا دُور، ایک اَور بنچ پر بیٹھا، ایک کتاب کے مطالعے میں محو تھا۔ یہ موٹی سی کتاب تھی۔ میرا خیال ہے، یہ بائی آلوجی کی کتاب تھی جس کا ایک حصہ حیوانات اور پرندوں کے عادات و اَطوار کے لیے وقف ہے۔ اِس کتاب میں کسی مغنی پرندے کا نام شاید ہی درج ہو!

میں شاعر ہُوں نہ پرندوں کے علم کا ماہر!

تاہم مجھے کویل کی کُوک اور فاختہ کی کُوکُو نے اکثر بے چَین کر دیا ہے...... بے چَین نہیں، اُداس اور پژمُردہ سا! دونوں کے نغموں میں بڑی کسک ہے۔ جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے اور پرندوں کی دُنیا منقار زیرِ پَر ہو جاتی ہے تو کویل کوکتی ہے، نہ جانے کیوں! شاعر نے اِس پرندے کو بیمارِ محبّت کا نام دیا ہے۔ اُس کی کوک نے مجھے ایک بے نام سی آرزو میں مبتلا کیا ہے...... ایک آرزو جس کا کوئی مرکز، کوئی محور نہیں...... ایک عجیب سی محرومی کا احساس، جیسے یہ بے نام آرزو پوری نہ ہُوئی اور اُس کی حسرت دِل میں پھانس بن کر رہ گئی ہے اور مئی جُون کی تنوّر کی طرح گرم، جلتی بھُنتی لُو لگی دوپہروں میں کسی کیکری کی چھدری شاخوں میں جب کوئی فاختہ کوکو کرتی ہے تو اُس دوپہر کی پوری وحشت میرے دِل میں سما جاتی ہے۔ اُس لمحے، صرف اندر کی دُنیا ہی نہیں، باہر کی دُنیا بھی اپنی ہر معنویّت سے رِشتہ توڑ لیتی ہے۔

لیکن گل دُم کی چہکار نے مجھے ہمیشہ زندگی سے قریب تر کیا ہے! مجھے یُوں لگا جیسے شبنم کی بُوندیں ٹپک رہی ہوں اور دِل کی ظلمات میں آبِ حیات کا چشمہ پھُوٹ بہا ہو۔ مجھے کھوئی ہُوئی امنگیں، شور

کرتے سُنائی دیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اِس مغنی سے میری ملاقات بہت دیر سے ہُوئی۔ بچپن اور جوانی میں کویل کی کوک اور فاختہ کی کوکو نے نغمۂ گل دُم سے آشنائی کا موقع ہی نہ دیا۔ میں عنقا اور ہُما کی طرح بلبل کو بھی ایک فرضی پرندہ سمجھتا رہا۔ کسی جماعت کے اُردو نصاب میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناول *ابن الوقت* کا ایک اقتباس شامل تھا جس میں "اڈے پر گُل دُم" کی پھبتی استعمال ہُوئی تھی۔ اُستادِ مکرم نے گل دُم کی صرف اتنی تشریح کی تھی کہ یہ ایک قسم کی چڑیا ہے۔ اَب لاکھوں کروڑوں چڑیوں میں اُس چڑیا کو کون تلاش کرتا۔ کبھی کبھار سکول جاتے یا آتے وقت سیال کوٹ چھاؤنی کی صاف شفاف سڑکوں کے دو رویہ خوب صُورت درختوں میں چھپی ہُوئی چڑیوں کے بے ہنگم چہچہوں میں ایک اجنبی سا نغمہ بھی اُبھرتا۔ مگر اُس زمانے میں مجھے اُس نغمے کا عِرفان حاصل نہیں ہُوا تھا۔ سچ ہے کہ نقار خانے میں طُوطی کی آواز کون سُنتا ہے!

لیکن اِن دِنوں جہاں میں رہتا ہُوں، وہاں میری خوش قسمتی سے سامنے کے کوارٹروں میں ایک آم کا درخت ہے، ایک نیم کا اور ایک جامن کا۔ اِن دِنوں موسم بہار کے آخری دِن ہیں، جسم و جاں پر ایک عجیب سی کسل مندی کی کیفیت چھائی رہتی ہے۔ دِن طویل ہو رہا ہے اور رات چھوٹی ہوتے چلے جا رہی ہے۔ ابھی دِن اِتنا گرم نہیں ہُوا کہ دوپہر کو سونے کا جواز پیدا ہو سکے۔ جُوں ہی شام ہوتی ہے، آنکھیں مُندنا شروع ہو جاتی ہیں۔ میں صحن میں چار پائی بچھا لیتا ہُوں۔ بہت جلد رات کی فضا میں خُوش گوار ٹھنڈک رچ جاتی ہے اور ابھی آنکھ لگے چند لمحے ہی گزرتے ہیں کہ صبح کی اَذان ہو جاتی ہے۔ میں صبح کی تازہ ہوا سے محظوظ بھی ہوتا ہُوں اور اُس کے دوش پر اُڑنے والی ملکوتی آواز سے پریشان بھی۔ صبح خیزی کی خاندانی روایت، صدیوں سے خمیر میں رچی ہُوئی ہے۔ یہ روایت ضمیر کو کچوکے دیتی ہے اور جسم کہتا ہے کہ میں دن بھر کی مصروفیت میں بہت ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہُوا ہُوں، اِس لیے تم بھی سو جاؤ اور مجھے بھی تازہ دم ہونے کا موقع دو! ضمیر اور جسم میں ایک عرصے تک جنگ چھڑی رہتی ہے اور غنودگی کے عالم میں ضمیر کے کچوکوں کے باوجود جسم کبھی سوتا ہے اور کبھی جاگتا ہے۔ سوتے جاگتے میں اذان کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ پھر اِردگرد کے مُرغے اَذان دینا شروع کر دیتے ہیں اور جُوں ہی اُجالا پھیلتا ہے، سامنے کے ایک درخت پر گل دُم نغمہ سَرا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتی ہے: "دِن چڑھا، دِن چڑھا، دِن چڑھا" اور اِس کے ساتھ ہی پتّوں میں چھپی چڑیوں کی چہکار ایک مسلسل گونج کی صُورت اِختیار کر لیتی ہے۔ اِن گھریلو چڑیوں سے اللہ محفوظ رکھے، اِن کی چہکار کی گھمسن گھیریوں سے صحن میں سونے والوں کو پناہ کہاں ملتی ہے! اِس بے آہنگ

نغمے میں پرندوں کا مغنّی اپنی ایک اَور دُھن کا اضافہ کرتا ہے۔ وہ اِس والہانہ انداز سے گاتا ہے کہ چڑیوں کی چہکار پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ اِس دُھن کو مَیں کئی دنوں تک لفظوں کا رُوپ نہ دے سکا۔ پھر کچھ بے معنی سے الفاظ ایک راگنی کی تشکیل کر گئے: ''تھری فِفٹی ایٹ۔ تھری فِفٹی ایٹ۔ تھری فِفٹی ایٹ''۔ اِن الفاظ کا تعلق یقیناً میرے لاشعور سے ہے کیوں کہ گل دُم کی زبان نہ انگریزی ہے نہ اُردو۔ مزید کچھ دِن گزر گئے تو الفاظ انگریزی ہی کے رہے لیکن اُن کے معنی بدل گئے۔ اَب گل دُم جب یہ راگنی چھیڑتی ہے تو مَیں سمجھتا ہُوں کہ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے: ''لائف اِز سویٹ۔ لائف اِز سویٹ۔ لائف اِز سویٹ''۔ میں اُٹھ کر مصلّے پر بیٹھ جاتا ہُوں۔

میں نماز پڑھتا ہُوں اَور گل دُم، حمد گاتی ہے۔ پھر مشرق سے سُورج کی کِرن پھُوٹتی ہے اَور پتّوں میں چھپی چڑیاں پھُر پھُر اُڑتی ہیں اَور دانے دُنکے کی تلاش میں اِدھر اُدھر بکھر جاتی ہیں۔ گل دُم بھی خاموش ہو جاتی ہے۔ گھروں کی مُنڈیروں پر سے دُھوپ صحن میں اُترنے لگتی ہے۔ اِس وقت مجھے چائے کی طلب بے چین کر دیتی ہے۔ میں چائے کے لیے پکارتا ہُوں۔ خود اُٹھتا ہُوں اَور برآمدے میں پڑی تپائی کو اپنی چارپائی کے ساتھ رکھ لیتا ہُوں۔ گھر کا کوئی فرد ایک چھوٹی سی چینک میں چائے، تپائی پر رکھ دیتا ہے۔ ایک پلیٹ میں میرا ناشتہ ہوتا ہے۔ ٹوسٹ کے کچھ ریزے تپائی سے گر جاتے ہیں۔ ایک چڑیا آتی ہے اَور ریزے چُن لیتی ہے۔ کبھی کبھار کوئی چڑیا پھُدک کر تپائی پر آ بیٹھتی ہے اَور بڑی ڈِھٹائی سے ٹوسٹ میں ایک ٹھُونگا مار لیتی ہے۔ گھریلو چڑیاں بھی خاصی بے تکلف ہوتی ہیں...... اُس کے دو ٹھُونگوں سے میرے رِزق میں کوئی کمی نہیں آتی، لہٰذا میں اُسے کچھ نہیں کہتا۔ البتہ کوّے سے مجھے بَیر ہے۔ وہ بہت ندیدہ ہوتا ہے اَور چھِینا جھپٹی میں بہت بے باک! ایک بار ایسا ہوتا ہے کہ میری آنکھیں، ناشتے کے رفیق، اخبار میں گڑی ہوتی ہیں اَور وہ کوّا جو ایک لمحہ پہلے، سامنے کی دیوار پر بیٹھا ہوتا ہے، آناً فاناً میری آنکھوں میں دُھول جھونک کر انڈے کی ٹِکیا اُڑا لے جاتا ہے۔ مجھے کوّے پر غصہ آتا ہے...... جی چاہتا ہے کہ اُس کی ٹانگ توڑ دُوں، پر وہ میرے نشانے پر نہیں آتا۔ اگلی صبح مَیں ناشتے کی بہت حفاظت کرتا ہُوں۔ ایک دو کنکر روڑے میز پر رکھ لیتا ہُوں۔ کوّا دیوار پر آ بیٹھتا ہے۔ میں اُسے روڑا مارتا ہُوں۔ وہ اُڑ کر دُوسری جگہ جا بیٹھتا ہے اَور کائیں کائیں کر کے میرا مذاق اُڑاتا ہے۔

میرے تصوّر میں بھی کبھی نہیں آیا تھا کہ میرے ناشتے میں گل دُم بھی شریک ہو جائے گی۔ یہ بہت شرمیلا پرندہ ہے۔ میں نے اکثر اُسے درخت کی شاخ پر بیٹھے دیکھا ہے۔ کبھی کبھار یہ چھتوں پر لگے انٹینوں

پر بھی آ بیٹھتی ہے۔ ذرا قرب کی خواہش بھی دِل میں آئی تو اُسے اُڑنے کے لیے بے چین پایا ہے۔ سچ ہے کہ دِل سے دِل کو راہ ہوتی ہے۔ گزشتہ دِنوں نغمۂ گل دُم کا جو عرفان مجھے حاصل ہُوا تھا‘ اُس نے رُوحانی طور پر میرے اَور اُس کے درمیان محبّت کا کوئی رِشتہ قائم کر دیا تھا کہ ریزے چننے والی چڑیوں میں‘ مَیں نے ایک گل دُم کو بھی دیکھا۔ اُس نے ایک ریزہ چُن کر گول گول آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک ریزہ اَور تپائی سے نیچے گِرا دیا۔ اُس نے اُس ریزے کو چننے سے اِنکار کر دیا اَور پھُر سے اُڑ گئی۔ گویا وہ گِرے پڑے ریزوں پر اپنا حق سمجھتی ہے لیکن جو ریزہ اُسے اپنی خُدائی کی زکوٰۃ سمجھ کر دیا جائے‘ اُسے وہ اپنی خُودی کے مُنافی خیال کرتی ہے۔ اگلی صبح مَیں نے اپنے فیاّضانہ جذبے کو قابُو میں رکھا۔ اُس صبح گل دُم‘ اُچک کر تپائی پر آ بیٹھی۔ اُس دِن مِکسڈ چائے میں چینی کم پڑی تھی۔ میں نے شکر دانی منگوا کر اُس میں سے ایک چمچہ پیالی میں ڈال لیا تھا۔ شکر دانی تپائی پر پڑی تھی۔ میں بہت حیران ہُوا کہ گل دُم نے شکر دانی میں چونچ ڈالی اَور چینی کے ننھے سے ڈھیلے کو چونچ میں بھر کر‘ مجھے ایک نظر دیکھا اَور پھُر سے اُڑ گئی۔ ایک نظر دیکھنے کا مقصد شاید یہ تھا کہ ہم زکوٰۃ قبول نہیں کرتے‘ ہاں اگر جی چاہے تو تھوڑی سی سینہ زوری ضرور کر لیتے ہیں؛ ہمیں شیرینی بہت بھاتی ہے‘ تمھارے صحن میں یا اِرد گِرد انگور کی کوئی بیل ہوتی یا اِنجیر کا کوئی پَودا...... تو ہم اِس شکر دانی کو قطعاً قابلِ اِعتنا نہ سمجھتے۔ مجھے اُس کے ذوق کی نفاست پر کچھ تعجب ضرور ہُوا۔ تب مَیں نے سوچا کہ وہ ایک مغنّی ہے اَور اُس کے ذوق میں نفاست ہونا ہی چاہیے...... اِس میں حیرانی کی کون سی بات ہے بھلا!

یہ گُل دُم اکثر ناشتے پر مجھے شرفِ مِلاقات بخشتی اَور صبح کی حمد وثنا میں بھی مجھے شریک رکھتی۔ اِس طرح اُس کے ساتھ میرا رُوحانی رِشتہ بہت مضبوط ہو گیا۔ تاہم کبھی میرے دِل میں خیال نہ آیا کہ اِس لااُبالی‘ سَیلانی فن کار کا کیا اعتبار...... اِسے بہلا پھُسلا کر قفس میں کیوں نہ ڈال لُوں...... اَیسا قفس جو قفس رنگ ہو اَور اُس کی آئینہ بندی کی گئی ہو‘ اُس میں پھُولوں کا ایک گُل دستہ رکھا ہو اَور کُنجِ قفس میں انگوروں کا ایک گُچھّا ہو اَور رس بھرے اِنجیر کا ذخیرہ ہو کہ اُسے آرام ہی آرام حاصل ہو اَور جب میں چاہُوں‘ اُس کی نغمہ سَرائی سے حظ اُٹھا سکوں اَور اُسے روزی کی تلاش کی زحمت نہ ہو اَور ہر ارضی وسماوی آفت سے محفوظ؛ گویا قفس اُس کے لیے جنّت بن جائے: وجہ شاید اِس کی یہ تھی کہ قفس سے میری اَپنی طبیعت کو بہت وحشت ہوتی ہے! اَپنے لیے مَیں خود قفس تعمیر کروں یا کوئی دُوسرا مجھے قفس میں ڈالنا چاہے‘ دونوں صُورتوں میں مجھے یہ نعمت قابلِ قبول نہیں محسوس ہوتی۔

تب میں نے گل دُموں کو زیرِ دام لانے کے لیے دانے کا اِنتظام کیا یعنی میں نے نہ صرف تپائی کے نیچے ریزے گِرانا شروع کر دیے بلکہ چائے کی پیالی کے ساتھ شکر دانی کا رکھنا معمول بنا لیا اَور چینی کے کچھ ذرّے بھی تپائی پر بکھیرنے لگا۔ افسوس کہ میرا یہ حربہ کامیاب نہ ہو سکا حالاں کہ میں اُن کے نغمہ ہائے صبح گاہی سے حسبِ دستور محظوظ ہوتا رہا اَور ایک ایک سُر کو دِل میں رچاتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبِ دِل میں کچھ کمی آ گئی تھی یا اِس کی تاثیر ہمیشہ سے اُلٹی ہے کہ میں جتنا اُنھیں اَپنی طرف کھینچتا رہا، وہ مجھ سے اُتنی ہی دُور کھنچتی رہیں۔ میں نے اُن کے اِنتظار میں لذّت بھی حاصل کی اَور پھر لذّت سے محرومی کے احساس سے بھی دوچار ہُوا حتیٰ کہ اِنتظار اَور محرومی کے فاصلے سمٹتے سمٹتے نقطۂ معدوم تک آ پہنچے۔ تب میں اِستغنا یا بے نیازی کی اُس منزل پر پہنچ گیا جب ہر جذبہ، نیوٹریلائز (neutralize) ہو کر اَپنی نیش زنی سے عاری ہو جاتا ہے۔

پھر ایک دِن دونوں گل دُمیں اچانک میری محفل میں رونق اَفروز ہوگئیں۔ میں اُن کی اچانک آمد پر حیران بھی ہُوا اَور مجھے خوشی بھی حاصل ہُوئی۔ وہ دونوں تپائی سے نیچے گِرے ہُوئے ذرّوں کو چُننے لگیں۔ میں نے ذرا غور سے دیکھا تو مجھے دونوں کی جسامت میں فرق نظر آیا۔ ایک گل دُم لمبائی میں دُوسری سے بڑی تھی۔ میں نے سمجھا کہ عُمروں میں فرق ہوگا۔ وجہ اِس خیال کی یہ تھی کہ میں تذکیر و تانیث کے معاملے میں دہلوی رُوز مرّے کا پابند ہُوں، اَور میں نے گل دُم کو ہمیشہ جنسِ لطیف کی صُورت میں دیکھا ہے۔ اچانک خیال آیا کہ قدرت نے ہر جنس کو جوڑے کی صُورت میں پیدا کیا ہے۔ کہیں یہ مسٹر گل دُم اَور مسز گل دُم تو نہیں! یہ نر اَور مادہ ایک عرصے سے معاشقہ اَور کورٹ شِپ کر رہے تھے اَور میں اُن کے رشتے سے بے خبر رہا۔ یُوں آج تذکیر و تانیث کا مسئلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ وہ گل دُم جو جسامت میں بڑی تھی اَور جس کے اُڑنے اَور ریزے چننے کے اَنداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پہلے سے مجھ سے شناسا تھی، پھدک کر میز پر آ بیٹھی۔ اُس نے شکر دانی میں چونچ ڈال کر چینی کا ایک ڈھیلا منتخب کیا اَور میری طرف گول گول آنکھوں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو: ''اَب یقین آیا نا میری مَردانہ جنسیت پر؟'' میں نے فوراً اُس کا نام مسٹر گل دُم رکھ دیا۔ مسز گل دُم اُس صبح شرمائی شرمائی سی رہیں کیوں کہ میں دُولھا کا مَحرم تھا اَور اُس کے لیے نامَحرم۔ نامَحرموں سے اِتنی جلدی گھل مل جانا اچھی بات نہیں۔ پھر دُولھا میاں نے کچھ کہا اَور دونوں میاں بیوی پُھر سے اُڑ گئے۔

مسٹر گل دُم، اَپنی دُلھن کی نسبت کچھ زیادہ خوب صُورت اَور وجیہہ تھے۔ جسم اُس سے زیادہ

سڈول تھا' دُم بھی کچھ لمبی تھی اور پَروں کے خاکستری رنگ میں چمک بھی کچھ زیادہ تھی۔ سَر پر کالے پَروں کی کلغی میں بھی شاہانہ عظمت زیادہ نمایاں تھی۔ اُن کے مقابلے میں مسز گل دُم کچھ گول مٹول سی اور سمٹی سمٹائی سی معلوم ہوتی تھی۔ ہر لمحے پھُر سے اُڑنے کو تیار، چھوئی مُوئی کا پودا تھیں کہ نظر کے گستاخ لمس کو بھی برداشت نہ کر پاتیں۔

وہ صبح مجھے یاد ہے۔ اُس صبح مجھے بہار کے گزرتے ہُوئے لمحوں کی آخری سسکی سُنائی دی تھی لیکن یہ ماننے کو جی نہیں چاہ رہا تھا کہ بہار گزر گئی ہے۔ میں نے بہار کے نظارے کے لیے ہر کھڑکی کھُلی رکھی تھی۔ پھر بھی بہار کے دِن یُوں ہی گزر گئے۔ اگر اُن گُل دُموں سے یارانہ نہ ہوتا تو بہار کے آنے اور جانے کا پتا ہی نہ چلتا۔

اُس صبح معمول کی نسبت خُنکی کم محسوس ہُوئی، تاہم معمول کے مطابق مسٹر گل دُم اور مسز گل دُم نے بڑی محویت سے اُس صبح کا خیر مقدم کیا۔ جب اُجالا ہُوا تو سامنے کے درخت پر چڑیوں کی چہکار کا بے ہنگم ساز چھِڑ گیا۔ گل دُم کا نغمہ اُس شور میں دَب کر رہ گیا۔ میں نے بھی اپنے معمولات کا آغاز کر دیا۔ تب یُوں ہُوا کہ سامنے کے درخت مُردہ ہو گئے' اِس لیے کہ اُن پتّوں میں چھپی ہُوئی چڑیوں کی چہکار کا اچانک گلا گھُٹ گیا' ہر طرف گہری خاموشی چھا گئی...... اتنی غیر فطرتی خاموشی کہ میں چونک گیا! میری حیرت ایک گہرا سمندر بن گئی کہ جس کی سطح پر ہر لہر ساکن و جامِد ہو گئی۔ اتنے سکُوت اور جمود سے مجھے خوف محسوس ہُوا...... جامِد سا خوف کیوں کہ میرا ماحول پتھرا سا گیا تھا' جیسے کسی اَن دیکھے جادُوگر کی ایک پھُونک سے ہر جان دار شے پتھر بن گئی ہو؛ میں خود پتھر بن گیا تھا!

نہ جانے پتھر کی دُنیا کا یہ ایک لمحہ تھا یا ایک صدی کہ وقت کی رفتار تھم گئی تھی اور میرا سانس رُک گیا تھا۔ پھر ایک کوّے نے کائیں کائیں کی اور ایک درخت کی سب سے اُونچی پھُننگ سرسرائی اور وقت کی گھڑی ٹک ٹک چل پڑی۔ میرا رُکا ہُوا سانس بھی رواں ہو گیا۔ لمحہ' پتھر کی قید سے آزاد ہو کر صدیوں کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ میں نے درخت کی طرف دیکھا۔ اُس کی اُونچی پھُننگ پر وہ جادُوگر نظر آیا جس نے کائنات کو حرکت سے محروم کر دیا تھا۔ اُس کے پنجوں میں ایک تڑپتی پھڑکتی چڑیا دبی ہُوئی تھی۔ اُس نے چڑیا کے جسم میں پہلی چونچ لگائی۔ میں نے ہَوا کے ایک سانس میں اُس پَر کو مُرتعش دیکھا۔ پھر یہ پَر پتّوں کے جھُرمٹ میں گِر کر غائب ہُوا تو اچانک چڑیوں کی چہکار کا نغمہ پھِر سے رواں دواں ہو گیا، گویا حرکت کے ساتھ آواز بھی لَوٹ آئی حالاں کہ ابھی تک وہ خونی جادُوگر' اُونچی پھُننگ پر بیٹھا' چڑیا کے پَر نوچ رہا تھا۔

میں نے مَوت کے بہت سے لمحے دیکھے ہیں۔ اِن لمحوں سے مجھے بصیرت کا سامان مِلا ہے۔ اِس لیے اِتنے بڑے ہجوم میں سے ایک چڑیا کے اُچک لیے جانے سے مجھے زیادہ متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا کہ زندگی اِسی کا نام ہے۔ ہر جان دار کو کبھی نہ کبھی مَوت سے ہم آغوش ہونا ہی پڑتا ہے۔ فرشتۂ اجل، ہزار ہا رُوپ دھارنے پر قادِر ہے۔ کبھی وہ بیماری کے رُوپ میں آتا ہے، کبھی کسی حادثے کے رُوپ میں، کبھی وہ بندوق کی گولی سے برآمد ہوتا ہے اَور کبھی قصّاب کی چُھری بن جاتا ہے۔ ایک چڑیا کے لیے اُس نے شِکرے کا رُوپ دھار لیا تو اِس میں حیرت کی کون سی بات تھی!

پر مَیں کچھ مضطرب سا ضرور تھا!

ہم اِنسان کِسی کے مَرنے پر کچھ لمحوں کے لیے دم بہ خود ضرور رہ جاتے ہیں ممکن ہے ہمیں اپنی موت کا خیال آجاتا ہے یا شاید مَرنے والے کا غم ہمیں مُہر بہ لب کر دیتا ہے۔ لیکن مجھے پرندوں کی دُنیا کا یہ دستور پسند نہ آیا کہ ایک جیتی جاگتی، ہنستی کھیلتی، ناچتی گاتی چڑیا کو شِکرے نے اُچک لیا اَور دُوسری چڑیوں نے اُس کی مَوت پر کوئی غم نہ کیا۔ جب تک شِکرے نے اُن میں سے کسی ایک کا اِنتخاب نہ کیا تھا، وہ مَوت وحیات کی کشمکش میں مبتلا، آواز اَور حرکت سے محروم ہو گئی تھیں؛ جُوں ہی ایک چڑیا شِکرے کے پنجے میں آئی، سبھی نے جانا کہ اَب سب اُس لمحے تک محفوظ ہیں جب تک شِکرے کو پھر اِشتہا، شِکار پر مجبور نہیں کرتی، اَور اُنھوں نے سُورج کی پہلی کِرن کا سواگت کرنے کے لیے پھر چہکار کا آغاز کر دیا۔ اُنھیں ایک ساتھی کی مَوت پر نوحہ تو کرنا چاہیے تھا یا کم از کم اُن کی چہکار میں نئے دِن کی مُسرّتوں کی چھنک تو نہیں آنی چاہیے تھی۔

تب مَوت کے اُس لمحے نے بھی مجھے بصیرت کا ایک نکتہ عطا کیا!

اجل ایک شِکرے کے مانند ہے کہ زندگی پر ہر لمحے جھپٹنے پر تیار۔ نہ جانے یہ لمحہ کس کی تقدیر میں رکھا ہے! اِس کا شعور کسی کو نہیں مِلا تو پھر زندگی اَور موت کے درمیان، آزادی کے جو چند لمحے مِلتے ہیں، اُنھیں نغمہ سَرائی میں کیوں نہ گزارا جائے! اِنسان اِس اَزلی واَبدی رمز سے آشنا نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مَرنے والوں کو وہ مدّتوں تک یاد رکھتا ہے اَور غم کی بھٹّی میں جلتا رہتا ہے!

لمحے کی اِسی بصیرت پر مَیں نے چڑیوں کی چہکار کو معاف کر دیا۔ تب سُورج کی پہلی کِرن پھُوٹی اَور چڑیاں، پتّوں اَور شاخوں کی پناہ گاہ کو پھُر پھُر چھوڑنے لگیں کہ اَپنے دانے دُنکے کی فکر کریں۔

جب میز پر ناشتہ آیا تو میں نے شکر دانی سے چینی کے دو چار ذرّے تپائی پر گرائے۔ ٹوسٹ کے

کچھ ریزے تپائی سے نیچے گرائے۔ کوّے نے سامنے کی دیوار پر کائیں کائیں کی۔ میری ازلی اور ابدی دُشمن شارک بھی آئی؛ اُس نے بھونڈی آواز میں مجھے چڑایا۔ ایک چڑیا اور ایک چڑا پُھدکتے ہوئے آئے اور تپائی سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر چُوں چُوں کرنے لگے، گویا پوچھ رہے ہوں: ''کہو تو ہم یہ ریزے چُن لیں!''

میں نے سر ہلا کر اِنکار کر دیا۔ وہ پھُدک کر دو چار قدم پیچھے ہٹ گئے۔ لیکن اُس صبح اِنتظار کے باوجود مسٹر اور مسز گل دُم میرے مہمان نہ بنے۔ میں نے سوچا: ''آج اُن کی کوئی اور مصروفیت ہو گی۔ وہ من موجی فن کار ہیں، کیا پتا آج وہ کسی اور کی دعوت میں چلے گئے ہوں...... ہو سکتا ہے کہ نغمہ سرائی کے جوش میں ناشتے کا خیال ہی نہ رہا ہو!''

لیکن اُس دِن میں اُن مغنّیوں کی نغمہ سرائی سے محروم رہا۔

یہ محرومی میرے لاشعور کے ساتھ چپک کر رہ گئی۔ میں سارا دِن مصروف رہا۔ مصروفیت میں اِنسان بہت کچھ بھول جاتا ہے لیکن جب فرصت کا ایک لمحہ بھی مِلتا ہے تو محرومی کا احساس کھٹ سے آن موجود ہوتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہُوا۔ میں اِس احساس کو لیے ہنستا کھیلتا بھی رہا اور میٹھی نیند بھی سویا تا آں کہ اگلی صبح ہو گئی۔

صبح کا اُجالا ہُوا تو سامنے کے درخت بھی جاگ پڑے۔ چڑیاں چہچہائیں، کوّوں نے کائیں کائیں کی، میری ازلی و ابدی دُشمن شارک نے بھی اپنی بھونڈی آواز میں مانگے تانگے کی دُھنوں میں نغمہ سرائی کی۔ میں نے اُن سب کی طرف سے کان بند کر لیے اور گل دُموں کے دوگانے کا اِنتظار کرنے لگا حتیٰ کہ میرا ناشتہ میز پر لگ گیا۔ میں نے حسبِ معمول چینی کے دو چار موٹے موٹے ذرّے تپائی پر بکھیرے اور کچھ ریزے میز سے نیچے گرا دیے اور ہمہ تن اِنتظار بن گیا۔ تب سامنے کی چھت پر لگے ہُوئے انٹینے پر ایک گل دُم آ بیٹھی۔ اُس نے کومل سی آواز میں ایک نغمہ گایا۔ دُوسری گل دُم نے اُس کا جواب نہ دیا۔

آدھے صحن میں دُھوپ پھیل گئی تو مَیں نے سوچا کہ بوریا بستر لپیٹ کر اندر کمرے میں چلا جاؤں۔ ابھی یہ ارادہ عمل کی صُورت اِختیار نہ کر پایا تھا کہ ایک گل دُم پہلے دیوار پر آ بیٹھی، پھر ہچکچاتے ہُوئے دیوار سے نیچے اُتری اور تپائی سے ایک دو قدم کے فاصلے پر رُک گئی۔ اُس کی دُم ایک دو بار ہلی۔ میں نے کن اکھیوں سے اُسے دیکھا۔ یہ مسز گل دُم تھی۔ میں اُس کی جسامت سے اُسے پہچان گیا تھا۔ میں نے دِل ہی دِل میں اُس سے پوچھا: ''آج مسٹر گل دُم نہیں آئے؟'' یہ آواز لفظوں کی صُورت میں زبان پر نہ آئی کیوں کہ مَیں جانتا تھا کہ مسز گل دُم، آواز کی سبک سی لہر کی بھی متحمل نہیں ہو سکیں گی۔ وہ لاج ونتی کسی

غیر مرد کی آواز کو اپنی لجیا کے مُنافی خیال کریں گی۔ وہ ایک دو قدم آگے بڑھیں، ایک ذرّہ چونچ میں لے کر میری طرف دیکھا اور گول مٹول، کالی کالی آنکھوں کی معصومیت مجھے اُس قطرے کے مانند نظر آئی کہ جو ابھی ٹپک جائے گا!

میں نے بے اختیار سا ہو کر پوچھ لیا: ''مسز گل دُم! آج تم اکیلی کیوں ہو؟ تمھارے وہ کیوں نہیں آئے؟''

اُس نے میرے استفسار کا جواب نہ دیا۔ ایک ریزہ اور چُنا اور پھُر سے اُڑ گئی۔

تب ایک جگنو سا چمکا۔ ایک شرارہ کہ جس کی گریز پا چمک میں بصیرت کے ایک لمحے کا ایک دُھندلا سا ہیُولا مجھے نظر آیا۔ میں نے دیکھا کہ اجل نے شِکرے کا رُوپ دھار کر ایک نغمے کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا ہے!

جب اُس لمحے سے نغمے کے لہُو کا ایک قطرہ ٹپکا تو میری بصیرت کی تکمیل ہو گئی۔

☆☆☆

وُہ!

نور جہاں کے مَقبرے کے اَندر خنکی تھی!

باہر گرم گرم دُھوپ تھی کیوں کہ یہ موسمِ بہار کا ایک دِن تھا۔

نور جہاں کے مَقبرے کی تاریکی اَور خنکی میں اُس نے ایک ہیُولا دیکھا تھا' جیسے مغل عہد کی کسی مصوّر کتاب کا ایک رَنگین وَرق اُڑ کر سینما سکوپ سکرین پر آ گیا ہو...... ایک لمحہ...... ایک ثانیہ...... مصوّر کے مُو قلم کا ایک رَنگین چھینٹا!

ریلوے لائن دُھوپ میں چمک رہی تھی!

گرم گرم فضا میں ایک بے نام سی خُوش بُو رچی ہُوئی تھی۔ ایک جامِد سی خُوش بُو، سوئی سوئی سی دُھوپ۔ وہ مَقبرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

اُن کے سایے نرم نرم مٹی سے چپک گئے تھے، جس پر کل کی بارش کی نمی تھی اَور سڑک کے دُوسرے کنارے پر کھجوروں کی پُھننگیں، سوئی سوئی دُھوپ سے سرگوشی کر رہی تھیں۔ اُن کے سایوں میں بہار کی دُھوپ رچی ہُوئی تھی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ کائنات خاموش تھی۔ موسمِ بہار کا یہ دِن خاموش تھا۔ وہ چند لمحے پہلے اکٹھے تھے۔ اَب وہ دونوں اکیلے تھے کیوں کہ مغل عہد کے بے نام مصوِّر کے مُوقلم کا ایک رَنگین چھینٹا اُن کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔

سب سے پہلے وہ خاموشی جاگی جو کھجور کی پُھننگ پر دُھوپ سے سرگوشی کر رہی تھی۔ دُھوپ لرزی اَور لرزش، پُھننگ سے اُتر کر ایک ننھی سی لہر بن گئی...... ایک بے نام سا اِضطراب' ایک دِھیما سا ارتعاش' جیسے گھونگے میں سمندر بول رہا ہو! گہرا سمندر بھی خاموش تھا۔ ابھی اُس پر سکُوت کی مُہر لگی تھی۔ بہار کے پرندے خاموش تھے کیوں کہ کویل کی کوک کو ابھی اَبرِ بہار سے اِذنِ نغمہ سرائی نہ مِلا تھا۔

لیکن جب وہ بڑے پھاٹک سے اَندر داخل ہُوئے تو دُو رویہ رِوِشوں کے پھُول اُن کے ساتھ چلنے لگے...... چُپ چاپ؛ لان کے درخت اَپنے سایوں کی جلَو میں چل پڑے...... دبے پاؤں؛ اَور

پھولوں کے رنگ سایوں میں گھل مل گئے اَور پھولوں کی خُوش بُو قافِلہ سالار بن گئی!

وہ لوگ جو اُنھیں روِش روِش پر مِلے، چلتے پھرتے موم کے پُتلے تھے...... بے جان، گُم صُم، جیسے وقت کے دھارے پر بہے چلے آ رہے ہوں اَور وقت نے اُنھیں آزاد نہ کیا ہو اَور وہ یُوں محسوس کر رہا تھا......نہیں، ابھی وہ احساس کی سرحد پر بھی نہ پہنچا تھا، ابھی تو وہ اِدراک اَور احساس کے سنگم پر تھا...... ابھی لمحہ، اَپنے محور پر گردِش کر رہا تھا، ابھی وقت کا دھارا اَپنا رُخ بدل رہا تھا......وہ ابھی لمحے کی قید سے آزاد نہیں ہُوا تھا کیوں کہ اُس نے ٹوٹتی زنجیروں کی آواز نہیں سُنی تھی......سمندر ابھی مُہر بہ لب تھا، گھونگے کی لرزشیں محض سَرابِ وقت تھیں......ایک فریبِ گوش......

....

نغمی نے کہا:

سلیم! موسم کتنا دِل فریب ہے۔

بڑا دِل فریب ہے؟ نہیں تو......

تم بولتے بولتے رُک کیوں گئے؟

وہ بولتے بولتے رُک گیا تھا۔ نغمی کی آواز نے لمحے کے تسلسل کو توڑ دیا تھا۔ اَور پھر موسم بدلتا نہیں، دل فریبی کے انداز بدلتے رہتے ہیں۔

اُس دِن بھی یہی موسم تھا۔ بہار کی خُوش بُو اَور پھُولوں کا نکھار......

کون سا دِن؟

اُس نے پُوچھا۔

نغمی حیران ہوگئی۔ اُس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اُس کی پیشانی بھیگ گئی:

اُس دِن بھی بہار کا موسم تھا اَور پھُول کھِلے تھے اَور دُھوپ......

اَور تم ایک لان میں اکیلی کھڑی تھیں......ایک بیمار سی لڑکی! تمھارے چہرے پر دُھوپ کی زردی تھی اَور تمھاری آنکھوں میں نیلاہٹ تھی۔ نم ناک آنکھوں میں جیسے حسرتیں بیٹھی جھانک رہی ہوں۔ مجھے تمھاری آنکھوں نے اَپنی طرف کھینچا......میں جو تخیل کی وادیوں کا آوارہ شہزادہ ہُوں، لیکن میں نے تمھیں اِس سے پہلے بھی دیکھا تھا......کہاں......میں نہیں جانتا......اَور میں نے اُس دِن یہی سمجھا کہ میں نے اُسے پا لیا ہے۔

نغمی! اُس دِن بھی دُھوپ خاموش تھی لیکن اُس دِن درخت اَور پھُول میرے ساتھ نہیں چل رہے تھے۔ اُس دِن بھی مجھے اُس کی تلاش تھی۔

کس کی؟

نغمی کی آواز میں ایک دردناک سُر تھا۔

میں نہیں جانتا۔ میں ابھی......

نغمی کا درد ماضی کے دُھندلکوں میں رَستہ بھُول گیا۔

اُس دُھند میں دُھوپ بھی تھی، ایک سوگ وارسی دُھوپ! وہ مقبرۂ جہاں گیر کی سَیر کو آئی تھی، پِک نِک کے لیے اَور اَپنی سہیلیوں کے شور وغل، قہقہوں اَور شرارتوں میں اُس کا دِل لگ نہ سکا تھا۔ وہ نہ جانے اِتنا مضطرب دِل لے کر کیوں پَیدا ہُوئی تھی! یہ دِل جسے خوشیوں کا راگ بھی بھلا نہ معلوم ہوتا اَور وہ اِس لان میں تنہا کھڑی تھی اَور اُس کے اِردگِرد پھُول مسکرا رہے تھے۔ اُسے خوابوں کے کسی شہزادے کا اِنتظار بھی تو نہ تھا اَور پھر وہ اُس کی طرف آیا تو وہ چونک بھی نہ سکی۔ وہ چند قدم دُور کھڑا تھا اَور اُسے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اُسے پہچان لیا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ نہیں، وہ میری تلاش میں نہیں آیا تھا۔ میں اُسے کیوں پہچانتی۔ میں تو اَپنی ہی آگ میں جل مَرنے کے لیے پَیدا ہُوئی تھی۔ میں دُوسرے کی آگ کو کیسے محسوس کر لیتی! اُس نے نیلی پتلون پہنی ہُوئی تھی۔ اُس کے سوِیٹر کا رنگ عُنابی تھا۔ اُس کے بال بڑھے ہُوئے تھے اَور وہ مجھے غور سے دیکھ رہا تھا اَور اُس کی آنکھوں میں ایک خوابِ آوارہ تھا۔ اُس نے کہا تھا: ''میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرے اَور قریب ہوگیا: ''میں مدّت سے آپ کی تلاش میں تھا۔'' وہ میری تلاش میں تھا۔ نہیں، وہ میری تلاش میں نہیں تھا۔ میں یقین اَور بے یقینی کی فضا میں معلّق تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکی۔ پھر وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا۔ ایک لمحے نے اُس کی آنکھوں سے جھانک کر کہا: ''میں مصوّر ہُوں، میں ایک زمانے سے اَپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہُوں...... میرا گم گشتہ تخیل: شاید وہ تم ہو!''

''میں وہ نہیں ہُوں!''...... اُس نے لمحے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔ لیکن وہ اُس کے ساتھ چل پڑی تھی اَور اُس کی سہیلیاں اُسے ایک اجنبی کے ساتھ چلتے ہُوئے دیکھ کر حیران ہوگئی تھیں ...... اُنھیں کیا معلوم، ابھی اُن کے راستے الگ الگ تھے اَور فوّارے کے قریب......

....

دُھوپ نے پھر اُن کا راستہ روک لیا تھا۔

فوّارہ اُچھل رہا تھا۔ پھُویّاں پھُویّاں پانی برس رہا تھا اَور جھرنوں سے بُوند بُوند رِس رہا تھا۔

سامنے جہاں گیر کا مقبرہ تھا جس کا سنگِ مَرمَر دُھوپ میں چمک رہا تھا۔

"میرا راستہ دُھوپ نے کیوں روکا؟"...... نغمی نے سوچا۔

نہیں تو...... دُھوپ کسی کا راستہ نہیں روکتی...... اُس دِن بھی فوّارے کے قریب آ کر وہ رُک گئی تھی۔ سلیم نے کہا تھا: "چلو اَندر سے مقبرہ دیکھ آئیں!" اُس نے اِنکار میں سَر ہِلا دیا تھا۔ "مقبرہ یہاں سے زیادہ خوب صُورت، زیادہ نازک اَور زیادہ sublime نظر آتا ہے۔"...... اُس نے کہا تھا: "فاصلے حُسن کو اَور بھی sublime بنا دیتے ہیں۔ یہ مینار دُور سے کتنے خوب صُورت اَور slim نظر آتے ہیں، جیسے ابھی ابھی جوانی چڑھے ہوں...... تھوڑے سے شرمائے ہُوئے، لجائے ہُوئے، نیچی نظریں کیے، جیسے ترک شہزادے جن کی مَسیں بھیگ رہی ہوں اَور پہلی بار انارکلیوں سے اُن کی نگاہیں دوچار ہُوئی ہوں۔"

ہَوا کا ایک جھَونکا فوّارے کی اُچھال کے ساتھ کھیلتے ہُوئے گزر گیا۔ اُس میں بہار کے دُھلے دُھلے، میٹھے اَور معطّر سانس بھی تھے۔ اُس نے سبزے کی مَوج در مَوج ہریالی اَور نوخیز کونپلوں کی معصوم نزاکت کا لمس محسوس کیا۔ ایک کونپل مسکرائی اَور فوّارے کی ایک اُچھال شبنم کے ننّھے مُنّے قطروں کی صُورت میں اُس کی پیشانی پر بکھر گئی...... وہ جھُوم اُٹھی۔

"زندگی کا ریلا زندانِ وقت نہیں، وہ تو شبنم کا ایک قطرہ ہے۔"

اَور مینار، شرما کر، اَور بھی جُھک گئے کیوں کہ وہ انارکلی تھی، نورجہاں نہیں تھی۔

اَور اُسے ابھی اِس کا علم نہیں تھا۔

یہ آصف جاہ کا مقبرہ ہے۔

سلیم نے کہا۔

میں جانتی ہُوں۔

نغمی نے کہا۔

یہ گنبد اَپنی تعمیر کے اِعتبار سے دُنیا کی واحد چیز ہے۔ میں اِسے اَپنی کسی تصویر میں علامت بنانا چاہتا ہُوں لیکن کس چیز کی، یہ میں نہیں جانتا۔

نغمی نے گنبد کو ایک نظر دیکھا اَور پھر نگاہیں جُھکا لیں۔ گنبد کا پلستر اُکھڑ چکا تھا۔ بڑے بڑے پتھروں کی دراڑیں، مُنہ کھولے کھڑی تھیں۔ اُس کی چوٹی پر دو گدھ بیٹھے تھے۔ اَور اُس کے اُکھڑے اُکھڑے پلستر پر پرندوں کے بیٹیں تھیں۔ اُس وِیران وِیران سے گنبد میں کوئی وحشت ناک اَسرار بسا ہُوا تھا۔ نہ جانے یہ اَسرار کس چیز کی علامت تھا! گنبد پر دُھوپ لہرا رہی تھی اَور اُس کے اَندر کبوتر غٹرغوں غٹرغوں بول رہے تھے۔ باغِ جہاں گیر کے اِس حصے میں تنہائی تھی...... بڑی مُردہ سی خاموشی!

نغمی نے کہا:

لیکن یہ گنبد بہت بدصُورت ہے!

دُنیا کی کوئی چیز بدصُورت نہیں۔ میں اِس گنبد کو وقت کا سمبل بنا کر تصویر بناؤں گا۔

پر یہ گنبد تو یقیناً بدصُورت ہے سلیم!

اُس کے لہجے میں ہلکا سا اِحتجاج تھا۔

آصف جاہ، نور جہاں کا بھائی تھا۔ ممتاز محل کا باپ......

میں جانتی ہُوں سلیم!

آصف جاہ نے ممتاز محل کی پرورِش اَور تربیت اِس انداز سے کی جیسے وہ اُس کی پیشانی پر اُس کی تقدیر پڑھ چُکا ہو۔ وہ اُسے ملکۂ ہندوستاں کے رُوپ میں دیکھ رہا تھا۔ وہ کتنا بڑا خواب دیکھنے والا اِنسان تھا، اَور اُس کا خواب پورا ہو کر رہا!

مجھے معلوم ہے سلیم!

اَور جب بھی اُسے ممتاز محل اَور تختِ ہند کے درمیان کوئی رُکاوٹ نظر آئی، اُس نے اپنے ناخنِ تدبیر سے......

میں تاریخ کے اِس خُونیں ورق سے بھی آگاہ ہُوں سلیم!

اُس نے مراد بخش کے بیٹے داور بخش کو تخت پر بٹھایا اَور...... پرویز، شہریار...... داور بخش سبھی کو ممتاز محل کے راستے سے ہٹا دیا!

ہاں سلیم! جبھی تو یہ گنبد دُنیا کی بدصُورت تعمیر ہے...... اِس کے نیچے سونے والے کے اِرادوں کا خوف ناک مظہر! مجھے تو یُوں معلوم ہوتا ہے، جیسے آصف جاہ کی رُوح اِس گنبد کے نیچے اَب بھی کسی خونیں عزم کو عملی جامہ پہنانے کا خواب دیکھ رہی ہو!

اِسے کچھ نہ کہو نغمی!......

سلیم نے چَونک کر کہا:

ہر شخص شیطان کا قیدی ہے!

اَور تم؟

میں...... میں......

سلیم سوچنے لگا۔

نغمی اُس کے سوچتے ہُوئے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کتنا دِل کش چہرہ ہے، اِن آنکھوں میں کتنی گہرائیاں ہیں، اِس فراخ پیشانی میں عظمت کا نشان ثبت ہے، یہ سَر ایک عام آدمی کا سَر نہیں! لیکن...... یہ لمحے کا قیدی ہے...... اَپنے ہی فلسفے کا اسیر...... میرا اَور اِس کا ایک سال کا ساتھ ہے...... میں اِسے لمحے سے آزاد نہ کرا سکی اَور اِس کا فلسفہ میرے رگ و ریشے میں نہ رچ سکا، پر میں نے اِسے پھر بھی

والہانہ چاہا...... میں نے قدم قدم اِس کا ساتھ دیا۔ میں اِس کے سٹوڈیو کی گھٹی گھٹی فضا میں گھنٹوں بیٹھی رہی...... میں اِس کے ساتھ ساتھ رہی...... میں نے گلی گلی کی سیر کی، قریہ بہ قریہ گھومی، یہ ہجوم میں کھو گیا تو میں بھی اِس کے ساتھ کھو گئی...... اِس نے جس شے سے نفرت کی، میں نے بھی اُس سے نفرت کی ...... اِس نے جس سے پیار کیا، میں نے بھی پیار کیا......

اُس نے کہا:

"میں ایک لمحے کی تلاش میں ہُوں۔ وہ اِس لمحے میں پوشیدہ ہے۔ میرا ساتھ دو!"

میں نے کہا: "میں تیار ہُوں!"

میں نے اِس کا ساتھ دیا اَور......

"میں وقت کا قیدی ہُوں اَور وہ بھی جن کی تلاش میں، مَیں سَرگرداں ہُوں!"

وہ کون ہے، جس کی مجھے تلاش ہے! ابھی ابھی درخت اَور سایے، دُھوپ اَور سَرگوشی، پھُول اَور خوش بُو میرے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اگر نغمی فوّارے کے قریب رُک نہ جاتی تو میں اِس کے اَسرار کو پا نہ لیتا کیا شاید؟...... نغمی فوّارے سے آگے نہیں بڑھتی اَور نور جہاں کے مقبرے میں وہ تہ خانے کے اَندر چلی گئی تھی حالاں کہ مجھے وحشت محسوس ہوئی تھی۔ تہ خانے کی فضا میں نمی تھی اَور نمی میں اندھیرا رچا ہُوا تھا۔ وہیں میں نے اُس ہَیُولے کو دیکھا جو مصوِّر کے مُوقلم کا ایک چھینٹا تھا اَور وہ اِس لمحے میں اسیر ہے۔

ممتاز محل وقت کا شاہ کار تھی۔ اُسے عظمت کی بِھینٹ چڑھا دیا گیا!

سلیم نے کہا۔

وہ ایک گھریلو سی عورت تھی جس نے آٹھ بچّوں کو جنم دیا اَور مَر گئی!

نغمی بولی۔

وقت نے اُسے تاج محل کے سنگِ مَرمَر میں قید کر دیا۔

سلیم نے کہا۔

تاج محل دُنیا کا ایک عجوبہ ہے۔ کسی انگریز سیّاح کی بیوی نے تاج محل کو دیکھ کر کہا تھا کہ اگر اُس کا شوہر اِسی قسم کی عمارت اُس کے مزار پر تعمیر کروانے کا وعدہ کرے تو وہ اِسی لمحے مَرنے کو تیار ہے۔

سلیم نے مسکرا کر کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ نغمی بولی:

میں اِس قسم کی خواہش کبھی نہ کروں گی سلیم! تاج محل کے حُسن میں ٹھنڈک ہے، آگ نہیں۔ ایک گھریلو عورت کی یاد میں ایسی ہی عمارت بنی چاہیے تھی!

سلیم نے حیران ہو کر نغمی کی طرف دیکھا اَور دیکھتا رہا۔

نغمی ہمیشہ اُسے شبنم کی بُوند محسوس ہُوئی اَور شبنم کی بُوند میں شرارہ!

وہ یقیناً شبنم کی بُوند تھی شبنم کی بُوند جو سُورج کی کِرن سے ہم آغوش ہو کر ایک چنگاری بن جاتی ہے۔

نغمی نے کتنی اُونچی بات کہہ دی تھی!...... ''تاج محل کا حُسن شبنم کی بُوند ہے۔ کیا اُسے سورج کی کِرن کا لمس نصیب نہ ہو سکا کہ وہ شرارہ بن جاتی؟''...... سلیم نے سوچا۔

گنبد کے اَندر سے آواز آئی: ''غٹرغوں، غٹرغوں، غٹرغوں!''

گنبد کی چھت پر سے دونوں گِدھ اُن کے سَروں پر مہیب سایہ ڈال کر دُور گھنے درختوں کے جھُنڈ کی طرف اُڑ گئے۔

نغمی! خرم نے ممتاز کو اَپنی شریکِ زندگی بنایا لیکن اُسے اِس گھریلو عورت سے کتنی محبّت تھی کہ اُس نے اُس کے مَرنے کے بعد کسی دُوسری عورت کو اُس کی سیج پر نہ بٹھایا!

نغمی نے اُسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو: ''تم اَپنے فلسفے کے باوجود کس قدر سادہ لَوح ہو!''

سلیم!......

نغمی نے کہا:

اُسے ممتاز محل سے زیادہ اَپنے تخلیقی عمل سے پیار تھا۔ ممتاز تو اُس کا تخیل تھا جسے وہ سنگِ مَرمَر میں نہ ڈھال سکا تو اُس نے اُسے، تاج کا تجریدی لَبادہ اوڑھا دیا۔

سلیم چَونک گیا:

میں بھی تو ایک فن کار ہُوں۔ میں نغمی کو تجرید کے کون سے رنگ میں دیکھ رہا ہُوں! میں اَور نغمی ایک سال سے مِل رہے ہیں۔ یہ دُوسری بار ہے کہ ہم مقبرۂ جہاں گیر میں آئے ہیں۔ کیا میں نغمی کو سمجھ نہیں سکا؟ کیا یہ وہی رنگ کا چھینٹا تو نہیں جو مقبرۂ نور جہاں میں ایک ہیُولا بن گیا تھا، جیسے کتابِ زندگی کا ایک نقش غیر مَرئی ہو یا شبنم کی ایک بُوند جو سُورج کی ایک جِھل مِلاتی کِرن سے ہم آغوشی کی منتظر ہے!

غٹرغوں......غٹرغوں......غٹرغوں......

دُھوپ تیز ہو گئی اَور درختوں کے سائے سمٹ گئے۔

وہ دونوں ایک شیشم کے سایے تلے آگئے اَور شیشم کی کونپلیں خُوش بُو کے فوّارے بن گئیں۔ وہ چھاؤں تلے، سبز گھاس پر بیٹھ گئے۔ گھاس میں ابھی رات کی خنکی اَور تَری رچی ہُوئی تھی۔

نغمی! چائے پیو گی؟

نغمی نے کھوئے کھوئے اَنداز میں سَر ہلا دیا۔

اُس نے تھرمس کھول کر گلاس میں چائے ڈالی، گرم گرم بھاپ اُٹھی اَور خُوش بُو کے فوّاروں سے

جا ملی۔ نغمی نے گلاس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اُس کی مخروطی اُنگلیوں کی حِنائی پوریں، بھاپ اور خوش بو کے ساز پر رقص کرنے لگیں۔ دُور گلاب کی ایک کلی چٹک کر پھُول بن گئی یا کھجور کی پھنگ سے دُھوپ کی جولرزِش پھیلی تھی، وہ کلی سے سَرگوشی کرنا چاہتی تھی کہ منجمد ہو کر رہ گئی، یا شاید مغل مصوِّر کے مُوقلم کا رنگین چھینٹا وقت کے صفحے پر ثبت ہو گیا تھا۔

''میں فریبِ نظارہ ہُوں، سرابِ نظر ہُوں!''...... رنگ کے چھینٹے نے کہا۔ ''میں لمحے کو اُس کے اصل رُوپ میں کب دیکھوں گا؟ ...... اُس نے پوچھا۔ ''آج میں نے لمحے کو چلتے ہُوئے دیکھا اور میں اُس کی تلاش میں تھا اور پھُول میرے ہم سفر تھے اور فوارے کے قریب قافلۂ رنگ و بُو رُک گیا تھا کیوں کہ نغمی رُک گئی تھی۔ ابھی کوئی زنجیر بھی تو نہ ٹوٹی تھی!''

''میں اِس پاگل مصوّر کے فریب میں کیوں آ گئی! اِس کے تخیل میں ادھورے خوابوں کا پرستان آباد ہے۔ نہ جانے اِسے کِس کی تلاش ہے! اِس کا تخیل ادھورا ہے، اِس کے خواب ادھورے ہیں، اِس کے کینوس پر کوئی تصویر بھی تو مکمل نہیں اور میں جو ایک سال سے اِسے مِل رہی ہُوں، اِس کے کینوس پر ہمیشہ ادھوری تصویر کے رُوپ میں آئی ہُوں لیکن ...... قدرت مجھے اِس عظیم فن کار کی عظمت کی بھینٹ کیوں چڑھانا چاہتی ہے؟''

نغمی نے آصف جاہ کے گنبد کی طرف دیکھا۔

''غُٹرغُوں ...... غُٹرغُوں ...... غُٹرغُوں ......'' ایک کبوتر گنبد سے باہر نکل کر چبوترے کے فرش پر آ گیا اور ناچنے لگا اور ناچتے ناچتے رُک کر اُسے دیکھنے لگا، جیسے اُسے پہچان رہا ہو۔

''عظمت کی بھینٹ ...... عظمت کی بھینٹ ...... عظمت کی بھینٹ!''

نغمی نے گلاس منہ سے لگا لیا۔

سفید پلاسٹک کے گلاس پر نغمی کے ہونٹ ہلال بن کر جھک گئے۔

اور سلیم اُنھیں یُوں دیکھنے لگا جیسے وہ پہلی بار اُنھیں دیکھ رہا ہو۔ یہ ہونٹ کتنے گداختہ ہیں؛ اِن کے گداز میں کتنی حسّاس نزاکت ہے؛ اِن کی قوس، مصوّرِ فطرت نے کتنی فن کاری سے بنائی ہے!

غُٹرغُوں ......

اُن ہونٹوں کی قوس میں اچھوتی دوشیزگی تھی جسے نظروں کے لمس نے بھی ملوّث نہ کیا ہو ......

اِتنے پاکیزہ جیسے اُن کا گداز، خیال کی آغوش سے بھی گریزاں رہا ہو۔

''میں کن خیالوں میں کھو گیا ہُوں؟ میں جو اُس کی تلاش میں ہُوں ...... وہ جو ایک حقیقت بھی نہیں۔ میری عظمت جو ادھوری تصویروں کی خالق ہے ...... ایک معصوم فریب کی رہینِ مِنّت کیسے ہو سکتی ہے! میں تاج محل کا شہزادہ خرم نہیں ...... نہیں ...... میں تو تاج محل کا خالق ہُوں! وہ کون ہے جس کی مجھے تلاش ہے کہ میری ادھوری تصویر ......''

ادھوری تصویر ...... معصوم آنکھیں ...... معصوم ہونٹ ...... قوسِ قزح ...... فریبِ نظر ...... قوسِ قزح

......دھنک کے سات رنگ، آفتاب کی تجرید...... یہ نغمی تھی یا مہرالنسا جو دھنک سے اُتر رہی تھی، اور اُدھر کھجور کی پھننگ سے دُھوپ کی ایک لرزش نے گلاب کی کلی کا مُنہ چُوم لیا تھا اور کلی چٹک کر پھُول بن گئی تھی...... گل غنچگی میں...... رنگ کا دریا...... ایک لہر...... مصوّر کا مُوقلم لرزا...... اُس کی نوک سے ایک چھینٹا پھسلا اور اُس کی ادھوری تصویر پر گِر کر دھنک کے سات رنگ بن گیا...... ادھوری تصویر...... یہ تصویر کب مکمل ہوگی...... نغمی گھنٹوں ماڈل بن کر میرے سامنے بیٹھی...... میں اُس کا اَسرار نہ پا سکا...... وہ کون ہے...... یہ لمحہ مجھے کب آزاد کرے گا...... کلی مسکرا کر پھُول بن گئی ہے...... ازل سے یہی ہوتا آیا ہے اَبد تک یہی ہوتا رہے گا...... دھرتی کے کینوس پر خالقِ ازل و اَبد کی تصویر اِسی طرح تکمیل پذیر ہوتی رہے گی لیکن مَیں...... میری تصویر...... میں تصویروں کا مکینک نہیں...... میں تو تخیل کا مصوّر ہُوں...... نغمی کی اَدھ کھُلی آنکھ میں خواب کا ایک اَبر پارہ اُڑ رہا ہے...... اَبر پارہ یا نغمی...... یہ نغمی تھی...... یہ نغمی نہیں تھی۔

یہ نغمی تھی یا مہرالنسا جو سرو کے ایک درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ اور باغِ جہاں گیر کی رِوش رِوش آباد تھی! مینا بازار لگا تھا۔ باغِ جہاں گیر کی ہر رِوش پر رنگ اُڑ رہے تھے، اور بُو آوارہ تھی۔ باغیچوں میں رنگ برنگ کے پھُول مسکرا رہے تھے۔ اور کلیوں کے چٹکنے کی صَدا آ رہی تھی...... اور وہ لڑکی، ہجوم سے ہٹ کر، ایک سَرو کے نیچے کھڑی تھی کیوں کہ اُس کا ہجوم سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اُس کی اَدھ کھُلی آنکھوں میں خواب کا ایک اَبر پارہ اُڑ رہا تھا اور اُس کے حاشیے پر سبز لکیر مصروفِ پرواز تھی۔ پھُول پر اَبر کا سایہ تھا اور اَبر پارے میں پھُول کھِل رہے تھے۔ صبا اور نسیم کے جھونکے، پھُولوں کے فرش پر یُوں چل رہے تھے جیسے گُل کتر رہے ہوں اور خِرام ناز میں رقص تھا اور ساز میں آواز نہیں تھی۔ وہ زعفران تھی، وہ سِتارہ تھی، اُس کے گلے میں مَروارید کی مالا تھی۔ اُس کی اوڑھنی سے عَنبر کی خُوش بُو آ رہی تھی۔ وہ کابل سے آئی تھی۔ اُس نے قندھار میں جنم لیا تھا۔ اُس نے ایران کی سَرزمیں سے پھولوں کی نکہت اُڑائی تھی۔ اُس کے بیضوی چہرے پر مغلئی آنکھیں تھیں...... ترچھی آنکھیں، سُرمے کے دُنبالے، کَسا کَسا لباس اور سانچے میں ڈھلا ہُوا جسم، تُرکانِ غمزہ زَن یاسمن کی کلیاں، گلاب کے پھُول، چنبیلی کی نگہتیں، سنبل و ریحان کے کاکلِ پریشاں، بنفشے کے پیچ، آنکھوں میں گُلِ داوُدی، آگ اور پھُول کا میل...... سُرخ ہونٹوں کی اوٹ میں خلیجِ فارس کے موتی...... پلکوں میں شمشیرِ اصفہان کی آب...... چنبیلی کی خُوش بُو...... مُولسری کی لڑی...... چنبیلی کا ہار...... ناک، راج پُوتی کٹار کی دھار...... کنول نین...... سان پر لگی بھنویں...... پلکوں میں کالی راتوں کے سِتارے...... مانگ میں کہکشاں کی دُھول...... چھُوئی مُوئی...... تُلسی کی پتیّاں...... کاجل کے دھارے...... برکھا رُت کی

گھٹائیں ...... چہرے شام پارے، بدن بانکے ترچھے چھریرے؛ گنگا اور جمنا کے دھارے؛ اور وہ لڑکی اُس ہجوم میں سے نہیں تھی کیوں کہ وہ ایران سے نہیں آئی تھی۔ اُسے ہند کی خاک نے بھی جنم نہیں دیا تھا۔ اُس کی نوخیز جوانی، اپنی آگ سے بے خبر تھی حالاں کہ ابھی ابھی شاعرانِ عجم نے اُس کی شان میں غزل ایجاد کی تھی اور شاعرِ شیراز نے اُس کے مخملیں رُخسار کے ایک تِل پر سمرقند و بخارا نثار کر دیے تھے۔ بھرتری ہری نے اِسی کے لیے جوگ لے لیا تھا اور رام نے سیتا کو اِسی کے لیے اگنی کنڈ میں ڈال کر پوِتر بنایا تھا۔ نل نے دمینتی کو اِس کی تلاش میں کھو دیا تھا اور یونان کے شاعر ہومر نے اِسی کے لیے آنکھوں کی بصارت دے کر شاعری کی بصیرت کا سَودا کیا تھا۔ وہ یونان کو چھوڑ کر ترائے میں چلی گئی تھی کیوں کہ اُس نے خُسرو کے محل میں تیشۂ فرہاد کی آواز سُنی تھی اور وہ محملِ لیلیٰ میں بیٹھ کر صحرائے نجد کی ریت کا سَراب بن گئی تھی۔

یہ نغمی تھی یا مہرُالنسا؟

اَب اُس کے ہاتھ میں دو کبوتر تھے جو اُسے معصوم آنکھوں سے ٹِر ٹِر تک رہے تھے۔ وہ حیران تھے کیوں کہ اُس کے ہاتھوں کے گداز میں راحت تھی حالاں کہ مخروطی اُنگلیوں کی آتشیں پوروں سے بجلی کے شرارے پھُوٹ رہے تھے اور سَرو کی چوٹی پر ایک اَبر پارہ معلق تھا اور اُس لڑکی کے رُخساروں سے پھُوٹ نکلنے والے سُرخ شعلے اَبر پارے کو آگ لگا رہے تھے۔ یہ کون تھا جو دو کبوتر اُس کے ہاتھ میں تھما کر مینا بازار کی سَیر کو چل دیا تھا؟ وہ ایران، کابل، قندھار اور ہندوستان کے سنگم پر کھڑا تھا، جیسے ابھی ابھی مرج البحرین کا معجزہ رُونما ہُوا ہو۔ اُس کے کانوں میں ہندوستان کے مُندرے تھے اور اُن کے ساتھ لعلِ بدخشاں معلّق تھے جو ڈھل ڈھل چمک رہے تھے۔ اُس کی مَسیں بھیگ رہی تھیں اور سبزۂ خط اُتر رہا تھا۔ عُرفی نے ابھی ابھی اُس کی شان میں قصیدہ لکھا تھا اور اُس کے تُرکستانی اور راج پُوتی حُسن پر ایرانی تغزّل کے سَدا بہار پھُول نچھاور کیے تھے۔

با اَدب باملاحظہ ہوشیار! ظِلِّ الٰہی تشریف لاتے ہیں۔
مہابلی اکبر بادشاہ، مینا بازار کی سَیر دیکھنے آ رہے ہیں۔
نادرہ، اَری نادرہ!

پھولوں کے ایک کُنج سے قہقہہ بلند ہُوا، جیسے خُسرو کے سات تار جھَن جھنا اُٹھے ہوں۔ ایران کے نغمے کا ہِند کے سنگیت کے ساتھ مِلاپ ہو گیا تھا۔

انارکلی۔

انار، بابر کی تزک کے ساتھ قندھار سے آیا تھا...... کلی نے ہِند کی دھرتی سے جنم لیا تھا......

مہابلی ظِلِّ الٰہی، انارکلی کا رقص دیکھیں گے۔

ستار اَور طبلے کی سنگت ہُوئی۔ نغمہ مَوج در مَوج اُبلا۔ کابل اَور جمنا مِل گئے۔ سبزے کا مخملیں فرش...... پھُولوں کے کُنج...... خُوش بُو کی سوزنی...... طبلے کے توڑے...... سِتار کی لرزشیں...... میگھ ملار...... دِیپک راگ...... کبھی آگ لگی...... کبھی ٹپ ٹپ بُوندیوں کا راگ چھڑا۔

بے مثل...... بے نظیر! گیت کے لفظوں کے لیے تیری آواز ایک شراب ہے۔ مگر اَے جنّتِ اَرضی کی حُور! اَب کوئی رقص، ہم اِس شُعلے کو بے قرار دیکھنا چاہتے ہیں!

رقص کی اُڑانیں...... نرت میں بجلی کی چمک...... اُنگلیاں شہابِ ثاقِب...... انار کی پتیّاں، جگنو کے شرارے...... دھنک کا جُھولا آسماں کی بلندیوں سے چُھو گیا...... سَرو کی چوٹی پر اَبر کا آتشیں ٹکڑا چھم چھم برسنے لگا......

اَے تُرکِ غمزہ زَن کہ مُقابل نشستہ!

محفل برخاست ہو!

ظِلِّ الٰہی کی آواز میں چنگیز کی گرج تھی، تیمور کا صاعِقہ خیز دبدبہ تھا۔

ظِلِّ الٰہی...... مہابلی...... مہاراج...... ظِلِّ الٰہی...... ابّا جان...... ننگِ خاندان......

شیخو بیٹا! ہم تختِ ہِند کو محبّت کی آگ سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم تمھاری ذات میں ایران، ترکستان اَور ہندوستان کا مِلاپ دیکھنے کے آرزو مَند ہیں۔ جیجوں، سیحوں، کابل اَور گنگا جمنا کے دھاروں کا سنگم......

اِس بے باک عورت کو لے جاؤ اَور زِندان میں ڈال دو!

اَور انارکلی کے زرد چہرے پر، جو کسی شاعر کا خواب تھا، کسی مصوِّر کا تخیّل، ہِند کے آسماں سے اوس کے چھینٹے برس گئے اَور اُس کا چہرہ شاداب ہو گیا، نکھر گیا، جیسے انار کلی دُھل کر مسکرا اُٹھی ہو!

میں نے ہندوستان کو اَپنے قدموں میں دیکھ لیا ہے۔ شہنشاہ کا آہنی قانون کانچ کی چُوڑی کی طرح ٹوٹ گیا ہے۔

اَور وہ بے نیاز گم صُم سی لڑکی ابھی تک سَرو کی چھاؤں تلے کھڑی تھی!

سَرو کی چوٹی کا اَبر پارہ، آتشیں حاشیے سمیت اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا ہے۔

اَور ہندوستان کی تاریخ ایک بے اِنتہا نازک موڑ پر کھڑی تھی۔ پھر...... ہَوا کی ایک لرزِش...... سفید ہیولا...... آسماں کی نیلاہٹ...... بہار کی دُھوپ...... خُوش بُو کی لپک، کلیوں کی چٹک...... سَرو کی چھاؤں...... سفید ہیُولا فضا میں رقص کرنے لگا...... اَور وہ لڑکی، تبسم ریز ہو گئی...... گلاب کی پتّیوں پر خلیج فارس کے لُولُوئے تاب دار جھلک گئے۔

اے لڑکی، میرے کبوتر لاؤ!

وہ لڑکی جو تاریخ کے اِنتہائی نازک موڑ پر کھڑی تھی، چونک گئی؛ لیکن اُس نے بڑی بے نیازی سے کبوتر والا ہاتھ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

ایک؟

آواز کے تحکم میں حیرت کی لرزِش تھی۔

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا کیوں کہ سفید نقطہ، آسماں کی نیلاہٹ میں کھو گیا تھا۔

دُوسرا کیا ہُوا؟

حیران لہجے نے پوچھا۔

لڑکی آسماں کی نیلاہٹوں میں گم تھی۔ اِس لیے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

ہم جواب کے منتظر ہیں!

اُڑ گیا!

کیسے؟

لہجے کی شاہانہ تمکنت میں غصے کی تھرتھراہٹ تھی۔

یوں!

لڑکی نے کبوتر والا ہاتھ کھولا۔ حِنائی اُنگلیوں کے گلاب سے دُوسرا کبوتر پھر سے اُڑا، تیر کی طرح سیدھا اُٹھا اَور پھر سَرو کی چوٹی پر قلابازیاں کھانے لگا۔ تب دو نقطے ملے اَور آسماں کی نیلاہٹ میں گم ہو گئے۔

وہ لڑکی مسکرانے لگی۔

لیکن شاہانہ تمکنت کا غصہ تخیل کے خم و پیچ میں اُلجھ گیا۔

بہزاد بہت اچھا مصوِر ہے۔ وہ ہر چیز کی تصویر کھینچ کر رکھ دیتا ہے......

بابر نے تزک میں لکھا:

مجھے تصویروں کا ذوق اَور نقاش کو سمجھنے کی مہارت اِس قدر زیادہ ہو گئی ہے کہ گزشتہ اَور موجودہ زمانے کے ماہر مصوِروں کا کوئی بھی نمونہ مصوِر کا نام بتائے بغیر میری نظر سے گزارا جائے تو میں فوراً اَندازہ لگا لیتا ہوں کہ اِس کا مصوِر کون۔

سلیم نے کہا:

میں اِس لڑکی کی تصویر کھینچوں گا!

جہاں گیر نے تزک کا ایک صفحہ کھولا۔

یہ صفحہ سادہ تھا۔ اُس کے مُوقلم نے رنگوں کی آمیزش کا راز نہ پایا تھا۔ اور اُس نے تزک بند کر دی۔
وہ مصور تھا...... وہ تختِ ہندوستان کا وارث تھا...... اُس کے ہاتھ میں مُوقلم نہ آیا کیوں کہ عصائے شاہی نے اُس ہاتھ سے تخیل کو چھین لیا تھا...... اُس کی تصویر ادھوری رہ گئی کیوں کہ یہ صَفحہ قرطاس پر منتقل نہ ہو سکی تھی...... سَرو کا درخت...... پھُولوں کا کُنج...... بہار کی نیلاہٹ...... اور وہ لڑکی جو سَرو کے نیچے کھڑی تھی، تاریخ کے صَفحوں سے گم ہو گئی لیکن وہ کون تھی؟

تُزک کا وُہ صَفحہ تاریخ کے دُھندلکوں میں کیوں کھو گیا جس پر اُس لڑکی کی ادھوری تصویر کا ہَیُولا اُبھرا تھا...... ادھوری تصویر...... وہ اُسے شراب کے پیالے میں ڈھونڈتا رہا...... اور تاریخ نے لکھا:

یہ من گھڑت قِصّہ ہے کیوں کہ اِس کا تُزک میں ذِکر نہیں حالاں کہ تُزک کا مصنف بڑا بے باک جزئیات نگار تھا۔

تاریخ بڑی بے رحم ہے۔ تاریخ بڑی مہربان ہے۔ تاریخ نے اُس لمحے کو آزاد کر دیا...... ہندوستان کے بادشاہ نے ایک پیالہ شراب اور دو کباب کے لیے سلطنتِ ہند کو اُس کے ہاتھ بیچ دیا تھا...... اور اُس کی تکمیل ہو گئی تھی...... وہ جو مصوّر تھا، کیا اُس کی تصویر مکمل ہو گئی؟...... نہیں...... وہ لمحہ تو تاریخ کے اِنقلاب میں کھو گیا تھا...... دِنوں اور مہینوں، سالوں اور صدیوں کی چکّی میں پِس کر رہ گیا تھا...... کوئی تصویر مکمل نہیں ہوتی...... وہ مصوِّر جو تصویر کی تکمیل کا دعویٰ کرتے ہیں، مصوِّر نہیں ہوتے، عکّاس ہوتے ہیں؛ اور وہ مصوِّر تھا...... میں مصوِّر ہُوں...... اُس نے مہرالنسا کو کھو کر نور جہاں کو پا لیا تھا...... پر نور جہاں، مہرالنسا نہ تھی!

یہ نغمی تھی یا مہرُالنسا جو زندگی کے نازک موڑ پر کھڑی تھی۔

یہ نور جہاں تھی جس نے تاریخ کو ایک نیا موڑ دیا تھا...... اُس کے ہاتھ میں گلاب کا پھُول تھا، حُسنِ شاہانہ کی علامت...... اُس کے سَر پر تاج تھا۔ یہ ہیلن تھی۔ یہ قلوپطرہ تھی۔ یہ لیلیٰ نہیں تھی، یہ مہرالنسا نہیں تھی، یہ کون تھی؟ میں کیا جانوں، میں تو لمحے کا زِندانی ہُوں۔ ابھی میں نے کسی مہرُالنسا کو بھی نہیں دیکھا۔ میری تاریخ، میری تکمیل کیا کرے گی! میں ابھی تزک کے کسی خالی صفحے میں کھو جاؤں گا۔ میں ایک خواب میں کھو گیا تھا نغمی!

اُس نے دِھیمے لہجے میں سَرگوشی کی۔

نغمی مسکرائی۔ اُس کی آنکھوں کا اَبر پارہ فضا میں تحلیل ہو گیا۔

تمھیں وہ مِل گئی؟

تاریخ کے دُھندلکوں میں سے ایک آواز آئی۔

نہیں...... وہ کون ہے؟

سلیم نے چونک کر پوچھا۔

پھول تمھارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ تمھیں اُس کی تلاش تھی۔

نغمی نے کہا۔

نہیں...... میری تکمیل نہیں ہو سکی۔

سلیم کی آواز میں مایوسی تھی۔

لیکن وہ کون تھی سلیم؟

کون؟

ابھی ابھی میں نے اُسے تمھاری آنکھوں میں دیکھا تھا۔ باغِ جہاں گیر کی روِش روِش آباد تھی۔ وہ ایک سرو کے نیچے کھڑی تھی، اَور وہ کون تھا کہ جس کے وجود میں جیحوں، سیحوں اَور گنگا جمنا کا مِلاپ ہو گیا تھا۔ وہ جو اُسے دیکھ رہا تھا اَور ایک تصویر کا ہیُولا اُس کے تخیل میں اُبھر رہا تھا۔

وہ بھی میری طرح...... اُس کی ادھوری تصویر بھی مکمل نہ ہو سکی تھی۔ تزک کا وہ صفحہ تاریخ کے دُھندلکوں میں گم ہو گیا تھا اَور وہ مہرُالنسا تھی۔

نہیں...... وہ مہرُالنسا نہیں تھی۔ وہ نادرہ تھی۔ وہ انارکلی تھی۔ سلیم نے انارکلی کو مہرُالنسا کے رُوپ میں دیکھا تھا۔ سلیم انارکلی سے محروم ہو گیا کیوں کہ جہاں گیر کو نور جہاں مِل گئی تھی۔

نغمی!......

سلیم نے حیران ہو کر کہا:

تم اُس وقت کہاں تھیں؟

مہابلی میرا رقص دیکھ رہے تھے اَور میں ایک ترکِ غمزہ زن کے خیال میں غرق تھی اَور وقت کے دھارے تھم گئے تھے کیوں کہ وہ میرے مقابل بیٹھا ہوا تھا اَور ہندوستان کی تاریخ اُس لمحے کو فنا کی نیند سُلانے کے لیے پَر تول رہی تھی۔

نغمی!

سلیم نے اُسے پکارا۔

میں مہرُالنسا نہیں۔ میں نور جہاں نہیں۔ میں انارکلی ہُوں۔ میں وقت کے تخت پر نہیں بیٹھی۔ میں تو ایک لمحے کو جنم دیتی ہُوں، اَور خود وقت کی دیواروں میں چُن دی جاتی ہُوں!

نغمی کی آواز درد میں ڈوب گئی۔

میں نے اُس لمحے کو بھی کھو دیا۔ اَب میری تصویر کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ وہ زنجیر نہیں ٹوٹ سکی۔ میں سمندر کا نغمہ نہ سُن سکا۔ گھونگے کی لرزِش سَراب تھی...... وقت کا سَراب!

اَور پھر وہ فوّارے کے پاس کھڑے تھے۔

مینار، دُھوپ میں شرمائے کھڑے تھے۔ وقت کے قیدی، ترک شہزادے جو انارکلیوں سے آنکھیں چار نہ کر سکتے تھے!

☆☆☆

سرگوشی

یہ اُس کے بچپن کا واقعہ ہے!

رات اُس نے امّی جان سے پریوں کی کہانی سُنی تھی۔ یہ کہانی اِتنی پُراَسرار تھی کہ رات بھر وہ پرستان کے خواب دیکھتا رہا۔ وہ ایک طلسم زار میں یُوں گم رہا کہ دِن کی روشنی میں بھی اُس کی آنکھیں خواب دیکھتی رہیں اَور امّی جان کی لوری دینے والی میٹھی میٹھی آواز اُس کے کانوں میں رس گھولتی رہی۔

امّی جان نے کہانی یُوں شروع کی تھی:

ایک تھا شہزادہ۔ اُسے سیروسیّاحت کا بڑا شوق تھا۔ وہ جنگل میں ایک دِن شِکار کو گیا۔ اُس نے ایک خوب صورت ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالا اور ہرن چوکڑیاں بھرتا ہُوا ہَوا ہوگیا۔ وہ چھلاوے کی طرح کبھی کسی گھنی جھاڑی کے پیچھے نظر آتا، کبھی کسی درخت کی جھکی ہُوئی شاخوں کی اوٹ میں کھڑا دِکھائی دیتا، کبھی کسی ندی کے کنارے اُونچے اُونچے سرکنڈوں میں، کبھی ہَوا میں لٹکی ہُوئی کسی چٹان پر، اَور پھر ایک ٹیلے پر پہنچ کر وہ فضا میں گم ہوگیا...... اَور تب شہزادے نے ایک سرگوشی سُنی جیسے کوئی اُسے میٹھی آواز میں پکار رہا ہو......

ایک سرگوشی، اَور اُسے نیند آگئی تھی۔ نہیں، وہ تو امّی کی میٹھی میٹھی مدھم آواز سن رہا تھا جیسے کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو...... اَور دوپہر کے وقت جب تیز دُھوپ چمک رہی تھی، وہ سکول سے آتے ہوئے نہ جانے اُس ٹیلے کی طرف کیوں چلا گیا جہاں کیکر کے ننھے منے درخت تھے اَور اُن کی چھدری چھاؤں میں دُھوپ کے قُرص، چاندی کے دھبّوں کی طرح ناچ رہے تھے اَور فضا میں گمبھیر سنّاٹا تھا اَور کیکر کی ٹہنیوں پر فاختائیں کُوکُو کر رہی تھیں...... بڑی نرم میٹھی اُداس اُداس سی آواز میں، اَور وہ ایک کیکری کے نیچے بیٹھ گیا اَور اُس کے سر پر بیٹھی ہُوئی فاختہ کوکو کر رہی تھی اَور اُس نے یُوں محسوس کیا جیسے وہ جنگل میں بھُولا ہوا شہزادہ ہو اَور فضا کی تنہائی اُس کے ساتھ ہم کلام ہونے والی ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کرلیں اَور پھر اُس نے وہ سرگوشی سُنی حالاں کہ فاختہ اُس کیکری سے اُڑ کر دُوسری پر جا بیٹھی تھی...... یہ سرگوشی...... جیسے کوئی بغیر آواز کے اُسے پکار رہا ہو: وہ جو جنگل کا شہزادہ تھا!

اَور اَب اُس کی کَن پٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے۔ اُس کے جذبات میں نہ بچپن کی خواب آلود

معصومیت تھی، نہ جوانی کی حدّت۔ یُوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہار کی جنُوں سامانیوں سے بخیر و عافیت گزر گیا ہو اور اَب ذہنی اور فکری طور پر خزاں کا اِستقبال کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہو۔ اِس جذباتی سکون کے باوجود اُس کے احساس کی دھار کُند نہ ہُوئی تھی۔ وہ نہ شاعر تھا نہ فلسفی، نہ وِیدانتی نہ صُوفی: اُس نے کبھی شعر نہ کہا تھا، نہ اُس نے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا، نہ تصوّف کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کی تھی، وِیدانت کے اَسرار بھی اُس کی نگاہوں پر فاش نہ ہوئے تھے لیکن اگر فلسفہ، زندگی ہے تو وہ اَپنے طور پر سالِک بھی تھا۔

وہ ایک چھوٹے سے قصبے کا رہنے والا تھا جہاں دِن کی دُھوپ میں بھی کوئی ہنگامہ برپا نہ ہوتا اور شام کو ہر روشنی سوئی سوئی، اُونگھتی ہُوئی محسوس ہوتی، جیسے ابھی ٹِم ٹِما کر بجھ جائے گی اَور سَرِشام فضا پر دُھواں سا چھا جاتا، جیسے وجود عدم میں کھویا جا رہا ہو، یا جیسے عدم وجود کے طلسم خانے سے اُبھر رہا ہو، یا جیسے جنگل کا اَسرار طاری ہو رہا ہو اَور شہزادے رَستہ بھُول رہے ہوں؛ اَور وہ قمقموں کی زرد زرد روشنی کے ٹِم ٹماتے ہُوئے سحر میں یُوں کھو جاتا جیسے وہ بھٹکا ہُوا راہی ہو اَور اُس کی منزل بہت دُور ہو۔

اُس کی سوچ، خواب کے ایک اَبر پارے پر پرواز کر کے کبھی کبھار ایک قوسِ قزح سے ضرور جا ٹکرائی اَور ایک دُھویں میں گم ہو گئی، جیسے تخلیق کے نقطۂ آغاز پر پہنچ چکی ہو۔ اِس کے باوجود وہ سوچ کے سَرچشمے سے آگاہ نہ ہو سکا کیوں کہ یہ مبہم سی سوچ ایک تجریدی خیال تھی یا ایک گریز پا کِرن جس میں دھنک کے سات رنگ، شام کا دُھواں اَور شفق کی سُرخیاں سما جاتی تھیں۔

وہ فطرتاً درد آشنا تھا لیکن اَعصاب زدہ نہیں تھا۔

وہ ذہنی اَور جسمانی لحاظ سے صحت مَند تھا۔ اُس کا حلقۂ اَحباب وسیع نہیں تھا۔ لیکن وہ کم آمیز بھی نہیں تھا۔ اُس کے دِل میں گداز تھا اَور اِنسان کے دُکھ پر اُس کی آنکھ بھی کئی بار تر ہوئی تھی۔ زمین سے اُسے بڑا پیار تھا۔ چاند پر اُڑ جانے کی اُس نے کبھی تمنا نہ کی تھی کیوں کہ دھرتی ابھی زندہ تھی، حالاں کہ وہ دُکھوں کے بوجھ تلے دَب کر سِسک رہی تھی؛ لیکن وہ ہَری بھری تھی اَور اُس کی کوکھ ابھی بانجھ نہ ہوئی تھی، اَور اُس کے آنسوؤں میں ممتا کی نرم گرم آنچ بھی تھی اَور محبّت کی نمی اَور خنکی بھی۔

لیکن کچھ عرصے سے اُسے یُوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ روشنیوں کے سَیلاب میں غرق ہو اَور اُسے روشنی کی تلاش ہو...... ایک عجیب سا احساس جس کا وہ تجزیہ نہ کر سکتا تھا جیسے وہ عشرتوں کے رنگ محل میں رہ کر بھی عشرت آشنا نہ ہو سکا ہو...... ایک عجیب سی تشنگی، جیسے وہ سَراب کے پیچھے بھاگ رہا ہو اَور اُس

کے حلق میں پیاس کے کانٹے بھی نہ پڑے ہوں۔

اَور اُس دِن ......

اُس کے قصبے میں سُورج ڈوب چُکا تھا اَور سڑکوں پر قمقمے جل اُٹھے تھے۔ اَور ٹھنڈی میٹھی اُداس سی روشنی میں دُھوپ چھاؤں کا اَسرار اُبھر رہا تھا اَور وہ حسبِ معمول، چھڑی ہاتھ میں لے کر، سَیر کے لیے گھر سے نکل رہا تھا کہ ریحانہ نے پوچھا:

آپ سَیر کو جا رہے ہیں؟

وہ حیران ہو گیا حالاں کہ سوال عجیب بھی نہیں تھا لیکن ریحانہ کے لہجے کے ایک اجنبی سُر نے اُسے چونکا دیا تھا:

کیوں؟

یوں ہی!

ریحانہ نے مسکرا کر کہا۔

وہ ریحانہ کی مسکراہٹ کا محرمِ راز تھا۔ یہ خاموش اَور متین سی مسکراہٹ تھی جو اَپنے آپ میں گم رہ کر بھی اجنبی محسوس نہ ہوتی تھی۔ اُس میں حِفظِ اَنا کی ہر آن موجود تھی اَور اِیثار کی ہر اَدا بھی، جیسے وہ سمندر کی لہروں میں ڈوب جانا چاہتی ہو اَور ڈوبنے کے لیے تیار بھی نہ ہو اَور آج اُس کی مسکراہٹ میں یہ اجنبی سُر کہاں سے آیا! کیا قطرہ، قُلزُم آشنا ہو گیا تھا؟

تم بھی ساتھ چلو گی؟

میں......نہیں تو......میں

اُس کی مسکراہٹ نے کانپ کر کہا۔

"نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی کہ مسکراہٹ کانپ اُٹھی!"...... اُس نے سوچا اَور ریحانہ کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ مسکراہٹ اُس کی نظروں سے بچتی رہی اَور کانپتی رہی اَور ایک لمحہ آیا جب اُن کی آنکھیں مل گئیں اَور کانپتی ہُوئی مسکراہٹ، ریحانہ کی آنکھوں میں ایک تحریر بن گئی: "میں گرہست کی چِتا میں جل کر راکھ ہو سکتی ہُوں، پر مَیں سِیتا نہیں کہ رام کے ساتھ بَن باس لے لُوں!"

عجیب بات تھی: اُس نے ریحانہ کی مسکراہٹ کو آج کس رنگ میں دیکھا!

پھر اُسے یُوں لگا جیسے ریحانہ یشودھرا ہو اَور وہ کپل وَستُو کا شہزادہ سدھارتھ ہو جو روشنی کی تلاش میں جا رہا ہو اَور اُس نے رات کے اَندھیرے اَور یشودھرا کی معصوم نیند کا بھی اِنتظار نہ کیا ہو!

اَور اُس شام سڑک پر جلنے والے ہر قمقمے نے اُسے مُندھی مُندھی آنکھوں سے حیران ہو کر دیکھا کیوں کہ وہ اجنبی تھا اَور روشنی کے سَیلاب سے بھاگ کر روشنی کی تلاش میں جا رہا تھا۔

پھر وہ اجنبی قصبے سے باہر' اُجڑے اُجڑے پارک کے ایک کونے میں بچھے بنچ پر بیٹھا تھا جہاں دُور جلنے والے قمقمے کی بجھی بجھی روشنی نے اَندھیرے کی پناہ تلاش کر لی تھی۔ اُس کے سر پر ایک گھنے درخت کا سایہ تھا اَور پتّوں میں ہلکی سی سرسراہٹ تھی کیوں کہ ابھی ابھی خُوش بُو کا ایک سانس گزرا تھا اَور اُس میں روشنی کی مدھم' بے نام سی جھلک تھی اَور اَندھیروں کی اَزلی اَور اَبدی لرزِش' اَور رقص کی ایک گَت بھی اَور نغمہ اندھیرے اَور اُجالے کے سنگم پر گنگنا اُٹھا تھا...... ایک سَرگوشی جو آواز کے قالَب میں نہ آ سکی تھی......

"یہ سَرگوشی!"...... "میں نہیں جانتا!"......

"یہ اندھیرے کی زبان تھی یا روشنی گنگنا اُٹھی تھی!"......

"میں مدھم سُروں کے نغموں کی تعبیر کا اَہل نہیں۔ میں تو اُونچی آوازیں سُن کر بھی اُن کا مطلب نہیں پا سکتا...... نہ جانے کس طُور کی بلندیوں پر' کون کسی سے ہم کلام ہُوا تھا! اَور میں نے اُس کی آواز...... بازگشت کی ایک اُڑتی ہُوئی لَے سُن لی تھی یا شاید سلسلۂ زمان ومکاں سے ایک لمحہ کٹ کر قلزمِ ہستی میں آبِ نیساں کا قطرہ بن کر ٹپک گیا تھا...... میں نہیں جانتا......!"

وہ گھر واپس آیا تو اُس کے بچّے سو رہے تھے اَور ریحانہ سوئی سوئی آنکھوں سے اُس کا اِنتظار کر رہی تھی...... وہی حِفظِ اَنا سے بھرپور آنکھیں جن میں اِیثار و محبّت کی دِھیمی لَو بھی تھی' پر اُس نے ریحانہ سے آنکھیں نہ ملائیں۔ وہ دونوں مدّتوں سے اجنبی ہو چکے تھے۔ مرج البحرین کے بعد دونوں دھارے الگ الگ بہ رہے تھے۔

لیکن صبح زندگی اَپنی معمولی ڈگر پر آ گئی!

اُس نے سوچا: "وہ سَرگوشی کیا تھی؟"

ریحانہ کی مسکراہٹ نے کہا: "آپ نے سَرگوشی کہاں سُنی؟ یہ تو رُوح کی پاتال سے آتی ہے!"

"ہو سکتا ہے' یہ سَرگوشی' جو آواز کے رُوپ میں نہ آئی' وہی ہو جو میں نے تخلیق کے پہلے دِن سُنی تھی؛ جب ابھی ابھی میرا ہیُولا بنا تھا اَور اُس میں اُس نے رُوح پھُونک کر فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ اِسے سجدہ کرو!"

"سب کچھ ہو سکتا ہے' اَور کچھ بھی ممکن نہیں۔"

ریحانہ!

اُس نے چَونک کر کہا۔

جی!

کچھ بھی نہیں۔ یُوں ہی...... میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن میرا خیال نقشِ صحرا کی طرح مِٹ گیا ہے!

دُوسری شام، وہ اُس اُجڑے ہوئے نیم تاریک پارک کے ایک تنہا بنچ پر بیٹھا تھا اور تیسری شام بھی ...... اور یہ سلسلہ دراز ہوگیا اور وہ زندگی کے معمّے پر غور کرتا رہا اور اُس کی سوچ کے کوئی دو سِرے بھی آپس میں نہ مل سکے۔ یہ تانا بانا اُلجھتا رہا اور سُلجھ نہ سکا۔ وہ اپنی ہی آگ میں جلتا رہا اور جَل کر، نہ خاک ہوا نہ اَگنی کُنڈ سے نکل کر اَمر ہو سکا۔

''میں کون ہُوں؟ ...... میں کون ہُوں؟'' ......

اُس نے آسمان سے پوچھا۔ سِتارے ٹِم ٹِما کر بجھ جاتے رہے اور چاند نے چمک کر تاریک کونے میں ایک کِرن پھینکی لیکن اُس کے گوشۂ بصیرت میں کوئی روشنی نہ ہُوئی اور اُس کے پاؤں تلے زمین، سسکتی رہی، جیسے وہ زندگی کے بوجھ تلے دَب کر پِس رہی ہو اور اُس کے آنسو، گھاس کی پتّیوں پر ڈھلک رہے ہوں اور ہَواؤں کے دوش پر خنک سانس بن کر اُڑ رہے ہوں اور سُورج کی کِرن اُنھیں ایک لمحے کی چمک دے کر فضا میں تحلیل کر رہی ہو!

''میں کون ہُوں؟ ...... میں کون ہُوں؟''

یہ سوال، لمحے کے محور پر یُوں گھوم رہا تھا، جیسے چکّی چل رہی ہو اور اُس کی اَنا دو پاٹوں کے درمیان آکر پِس رہی ہو اور زمین رو رہی ہو: یہ اَزلی و اَبدی سوال ...... کیا اِس کا جواب اُس کی رُوح کی کسی نامعلوم گہرائی میں موجود تھا؟ ......

''شاید ...... پر مَیں نہ فلسفی ہُوں نہ صُوفی نہ شاعر نہ وِیدانتی ...... میں ایک سَرگوشی کے نقشِ پا پر چلا جا رہا ہوں جو اَپنے منبع کی طرف لَوٹ گئی ہے۔ یہ آواز، اَزل کے ایک لمحے پر مجھ سے جُدا ہوگئی تھی اور میں اَبد کے دُوسرے کِنارے پر اِس کی تلاش کر رہا ہُوں!''

''کیا یہ ہر اِنسان کا اَلمیہ ہے؟''

اُس نے اَپنے آپ سے سوال کِیا۔

''ہر اِنسان کا اَلمیہ ...... کوئی سِتارہ ٹوٹتا ہے تو خلا میں گم ہو جاتا ہے اور ایک سُر، وقت کی راگنی سے الگ ہوتا ہے تو سینا کی وادی میں کھو جاتا ہے!''

''میں کون ہُوں؟''

''میں نہیں جانتا!''

''میں وہ ہُوں جو کچھ کہ میں ہُوں!''

''میں تو ایک عام اِنسان ہُوں جو خلا میں پہنچ کر بھی ...... میں کون ہُوں؟ کا جواب نہ پا سکا اور آج میں یکایک فلسفی بن گیا ہُوں اور ذات و صِفات کے طلسم زار میں کھو گیا ہُوں۔ اُٹھو میاں فلسفی، اَپنے گھر چلو! کون سا گھر

......طُور کی چوٹی پر یا گیا کے پاس شجرِ حکمت کے خنک سایوں میں؟......اَور یہ سَرگوشی......یہ آواز جو آواز سے محروم تھی!......فاران کی چوٹی سے آئی تھی یا جبریل کے شہ پر کی ہلکی سی گونج تھی......یہ آواز، رَوشنی کی ایک کِرن کے ساتھ اُتری تھی یا رَوشنی، آواز بن گئی تھی!......کون جانے؟......میں تو ایک ذرّہ ہُوں اُس ریگ زار کا جسے کائنات کہتے ہیں......یہ ذرّے بھی تو کائنات کا عکس ہوتے ہیں لیکن کائنات کی مہیب عظمتوں کا راز نہیں پا سکتے۔ ذرّے طُور کی چوٹی پر......"

اَور وہ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا تھا۔

وہ چند لمحے پہلے اُس ندی کے کِنارے پر کھڑا تھا جو سَرسبز وادی میں سیماب بن کر مچل رہی تھی اَور اُس کی نظریں چوٹی پر لگی تھیں جہاں چیڑ کے درخت تھے اَور نیلا آسمان اُن کی پھننگوں کو چھُو رہا تھا۔ اُسے یُوں لگا جیسے زمین اَور آسمان مِل گئے ہوں، زمین بلند ہوگئی ہو، آسمان جھک آیا ہو اَور دونوں ایک دُوسرے سے سَرگوشی کر رہے ہوں!

ندی اُس کے پاؤں سے لگ کر مچل رہی تھی اَور گا رہی تھی۔ اُس نے اُس کے کنارے پر کچھ جنگلی پھول لہراتے ہُوئے دیکھے تھے۔ ندی کے کِنارے سے چوٹی تک کوئی پگ ڈنڈی نہیں جاتی تھی۔

"میں اُس چوٹی پر پہنچوں گا تاکہ زمین اَور آسمان کے مِلاپ کا قریب سے نظارہ کر سکوں۔"

اُس نے کچھ جنگلی پھول توڑے اَور اُن کا گُل دَستہ بنایا۔ پھر اُس نے چٹانوں میں سے راستہ تلاش کیا......اَپنا راستہ جس پر کوئی قدم نہ پڑا تھا کیوں کہ فطرتاً اُسے پامال راستوں سے نفرت تھی۔ وہ بڑھتا چلا گیا......اُوپر، اَور اُوپر، حتیٰ کہ ندی کی گنگناہٹ، دُور سے آنے والا دِھیما گیت بن گئی اَور وادی کے شاداب نظارے، فضا کے کینوس پر مدھم اَور دُھندلی تصویروں کا رُوپ دھار گئے۔

اُس کے چوٹی پر قدم رکھتے ہی زمین، آسمان سے جُدا ہوگئی، جیسے وہ اجنبی ہو اَور زمین کی دوشیزگی اُس کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکی ہو۔ چوٹی پر ہَری گھاس کا فرش تھا اَور چیڑوں کی جھالریں، سبز فرش پر چاندنی کیے ہوئے تھیں اَور ہَوا، جھالروں کو سرسرا رہی تھی۔ چوٹی پر دُھوپ بھی تھی اَور اُس میں سنہری شفق کا رَنگ گھُلا ہُوا تھا۔ وہ ایک لمحہ پہلے بہت خوش تھا۔ اَب ہَوا کے ایک خنک سانس نے اُس کی بھیگی ہُوئی پیشانی کو چھُوا تو وہ یکا یک اُداس ہو گیا۔ اُس سانس میں چیڑ کے پتّوں کی تیز خُوش بُو بھی تھی، پر وہ اُداس کیوں ہو گیا تھا......رِفعَت کی تمنّا میں جو لَو جل اُٹھتی ہے، وہ رِفعَت کے پا لینے پر بجھ کیوں جاتی ہے!

اُس نے ایک چیڑ کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا لی اَور آنکھیں مُوند لیں، جیسے وہ ایک سادُھو سنیاسی ہو، جو سمادھی لگا کر بیٹھ گیا ہو یا ایک صُوفی جو مراقبے میں ہو حالاں کہ وہ ابھی جوان تھا۔ ابھی تو وہ گرہست آشرم میں

بھی داخل نہ ہُوا تھا' سنیاس تو کوسوں دُور کی بات تھی۔ وہ آوارہ گرد جو بچپن میں بادل کے ٹکڑے کے ساتھ دوڑتا تھا تاکہ زمین پر اُس کے اُڑتے ہوئے سایے کو پکڑ سکے' جسے کتابوں سے زیادہ کھُلے کھیتوں سے محبت تھی' اَور اُن پگ ڈنڈیوں سے جو بَل کھا کر کھیتوں کی شاداب وُسعتوں میں کھو جایا کرتی تھیں' پہلی بار مَیدانوں سے پہاڑوں میں آیا تھا اَور آج اِس چوٹی پر پہنچ کر اُداسی' دِل گرفتگی اَور سوچ کی دُھند میں کیوں کھو گیا تھا!

....

باجی! میں تو بہت تھک گئی ہُوں۔

ناہید! ہم نے چوٹی سَر کر لی ہے۔ کیا تمھیں اِس پر خوشی محسوس نہیں ہُوئی؟

نہیں تو...... چوٹیاں نیچے سے بہت اچھی لگتی ہیں۔ دیکھیے تو باجی' آسمان یہاں سے کتنی دُور چلا گیا ہے!

زندگی بھی تو اِسی کا نام ہے پگلی کہ ہم منزل کی تلاش میں بڑھتے رہیں اَور منزل ہم سے دُور بھاگتی رہے!

یہ آپ کا فلسفہ ہے جو مجھے یہاں کھینچ لایا۔ آپ تو کہہ رہی تھیں کہ چوٹی پر فردوسِ گم گشتہ کا نظارہ ہوگا اَور یہاں تو خوف ناک تنہائی ہے اَور ہَوا کی سسکتی ہُوئی سَرگوشیاں ہیں۔ چلو باجی!

اِسی کا نام تو فردوسِ گم گشتہ ہے!

نہیں باجی! مجھے تو ڈر لگ رہا ہے۔

ڈرنے کی کیا بات ہے...... اِدھر آؤ! دیکھو تو' یہ آسمان ہے۔ وہ زمین ہے۔ وہ چمکتی لکیر' وادی میں بہنے والی ندی ہے جس کے کِنارے پر ہمارا گھر ہے۔ وادی میں دُھوپ چمک رہی ہے اَور ہم زمین سے دُور نہیں کیوں کہ زمین کے ساتھ ہمارا تعلق ٹوٹ نہیں سکتا' اَور آسمان بھی تو یہاں سے قریب ہے!

باجی! دُھوپ لرز رہی ہے۔ ہَوا چیڑ کی جالیوں کو سرسرا رہی ہے۔ مجھے تو یُوں لگتا ہے' جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو!

ناہید! تم چند لمحوں کے لیے خاموش رہو۔ میں ایک سَرگوشی کا اِنتظار کر رہی ہُوں...... کیوں کہ مَیں فردوسِ گم گشتہ میں پہنچ چکی ہُوں!

باجی...... باجی ساحرہ!...... آپ کا نام ساحرہ یُوں ہی تو نہیں رکھ دیا کسی نے!...... ابھی جادُو کا ڈنڈا ہلائیں گی اَور منتر پھونکیں گی' پھر ساری دُنیا کو نیند آجائے گی۔ چوٹی کی تنہائی میں ہَوا کے چند سانس بھی پتھر ہو جائیں گے اَور مَیں اکیلی رہ جاؤں گی...... باجی!

لیکن وہ فردوسِ گم گشتہ میں پہنچ چکی تھی' اَور وہ چیڑ کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے' بیٹھا سوچ رہا تھا......

''میں کون ہُوں؟ وہ کون ہے؟ یہ لڑکی جس کا نام ساحرہ ہے' اِس چوٹی پر کیوں آئی؟ وہی جو آنکھیں بند کیے چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھی ہے۔ اَور اُس کی بند آنکھوں میں نظاروں کے جو سلسلے جاری ہیں' میں بھی اُنھیں دیکھ رہا ہُوں۔ ہر طرف تخلیق کا عمل جاری ہے لیکن ابھی کسی تصویر میں جان نہیں پڑی۔ ہر چیز گونگی اَور بے حِس

ہے...... جامِد، اِضطراب سے محروم! نہ پرندوں کے چہچہوں میں آواز ہے نہ آب شاروں کے نغموں میں، نہ ہَوا کے جھونکوں میں سرسراہٹ ہے نہ خُوش بُو کی پھوار میں۔ بادل خاموش ہیں اَور کوثر و تسنیم کے دھارے ایک لمحے کے موڑ پر منجمد ہوگئے ہیں اَور دُوسرے لمحے کا اِنتظار کر رہے ہیں۔ ہر شے نقش بہ دیوار ہے...... میں نقش بہ دیوار ہُوں...... وہ نقش بہ دیوار ہے، جیسے پھُول کے عِطر دان میں بند خُوش بُو یا کلی کی معصُوم نزاکت جو کلی کے اَندر قید ہے...... میری سوچ جامِد ہے، اُس کی سوچ جامِد ہے۔ میرا اِحساس آواز سے محروم ہے...... اُس کا اِحساس نغمے کا ساکِت لمحہ...... 'کن' کہہ کر لبِ فطرت ساکِت ہوگیا؛ یا 'فیکون' کی منزل پر آواز، عدم کے قلزم میں کھوگئی؟"

ساحرہ باجی!

ناہید!

اَب چلو، شام پڑگئی۔ اَندھیرے کا قافلہ پہاڑ پہ اُتر آیا تو ہم بھٹک جائیں گے۔ آپ نے سرگوشی سُن لی؟

ہاں...... پر وہ آواز سے محروم تھی!

باجی، وہ کون ہے؟

ایک سرگوشی...... آواز سے محروم...... میں اُسے اَور کوئی نام نہیں دے سکتی۔

نہیں باجی! وہ جو چیڑ کے تنے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہے۔

ایک بھٹکی ہُوئی رُوح جو فردوسِ گم گشتہ کی تلاش میں اِس پہاڑ کی چوٹی پر آئی تھی اَور ایک جھلک پا کر......

دیکھو باجی! وہ اُٹھ کھڑا ہُوا ہے۔ وہ ہمارے پیچھے پیچھے آئے گا۔ مجھے اُس سے ڈر لگ رہا ہے!

اُس کا راستہ ہم سے جُدا ہے۔ وہ اَپنی راہ الگ تلاش کرے گا۔ ابھی ہم کسی نقطے پر نہیں مِل سکتے کیوں کہ میں نے اُس نقطے کو اَزل کی پہنائیوں میں دیکھا تھا اَور ابھی اُسے حرکت کا اِذن نہیں مِلا تھا۔

اَور تب وہ چٹان کی اوٹ میں نظروں سے اوجھل ہوگئیں۔

اَور وہ پارک کے ایک تنہا کونے میں ایک بنچ پر بیٹھا تھا حالاں کہ وہ ابھی ابھی پہاڑ کی چوٹی سے اُترا تھا۔ صبح، رات کی کوکھ سے جنم لے رہی تھی اَور سِتاروں کے ٹِم ٹِماتے ہُوئے دیے ایک ایک کر کے بجھتے چلے جارہے تھے اَور اُس کی پیشانی پر دھرتی کے خنک بوسوں کی نمی تھی۔

جب وہ گھر پہنچا تو ریحانہ کی حفظِ اَنا سے بھرپور آنکھوں میں بہ دستور اِیثار و محبّت کی دِھیمی جوت جگ رہی تھی اَور ایک اُداس سا دُھندلا خواب کہہ رہا تھا: "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ اَپنی منزل پر نہ پہنچ سکے! میں آنے والے لمحے سے خائف ہُوں لیکن میں یہ بھی چاہتی ہُوں کہ آپ کی رُوح کا کرب، نِروان سے ہم کنار ہو جائے!"

اَور ایک دِن وہ چپکے سے گھر سے نکل گیا۔

وہ اُس وادی میں کھڑا تھا جہاں ندی کی لہریں سیماب کی طرح مچل رہی تھیں اَور اُس کی نظریں

پہاڑ کی چوٹی پر لگی تھیں۔ لیکن اَب اُس چوٹی کی طرف بہت سی پگ ڈنڈیاں بل کھاتے ہُوئے جا رہی تھیں اَور وہ ایک پگ ڈنڈی پر ہولیا۔ پامال راہ پر اُس کے قدموں کے نشان ثبت ہوتے چلے گئے اَور اُسے افسوس ہُوا، جیسے وہ اَن گِنت نُقُوشِ پا میں اِنفرادیت کو گم کرتا چلا جا رہا ہو۔

پہاڑ کی چوٹی پر پارک بن چکا تھا۔ چیڑوں کے سایے تلے بنچ لگے ہوئے تھے اَور جگہ جگہ پھُولوں کی کیاریاں تھیں معلق باغیچوں میں سُرخ، نیلے پیلے، اُودے اُودے پھُول کِھلے تھے اَور دُھوپ، چنبیلی کے پھول کی طرح، اُجلی اُجلی مسکراہٹ لیے، پھولوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ چوٹی پر نیل گُوں آسماں کا سایہ تھا لیکن زمین اَور آسمان کا مِلاپ ادُھورا رہ گیا تھا۔ فردوسِ گم گشتہ، ساحرُالموت کا برگِ حشیش تھی کہ ہوش آنے پر نظاروں کا طلسم ٹوٹ گیا تھا: ''میں یہاں کیوں آیا...... کھوئی ہُوئی جنّت کی تلاش میں؟'' وہ ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ چیڑ کی جھالریں سرسرائیں لیکن اَزل خاموش رہی...... ساکِت اَور صامِت......!

اَور پھر وہ سمندر کے کِنارے پر تھا اَور پانی سمٹ کر دُور چلا گیا تھا۔ گیلی ریت پر چلتے ہُوئے اُس کے پاؤں کے تلووں میں خنکی سرایت کر گئی تھی۔ ایک عجیب سی راحت کا احساس اُس کے تھکے ہُوئے اَعصاب کو گدگدا رہا تھا اَور اُس کی نس نس میں غنودگی کا کیف سرسرا رہا تھا کیوں کہ وہ دُور سے آنے والی لہروں کی لوری سُن رہا تھا۔ ریت اُس کے پاؤں تلے سرسرا رہی تھی، جیسے پانی سے مِلاپ کی دبی دبی مسرّت تھرتھرا رہی ہو۔ موجیں اُس کے جسم کو چھُو رہی تھیں، اُن میں چاندنی گھُلی ہُوئی تھی۔

''زندگی نے پانی سے جنم لیا۔''

''کیا یہ وہی سرگوشی تھی کہ کسی لہر کی زبان پر آئی اَور لوٹ گئی؟''

اُس کا سوال اُمنڈی ہُوئی کف بر لَب موجوں کے شور میں ڈوب گیا۔

تب وہ ریت کے ایک ٹیلے پر کھڑا تھا۔

اُس کے اِرد گِرد لق و دق صحرا تھا جس کی وسعتیں اُفق سے جا ٹکرائی تھیں...... مَوج در مَوج، یم بہ یم پہنائیاں...... اُفق کے کِنارے رَنگین تھے کیوں کہ ابھی ابھی سُورج ایک ٹیلے کے عقب میں چھُپ گیا تھا۔ جھاڑیوں پر چند سنہری کرنیں پھڑپھڑا رہی تھیں اَور اِکّا دُکّا درختوں کے سایے شفق کی سُرخیوں میں گم ہو گئے تھے۔ ساکِت و صامِت فضا میں ایک موہوم سی تھرتھراہٹ تھی اَور مغرب میں ڈوبا ہُوا سُورج مشرق سے پھر برآمد ہو گیا تھا۔ یہ صحرا کا فریب تھا یا اُس کا واہمہ کیوں کہ صحرا، چمکتی دُھوپ میں سراب بن جاتا ہے اَور جب دُھوپ، شام کے سانولے دامن میں مُنہ چھپا لیتی ہے تو اَندھیروں کا سَراب جنم

لے لیتا ہے یا سُورج پھر مشرق سے برآمد ہو جاتا ہے۔

"میں کن بھول بُھلیوں میں کھو گیا ہوں!"

چند لمحوں بعد صحرا پر چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی۔

مرجھائی ہُوئی جھاڑیاں اَور لُنج مُنج درختوں کی کایا بدل گئی تھی کیوں کہ خاموش ریگ زار میں زندگی کی ایک غیر مرئی لہر در آئی تھی اَور ریت کے بطن میں زندگی کُلبلا رہی تھی۔ ہَوا کے سانسوں میں خنکی تھی اَور خنکی میں چاندنی رچی ہُوئی تھی۔ یہ غیر مرئی زندگی' یہ لرزتی ہُوئی چاندنی...... یہ صحرا کا فریب تھا یا صحرا جاگ رہا تھا کیوں کہ ٹیلے کی ریت سرسرا رہی تھی اَور چاندنی گنگنا رہی تھی۔ کیا زندگی' ریت اَور چاندنی کے ملاپ سے جنم لیتی ہے؟

چاند' نیلے آسمان پر چل رہا تھا اَور ریت کا جادُو جاگ رہا تھا۔ زندگی کا اَسرار کروٹ بدل رہا تھا اَور چاند چل رہا تھا' دِھیرے دِھیرے' جیسے کسی سمندر کے خاموش پانیوں پر بابل و نینوا کے عہد کا کوئی بجرا' سفید بادبان کے سہارے' اَپنے آپ بہے چلا جا رہا ہو' اَور نیند کا ماتا کوئی شہزادہ' حرکت کی پُرسکوں لے پر سو گیا ہو...... لیکن وہ سو نہیں رہا تھا کیوں کہ اُس کے جسم میں حرکت نہیں تھی اَور اُس کی آنکھیں' چاندنی اَور سکُوت کا منظر دیکھ رہی تھیں اَور اُس کے کان' ایک سَرگوشی کے منتظر تھے۔

پھر صحرا کو اُونگھ آ گئی۔

چاند' مغرب کے کِنارے کو چھُو کر بے اِنتہا اُداس ہو گیا اَور چاندنی پھیکی پڑ گئی اَور نہ جانے کب مشرق کی جانب سے سُورج کا قُرص اُبھرا اَور ریت میں آگ لگ گئی۔

....

آپ رات بھر کہاں رہے؟......

اُس دوشیزہ نے پوچھا جس کے سانولے چہرے پر صحَرا کی معصومیت تھی اَور جس کی کالی کالی آنکھوں میں چاندنی چھٹکی ہُوئی تھی:

بابا سائیں ساری رات آپ کو ڈھونڈتے رہے۔

ریت کے اُس ٹیلے پر۔

اُس نے دُور' ٹیلے کی طرف اِشارہ کرتے ہُوئے کہا۔

وہاں' ساری رات؟

آنکھوں کی معصومیت حیران ہو گئی۔

ہاں!

بابا سائیں کہتے ہیں، وہاں رُوحوں کا ڈیرا ہے۔

نہیں تو......

ہم تو دِن کو بھی وہاں نہیں جاتے۔ رات کو وہاں سے ایک آواز آتی رہتی ہے، جیسے کوئی......

آواز؟......

اُس نے چونک کر پوچھا:

تم نے وہ آواز سنی؟ میں اُسی آواز کی تلاش میں آیا ہوں۔ ایک سَرگوشی جیسے......

نہیں تو...... مجھے ٹیلے کی طرف جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ پر میرا جی چاہتا ہے، میں اُس آواز کو سُنوں!

کیوں؟

جی، میں کیا جانوں؟ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی اَن سُنی آواز مجھے بُلا رہی ہو۔ مجھ سے پہلے سسّی بھی......

اُس کی آواز کانپ گئی۔

سائیں، آپ رات بھر کہاں رہے؟

صحرا کی بیٹی کی بات ادھوری رہ گئی۔ نہ جانے کس سسّی نے اُس ٹیلے پر کس کی آواز سُنی تھی؟ وہ سرگوشی! ......کیا اُس نے آواز کا لبادہ اوڑھ لیا تھا؟

اوہو! وہاں، اُس ٹیلے پر سائیں؟ آپ نے غضب کیا...... رات بھر اُس ٹیلے پر؟ وہاں تو لوگ دِن کو بھی نہیں جاتے۔

اُس نے صحرا کی بیٹی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ اُسے یُوں لگا جیسے وہ دوراہی ہوں جو ایک ہی منزل کی طرف جا رہے ہوں لیکن اُن کے رَستے الگ الگ ہوں۔ ابھی دوراہے پر وہ نقطہ نہ آیا ہو جہاں اُن کا مِلاپ ہو سکے۔

میں پھر آؤں گا۔ اَب میں واپس جاؤں گا۔

اُس نے کہا۔

نہ سائیں، ابھی نہیں! پٹواری آج دوپہر کو اِس جھوک میں آئے گا۔ وارا بندی کا جھگڑا ہے۔ آپ نہ ہوئے تو پٹواری کام نہیں کرے گا۔ سات نمبر کا مربّع پورا پورا آباد نہیں ہُوا۔ پورا پانی نہیں مِلتا۔

اللہ وَسایا! مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔ میں پھر آؤں گا۔ پر ابھی نہیں، ابھی نہیں......

اُس نے ٹیلے کی طرف دیکھا جہاں ریت کی سطح پر لہریں اُٹھ رہی تھیں اور تیز دُھوپ میں جھلس کر زندگی بے ہوش ہو گئی تھی۔

"ابھی نہیں"...... اُس نے سوچا...... "ابھی صحرا کی بیٹی نے بھی سرگوشی کی آواز نہیں سنی...... نہ جانے ہم

دونوں میں سے کس کو پہلے عِرفان نصیب ہوتا ہے!"

....

درخت سے ایک سُوکھا پتّا گرا۔

ایک ہلکی سی سرسراہٹ سن کر وہ چونک گیا۔ وہ اِس بڑے شہر کے ہجوم سے گھبرا کر اِس خوب صورت باغ میں چلا آیا تھا اَور اَب درختوں کے سایے لمبے ہو رہے تھے اَور شام کے سایے لپکتے ہُوئے چلے آ رہے تھے۔ سنہری دُھوپ سمٹ کر درختوں کی پھننگوں سے جا چُھوئی تھی اَور باغ کے اِس کونے میں تنہائی تھی، شہر کا شور و غُل کہیں دُور چلا گیا تھا۔ کبھی کبھار کسی موٹر کی پوم پوم کی آواز آتی یا کوئی پرندہ درخت کی کسی شاخ پر چہک اُٹھتا۔

پھر وہ سُوکھا پتّا گرا اَور وہ بنچ سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ فٹ پاتھ پر بڑا ہجوم تھا، کھوے سے کھوّا چِھل رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے چل رہا تھا۔ وہ اِس بڑے شہر میں نَو وارِد تھا اَور ہجوم میں کوئی اُس کا واقِف نہ تھا۔ اِس کے باوجود یہ چہرے جانے پہچانے سے تھے...... وہی عام سے چہرے جنھیں وہ ہر روز دیکھتا تھا لیکن وہ اُن میں سے نہیں تھا اَور پھر بھی وہ بھاگ کر اُنھیں میں آ گیا تھا۔ کوہ ساروں کی تنہائی اَور صحراؤں کے سکوت کو چھوڑ کر وہ شہر کی ہاؤ ہُو میں چلا آیا۔ ہجوم کا ایک زبردست ریلا آیا، وہ اِس سَیلاب میں تنکے کی طرح بہ جانے والا تھا کہ اُسے ایک ریستوران نظر آیا۔ اُس نے بھاگ کر اُس میں پناہ لی۔ یہاں خنکی تھی اَور ہلکی ہلکی موسیقی کی دُھند چھائی ہُوئی تھی اَور تنہائی کا سِحر تھا اَور روشنی میں ہلکے ہلکے اندھیرے کا جادُو رَچا ہُوا تھا اَور بیرے سایوں کی طرح خاموشی سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ تب اُس نے دیکھا کہ اُس کی میز پر چمکتی ہُوئی ٹرے پڑی تھی اَور چائے دانی سے گرم گرم چائے کی خُوش بُو آ رہی تھی۔ اُس نے ایک پیالی میں چائے اُنڈیلی اَور گرم گرم خُوش بُو سے دُھند کا ایک ہَیولا اُبھرا اَور اُس نے یُوں محسوس کِیا، جیسے وہ شفق کے سایوں میں رَستہ بھُول کر تاریکی اَور روشنی کے سنگم پر پہنچ چکا ہو اَور دُھند کا ہَیولا آواز کا ہَیولا بن گیا ہو۔ یہ آواز کہاں سے آئی..... پہاڑ کی چوٹی سے یا چِھٹکی ہُوئی چاندنی کی اوٹ سے جو ریت کے ٹیلے پر لہروں کی سرگوشی میں ڈھل گئی تھی! یہ آواز جانی پہچانی تھی۔ یہ تو اُس کے نہاں خانۂ دِل میں یُوں اُتر آئی تھی، جیسے میگھ ملار کے سُر، یا جیسے اُس کے من میں آگ سلگ رہی ہو اَور یہ آواز بُوند بن کر آگ میں ٹپک گئی ہو۔

"یہ آواز مجھ سے ملتی جلتی ہے۔"

"یہی تو اِنسان کا سب سے بڑا اَلمیہ ہے کہ میری آواز دُنیا کے ہر شخص سے ملتی ہے۔"

ساحرہ باجی! آپ نے وہ شعر لکھ لیا؟

ایک مسکراتی ہُوئی آواز نے پوچھا۔

نہیں ناہید! میں ابھی تخلیق کی اُس منزل پر نہیں پہنچی۔

اُس آواز نے جواب دیا۔

لیکن آپ ہر وقت سوچتی رہتی ہیں۔ سوچنے والے فلسفی ہوتے ہیں یا شعر کہتے ہیں۔

شعر تو محسوس کیے جاتے ہیں ناہید، شعر سوچے نہیں جاتے!

باجی! آپ آج اِس ریستوران میں مجھے کیوں کھینچ لائیں؟

یہاں تنہائی کا جادُو ہے۔

باجی!......

ناہید کی آواز میں دُکھ کی ایک لہر تھی۔

آپ یہاں تنہا بھی آتی ہیں؟

ہاں!

آج مجھے بھی ساتھ لے آئیں۔ آپ تنہا تھیں، پر مجھے تنہائی کے جادُو کا اُسیر کیوں بنا رہی ہیں؟ مجھے تو بھری دُنیا سے محبت ہے۔

ناہید! میں جانتی ہُوں، تم میرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ میں تو ازل کی بیراگن ہُوں!

اچھی باجی!......

ناہید کے لہجے میں اِلتجا تھی:

اَب چلو، مجھے تنہائی سے ڈر لگ رہا ہے!

چلو ناہید!

ساحرہ کے لہجے میں دُکھ کا ایک سُر تھا، جیسے دھنک کا ایک رنگ ٹوٹ کر فضا میں بکھر گیا ہو۔

اُس نے پیالی میز پر رکھ دی اَور ٹرے میں پانچ ۵ روپے کا ایک نوٹ رکھ کر وہ ریستوران سے باہر نکل آیا اَور لپک کر فٹ پاتھ پر پہنچ گیا۔ ناہید نے دُور سے اُسے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

باجی! وہ کون ہے؟

کون؟

وہ جو فٹ پاتھ پر کھڑا ہے۔

وہ وُہی ہے جو کچھ کہ وہ ہے۔

ساحرہ نے فٹ پاتھ پر قدم رکھا تو اُس کی آنکھوں میں اِنتظار کا ہیُولا دیکھ کر اُسے رُکنا پڑا۔

آپ نے سرگوشی کی آواز سن لی؟

اُس نے دِھیرے سے پوچھا۔

سرگوشی!

ساحرہ سوچنے لگی۔

وہی جو فردوسِ گم گشتہ میں ابھی تک آواز سے محروم ہے۔

نہیں......

ساحرہ نے کہا۔

میں اِس کی تلاش میں صحرا کی خاک بھی چھان آیا۔ چِھٹکی ہُوئی چاندنی کی ایک لہر آسمان سے اُتری تھی اور دُخترِ صحرا نے کہا تھا کہ اُس ٹیلے پر لوگ نہیں جاتے کیوں کہ وہاں سے ایک اَن سُنی آواز آتی ہے، جیسے سّی......

"جیسے!"...... ساحرہ اَپنے آپ سے ہم کلام ہُوئی۔

پر سرگوشی آواز کے سانچے میں نہ ڈھلی۔ اُسے آواز کے سانچے میں ضرور ڈھلنا چاہیے، ورنہ......

ورنہ کیا؟

میں نہیں جانتا...... دھرتی بانجھ ہو جائے گی ...... اِنسان، اِنسان سے ہم کلام نہ ہو سکے گا۔

باجی! یہ کون تھا؟

ناہید نے اُسے بازو سے کھینچتے ہُوئے کہا۔

ایک بھٹکی ہُوئی رُوح...... اَزل کے ایک نقطے پر ہم اکٹھے تخلیق ہُوئے تھے...... ابھی کن کے بعد فیکون کی منزل نہیں آئی تھی کہ ہم بچھڑ گئے اَور اَب...... وہ نقش بہ دیوار ہے...... میں نقش بہ دیوار ہُوں...... اُس کا راستہ مجھ سے جُدا ہے کیوں کہ ہم متوازی لکیروں پر چل رہے ہیں۔ ہم ابھی کسی نقطے پر نہیں مِل سکتے ناہید، کیوں کہ ابھی سرگوشی، آواز کے رُوپ میں نہیں آئی۔

باجی! آپ تو ڈیلفی کی کاہنہ ہیں۔ ذُومعنی باتیں کرتی ہیں۔ اگر آپ میری باجی نہ ہوں تو اِس زمانے کی نبیہ ضرور ہوتیں!

ناہید! میں وُہی ہُوں جو کچھ کہ میں ہُوں، پر تم نہیں سمجھ سکو گی۔

☆☆☆

ماسی حاجن اَور چُوہا چور

ماسی حاجن اَور چُوہا چور ایک ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اُن کے اصل ناموں کی اِس کہانی میں کوئی اَہمیت نہیں۔ گاؤں کا نام لکھنا بھی ضروری نہیں۔ کیا پتا' وہ میرا ہی گاؤں ہو!

چُوہا چور کوئی نامی گرامی چور نہیں تھا۔ وہ جس زمانے کا چور تھا' اُس میں چوروں کا بھی ضابطۂ اَخلاق ہوتا تھا مگر وہ اِس کا بھی پابند نہیں تھا۔ مثلاً اُس نے اکثر چوریاں اَپنے ہی گاؤں میں کیں حالاں کہ مشہور تھا کہ جس گاؤں میں چور پَیدا ہو جائے' وہاں کے لوگ رات کو سُکھ کی نیند سوتے ہیں۔ ساتھ کے گاؤں میں اُس کے ہم عصر کریم چور نے بڑا نام پَیدا کیا تھا' اُس کے ہوتے اُس کے گاؤں میں کبھی چوری نہیں ہُوئی تھی۔

چُوہا چور ایک ہی ضابطۂ اَخلاق کا قائل تھا کہ چور کو چوری کرنی چاہیے' خواہ وہ اَپنے ہی گھر میں کیوں نہ ہو! مشہور تھا کہ پورا ایک سال اُسے چوری کرنے کا موقع نہیں مِلا تھا؛ یا تو چوکی دار اُسے عین موقع پر آ لیتا اَور وہ فرار ہونے پر مجبور ہو جاتا یا گھر کے لوگ جاگ اُٹھتے۔ زِچ ہو کر اُس نے اَپنے ہی گھر کی چوری کر لی تھی...... اَپنے چھوٹے بھائی کے ہاں جس کی نئی نئی شادی ہُوئی تھی۔

گھر کا جو کمرہ اُسے بٹوارے میں مِلا تھا' اُس کے پیچھے کوٹھری تھی۔ دُلھن نے بھڑولے کی تہ میں اَپنے زیور رکھے ہُوئے تھے۔ بھڑولے میں گندم بھری ہُوئی تھی۔ اُس نے گلی کی طرف سے نقب لگائی اَور بھڑولے کے سُوراخ پر سے مٹّی سے چپکا ہُوا ڈھکنا ہٹایا۔ بھڑولے نے بہت سی گندم باہر اُنڈیل دی۔ فرش پر ڈھیر سا لگ گیا۔ تہ میں رکھی پوٹلی کو ٹٹول کر نکال لینے میں اُسے کوئی خاص دِقّت نہ ہُوئی۔ کُھرا اُس نے پکّی سڑک پر جا کر گم کر دیا۔

پھر چُوہا چور نے کہا:

لڑکی! یہ کارستانی چودھری کریم کی ہے۔ دیکھتا ہُوں کہ اُسے میرے گھر میں چوری کرنے کی جرأت کیسے ہُوئی؟

وہ کریم چور کے گاؤں گیا یا کالے چور کے کسی کو کھوج لگانے کی کیا ضرورت تھی! سبھی کو یقین تھا کہ زیور خود چُوہا چور نے چُرائے ہیں۔ چوری کا چسکا بھی شراب کے نشے سے کم نہیں ہوتا' جو مُنہ کو لگ جائے تو چھٹتی نہیں۔ وہ ایک رات باہر رہ کر واپس آیا تو زیوروں کی پوٹلی بھرجائی کو دے کر بولا:

لڑکی! دیکھ لے' کوئی زیور کم تو نہیں؟

اُسے چُوہا چور کا جو لقب مِلا تھا' اُس کی وجہِ تسمیہ کچھ یُوں ہے کہ وہ ایک چھِیٹکا سا جوان تھا ...... دُبلے پتلے پھُرتیلے جسم کا مالک! بدن میں بہت لچک تھی۔ سکڑ سمٹ کر چھوٹے سے سُوراخ سے بھی گزر جاتا۔ اُس کی لگائی ہُوئی نقب سے چُوہا گزر جائے تو گزر جائے، کسی آدمی کے بچّے کا گزر ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

اُوپر مَیں نے کریم چور کو چودھری کہا ہے' اِس لیے نہیں کہ چور اُچکّا چوُھری ہوتا ہے' صرف اِس لیے کہ رات کو وہ چور ہوتا اَور دِن کو چوُھری۔ دس بارہ گھماؤں زمین کا مالک بھی تھا۔ لٹّھے کا کُرتا اَور تہ بند' سر پر کُلّے والی پگڑی جس کا طُرّہ بھی نکلا ہوتا' پاؤں میں نازک سی دیسی جُوتی اَور اُن کے نیچے سُبک رفتار گٹھے ہُوئے جسم والی گھوڑی۔ سُنا تھا کہ گاؤں کی پنچایت کا اکثر اُسے سَرپنچ بھی چُنا جاتا۔

میں نے اَپنے لڑکپن میں اُسے دیکھا تھا' اَپنے ننھیالی گاؤں میں' جہاں وہ ایک شادی میں شریک ہوا تھا۔ میں نے اَپنے ماموں سے' جو اُس گاؤں کے پِیر تھے' اِس خواہش کا اِظہار کیا تھا کہ میں اُسے ملنا چاہتا ہُوں۔ وہ مجھے اَپنے ساتھ لے کر گاؤں کے تکیے میں گئے جہاں برات اُتری ہُوئی تھی۔ کریم اُنھیں دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ماموں نے کہا:

چودھری کریم! یہ لڑکا تم سے مِلنا چاہتا ہے۔

اُس نے جھک کر میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اَور بولا:

چھوٹے پِیر جی! آپ نے یہاں آکر میری عِزّت بڑھائی۔ فرمایئے! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟

میں نے ہچکچا کر کہا:

چچا! یُوں ہی ...... میرا مطلب ہے ...... ہمارے گاؤں میں بھی ایک چور ہے۔ کیا آپ اُسے جانتے ہیں؟

میں نے اَپنے گاؤں کا نام بتایا۔

چوُھری کریم کِھل کِھلا کر ہنسا:

کیوں نہیں؟ ...... جانتا ہُوں ..... چُوہا چور کو کون نہیں جانتا ...... اَپنا دوست یار بھی ہے!

لیکن وہ آپ کی طرح کا کیوں نہیں؟

میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال پر کچھ دیر خاموش رہا' پھر مسکرا کر کہنے لگا:

بھتیجے! وہ صرف چور ہے' چودھری نہیں ...... اپنے ہی گاؤں میں چوری کرتا ہے ......لیکن کالے کوسوں دُور' کسی گاؤں میں ہونے والی چوری میں پھر بھی پولیس اُسے دھر لیتی ہے۔ میں تھانے کے اندر بھی چوری کرلوں' پولیس مجھ پر ہاتھ نہیں ڈالتی۔

چودھری کریم کی یہ منطق فوراً میری سمجھ میں آگئی۔ وہ چور ضرور تھا لیکن رکھ رکھاؤ کا قائل' وضع دار قسم کا طُرّہ اُونچا رکھ کر چوری کرنے والا چور...... صرف اُسے لُوٹتا جو لُوٹے جانے کے قابل ہو۔ پھر سخی بھی تھا۔

چُوہا چور بھی دو چار کھیتوں کا مالک تھا۔ اَپنے چھوٹے بھائی سے مِل کر ایک مشترکہ کنویں پر زراعت بھی کی لیکن چودھری کبھی نہ بن پایا' دِن کو نہ رات کو۔ مَیلے کچیلے کپڑے' ڈیڑھ ہاتھ کا صافہ سَر پر' پاؤں میں لتھڑے ہُوئے ٹوٹے پھوٹے جوتے۔ اگر کبھی دُھلے کپڑے اَور نئے جوتے پہن لیتا تو وضع قطع سے بے تُکا معلوم ہوتا۔ اُسے کبڈّی کھیلنے کا شوق تھا۔ کبڈّی ڈالنے جاتا تو بڑی تُرت پُھرت دِکھاتا لیکن پکڑ ڈالنے والے حریف سے دو چار قدم دُور رہ کر؛ مجال ہے کہ بدن پر ہاتھ لگنے دے! وہ کبڈّی کا اَیسا کھلاڑی تھا جو کسی کو مارتا ہے نہ خود مَرتا ہے؛ تماشا دیکھنے والا جس لطف کی تلاش میں آتا ہے' وہ ہیرا پھیری کر کے اُسے بھی چُرا لیتا ہے۔ چُوہا چور اکثر چوری کر کے پکڑا جاتا۔ دُوسروں کی چوری بھی اُس کے نام لگ جاتی۔ اُسے اَپنے ہی گاؤں کے لوگوں کے سامنے مار پڑتی۔ مار پڑتی تو چیختا بہت تھا۔ ایک بار چیخ دَہاڑ سُن کر میں بھی نمبردار کی حویلی میں چلا گیا جہاں پولیس آکر ٹھہری تھی۔ ایک پولیس مَین اُسے پِیٹ رہا تھا اَور غلیظ گالیاں بھی دے رہا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ ایک دو گالیاں' تماشا دیکھنے والوں کی طرف بھی پھینک دیتا۔ میں نے عزّتِ سادات کو خطرے میں دیکھا' تو وہاں سے کِھسک آیا۔

پھر یہ خبر اُڑی کہ چُوہا چور نے چوری مان لی ہے۔ اُس نے کماد کے ایک کھیت میں مال دبا رکھا تھا۔ دو سپاہیوں کی حفاظت یا حراست میں وہ کماد میں گُھس گیا۔ جب باہر نکلا تو ایک گٹھری اُس کے سر پر تھی۔ اَب حویلی کے اَندر کا منظر پبلک کے لیے ممنوع قرار دے دیا گیا۔ گاؤں کے دو نمبردار تھے' وہ بتاتے تھے کہ ہماری موجودگی میں گٹھری کھولی گئی۔ جس کی چوری ہُوئی' وہ بھی موجود تھا۔ اُس نے کہا کہ جناب کپڑے تو پورے ہیں لیکن پانچ تولے کا زیور کہاں گیا؟ اَب چُوہا چور کے بجائے بے چارے سادھ کو لِتّر پڑے۔ نمبرداروں کی سفارش پر دو چار لتّروں ہی پر اِکتفا کر لی گئی۔ ایک کورے کاغذ پر اُس سے

انگوٹھا لگوا لیا گیا کہ مال پورا ہے۔ معلوم ہوا کہ مال ملے گا اُس وقت، جب عدالت سے چور کو سزا مل جائے گی۔ چُوہا چور ایک ہفتہ پولیس کا مہمان رہا۔ وہ تو چھوٹ گیا لیکن بے چارے سادھ کو کپڑوں کی گٹھڑی بھی نہ ملی۔ البتہ عدالت میں پیشیوں سے بچ گیا۔

میں نے ایک دِن سرِ راہ اُس سے پوچھا:

چاچا اللہ رکھے! کیا چوری ہونے والا مال مل گیا؟

بھتیجے! مال کیا ملتا...... دو تین مرغیاں تھیں، وہ بھی پلسیے چٹ کر گئے...... پھر بھی اللہ کا شکر ہے کہ عزت بچ گئی۔

میں ایک عرصے تک اُپنے آپ سے پوچھتا رہا کہ چاچا رکھے کی عزت کس مٹی سے بنی تھی کہ مال گنوانے اُور لتر کھانے کے بعد بھی بچی رہی۔ ابھی تک مجھے اِس سوال کا جواب نہیں ملا۔

اُور مجھے اِس محاورے کی عملی تفسیر مل گئی کہ چوروں کو مور کیسے پڑتے ہیں!

ماسی حاجن کے ہاں جو چوری چُوہا چور نے کی، وہ میرے ہوش سے پہلے کی ہے لیکن یہ واقعہ میرے گاؤں میں بہت اہمیت کا حامل تھا؛ اِس لیے ایک دو نسلوں تک چلا اُور اَب میں یہ کہانی لکھ کر اُپنے سے بعد کی نسل کو پہنچا رہا ہوں۔ یہی دو چار کہانیاں تو گاؤں کی کل کائنات ہوتی ہیں۔

ماسی حاجن، بڑی دِین دار خاتون تھی۔ ابھی جوان ہی تھی کہ حج کا شوق اُس کے دل و دماغ میں چھا گیا۔ اُس نے پیسا پیسا بچا کر، حج کے لیے رقم جمع کی اُور جب رقم پوری ہوئی تو وہ ادھیڑ عمر کی ہو چکی تھی۔ ہزار ڈیڑھ ہزار روپے کے سکے تھے جو اُس نے لوہے کی ایک صندوقچی میں ڈال کر، گھر کی سب سے پچھلی کوٹھری کے فرش میں دفن کر دیے تھے۔ اِس کا پتا صرف اُس کے خاوند کو تھا۔

کہتے ہیں کہ چور کو قدرت نے ایک حس زیادہ دی ہوتی ہے۔ جی تو نہیں مانتا کہ قدرت نے چوہا چور پر بھی یہ مہربانی کی ہوگی، پر اُس نے عین اُسی کوٹھری میں نقب لگائی جہاں صندوقچی دبی ہوئی تھی، اُور فرش بھی وہیں سے کھودا جہاں صندوقچی دبی ہوئی تھی۔ جس طرح آیا تھا، اُسی طرح سے واپس چلا گیا لیکن صندوقچی لے کر!

صبح گلی میں سے گزرتے ہوئے کسی نمازی نے نقب دیکھی اُور چلا کر کہا:

گھر والو! تم لٹ گئے ہو۔

ماسی حاجن بڑی صبر و شکر والی خاتون تھی۔ جزع فزع سے باز رہی۔ چور کو بددُعا بھی نہ دی۔

گاؤں کے لوگ چاہتے تھے کہ چُوہا چور کو مسجد میں لے جا کر قرآن اُس کے سَر پر رکھیں اَور قسم لیں لیکن ماسی نے منع کر دیا۔ کہنے لگی: ''اِس کا وَبال' اِس کی اَولاد پر پڑے گا۔''

خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیوں اَور کیسے' اُسی دِن سے لوگ اُسے ماسی حاجن کے نام سے پکارنے لگے۔

ایک روایت یہ بھی مشہور تھی کہ ماسی کو خواب میں حج نصیب ہو گیا تھا۔ گاؤں کے واحِد حاجی بابا الہ داد نے ماسی کی زبانی اُس کا خواب سُنا تو رونے لگا۔ اُس نے خواب میں دیکھی ہُوئی ہر تفصیل کی تصدیق کی اَور کہا: ''ہم اِتنی تکلیفیں برداشت کر کے حج تو کر آئے' پر کیا پتا حج قبول بھی ہُوا یا نہیں! اَور بی بی کو خدا نے خواب میں حج کرایا' تو سمجھو اُسے قبول بھی کر لیا!''

پر چُوہا چور' چوری سے باز نہ آیا۔ چور سے قطب بننے والے لوگ اَور ہی ہوتے ہیں۔ نظرِ کیمیا اَثر بھی تو جوہرِ قابل ہی کو متاثّر کرتی ہے۔

دو اڑھائی سال بعد چُوہا چور نے اَپنی بیٹی کی شادی خاصی دُھوم دھام سے کی اَور اُسے جہیز بھی اچھا دیا۔

ماسی نے کہا: ''چلو میرا پیسا میری دھی کے تو کام آیا!''

ایک چوری میں وہ پکڑا گیا۔ مقدمہ بنا اَور اُسے تین سال کی سزا ہو گئی۔ چھُوٹ کر آیا تو سیدھا مسجد میں پہنچا' غسل خانے میں نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے اَور اِعلان کر دیا کہ آج سے وہ چوری سے تائب ہو گیا ہے!

مشہور ہے کہ چور' چوری سے جائے تو جائے' ہیرا پھیری سے نہیں جاتا۔ ایک بار وہ دیسی شراب کی خفیہ بھٹّی چلانے پر بھی پکڑا گیا۔ پھر مشہور ہُوا کہ وہ پُڑیاں بیچتا ہے۔ گاؤں میں کئی نوجوان پُڑیوں کے عادی ہو گئے اَور چوریاں بڑھ گئیں۔ گاؤں کی ایک مسجد سے پنکھے اَور کلاک غائب ہُوئے؛ دُوسری میں' پانی کے لیے جو موٹر لگی تھی' وہ کسی نے اکھیڑ کر بیچ کھائی۔ یہ کام پُڑیوں کے عادی نوجوانوں نے کیا۔

لوگوں نے کہا کہ اِن کا گناہ بھی چُوہا چور کے نامۂ اَعمال میں لکھا جائے گا۔ اَور ایک دِن گاؤں کی بڑی مسجد کے لاؤڈ سپیکر پر اِعلان ہُوا کہ ''فلاں چودھری حج پر جا رہا ہے؛ کسی کو اُس سے کچھ لینا دینا ہو تو مسجد میں آ جائے!''

اِس اِعلان کے پیچھے صرف اِتنی سی داستان ہے کہ اُس چودھری کے ایک بیٹے نے شہر میں جا کر ٹریکٹروں کی مرمّت کا کام سیکھا اَور اَپنے گاؤں میں وَرکشاپ کھول لی۔ اُس کی وَرکشاپ چل نکلی۔ اُس

نے اِتنی رقم پس اَنداز کرلی کہ باپ کو حج پر بھیج سکے۔ پر اُس کے باپ نے بہت لیت ولعل سے کام لیا اَور وہ کہتا رہا کہ حج کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا' پہلے اَپنا مکان پکا کرلو' اَپنی زمین پر ٹیوب ویل لگاؤ اَور ٹریکٹر خرید کر کرایے پر چلاؤ!

لیکن بیٹے کی ایک ہی رَٹ تھی کہ ابّا حج پر جاؤ!

اصل بات یہ تھی کہ وہ اَپنے آپ کو چور کے بجائے ایک حاجی کا بیٹا کہلوانا چاہتا تھا۔ چناں چہ مجبور ہو کر چُوہا چور نے باقاعدگی سے مسجد میں جانا شروع کر دیا' ڈاڑھی رکھ لی' کچھ مسئلے مسائل بھی سیکھے۔ لوگ کہنے لگے کہ اَب سچّے دِل سے تائب ہو گیا ہے!

جب نماز روزہ پکّا ہو گیا تو اُس نے بیٹے سے کہا: ''اَب مَیں حج پر جانے کو تیار ہُوں!''

مسجد سے لاؤڈ سپیکر پر جو اِعلان ہُوا' وہ ماسی حاجن نے بھی سُن لیا۔ وہ اِعلان کروائے بغیر حج پر چلا جاتا تو ماسی کچھ نہ کہتی۔ اَب اُس پر فرض عائد ہو گیا تھا کہ مسجد میں جائے اَور اَپنا مقدّمہ دائر کرے۔

چناں چہ جب وہ مسجد کے صحن میں پہنچی' اُس وقت چُوہا چور' اُجلے کپڑے پہنے' نمازیوں کے جُھرمٹ میں دُولھا بنے بیٹھا تھا کیوں کہ دو تین ہار اُس کے گلے کی زینت تھے۔

جُوں ہی ماسی نے مسجد کے صحن میں قدم رکھا' مسجد کی فضا میں ایک عجیب سی سنسناہٹ پَیدا ہُوئی اَور لوگوں نے جانا کہ ہَوا کا کوئی تیز جھونکا اُن کے رُوئیں رُوئیں کو سرسرا کر گزر گیا ہے۔

چُوہا چور کانپنے لگا۔

مولوی صاحب نے پوچھا: ''ماسی! تم کیوں آئیں؟''

ماسی نے چُوہا چور کی طرف اِشارہ کر کے پوچھا: ''مولوی جی! کیا اِس کا حج قبول ہو جائے گا؟''

''یہ تو اللہ کو معلوم ہے ماسی! میں کون ہوتا ہُوں کہ حج کے قبول ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ دے سکوں؟''...... مولوی صاحب بولے۔

''کیا اِسے یقین ہے کہ اِس کا حج قبول ہو جائے گا؟''...... ماسی نے پھر پوچھا۔

''اِس کا جواب تو چودھری ہی دے سکتا ہے ماسی حاجن!''...... مولوی صاحب نے جواب دیا۔

سارے نمازیوں کی نظریں چُوہا چور کے چہرے پر جم گئیں جس پر لہُو کا ایک قطرہ بھی باقی نہ رہا تھا...... چند لمحوں کے بعد کہ جو لوگوں کو بہت ہی طویل محسوس ہُوئے' وہ آنکھیں جُھکا کر بولا: ''ماسی حاجن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میرا حج قبول نہیں ہو سکتا۔''

"کیوں ابا!"...... اُس کے بیٹے نے گھبرا کر پوچھا۔ چُوہا چور' بیٹے کو ایک نظر دیکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

ماسی نے اُس سے مخاطب ہو کر کہا: "اللہ کے بندے! تمھیں اِتنا بڑا بول نہیں بولنا چاہیے۔ دُنیا میں کون ہے جو "لینے دینے" کا پورا حساب چُکا سکتا ہو...... میں نہ تم...... اچھا' اپنا حساب تم جانو! میرا تم سے کوئی لینا دینا نہیں...... اللہ تمھارا حج قبول کرے!"...... یہ کہہ کر ماسی حاجن مسجد سے چلی گئی۔

چُوہا چور' کچھ دیر' گھٹنوں میں سَر دیے روتا رہا۔ پھر اُس نے گلے سے ہار نوچے' گریبان پھاڑا اور پگڑی گلے میں ڈال کر مسجد سے نکل گیا۔ جب وہ گلی میں پہنچا تو زور سے چِلّایا: "لوگو! سُن لو' میرا حج قبول ہو گیا' میرا حج قبول ہو گیا!"

وہ گلیوں سے ہوتا ہُوا قبرستان میں جا پہنچا اور وہاں ایک کونے میں ایک ببُول کے سایے تلے بیٹھ گیا اور مُنہ پر چُپ کی مُہر لگالی۔ کیا چور' قطب ہو گیا تھا؟

اللہ جانے!

لیکن سعادت مَند بیٹے کو ساری عُمر یہ افسوس رہا کہ وہ اَپنے آپ کو حاجی کا بیٹا نہ کہلوا سکا!

☆☆☆

شِکار

اُس نے تکیے سے باہروَن کی ایک جھکی ہُوئی شاخ کے ساتھ لگام کو بل دے کر گھوڑے کو باندھا اُور اُس کی گردن پر تھپکی دے کر کہا:

دیکھو بیٹا! کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو کہ تم یہاں ہو!

کمیت گھوڑے نے اُسے بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھا اُور یُوں لگا' جیسے وہ اُس کی بات سمجھ گیا ہو۔

یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رات کے اَندھیرے میں اُس کے نقوش واضح نہیں تھے۔ یقیناً سارے مکان کچّے تھے۔ کسی کسی گھر میں دِیا جل رہا تھا۔ گاؤں سے باہر تکیہ تھا اُور اُس کے ساتھ مِلا ہُوا ایک چھوٹا سا قبرستان جس میں اوکاں' وَن اُور جنڈ کے درختوں کا جھُنڈ تھا۔ اُس قبرستان میں صرف ایک قبر پکّی تھی اُور اُس کے سرھانے ایک جھنڈا لہرا رہا تھا۔ مزار کے تعویذ پر چادر بچھی تھی اُور طاقچے میں دِیا جل رہا تھا۔ مزار سے ذرا ہٹ کر ایک کچّا حُجرہ تھا جس کا دروازہ کھُلا تھا۔ یہ حجرہ خالی تھا۔ تکیے اُور قبرستان کا رکھوالا سائیں' گاؤں میں روٹیاں مانگنے گیا ہُوا تھا۔ اِس سے ذرا آگے گاؤں میں داخل ہونے والی گلی شروع ہوتی تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مسجد کے اَندر دِیا ٹِمٹِما رہا تھا۔

اِتنے گھُپ اَندھیرے میں دِیے کی ٹِمٹِماہٹ' جگنو کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر مسجد کے صحن میں آیا۔ ابھی تک مسجد خالی تھی۔ صحن میں پانی کا ایک بھرا ہُوا مٹکا دھرا تھا۔ اُس کے اُوپر ڈھکنے پر ایک پیالہ رکھا تھا۔ اُس نے پیالے سے لوٹے میں پانی ڈالا اُور سوچنے لگا: ''میں نے اَیسا کیوں کیا؟ اُس نے مدت سے نماز نہیں پڑھی تھی اُور آج بھی وہ یہاں نماز پڑھنے تو نہ آیا تھا۔''

''مسجد پاک جگہ ہے' اِس میں وضو کر کے داخل ہونا چاہیے!''...... اُسے ایک بھُولا ہُوا سبق یاد آ گیا۔ اُس نے جلدی جلدی وضو کیا: ''کیا میں نے وضو ٹھیک سے کیا ہے؟''...... اُس نے اَپنے آپ سے پوچھا: ''میں نہیں جانتا!'' وہ مسجد کے اَندر داخل ہُوا۔ محراب کے پاس ایک طاقچے میں دِیا رکھا ہُوا تھا۔ کڑوے تیل کی بُو ہر طرف پھیلی ہُوئی تھی۔ کھلے دروازے سے ٹھنڈی ہَوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اُس کے اَندر داخل

ہوا تو دِیا پھر جگنو کی طرح ٹِم ٹِمایا۔ اُس ٹِم ٹِماہٹ پر اُس کی یادوں کی گہرائی میں کوئی ایک کونا روشن ہو گیا۔ اُسے اَپنا بچپن یاد آ گیا' جب وہ اَپنے گاؤں کے مولوی صاحب سے قرآن پڑھتا اَور نماز سیکھتا تھا۔ اُس کے علاقے کے لوگوں میں قرآن حِفظ کرنے کا بڑا شوق تھا۔ اُس کے دِل میں بھی یہی شوق کروٹیں لیتا تھا۔ وہ اُن دِنوں سَر گھُٹواتا' اُس پر صافہ لپیٹتا اَور تہ بند کو ٹخنوں سے اُوپر رکھتا۔ اُس کا باپ کہتا:

خانُو! کہیں مولوی نہ بن جانا!

وہ جواب میں مسکراتا اَور سوچتا: "میرا باپ نماز کا پابند ہے لیکن وہ مجھے مولوی کیوں نہیں بنانا چاہتا! شاید اُس کے نزدیک' میں ایک سیدھے سادے کسان کے رُوپ میں ہی اچھا لگتا ہوں۔" وہ مسجد میں اَذان بھی دیتا اَور ہر نماز میں شریک ہوتا۔ شام کے وقت مسجد میں دِیا جلاتا اَور دِیے کی پہلی ٹِم ٹِماہٹ پر اُس کے دِل میں ایک جگنو سا بھی چمک اُٹھتا تھا۔

پھر وہ جوان ہونے سے پہلے پہلے قرآن بھی بھول گیا اَور نماز کا شوق بھی اُس کے دِل سے جاتا رہا اَور وہ جگنو بھی اَپنی چمک کے ساتھ بجھ کر راکھ ہو گیا' اَور آہستہ آہستہ اُس کے دِل میں گھپ اَندھیرا چھا گیا۔ آج اُس گھپ اَندھیرے میں وہ جگنو ٹِم ٹِمایا تو اُسے خوشی بھی ہُوئی اَور دُکھ بھی......

"دُکھ کس بات کا؟"...... اُس نے سوچا اَور پگڑی کے پلّو سے اَپنے چہرے کا نچلا حصہ چھپا لیا...... مسجد خالی تھی۔ یہاں اِس گاؤں میں اُسے کون جانتا ہے؟ وہ کس سے چھپ رہا ہے؟ اَپنے آپ سے؟ اَپنے آپ سے کون چھپ سکتا ہے بھلا؟ اُس کا چہرہ چھپا ہُوا تھا مگر اُس کی آنکھیں چمک رہی تھیں...... تیز تیز نظروں والی عقابی آنکھیں...... وہ درمیانے قد اَور چھریرے بدن کا آدمی تھا۔ لمبے کُرتے اَور تہ بند میں اُس کا بدن اَپنے سڈول پن کے ساتھ چھپا ہوا تھا لیکن اِس کے باوجود یُوں لگتا تھا' جیسے اُس جسم میں بجلیاں بھری ہوں اَور جب کوئی چٹان اُن کے سامنے حائل ہوتی ہے تو وہ چُور چُور ہو جاتی ہے۔

وہ مسجد کے دُور کے اُس کونے میں جہاں دِیے کی روشنی بہت کم پہنچتی تھی' بیٹھا تھا۔ تب اُسے باہر لوٹے میں پانی گرنے کی آواز آئی۔ کوئی نمازی آیا۔ ذرا دیر بعد اَذان گونجی۔ مُوذِن کی آواز میں عجیب سی تھرتھراہٹ تھی' جیسے رات کا اَندھیرا کانپ رہا ہو۔ اَندر اُسے دِیے کی ٹِم ٹِماہٹ بھی کپکپاتی سی محسوس ہُوئی۔

اَذان ختم ہُوئی تو موذن نے مسجد کے اَندر آ کر کہا:

السلام علیکم!

وعلیکم السلام!

اُس نے جواب دیا۔

کچھ نمازی آجائیں تو نماز شروع ہو......

اُس شخص نے اُس کی طرف کوئی توجّہ کیے بغیر کہا:

عشا کی نماز لوگوں پر بہت بھاری گزرتی ہے۔

وہ اُس سے ذرا دُور بیٹھ کر تسبیح پھیرنے لگا۔ اُس نے کن اَکھیوں سے اُس شخص کو دیکھا۔ یہ ایک جوان آدمی تھا جس کے گورے چہرے پر کالی کالی خشخشی ڈاڑھی خوب پھب رہی تھی۔ وہ لٹھّے کے صاف ستھرے کُرتے اَور تہ بند میں ملبوس تھا۔ اُس کے سَر پر چھوٹا سا سبز رنگ کا صافہ لپٹا ہُوا تھا' صرف ایک دو بَل' اَور اُن کے نیچے سے اُس کے کالے کالے پٹے نکل کر اُس کے کندھوں پر جھُول رہے تھے۔ اُس کی جھکی جھکی آنکھوں میں سُرمے کی دھاریاں تھیں۔

"یہ وہی ہے' یہ وہی ہے!"...... ایک آواز نے اُس کے کان میں سَرگوشی کی۔ اِس پیغام پر اُس کا دِل زور زور سے دھڑکا تو وہ حیران ہو گیا۔

"میرا دِل کیوں دھڑکا؟"...... اُس نے سوچا۔

اُسی آواز نے کہا: "اَب موقع ہے' ابھی تک کوئی نمازی نہیں آیا۔ پھر پتا نہیں' یہ موقع تمھیں ملے یا نہ ملے!"

"نہیں...... یہ مسجد ہے اَور میں مسلمان ہُوں' مسجد میں اَیسا کام!"

"مسجد ہو یا مندر' برا کام برا کام ہی ہوتا ہے۔"

"دیکھو تو! شکل صورت سے یہ شخص کتنا معصوم لگ رہا ہے اَور ابھی یہ جوان بھی ہے اَور خوب صورت بھی۔"

"پہلے تو تم کبھی اِس طرح نہیں سوچتے تھے۔ تمھارے نزدیک خوب صورتی اَور بدصورتی' جوانی اَور بڑھاپے میں کچھ فرق نہ تھا۔ نکالو ڈَب سے اَپنا خنجر!......"

اُس کا ہاتھ اِضطراری طور پر ڈَب کی طرف بڑھا تو اُس شخص نے اچانک ذرا سا گھوم کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کا بڑھا ہُوا ہاتھ شل ہو گیا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی...... بڑی معصوم اَور دِل آویز مسکراہٹ! اُس کے دِل میں پھر جگنو سا چمکا۔

اُس نے پوچھا:

تم مسافر معلوم ہوتے ہو؟

ہاں!

اُس نے دِھیمے سے سَر ہلا کر کہا۔

تمھیں کھانا مِلا؟

نہیں تو...... مجھے بھوک بھی نہیں!

تم کہاں سے آئے ہو؟

جہاں سے بھی آیا ہوں، بس ایک مسافر ہوں!

تم نے مُنہ پر ڈھاٹا کیوں باندھ رکھا ہے؟

یوں ہی......

مسجد میں بیٹھ کر کس سے منہ چھپاتے ہو؟ اللہ میاں سے؟ اُس کی نظروں سے کون سا چہرہ چھپا ہے؟

اُس نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ شخص اُس سے بے نیاز ہوکر تسبیح پھیرنے میں محو ہو گیا۔ اِتنے میں دو چار نمازی آگئے...... گاؤں کے غریب کسان، جن کے مَیلے کپڑوں سے، ٹھنڈے موسم کے باوجود پسینے کی بھپک آرہی تھی! کسی نے اُس کی طرف توجّہ نہ دی۔ اَندھیرے کونے میں اُس کا چہرہ کسی کے لیے باعثِ توجّہ نہ بنا۔

وہ شخص اُٹھ کر محراب کے اَندر مصلّے پر جا بیٹھا۔ اقامت ہُوئی تو صف کھڑی ہو گئی۔ وہ بھی صف میں کھڑا ہو گیا۔ اُس شخص نے بڑی کیف بھری آواز میں نماز پڑھائی۔ عجیب بات تھی کہ نماز کے دوران میں اُس کے خیالات ہر طرف سے ہٹ کر عربی کے اُن اَلفاظ میں کھوئے رہے جن کا وہ مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ اُسے اِس بات کا علم بھی نہ ہو سکا کہ کب نماز ختم ہُوئی، کب اُس نے نفل پڑھے اَور کب آخری دُعا مانگی گئی۔ جب وہ اَپنے آپ میں آیا تو مسجد خالی ہو چکی تھی اَور دِیا ٹِمٹما رہا تھا اَور خاموشی اِتنی گہری ہو گئی تھی کہ وہ اَپنے دِل کی دھڑکن سُن رہا تھا اَور وہ جھنجھلایا ہُوا تھا۔ اُس کا شِکار، دام بچھا کر خود شِکاری کو اُس میں پھانس گیا تھا:

”اَب مَیں اکبر خاں کو کیا جواب دُوں گا؟“

خان کی آنکھ دِیے کی لَو میں چمکی...... غضب ناک آنکھ جو بڑے بڑے جیالوں کا پِتّا، پانی کر دیتی ہے۔ خان نے کہا تھا: ”یہ شخص خطرناک ہے۔ اگر یہ کانٹا اَب نہ نکلا تو آئندہ ہمارے لیے اِس کا ختم کرنا مشکل ہو جائے گا۔“ اَب موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ مخبر نے بتایا تھا کہ وہ عِشا کی نماز کے بعد دیر تک اکیلا مسجد میں بیٹھ کر وِرد و وظائف کرتا رہتا ہے۔ وہ آج نماز ختم ہوتے ہی اُٹھ کر چلا گیا تھا۔

”کیا اُس نے خطرے کو بھانپ لیا ہے؟“...... اُس نے سوچا: ”لوگ کہتے ہیں، یہ رُوحانی لوگ آنے والے خطرے سے آگاہ ہو جاتے ہیں۔“...... اِس خیال پر وہ کانپ گیا۔

اکبر خاں نے جس شخص کو اَپنے لیے خطرہ قرار دیا ہے، وہ تو اُسے ایک سیدھا سادا شریف سا نوجوان نظر

آتا تھا۔ ایسے لوگ سیاست سے دُور رہتے ہیں۔ اِنھیں دُنیا کے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ یہ جس گاؤں میں رہتا ہے، اُس کے باسی غریب کسان ہیں۔ یہ بھلا اُن کی مدد سے خان کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے! خان کا اِس علاقے پر اتنا دبدبہ ہے کہ کوئی اُس کے سامنے دم بھی نہیں مار سکتا۔

"میرا ہاتھ اِس شخص پر نہیں اُٹھ سکے گا۔ میں نے تو ہمیشہ اُسے شِکار کیا ہے جس کا پنجہ میری گردن پر بھی پڑ سکتا ہو۔ میں فاختہ کا شِکاری نہیں۔"

لیکن خان نے کہا تھا: "اِس آدمی نے پچھلے اِنتخابات میں ہمارے دُشمن، ملک داد خاں کا ساتھ دیا تھا۔ اِس نے لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکایا اور ملک کو اِتنے ووٹ دِلا دیے کہ ہم اُس کی ضمانت ضبط نہ کروا سکے۔"

آج اِس شخص سے ملاقات کے بعد اُس کی ڈب سے خنجر نہ نکل سکا۔ اِس نمازی قسم کے آدمی سے خان کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے! خان تو ایک پہاڑ ہے، اُس کے ساتھ ٹکر کون لے سکتا ہے؟

"آج مَیں اِس کو خان کے اِرادے سے آگاہ کر دُوں گا اور کہوں گا کہ وہ اِس علاقے سے دُور چلا جائے! اِس طرح خان کا منشا بھی پورا ہو جائے گا۔"

"نہیں...... تم خان کے آدمی ہو، اُس نے جو کچھ کہا ہے، کر گزرو!"

"میں ایسا نہیں کر سکتا!"

"آج تمھارے قدم کیوں ڈگمگانے لگے ہیں؟ کیا تم بُزدِل تو نہیں بن گئے؟ اپنے آپ کو سنبھالو! تم خان کے آدمی ہو، تمھیں کسی کی شرافت اور نیکی سے کیا غرض!"

"کیا میں اِنسان نہیں؟"

"اِتنے بے گناہ لوگوں کو قتل کرنے کے بعد بھی؟"

"قاتل کے دِل میں بھی تو اِنسانیت زِندہ رہ سکتی ہے!"

"سوچو تو، خان کے تم پر کتنے احسان ہیں!"

"احسان! کون سے احسان؟"

"خان نے تمھیں کئی بار پھانسی کے پھندے سے بچایا۔ تم قانون کی نظروں سے محفوظ ہو۔ آج وہ تمھاری پیٹھ سے ہاتھ اُٹھا لے تو ہزاروں پھندے تمھاری گردن میں آ پڑیں!"

"میں نے ہر قتل، خان کے کہنے پر کیا۔"

"وہ پہلا قتل بھی؟"

"ہاں...... نہیں...... وہ میرا دُشمن تھا!"

"ایسی چھوٹی چھوٹی دشمنیاں تو ہر خاندان میں ہوتی ہیں۔ وہ تمھارا چچیرا بھائی تھا۔ اُس نے تمھاری منگیتر تم سے چھین لی تھی۔ وہ اُس کی بہن تھی۔ اُسے اِس فیصلے کا حق حاصل تھا۔ یہ ایک خاندانی تنازع تھا۔ تم صبر سے کام لیتے تو شاید وہ اپنا فیصلہ بدل لیتا۔ تم نے کتنی جلدی کی، تمھارا خون جوش میں آ گیا! تمھاری ڈب سے خنجر اپنے آپ

نکل گیا۔تم نے اُس کے گھر جا کر اُسے زخمی کر دیا۔وہ مَر گیا لیکن تمھاری منگیتر تمھیں نہ مِل سکی!"

"تم مجھے یہ سب کچھ کیوں یاد دِلا رہے ہو؟"

"تم خان کی پناہ میں چلے گئے۔ پولیس تم پر ہاتھ نہ ڈال سکی۔زری تمھاری جانی دُشمن بن گئی۔اُس نے قسم کھائی کہ جب تک وہ اپنے بھائی کا اِنتقام نہیں لے گی، چین سے نہیں بیٹھے گی۔تم نے اُس کے اِرادے میں خنجر کی خونیں چمک دیکھی اَور پردے میں چھپ گئے۔تم غاروں میں چلے گئے، جنگلوں میں پناہ لی اَور ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔لوگ خانو ڈاکو کا نام سُن کر کانپنے لگے اَور تم سمجھنے لگے کہ تم دُنیا کے حکم راں ہو، ساری دُنیا تم سے ڈرتی ہے!"

"مَردوں سے ایسی غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔"

"مَردوں سے نہیں، بُزدِلوں سے! مَرد خنجر کو اَپنا مالک نہیں، غلام بناتے ہیں؛ بُزدِل خنجر کے غلام بن کر ڈاکو بن جاتے ہیں۔"

"میں ڈاکو اِس لیے بنا کہ میں زری سے دُور رہوں۔ مجھے اُس کے اِنتقام سے خوف نہیں تھا لیکن میں عورت ذات سے ٹکر لینے سے ڈرتا تھا۔"

"اَب تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم نے ہر قتل، خان کے کہنے پر کیا تھا۔"

"تم بھی جانتے ہو، ساری دُنیا جانتی ہے کہ زری کا بھائی مجھ سے کیوں ناراض ہُوا! میں نے خان کے ڈیرے پر آنا جانا شروع کیا تھا، اِس کی وجہ بھی تم جانتے ہو۔زری کا بھائی، خان کے ساتھ میرے میل جول کو پسند نہیں کرتا تھا۔اِس لیے اُس نے منگنی توڑ دی اَور میں غصے میں آ گیا۔اِس غصے کے پیچھے بھی خان کا ہاتھ نہیں تھا کیا؟...... چھپا ہُوا ہاتھ جس نے اِشاروں ہی اِشاروں میں مجھے بتایا کہ اگر میں زری کے بھائی کو قتل کر دُوں گا تو زری مجھے مِل جائے گی اَور دُنیا کی کوئی طاقت اُسے مجھ سے جُدا نہیں کر سکے گی۔"

تب اُسے یُوں لگا جیسے وہ شخص جو اُس سے سوال جواب کر رہا تھا، اَب اُس کے پاس کندھے سے کندھا مِلا کر بیٹھ گیا ہے۔

اُس نے پوچھا: "تم کون ہو؟"

"میں خانو ڈاکو ہُوں۔"

"تم یہاں کیوں آئے؟"

"یہ مسجد ہے، اِس میں ہر شخص آ سکتا ہے۔ یہ سب کے لیے ہے۔ یہاں خانو ڈاکو بھی آ سکتا ہے اَور خان محمد بھی جو ایک شریف باپ کا بیٹا ہے۔"

"تم چلے جاؤ، خانو ڈاکو!"

"میں تو تمھیں ساتھ لے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔تم جانے کو کہہ رہے ہو۔"

"میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔میرے سامنے خون کا ایک دریا ہے۔ میں اُسے پار نہیں کر سکتا۔"

تب دیوار پر ایک سایہ لپکا اَور خانو ڈاکو غائب ہو گیا۔

سبز صافے والے نے اُس کے سامنے چھابا اور دُودھ کی گڑوی رکھ دی: ”لو کھانا کھاؤ!“

”نہیں، مجھے بھوک نہیں!“

وہ شخص اُس کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پہلی بار اُس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ خان محمد کے دِل میں جگنو چمکنے لگے۔

”نہیں، نہیں! میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ میں رات بسر کروں گا اور صبح صبح چلا جاؤں گا۔“

”جب چاہے چلے جانا لیکن کھانا تو کھاؤ! کوئی لمبا سفر درپیش ہے مسافِر؟“

”میں نہیں جانتا پِیر بادشاہ!“

”تم مجھے جانتے ہو؟“

وہ اپنی غلطی پر لرز گیا۔

اُس نے کہا: ”نہیں تو...... نہیں تو...... ہمارے علاقے کے پِیر، سر پر سبز عِمامہ باندھتے ہیں اور پٹے رکھتے ہیں۔ تمھارا عمامہ بھی تو سبز ہے۔ میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”نہیں...... لیکن یہ بتاؤ، تم میرا نمک کیوں نہیں کھاتے؟“

”نمک...... تمھارا نمک؟“

”دیکھو، رِزق اللہ کی طرف سے مِلتا ہے۔ اِس میں جو نمک ہوتا ہے، وہ بھی اُسی کا ہے۔ یہ رِزق تمھارے نام کا ہَے۔ اِس میں میرا کوئی نمک نہیں...... ایک ذرّہ برابر بھی نہیں!“...... اُس نے ایک ایک لفظ سوچ کر اَدا کیا۔

پھر وہ اچانک مسکرایا: ”تمھارے سامنے جو کھانا رکھا ہے، اُس میں نمک، نام کو بھی نہیں۔ نہ روٹی میں نہ دُودھ میں!“

”اچھا تم جاؤ، میں کھا لوں گا!“

وہ شخص چلا گیا تو مسجد اُسے خالی خالی نظر آئی۔ اُس نے ایک لقمہ توڑ کر مُنہ میں رکھا اور دُودھ کے ایک گھونٹ کے ساتھ گلے سے اُتار لیا۔ اُس لقمے میں اُسے عجیب سی لذّت مِلی۔ اُس کی بھوک تیز ہو گئی۔ جب وہ روٹی کھا چکا تو اُس نے چھابا ایک طرف سرکا دیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔

اُس نے آنکھیں مُوند لیں، یکایک خانو ڈاکو بولا: ”اَب سو جاؤ گے؟“

”ہاں، مجھے نیند آ رہی ہے۔“

”اور تم جس کام کے لیے آئے تھے، اُس کا کیا بنے گا؟“

”کون سا کام؟“

”بھول گئے؟ تم خان کا حکم بھول گئے۔ جانتے ہو، اِس کا نتیجہ کیا ہو گا؟“

”جانتا ہُوں...... لیکن تم مجھے یاد کیوں دِلا رہے ہو؟“

”میں تمھارا خیر خواہ اَور دوست ہُوں۔ تم جانتے ہو‘ پھانسی کے کتنے پھندے تمھارا اِنتظار کر رہے ہیں! ذرا اُنگلیوں پر گِن کر دیکھو‘ آج تک کتنے خون کر چکے ہو! ایک...... دو...... تین......“

”نہیں‘ مجھے یاد نہ دِلاؤ!“...... اُس نے آنکھیں کھول دیں: ”اَب صرف ایک خون اَور باقی ہے!“ ...... اُس نے بڑبڑا کر کہا۔

”پھر کیا ہو گا؟“...... خانو ڈاکو نے پوچھا۔

”میں خود اَپنے ہاتھ سے پھانسی کا پھندا گلے میں ڈال لوں گا۔“

....

خان محمد کو زری سے محبّت تھی۔ وہ اُس کے چچا کی بیٹی تھی اَور ایک سیدھی سادی سی لڑکی‘ بچپن سے اُس کی زِندگی میں داخل تھی۔ جب وہ جوان ہوئے تو اُسے یوں لگا جیسے وہ اَور زری ایک ہی وجود میں ڈھل گئے ہوں۔ پھر زری اُس کی منگیتر بن گئی۔ وہ اَپنے علاقے کی روایات کے مطابق فوج میں بھرتی ہو جاتا لیکن ماں باپ کا اِکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اُسے اَپنے سے دم بھر کو بھی جُدا کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُسے دُودھ‘ گھی اَور مکھن کِھلا کر پالا گیا تھا۔ جوانی آئی تو اُس کے جسم میں طاقت کا بے پناہ سَیلاب اُمنڈ آیا۔ وہ پنجہ لڑانے، کبڈّی کھیلنے اَور کُشتی لڑنے میں بہت جلد اَپنے علاقے میں مشہور ہو گیا۔ کوئی کوئی جوان تھا جو اُس کی للکار پر اُس کے مقابلے میں آتا۔

خان اکبر خاں اُس علاقے کا سرکردہ آدمی تھا...... بہت سی زمینوں کا مالک‘ اِرد گِرد کے علاقے پر اُس کا دبدبہ‘ وہ گویا اُس علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ کوئی اُس کے سامنے دم نہ مار سکتا لیکن یہ عجیب بات تھی کہ وہ اَپنے علاقے میں ذرا سی اُبھرتی ہُوئی طاقت سے بھی خائف ہو جاتا۔ یہ طاقت‘ جسمانی ہو یا رُوحانی‘ اِس کا تعلق دولت سے ہو سیاست سے‘ وہ اِسے اَپنے اِقتدار کے لیے چیلنج سمجھتا اَور کلّے ٹھلّے کے گبھروؤں کو اَپنی نظر میں رکھتا۔ جوں ہی خان محمد کی اُبھرتی ہُوئی طاقت اُس کی نگاہوں میں آئی‘ اُس نے سوچا کہ یہ طاقت ابھی جسم تک محدود ہے؛ یہ گبھرو آگے چل کر خطرناک بن سکتا ہے۔ اِس پر ابھی سے پھانسی کا پھندا ڈال دو!

اُس نے خان محمد کو قابو کرنے کے لیے بہت سے طریقے سوچے۔ اَپنے حرم کی ایک چنچل اَور خوب صورت عورت کو اُس کے پیچھے لگا دیا لیکن وہ اُس کے دام میں نہ پھنسا کیوں کہ زری کی محبّت آڑے آئی تھی۔ اُس نے اُسے کسی چوری کسی ڈاکے میں پھنسانا چاہا لیکن یہاں زری کے بھائی کی فراست آڑے آئی۔ وہ خان کے حربوں سے واقف تھا اَور اُس نے خان محمد کو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا۔ تب وہ چال

چلی گئی جس میں بہ ظاہر کوئی دھوکا فریب نظر نہ آتا تھا۔ پھر خان نے اپنے علاقے کے ایک میلے میں، کبڈی، کشتی اور پنجہ لڑانے کے مقابلے کرائے۔ خان محمد اِن مقابلوں میں دندنا کر شامل ہُوا۔ اُس نے اپنے گاؤں کے نوجوانوں کی ایک ٹیم تیار کی اور مقابلے پر مقابلہ جیتتا رہا۔ ایک مقابلے میں علاقے کا سب سے بڑا اور تجربہ کار کھلاڑی اُس کا مدِّمقابل بن کر آیا۔ خان محمد کی اُس کے ساتھ کئی پکڑیں ہُوئیں، ہر پکڑ پر خان محمد جیتتا رہا۔ تب اچانک خان کی شہ پر مقابل ٹیم نے لڑائی کا بیج ڈال دیا۔ گالی گلوچ کے بعد لاٹھیاں چلیں، بندوقوں اور پستولوں کے فائر ہُوئے، کئی نوجوان زخمی ہُوئے، کئی سر پھٹے، پولیس آئی اور بلوے کے اِلزام میں خان محمد کو گرفتار کر کے لے گئی، اُسے حوالات میں بند کر دیا گیا۔

ابھی پولیس نے کسی کا چالان نہیں کیا تھا کہ خان اکبر خاں، تھانے میں پہنچا۔ اُس نے خان محمد کی صفائی دی اور اُسے پولیس کی حراست سے چھڑوا کر اپنے ہاں لے آیا۔ اِس واقعے سے خان محمد کی زندگی کا وہ آغاز ہُوا جس نے اُسے چور اور رسّا گیر بنایا اور خان کے ایما پر اُس کے دشمنوں کے ہاں چوریاں کرتا رہا اور ڈاکے ڈالتا رہا اور جوانی کے جوش میں اُسے اِن کارناموں پر بڑا ناز محسوس ہوتا اور خان اُس کا دِل بڑھاتا رہا۔ وہ خان کا آدمی تھا، اِس لیے پولیس اُس پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتی تھی۔ تب زری کے بھائی نے اُس کی منگنی توڑ دی اور زری نے اُس کے ساتھ اِغوا ہونے سے اِنکار کر دیا۔ اُس کا خون جوش میں آ گیا۔ وہ دِن دہاڑے اپنے گاؤں آیا۔ اُس نے خنجر کے ایک وار سے اپنے آپ کو خونی اور قاتل بنا لیا۔ پولیس نے اُس کے خلاف مقدمہ درج کر لیا لیکن وہ خان کی پناہ میں چلا گیا اور خان نے اُسے فرار ہو جانے کی صلاح دی۔ وہ جنگلوں اور غاروں میں چلا گیا۔ جب کبھی خان کو اُس کی ضرورت پڑتی، وہ جنگل سے نکل آتا اور خان کے کسی حریف کے خون میں ہاتھ رنگ کر پھر جنگل میں چلا جاتا۔ ایک قتل کے بعد دُوسرا قتل...... اب وہ اکبر خاں کے ہاتھ میں اُس باز کی طرح تھا جو رسّی کے ایک ٹُنکے پر شِکار پر جھپٹتا ہے، لیکن یہ شِکار اُس کا اپنا نہیں ہوتا اور آج اکبر خاں نے اُسے جس شِکار پر بھیجا تھا، کیا یہ اُس کا آخری شکار ہے؟...... نہیں...... اکبر خاں اُسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں کرے گا۔ اِس کے بعد کوئی اور حریف مَیدان میں آئے گا تو خان اُس سے پھر یہی کام لے گا اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو گا۔

اور آج وہ جس شِکار پر آیا تھا، اُس پر جھپٹنے کے لیے، اُس کے پنجوں میں کس بل باقی نہیں رہا تھا......

کیوں؟ اِس لیے کہ باز جس پرندے پر جھپٹتا ہے، وہ اپنی جان بچانے کے لیے پھڑپھڑاتا ہے، جھاڑیوں میں چھپتا ہے، تیز اُڑان لے کر اُس کے پنجوں سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا: شِکار کو پکڑنے کے

لیے' باز کو تگ و دَو کرنا پڑتی ہے لیکن یہ شِکار عجیب تھا۔ یہ خود اُڑ کر باز کی طرف آیا تھا' گویا یہ کہہ رہا ہو: "کر لو شکار' مَیں تمھیں ذرّہ بھر زحمت نہیں دُوں گا!"......اَور باز کی درِندگی اُس آگ کی طرح بجھ گئی تھی' جس پر بارش کے چھینٹے پڑ گئے ہوں۔

"نہیں......میں اِس فاختہ کو شکار کر کے اَپنی شاہ بازی پر حرف نہیں آنے دُوں گا۔"

"خان کو کیا جواب دو گے؟" خانو ڈاکو بولا۔

اُس نے مُنہ سے ڈھاٹا ہٹا کر کہا: "میں آج خان کو اَپنا اصلی چہرہ دِکھاؤں گا۔"

اَور خانو ڈاکو خوف سے تھر تھر کانپنے لگا اَور مسجد کا دِیا آخری ٹِم ٹِماہٹ کے ساتھ جِھل مِلا کر بجھ گیا۔ تب آدھی رات کا اَندھیرا لپک کر آیا' وہ مسجد کے باہر نکل آیا۔ اُس نے وَن اَور اوکاں کے جُھنڈ کا رُخ کیا اَور گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اَندھیرے میں گم ہو گیا۔

....

جب صبح پیر صاحب مسجد میں آئے تو اُنھوں نے پکار کر پوچھا: "مسافر! تم کہاں ہو؟"

"میں یہیں ہُوں پِیر بادشاہ!"

"مسجد کا دِیا بجھ گیا؟"

"ہاں!"

"تمھیں اَندھیرے سے ڈر تو نہیں لگا؟"

"نہیں!"

پیر صاحب نے اَذان دی۔ صبحِ صادق کا اُجالا پھیلا تو مسجد میں لوگ جمع ہونے لگے۔ اُس نے پچھلی صف میں کھڑے ہو کر جماعت کے ساتھ نماز پڑھی اَور پیر صاحب دُعا سے فارِغ نہیں ہُوئے تھے کہ وہ مسجد سے نکل گیا۔

پیر صاحب نے پوچھا: "مسافر چلا گیا؟"

"جی ہاں' چلا گیا ہے!"......ایک مُقتدی نے جواب دیا۔

....

ابھی سُورج نکلا ہی تھا کہ علاقے کے سب سے بڑے زمیندار خان اکبر خاں کے قتل کی خبر مشہور ہو گئی۔ خان کا قتل آدھی رات کو اِتنا چپکے سے ہُوا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہُوئی۔ لوگوں نے کہا: "سَو دِن چور کے' ایک دِن سادھ کا!"......خان کے دُشمنوں کا آخر وار چل گیا۔ ظالم کی رسّی دراز ہوتی ہے۔ پر سچ

ہے‘ خُدا کے ہاں دیر ہے اَندھیر نہیں۔ اَور ابھی یہ خبر‘ ایک ہونٹ سے دُوسرے ہونٹ تک گردِش کر رہی تھی کہ ایک اَور خبر مشہور ہوگئی کہ خانو ڈاکو نے تھانے میں پہنچ کر اَپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا۔

زری نے یہ خبر سُنی تو اُس نے خنجر کو طاق میں رکھ دیا اَور گھر کی چار دیواری میں پناہ لیتے ہوئے کہا:

اَب مَیں اُس کا اِنتظار کروں گی!

☆☆☆

تیکھا موڑ

اندھیرے اَور اُجالے گلے مِل رہے تھے کہ سمّوں نے خانو اَور چھمّاں کو پگ ڈنڈی کے ایک موڑ پر آمنے سامنے کھڑے دیکھا۔ چھمّاں کی پُشت اُس کی طرف تھی' خانو کا چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ وہ ایک دُوسرے کو دیکھنے میں اِس درجہ محو تھے کہ چھمّاں نے اُس کے قدموں کی چاپ نہ سنی اَور خانو اُسے دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھ سکا۔ سمّوں ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ پگ ڈنڈی کے دونوں طرف گنّے کے کھیت' گھنے جنگل کا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہَوا کا ایک دِھیما سا جھونکا آیا۔ کھیت سرسرائے تو چھمّاں چَونک اُٹھی۔ وہ ایک قدم پیچھے کی طرف ہَٹی تو دُودھ چھلک کر گڑوے کے کِناروں سے بہ نکلا۔

چھمّاں نے دھیمی سی آواز میں کہا:

یہ تم ہو ماموں؟ میں تو ڈر گئی تھی!

پر تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟

کچھ نہیں...... یُوں ہی...... میں کنویں سے دُودھ لے کر آ رہی تھی کہ اِس موڑ پر خانو مِل گیا۔

خانو! تم نے چھمّاں کا رَستہ کیوں روکا؟

نہیں تو...... میں نے اِس کا رَستہ نہیں روکا۔ کیوں چھمّاں؟

ہاں ماموں! خانو نے میرا رَستہ نہیں روکا۔ ہم اِس موڑ پر آمنے سامنے ہو گئے تو......

سمّوں کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔ اُس نے کہا:

خانو! ایک طرف کو ہَٹ جاؤ۔

خانو پگ ڈنڈی سے نیچے اُتر گیا۔

چلو بیٹی!

چھمّاں اُس کے پیچھے پیچھے ہولی۔ خانو وہیں کھڑا رہا۔

سمّوں نے سوچا:

''خانو اَور چھمّاں بچپن کے ساتھی ہیں۔ اکٹھے کھیل کُود کر جوان ہُوئے' پر آج پگ ڈنڈی کے اِس تیکھے موڑ پر اکٹھے ہُوئے تو اِن کی زبانیں گُم صُم کیوں ہوگئیں!''

ایک سَرد جھونکا آیا اَور وہ کانپ گیا۔ گاؤں آیا تو چھماں اَپنی گلی میں مُڑ گئی۔ وہ گاؤں کا چکّر کاٹ کر گھر پہنچا تو شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ آنگن میں بچھی کھاٹ پر بیٹھ گیا۔ اندھیرے کا دامن شبنم کے چھینٹوں سے بھیگ گیا لیکن اُس کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اُس نے پھر سوچا:

''خانو اَور چھماں اِس تیکھے موڑ پر کیوں اکٹھے ہُوئے! کہیں وہ پیار کا سَودا نہ کر لیں...... نہیں...... اَیسا نہیں ہونا چاہیے!''

....

سموں کا قبیلہ کبھی خانہ بدوش تھا' اَب یہ مدتوں سے اِس گاؤں میں آباد تھا۔ اِس کے قبیلے کے لوگ چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ یہ لوگ شہتوت کی ٹہنیوں سے ٹوکریاں بُنتے' سَرکنڈے سے چھاج اور مونڈھے بنا کر بیچتے۔ کچھ لوگوں نے کاشت کاری کا پیشہ اِختیار کر لیا تھا۔ سموں کا قبیلہ مدتوں سے مسلمان ہو چکا تھا۔

سموں' قبیلے کا سردار تھا۔ اُس کا رنگ سانولا تھا لیکن کسرتی اَور گُٹھے ہُوئے جسم نے اُس کے خدوخال میں ایک عجیب قسم کی وجاہت پَیدا کر دی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں ذہانت تھی اَور چہرے کی وجاہت میں خودداری کے جَوہر۔ وہ ٹھیکے پر زمین کاشت کرتا تھا اَور اُس کی پیاری بہن رانی' چوہدری کرم دین کے نکاح میں تھی۔ چھماں اُس کی بھانجی تھی۔ وہ گاؤں کے لوگوں میں بڑا ہر دِل عزیز تھا۔ شادی بیاہ' مرنے جینے میں گاؤں والوں کا برابر کا شریک تھا۔ پر آج خانو اَور چھماں کو ایک موڑ پر آمنے سامنے دیکھ کر وہ کیوں پریشان ہو گیا:

''اِس لیے کہ خانو سموں کا بیٹا ہے اَور چھماں چودھری کرم دین کی بیٹی ہے۔ اِن دونوں میں کیا میل ہو سکتا ہے! میں خانو کو روک دُوں گا کہ وہ چھماں سے نہ ملے۔ میرے قبیلے میں بیسیوں لڑکیاں ہیں۔ خانو سے کہوں گا کہ وہ جس سے چاہے' شادی کر لے اَور اگر خانو نہ مانا تو......''

''لیکن رانی تو میری بات مان گئی تھی۔ اگر وہ میری بات نہ مانتی تو......''

''میری مشکل خود چودھری نے حل کر دی تھی!''

وہ اَب تک بھائی بھائی بن کر رہے...... ایک دُوسرے کے دُکھ درد میں شریک! اَور آج خانو اَور چھماں جوان ہو چکے تھے۔ نہ جانے چودھری اَب...... نہیں...... وہ کانپ گیا!

....

آج سے بیس سال پہلے سموں جوان تھا۔

وہ کبڈی کا کھلاڑی تھا اور شکار کا بے اِنتہا شوقین! اُس کے پاس دو شِکاری کتّے بھی تھے۔ چودھری کرم دین اُس کا جگری دوست تھا۔ وہ گاؤں کے نمبردار کا اِکلوتا بیٹا تھا...... بیس ایکڑ زمین کا مالک اور کبڈی اور شِکار کا شوقین! وہ دونوں ایک ہی اکھاڑے میں کسرت کرتے، کبڈی کھیلتے اور خرگوشوں کا شکار کرتے۔ سموں کے قبیلے والے کبھی کبھار جشن مناتے تو کرم دین بھی شریک ہوتا۔ رات بھر ڈھولک اور اَلغوزے بجتے۔ گانے والے لہک لہک کر پُورن بھگت کا قصہ گاتے تو رات ایک کیف کے عالم میں گزر جاتی۔ ایسی ہی ایک محفل میں، گانے والا پُورن بھگت کی سوتیلی ماں رانی لُوناں کے حُسن و جوانی کی تعریف کر رہا تھا کہ رانی اَپنے بھائی سموں سے کوئی بات کرنے آئی اور یُوں ہی ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ کرم دین نے ایک نظر رانی کو دیکھا تو اُسے یُوں لگا جیسے لوناں کا حُسن، جو آگ کا شعلہ تھا، رانی کے جسم میں سما کر چودھویں کے چاند کی ایک ٹھنڈی میٹھی کرن بن گیا ہو!

رات چاندنی تھی اور چاند اُتر کر رانی کی آنکھوں میں سما گیا تھا!

آج پہلی بار تھی کہ رانی کو دیکھ کر کرم دین کو اُس کے وجود کا بھرپور احساس ہُوا۔ آج سے پہلے بھی اُس نے رانی کو دیکھا تھا لیکن سموں کی بہن کے رُوپ میں...... سموں جو اُس کا دوست تھا، پر اُس کے قبیلے برادری سے نہیں تھا، جسے کرم دین پر اِعتماد تھا؛ اور آج اُس نے رانی کو اِس نگاہ سے کیوں دیکھا ...... یہ نگاہ جو زِندگی کی راہیں بدل سکتی ہے...... اُس نے نظریں جُھکا کر کہا: "نہیں!"

پر رانی اُس رات کے بعد اُس سے جُدا نہ ہو سکی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتا، رانی اُس کے ساتھ ہوتی۔ وہ ہل چلا رہا ہوتا تو رانی سَر پر لسّی کا مٹکا اور دسترخوان میں لپٹے پراٹھے لے کر کھیتوں میں پہنچ جاتی اور جھکی جھکی نگاہوں سے کہتی: "روٹی کھا لو جی!" صبح کے اُجالے میں، شام کے جُھٹ پٹے میں، اندھیری رات میں، چاندنی رات میں، کھیتوں میں، پگ ڈنڈیوں پر، کماد کی اوٹ میں، ہل کے پیچھے، گادھی پر بیٹھے، ہر جگہ رانی اُس کا پیچھا کرتی۔ گھونگھٹ کی اوٹ میں سے اُس کا سانولا چہرہ ایک چھب دِکھا کر کہتا:

"مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے تم!"

"پر رانی، تم میرے دوست سموں کی بہن ہو!"

"ہاں! ...... پر میں رانی بھی ہُوں نا! ...... اِس بھرے جہان کی رانی، چاند اور سُورج کی رانی، تیرے سپنوں کی رانی!"

اُس نے اَپنے دِن رات کے سپنوں کا گلا گھونٹ دینا چاہا۔

پر ایک دِن رانی اُسے سچ مُچ مِل گئی۔

وہ کماد کے ایک گھنے کھیت کی اوٹ میں سے نکلی تو کرم دین سے اُس کا سامنا ہو گیا۔

یہ سردیوں کی دوپہر کی نرم نرم' ٹھنڈی ٹھنڈی اَور گداز دُھوپ تھی جو رانی کے ساتھ ساتھ آئی تھی اَور اُس کی دُنیا کو منوّر کر گئی تھی' پر اُس دُھوپ میں بھی اُسے کپکپی لگ رہی تھی۔

رانی نے پاس سے گزر جانا چاہا تو وہ دِھیمے سے پکارا:

رانی!

رانی' بانسری سے نکلے ہُوئے نغمے کی طرح کانپ گئی۔

مجھے اَیسا لگتا ہے' جیسے اِس موڑ پر ہم پہلے بھی کبھی ملے تھے۔

اُس نے کہا۔

نہیں تو!

رانی نے کہا اَور ایک جھونکے کی طرح اُس کے پاس سے گزر گئی۔ اُس کا چھریرا بدن ہوا میں تیر رہا تھا۔

"میں کون سے موڑ پر اِس سے ملی تھی بھلا! یہ تو میرے بھائی کا دوست کرم دین ہے۔ اِس نے آج تک مجھ سے کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ یہ ہمارے گھر آتا ہے تو مَیں اِسے کھاٹ بچھا کر دیتی ہُوں۔ یہ پوچھتا ہے تو بتا دیتی ہُوں کہ بھائی تو گھر پر نہیں' وہ کنوئیں پر گیا ہُوا ہے۔ اَور آج اِس نے کہا ہم اِس موڑ پر پہلے بھی ملے تھے!"

"اِس موڑ پر؟"

"میری زندگی میں تو اَیسا موڑ کبھی نہیں آیا۔"

"نہ جانے یہ کون سا موڑ ہے!"

پگ ڈنڈی کے دُوسرے موڑ پر اُس نے گھوم کر دیکھا' کرم دین وہیں کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں رانی کے قدموں تلے بچھے جا رہی تھیں اَور نہ جانے کیا ہُوا کہ ایک نظر اُس کے اُٹھے ہُوئے قدم سے یُوں اُلجھ گئی' جیسے کہہ رہی ہو: "رانی! آگے نہ بڑھو' ایک بار اَور مُڑ کر دیکھ لو!"

رانی نے دُوسری بار مُڑ کر دیکھا تو اُس کے دِل میں مدتوں سے سویا ہُوا ایک چشمہ پھُوٹ بہا' جیسے اُسے انگڑائی آ گئی ہو یا دِل کے اَلغوزے پر کسی نے ایک تان اُڑا دی ہو...... ایک تان جس پر کھیت جھوم اُٹھے ہوں اَور ہواؤں نے دُھوپ کے ساتھ محبت بھری سرگوشیاں شرُوع کر دی ہوں یا کماد کے کھیت سرسرا کر کہہ رہے ہوں: "نادان لڑکی! یہ تو پریم کہانی کا پہلا بول تھا جو تیرے کانوں نے سُنا اَور تُو اِسے سمجھ نہ سکی۔"

اَور نادان لڑکی ایک لمحے کے اَندر اَندر اَلھڑ مٹیار بن گئی۔ دوشیزگی نے پریم پیالے سے ایک مدھ

بھرا گھونٹ بھرا تو جوانی، مور کا ناچ ناچ اُٹھی۔

کرم دین نے تیز تیز قدم بڑھا کر پھر اُسے آلیا اَور کہا:

رانی! تُو ایک بار اَپنے مُنہ سے کہہ دے کہ تُو نے میرا پیار سندیسا سُن لیا ہے تو مَیں تیرے لیے دُنیا جہان تو کیا......

اَور یکایک سموں اُس موڑ پر پہنچ گیا۔ اُس نے کرم دین اَور رانی کو آمنے سامنے کھڑے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ رانی نے اُس کے قدموں کی چاپ نہ سنی اَور کرم دین رانی کو دیکھنے میں یُوں محو تھا، جیسے کچھ بھی نہ دیکھ رہا ہو:

رانی!

رانی چَونک کر کانپ اُٹھی۔

یہ تم ہو بھیا؟

ہاں! پر تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟

یوں ہی...... میں کنویں سے آ رہی تھی کہ اِس موڑ پر......"

کرم دین! تُو نے رانی کا رَستہ کیوں روکا؟

میں نے......نہیں......ہاں سموں، میں نے رانی کا رَستہ روکا......!

تم تو میری دوستی کا دَم بھرتے تھے کرم دین!......اَور رانی میری بہن ہے۔

سموں کی آنکھیں غصے سے سُرخ ہو گئی تھیں۔

میں اَب بھی تمھارا دوست ہُوں۔

پر تُو نے رانی کا رَستہ کیوں روکا؟

نہیں بھیا! اِس نے میرا رَستہ نہیں روکا۔ پگ ڈنڈی کے اِس موڑ پر یُوں ہی ہمارا سامنا ہو گیا تھا۔

چلو رانی!

سموں نے دِھیرے سے کہا۔

رانی سَر جھکائے، اُس کے ساتھ ہو لی!

پھر نہ جانے کیا ہُوا کہ دُھوپ کجلا گئی اَور گھَن گھور گھٹائیں چھا گئیں جن میں سات سمندروں کا پانی بھرا ہُوا تھا کہ ذرا سا چھید ہونے پر چھم چھم برس پڑتیں۔

گھر پہنچ کر سموں نے کہا:

رانی! مَیں سب کچھ سمجھ گیا ہُوں پر دیکھ، تیرا اَور چودھری کا کوئی میل نہیں۔ میری غیرت کا دامن تیرے

ہاتھ میں ہے۔ اَپنے بھائی کا سَر نیچا نہ ہونے دینا رانی!

گھن گھور گھٹاؤں میں چھید ہو گیا۔

رانی آنسو پونچھتے ہُوئے جھونپڑی میں چلی گئی!

پھر کئی دِن تک رانی یُوں بولائی بولائی پھرتی رہی' جیسے کسی کھوئی ہُوئی چیز کو پا رہی ہو یا کسی پائی ہُوئی چیز کو کھونے کی سعی کر رہی ہو' اَور ایک دِن سموں نے رانی کے سَر پر ہاتھ پھیرا تو رانی نے آنسو پونچھ ڈالے اَور وہ اُس سَرو کی طرح تن کر کھڑی ہو گئی جس نے ایک طوفانی جھونکے کا تھپیڑا سہ کر بھی جینا سیکھ لیا ہو۔

رانی نے پوچھا:

بھیا! تمھیں مجھ پر یقین ہے نا؟

کیوں نہیں!

سموں نے مسکرا کر کہا۔

اُس نے سوچا: ''اَب رانی کے مُنہ سے آہ بھی نہیں نکلے گی' پر یہ آگ جلتی رہی تو رانی بھسم ہو کر نہ رہ جائے گی کیا! ...... نہیں ..... مجھے اَب رانی کی طرف سے کوئی ڈر نہیں' اَور جو چودھری کا ہاتھ میری پگڑی کی طرف بڑھا تو مَیں یہ ہاتھ توڑ کر رکھ دُوں گا!

سمّوں نے کرم دین سے میل جول بند کر دیا!

پھر ایک دِن کرم دین کا باپ آیا اَور سموں سے کرم دین کے لیے رانی کا رِشتہ مانگا۔ سموں گُنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ دیر تک کوئی بات نہ کر سکا:

نہیں چودھری جی! میرا اَور آپ کا کوئی جوڑ نہیں۔

میں ساری برادری کی دُشمنی مول لے کر تیرے پاس آیا ہُوں سموں کرمُو میرا اِکلوتا بیٹا ہے' پر تیرا جگری دوست بھی ہے۔ تُو نے مجھے خالی ہاتھ لوٹا دیا تو برادری مجھے طعنے دے گی اَور کرمو جیتے جی مَر جائے گا۔ سوچ لے سموں!

سموں نے سَر جھکا لیا!

اُس نے جھکی ہُوئی آنکھوں کے ساتھ رانی کو دیکھا جو بڑی غم بھری نگاہوں سے اُس کی طرف تک رہی تھی۔

اَور تب کرم دین اَور رانی کی شادی' سارے علاقے کے لیے ایک اچنبھا بن کر رہ گئی! بھانت بھانت کی باتیں ہُوئیں ...... ''کرم دین اگر رانی کو زبردستی اُٹھا کر لے جاتا تو سموں کیا کر لیتا!'' ..... ''رانی کون سے راٹھ

کی بیٹی تھی کہ چودھری جھولی پھیلا کر دان لینے کے لیے گیا!"...... "چودھری نے تو برادری کی لٹیا ہی ڈبو کر رکھ دی!" ...... "عشق، ذات پات نہیں پوچھتا، عشق تو دو دِلوں کے مِل جانے کا نام ہے!"

اَور آہستہ آہستہ یہ باتیں ختم ہو گئیں۔ شادی کی غرابت، ماضی کی گود میں دفن ہو گئی۔ سموں اَور کرم دین نے یُوں زِندگی گزاری، جیسے ایک ہی برادری کے فرد ہوں! اَور آج ایک دُوسرے موڑ پر خانو اَور چھماں مل گئے تھے۔

خانو جو چھماں کا ماموں زاد بھائی تھا۔

چھماں جو خانو کی پھُوپھی کی بیٹی تھی۔

پر خانو سموں کا بیٹا تھا جو کبھی خانہ بدوش تھا۔

اَور چھماں کرم دین کی بیٹی تھی جو گاؤں کا چودھری تھا۔

اِن دونوں میں کیا میل ہو سکتا ہے:

"میں خانو کو روک دُوں گا کہ وہ چھماں سے نہ ملے۔ اِن کا معاملہ اَور ہے، اَور چھماں میری بہن کی بیٹی ہے جس سے مجھے بڑی محبت ہے۔"

....

جب خانو، رات گئے، گھر آیا تو سموں نے اُسے بُلا کر کہا:

دیکھ خانو! چھماں اَب جوان ہو چکی ہے۔ اُس سے نہ ملا کرو۔

کیوں؟

خانو نے حیران ہو کر پوچھا۔

لوگ بُری بُری باتیں کریں گے۔ کسی اَور نے دیکھ لیا تو چھماں بدنام ہو جائے گی۔

خانو نے وَعدہ کر لیا۔

لیکن اُس دِن کے بعد اُس کے قدم کئی بار اُس پگ ڈنڈی کی طرف بڑھے جہاں چھماں اُسے ہر شام مِل جایا کرتی تھی، پر وہ اُٹھے ہُوئے قدموں کو روک لیتا اَور چُپ چاپ کنویں پر باپ کے ساتھ کام کرتا رہتا۔ اُس نے اَپنے دوستوں سے بھی مِلنا جُلنا چھوڑ دیا۔ وہ نہ کبڈّی کھیلتا، نہ چوپال میں بیٹھ کر گانے گاتا، نہ کسی میلے ٹھیلے میں جاتا۔ سموں نے اُسے کبھی ہنستے ہُوئے نہ دیکھا تو اُس کے دِل میں ایک سرسراہٹ سی ہُوئی، ایک خوف نے دِھیرے دِھیرے اُس کے کان میں سرگوشی کی:

"رانی نے تیری عزّت کی چوکھٹ پر سَر جھکا دیا تھا۔ وہ تیری آن پر بھینٹ چڑھ جانے کے لیے تیار ہو

گئی تھی پر خانو کا مُعاملہ دُوسرا ہے۔ وہ مَرد ہے' وہ آسانی سے ہار نہیں مانے گا۔ اَب مَیں کیا کروں ...... کیا کروں!''

اُس نے کہا:

خانو! تم سارا دِن چُپ چاپ کیوں رہتے ہو؟

نہیں تو۔

دیکھ خانو! اَپنے دِل سے چھماں کا خیال نکال دے۔

میں چھماں سے کبھی نہیں مِلا۔

پھر ہنس کھیل کر دِن گزارا کر خانو! تُو چُپ رہتا ہے تو میرا جی کُڑھتا ہے۔

خانو نے مسکرانے کی کوشش کی تو سموں کا جی ڈوب گیا' جیسے کسی نے اُسے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔

خانو کُھل کر نہ ہنس سکا' پر وہ کنویں کا کام ختم کرنے کے بعد کبھی کبھار باہر جانے لگا۔ ایک دِن لوگوں نے اُسے ایک غیر آباد کنویں کے کِنارے' پاؤں لٹکائے' بیٹھے دیکھا ...... دُور نیچے کنویں کی تہ میں پانی' تارے کی طرح چمک رہا تھا۔ لوگ کہتے تھے' اُس کنویں پر اَسرار رہتے ہیں۔ لوگوں نے اُس کے اِرد گِرد ایک کالے سانپ کو مَنڈلاتے ہُوئے دیکھا تھا۔ لوگوں نے خانو سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں بیٹھا ہے' تو جواب میں وہ کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔ لوگوں نے سمجھا' واقعی اِس پر کسی پَری کا سایہ ہو گیا ہے۔ جب سموں کو اِس بات کا علم ہُوا تو اُس کا سِینہ کٹ کر رہ گیا:

''میں جانتا ہُوں' اُسے کیا روگ ہے ...... پر لوگوں کو کیا بتاؤں!''

ایک شام' لوگوں نے اُسے اُس ٹیلے کی طرف جاتے دیکھا جہاں ایک مست فقیر رہتا تھا۔ اُس کی جُھگّی میں بُوٹی کے دَور چلتے تھے۔

ایک رات وہ دیر سے گھر آیا تو سموں نے پوچھا:

کہاں رہے تم خانو؟

خانو کِھل کِھلا کر ہنس پڑا۔ ماں نے اُس کے سامنے روٹی رکھی تو وہ بھری چنگیر پر پِل پڑا۔ سموں نے آج کئی دِن بعد اُسے رغبت سے کھانا کھاتے دیکھا تو اُسے خوشی ہُوئی لیکن خانو کچھ اَیسے اَنداز سے کھا رہا تھا' جیسے وہ کئی دِنوں کا بُھوکا ہو۔ وہ چنگیر کی ساری روٹیاں سمیٹ گیا تو سموں نے کہا:

واہ میرے شیر! تم جو روز اِسی طرح سے کھایا کرو گے تو بھائی' ہم اِس گاؤں سے کُوچ کر جائیں گے۔

سموں ہنسا تو خانو بھی ہنس پڑا لیکن سموں کو خانو کی اُکھڑی اُکھڑی ہنسی پر حیرت ہُوئی! اُس نے ذرا غور سے دیکھا تو خانو کی آنکھوں میں اُسے عشقِ ناکام کے قصے کی پہلی سطریں لکھی ہُوئی نظر آئیں اَور

لال لال ڈوروں میں خود فراموشی کی پہلی تحریر!

اُس نے پوچھا:

آج تم نے بھنگ پی ہے خانو؟

خانو جواب میں ہنس پڑا...... ہنسی کی مُوسلا دھار بارِش تھمنے میں نہ آتی تھی۔

خانو! پھر مُنہ نہ لگانا اِسے، ورنہ مَیں جان سے مار دُوں گا تمھیں!

اَور خانو رو پڑا...... ساون بھادوں کی جھڑی!

میں چھماں سے نہیں مِلا کروں گا۔

اُس نے سہمی سہمی آواز میں کہا۔

اُس معصومانہ اَنداز میں جانے کتنا دُکھ بھرا تھا کہ سموں نے مُنہ پھیر لیا!

وہ چپکے سے باہر نکل گیا!

....

چودھری کرم دین کے آنگن میں داخل ہو کر وہ جھجک گیا!

اُس آنگن میں وہ بیس۲۰ سال سے یُوں آتا تھا جیسے اَپنا ہو لیکن آج اُسے یہ آنگن بیگانہ بیگانہ سا لگا۔

چودھری نے کہا:

سموں! سُنا ہے، خانو پر کسی اَسرار کا سایہ ہو گیا ہے۔

ہاں چودھری!

کسی سیانے کو دِکھاؤ نا!

وہ سائیں مستانے کے پاس روز جاتا ہے۔ جو اُن کی کرم کی نگاہ ہو گئی تو......

ٹھیک ہے سموں، رب بھلا کرے گا!

کچھ دیر فصلوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ بَیلوں اَور بھینسوں کا ذِکر ہُوا۔ یکایک چودھری نے کہا:

سموں! اَب کے مَنڈی لگے تو پنج کلیان کو بیچ آئیں۔

کیوں چودھری؟

چھماں جوان ہو گئی ہے نا! ابھی سے تھوڑا تھوڑا جہیز بنتا رہے تو اچھا ہے۔

سموں کا دِل ایک اَن جانے بوجھ تلے بھنچ کر رہ گیا۔

تو میری عزّت کا ساجھی ہے سموں! ایک بات کہوں جو تُو بُرا نہ منائے تو۔

کہو!

اَب خانو سے کہو، وہ اِس گھر میں نہ آیا کرے! میں نے اُڑتی اُڑتی خبر سنی ہے: فیض آباد کا نمبردار

چھماں کا رِشتہ مانگنا چاہتا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے، پر خانو اِس گھر میں کیوں نہ آئے؟

چودھری نے سَر جھکا لیا۔

میں ایک جوان بیٹی کا باپ ہُوں سموں! تم جانتے ہو، میرا اَور رانی کا جوڑ......

چودھری!......

سموں نے دانتوں تلے زبان دبا لی: "لوگ اِس بات کو بھُول چکے ہیں۔ پر چھماں جوان ہو چکی ہے۔ خانو بھی جوان ہے۔"

کرم دین، میں کیا کہہ سکتا ہُوں! میری بہن کا پلّو تیرے ہاتھ میں ہے۔ پر میں بھی ایک بات کرنے آیا تھا۔ سنو گے؟

کہو سموں!

میں نے ایک زمانے سے خانو کو منع کر دیا ہے کہ وہ اِس گھر میں نہ آیا کرے، اَور اُسی دِن سے اُس پر کسی اَسرار کا سایہ ہو گیا ہے!

میں نہیں سمجھا۔

میں تجھے کیسے سمجھاؤں چودھری! کتنے سال بیت گئے، تیرا باپ میرے ہاں جھولی پھیلا کر آیا تھا۔ میں نے رانی کو اُس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اَب مَیں چھماں کے لیے جھولی پھیلا کر......

سموں بات ختم نہ کر سکا۔ زَن کی آواز آئی اَور اُس کے مُنہ سے خون بہنے لگا۔

کمینے! تمھیں اِتنی بڑی بات مُنہ سے نکالتے ہُوئے ڈر نہ لگا؟

نہیں چودھری! تُو نے مجھے بھائی کہا تھا۔ ایک بھائی سے دُوسرا بھائی رِشتہ مانگنے کے لیے آ ہی جایا کرتا ہے۔ بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔

سموں!......

کرم دین نے کہا:

میں نے رانی کی خاطر تجھے بھائی بنایا تھا۔ جا رانی کو ساتھ لے جا! یہی سمجھ کہ آج سے تیرا اَور میرا رِشتہ ٹوٹ چُکا ہے۔

چودھری! چھماں بھی تو رانی کی بیٹی ہے۔ کہو تو اُسے بھی ساتھ لیتا جاؤں!

تو نے چھماں کا نام کس مُنہ سے لیا سموں!

چودھری پیچ و تاب کھا کر اُٹھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھایا تو سموں بولا:

بس چودھری!

چودھری کا اُٹھا ہُوا ہاتھ نیچے گر گیا:

میں نے جوانی میں کتنی بڑی غلطی کی کہ رانی کے عشق میں اندھا ہو کر......

چودھری!......

سموں نے اُس کی بات کاٹ کر کہا:

اَب میں سوچ رہا ہُوں، جو رانی کی بیٹی چھماں، خانو کے عشق میں اندھی ہو کر، کچھ کر بیٹھے تو کیا ہوگا!

کیا کہا؟

چودھری کی آواز میں بجلی کی کڑک تھی۔

یہی کہ پیار اُونچ نیچ نہیں دیکھتا چودھری! کچھ دِن ہوئے، مَیں نے چھماں اور خانو کو پگ ڈنڈی کے ایک تیکھے موڑ پر دیکھا تھا۔ ایک گھر کے آنگن میں اکٹھے کھیل کُود کر پروان چڑھنے والے، ایک موڑ پر آمنے سامنے ہو جائیں تو اِس کا مطلب کیا ہوتا ہے چودھری!

چودھری کا غُصّہ شُوں شُوں بجھ گیا۔

اُس کی آنکھیں بھی دِیے کی لَو کی طرح ٹِم ٹِما کر بجھ گئیں۔

سموں دِھیرے دِھیرے چودھری کے گھر سے نکلا۔ بجھی بجھی چاندنی سے لبالب بھرے آنگن میں رانی کھڑی تھی۔ سموں نے رانی کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں بے کسی تھی اور چہرے پر راکھ اُڑ رہی تھی!

....

خانو کھاٹ پر گُم صُم بیٹھا تھا۔

خانو!

سموں نے اُسے دِھیرے سے پکارا۔

خانو نے خالی خالی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

میں تیرے لیے کچھ بھی نہ کر سکا۔ میں آج چودھری کے پاس گیا۔ میں نے تیرے لیے چھمّاں کا رشتہ مانگا۔

چھماں!

خانو چونک گیا۔

ہاں خانو! میں نے چھمّاں کے لیے جھولی پھیلائی۔

پھر؟

خانو یک دم جاگ اُٹھا۔ اُس کا نشہ ہرن ہو گیا۔

کچھ بھی نہیں۔ میں نے ایک پھُول مانگا تھا۔ اُس نے میری جھولی کانٹوں سے بھر دی!......

سموں نے جواب دیا۔

اُس نے میرے مُنہ پر......

تیرے مُنہ پر......

خانو نے غور سے سمّوں کو دیکھا۔ اُسے سموں کی باچھوں سے بہ کر جمی ہُوئی خون کی لکیریں نظر آ گئیں۔

اُس نے تِلملا کر پوچھا:

چودھری نے تجھ پر ہاتھ اُٹھایا بابو؟

نہیں...... وہ میرا دوست تھا نا...... میرا بھائی۔ اُس نے مجھے اپنے پیار کا تحفہ دیا۔

میں اُس کا وہ ہاتھ توڑ ڈالوں گا بابو، جو تجھ پر اُٹھا! میں اُس کا غرور خاک میں مِلا دُوں گا...... مجھے ایک بار کہو......

خانو کی جوانی نے چمک کر کہا۔

نہیں خانو! اُس کا غرور پہلے ہی خاک میں مل چکا ہے۔

نہیں بابو...... ابھی نہیں...... میں اُس کے گھر میں آگ لگا دُوں گا...... دانا باد کے مرزے کی طرح چھماں کو بکّی پر بٹھا کر......

خانو!

سموں غصے سے چیخ اُٹھا:

تم نے چھمّاں کا نام کس مُنہ سے لیا! چھمّاں رانی کی بیٹی ہے اور جو ہاتھ رانی کی عزّت پر اُٹھے گا میں اُسے اُٹھنے سے پہلے کاٹ ڈالوں گا۔ مجھے......!

☆☆☆

اپنا گھر

جب مہر دین جاٹ نے کہا کہ وہ زمین اپنے دو بیٹوں میں بانٹ کر مصلّے پر بیٹھ جائے گا تو اُس کی بیوی بولی:

چودھری! تیری مت تو نہیں ماری گئی۔ تو بعد کو پچھتائے گا۔

جیناں! اِتنا زمانہ ہو گیا ہے کام کرتے کرتے، اب جی چاہتا ہے کہ آرام کروں۔

میری بات گرہ میں باندھ لے چودھری! آرام جٹ کی قسمت میں لکھا ہی نہیں۔

میاں بیوی میں یہ مکالمہ، ٹیوب ویل پر اُس دوپہر کو ہوا جب بھادوں کی دُھوپ نے مکّی کے کھیت میں نلائی کرتے ہوئے، جاٹ کو بے حال کر دیا تھا اور کھیت کی مینڈھ پر جو پاپلر کے درخت تھے، اُن کا سایہ اتنا کم اور سُکڑا ہوا تھا کہ اُس کا پسینہ بھی نہ سُوکھ سکا تھا۔

کسی اگلے نے سچ ہی کہا تھا کہ بھادوں کی دُھوپ نے جٹ کو فقیر بنا دیا تھا۔

....

اِس سے دو چار دِن بعد بشیر اور نذیر میں جھگڑا ہو گیا۔ نذیر کا خیال تھا کہ بشیر، بڑا بھائی ہونے کے ناتے سے، مجھ سے زیادہ کام لیتا ہے، ٹیوب ویل چلا کر خود دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھا حُقّہ پیتا رہتا ہے اور کھیتوں میں سارے کام مجھے کرنا پڑتے ہیں...... ناکے مَیں موڑتا ہُوں، کیارے مَیں بناتا ہُوں؛ مونجی کی فصل، جسے پانی کی بہت ضرورت ہوتی ہے، اُس کی دیکھ بھال بھی مَیں کرتا ہُوں؛ لبالب بھرے مونجی کے کھیت کی مینڈھ پر کھڑے ہونا اور وہ بھی بھادوں کی دُھوپ میں، یوں لگتا ہے جیسے کسی کو گرم بھاپ دی جا رہی ہو، سر سے پاؤں تک بندہ پسینے میں نہا جاتا ہے: پانی میں کئی سُورج تیر رہے ہوتے ہیں اور چنگاریاں اُٹھتی ہیں، آنکھوں کی پتلیاں جلتی ہُوئی محسوس ہوتی ہیں، ایک بار کھیت کو دیکھ لو تو دیر تک آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہتا ہے۔

اصل میں سارا فساد بھادوں کی دُھوپ کا تھا۔

جہاں جہاں سے پانی رِس رہا تھا، وہاں مُونجی کے کھیتوں کی مینڈھیں درست کر کے، نذیر ٹیوب ویل

پر لوٹا تو بشیر دھریک کے سایے میں کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے اُونگھ رہا تھا۔

نذیر پھٹ پڑا:

بھا بشیر! کوئی چھوٹا موٹا کام تُو بھی کر لیا کر۔

بشیر نے یکایک جاگ کر کہا:

کیا کہہ رہے ہو نذیر! میں کام نہیں کرتا؟

ہاں! دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں تلے بیٹھ کر حُقّہ چھکتے رہتے ہو اَور میں کھیتوں میں کھڑا دُھوپ میں جلتا رہتا ہُوں۔ ذرا دُھوپ میں نکل کر تو دیکھو!

ابھی دونوں بھائیوں میں تُو تکار شروع نہیں ہوئی تھی کہ نذیراں سَر پر روٹیوں کا چھابا رکھے اَور ہاتھ میں گھنی لسّی کا ڈول لٹکائے بھتّے ویلا لے کر آ گئی۔ اُس کے چہرے پر پسینہ تھا اَور پسینے سے غصہ چھلک رہا تھا۔ اُس نے کھاٹ پر چھابا رکھا اَور ڈول لے کر ٹیوب ویل پر چلی گئی۔ پہلے اُس نے ٹیوب ویل کے ٹھنڈے ٹھار پانی سے مُنہ ہاتھ دھوئے، پھر کوٹھری کے اَندر سے ایک لمبا سا گلاس نکالا اَور ٹیوب ویل کی تیز دھار سے گلاس بھر بھر کر ڈول میں ڈالے اَور لسّی بڑھائی۔ نذیر اَیسے ہی دو۲ گلاس اَور دھو دھا کر لے آیا۔ نذیراں نے ایک گلاس بھر کر بشیر کو دیا اَور کہا:

بھا! ایک بات کروں، تُو غصے تو نہیں ہو گا؟

نہیں نذیراں!

بشیر نے لسّی کا گھونٹ بھر کر کہا۔

بھا! بہن بشیراں کو سمجھا۔ دِن رات منجی پر پڑی رہتی ہے، کچھ ہِلا جُلا کرے۔ گھر کے سارے کام بھی مجھے کرنے پڑتے ہیں اَور باہر کے بھی!

دیکھ نذیراں!......

بشیر نے بڑے پیار سے کہا:

اُس پر وقت بھی تو اَیسا ہی آیا ہُوا ہے۔ تجھے تو مجھ سے زیادہ پتا ہے۔

نذیراں نے کچھ جھینپ کر کہا:

اُسے کچھ تو ہاتھ پیر ہلانے چاہئیں۔ منجی پر پڑی پڑی "مجھ کی مجھ" ہو رہی ہے!

چپ کر نذیراں!

اُس کے خاوند نذیر نے اُسے جھڑکا:

بشیر میرا بڑا بھائی ہے اَور بشیراں میری بڑی بہن۔ گھر میں بہن بشیراں کام نہیں کرتی اَور یہاں بھا بشیر...... اُٹھ بابے کو آواز دے!

نذیراں نے کچھ دُور جا کر پکارا:

ماماں! آ روٹی کھا لے۔

نذیراں مہردین کی بھانجی تھی۔

جب مہردین پسینے میں ڈوبا ہُوا ٹیوب ویل پر آیا تو تقریباً نیم بے ہوش تھا۔ نذیراں نے فوراً لسّی کا گلاس بھر کر اُس کے ہاتھ میں تھما دیا اَور کہا:

ماماں! تیرا تو بُرا حال ہے۔

مجھے کچھ نہیں ہُوا کُڑیے!

مہردین نے کہا اَور غٹ غٹ لسّی کا گلاس چڑھا گیا۔

تب نذیر بولا:

بابا! اَب تیرے دِن کام کرنے کے نہیں۔ تُو بھا بشیر سے کیوں نہیں کہتا کہ کام کیا کرے!

بشیر بھی کام کرتا ہے۔

ہاں! بہت کام کرتا ہے۔ ٹیوب ویل چلا کر دھریک کی چھاؤں میں بیٹھا رہتا ہے اَور حقہ ٹھونستا رہتا ہے۔

بس کر نذیرے! تُو تو ٹوٹے چھتّر کی طرح پھیلتا ہی چلا جا رہا ہے۔

بشیر نے غصے سے کہا۔

ماماں! گھر میں بہن بشیراں بھی تو منجی پر بیٹھ کر چَودھر کرتی ہے۔

نذیراں بولی۔

بابا! سنا؟ نذیراں کیا کہہ رہی ہے!

بشیر کے انداز میں غصہ بھی تھا اَور گِلہ بھی۔

سن لیا!......

مہردین نے کہا:

اَب مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لینا چاہیے ...... آؤ' اَب روٹی کھائیں!

تنور کی روٹیاں' مکھن سے چُپڑی ہُوئی تھیں۔ ایک پیالے میں ٹِنڈوں کا سالن تھا' ایک میں آم' لسوڑوں اَور مرچوں کا اَچار۔ ہر ایک کے ہاتھ میں گلاس تھا جس میں ٹھنڈی نمکین لسّی تھی۔ ایک لقمے میں مکھن' سالن' اَچار اَور لسّی کا چہار آتشہ مزہ گُھلا ہُوا تھا۔ تینوں نے چُپ چاپ روٹی کھائی اَور بھائیوں کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بشیر اُٹھا۔ اُس نے نئ چلم بھری اَور ٹیوب ویل سے حقہ تازہ کر کے باپ کے سامنے رکھ دیا۔ نذیراں برتن سمیت کر گاؤں کی طرف چلی گئی۔ نذیر حقے کے دو کش لگا کر کھیت کی طرف چلا گیا

اَور وہاں سے اُس نے اِشارہ کیا کہ ٹیوب ویل بند کر دو کھیت بھر چکا ہے لیکن مہر دین نے بشیر کو روک دیا۔ وہ لنگوٹا کَس کر ٹیوب ویل کی دھار کے نیچے جا کھڑا ہُوا۔ اگرچہ دوپہر کی دُھوپ بہت تیز تھی اَور ٹیوب ویل پر کوئی سایہ بھی نہیں تھا لیکن ٹھنڈے پانی نے جسم کی ساری گرمی نکال دی تھی۔

وہ حقّے کی نے مُنہ میں لے کر کھاٹ پر بیٹھ گیا۔

جب نذیر کھیت سے واپس آیا تو دونوں بھائی زمین پر بیٹھ گئے اَور باپ کا مُنہ تکنے لگے: ''پتا نہیں، بابے نے کیا فیصلہ کیا ہے؟'' مہر دین نے پانچ سات منٹ اُنھیں اِنتظار میں رکھا۔ پھر کہا:

تمھاری ماں سے مشورہ کرلوں تو پھر کوئی فیصلہ کروں گا۔

کیا فیصلہ کرو گے؟

دونوں نے بہ یک وقت پوچھا۔

ابھی نہ پوچھو۔ جاؤ اَندر سے سرہانا لے آؤ!

مہر دین حقّے کی نَے مُنہ میں لیے دھریک کے سایے تلے بچھی کھاٹ پر لیٹتے ہی گُھوک سو گیا۔ بھادوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے، ہلکی ہلکی ہَوا بھی چلتی رہتی ہے اَور حبس بھی نہیں ہوتا۔

بشیر نے نہایت آہستگی سے حقّے کی نَے بابے کے مُنہ سے نکال لی۔

....

مہر دین عام طَور پر ٹیوب ویل ہی پر رہا کرتا تھا۔ ڈھور ڈنگروں کی رکھوالی ضروری تھی بعض اَوقات رات کو بھی ٹیوب ویل چلانا پڑتا تھا۔ بشیر اَور نذیر گھر چلے جایا کرتے تھے۔ اُس شام اُس نے بشیر اَور نذیر سے کہا کہ آج رات وہ دونوں ٹیوب ویل پر رہیں، میں گھر جاؤں گا!

مہر دین کو وَرثے میں پانچ سات کھیت ہی ملے تھے۔ وہ محنتی آدمی تھا اَور اُس کی بیوی جُز رس۔ اُس نے چھ سات کھیتوں کا اِضافہ کر لیا تھا۔ اُس زمانے میں زمین کی اِتنی قدر نہ تھی۔ مہاجر زمین اَلاٹ کراتے اَور اَونے پَونے بیچ کر کسی دُوسرے گاؤں میں چلے جاتے۔ عام طور پر اُنھیں نہری علاقہ پسند تھا۔ اِشتمال ہُوا تو آدھا مربع زمین ایک جگہ اکٹھی ہو گئی۔ بجلی آئی تو مہر دین نے ٹیوب ویل بھی لگوا لیا۔

اُس رات کُھلی چھت پر میاں بیوی آپس میں کُھسر پُھسر کرتے رہے اَور بشیراں اَور نذیراں کان لگائے اُن کی باتیں سننے کی کوشش کرتی رہیں لیکن چھت دو حصوں میں منقسم تھی اَور درمیان میں دیوار تھی۔

اُس نے جیناں کو آج دوپہر کا قصہ سُنایا اَور کہا:

جیناں! تُو بڑی بھاگ والی ہے۔ تُو نے مہر دین کے گھر کو جنّت بنا دیا ہے' پر اَب جنت میں نقب لگ چکی ہے۔ دونوں بھائیوں میں پھُوٹ پڑ گئی ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اُنھیں الگ الگ کر دیا جائے!

جیناں رونے لگی لیکن اُس کے فیصلے کی تردید نہ کی۔

اگلے دِن مہر دین نے اَپنا فیصلہ سُنا دیا۔ دونوں بھائیوں میں زمین' برابر برابر تقسیم کر دی۔ ٹیوب ویل کے ساتھ کا چار کنال کا ٹکڑا اَپنے پاس رکھا اَور ٹیوب ویل بھی اَپنی تحویل میں لے لیا کہ کہیں پانی کی تقسیم پر دونوں بھائی لڑتے نہ رہیں۔ ڈھور ڈنگروں کے متعلق طے ہُوا کہ بیلوں کی جوگ مشترکہ ہوگی۔ ایک ایک لیری (دودھیل بھینس) بھائیوں کے حصے میں آئی لیکن ایک "جھوٹی" کو جیناں نے اَپنے پاس رکھ لیا۔ اِس کے ساتھ ہی میاں بیوی کا بٹوارا بھی ہوگیا۔

مہر دین چھوٹے بیٹے نذیر کے حصے میں آیا کیوں کہ نذیراں اُس کی بھانجی تھی اَور جیناں بڑے بیٹے بشیر کے حصے میں کہ بشیراں اُس کی بھانجی تھی۔

ٹیوب ویل پر جو کمرہ بنا ہُوا تھا' اُسے لیپ پوت کر نذیراں نے مامے کی مستقل رہائش کے قابل بنا دیا۔ یُوں مہر دین پہلے بھی اُسی کمرے میں رہتا تھا۔ جیناں اُسی کوٹھری میں مقیم رہی جو میاں بیوی کے لیے مخصوص تھی۔

مہر دین کے لیے کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی تھی اَور شروع شروع میں جیناں کو بھی کچھ زیادہ فرق محسوس نہ ہوا کہ ڈوئی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ جب سب اکٹھے تھے تو وہ چُولھے چَوکے میں بہوؤں کا ہاتھ بٹاتی تھی' کبھی تنور تپا کر روٹیاں بھی لگا لیتی۔ بہوئیں پکا رِیندھ کر ہانڈی اَور چنگیر اُس کے سامنے رکھ دیتیں۔ پوتے پوتیاں اُس کے اِرد گِرد بیٹھ جاتے۔ وہ روٹیاں چُپڑتی، لسّی بڑھاتی' پہلے ٹیوب ویل والوں کے لیے کھانا پروستی، پھر پوتے پوتیوں کو کِھلاتی اَور اُن کے بعد بہوؤں کو کھانا دیتی اَور سب سے آخر میں خود کھاتی۔ کبھی کبھار یہ ہوتا کہ اُس کے لیے سالم روٹی نہ بچتی اَور وہ بچّوں کے چھوڑے ہُوئے ٹکڑے کھا کر پیٹ بھر لیتی۔ دال سبزی کم پڑ جاتی تو اُسے کوئی پروا نہ ہوتی' وہ لسّی سے روٹی کھا لیتی۔ جس کے ہاتھ میں ڈوئی ہو' اُسے ایسی قربانیاں دینا ہی پڑتی ہیں۔ ڈوئی حکومت ہے اَور حکومت اَپنی قیمت بھی مانگتی ہے۔

کچھ عرصے تک بشیراں نے ڈوئی اُس کے ہاتھ سے نہ چھینی۔ وجہ یہ تھی کہ اَب بشیر کے ساتھ اُسے کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ جب اُس کی زچگی قریب آئی تو بشیر نے ایک کاماں رکھ لیا۔

دونوں بھائی اَب بہت محنت کرتے تھے اَور اَپنے اَپنے حصے کی کھیتی میں بڑھ چڑھ کر کام کرتے۔

زراعت بھی آسان ہو گئی تھی۔ گاؤں میں ایک دو ٹریکٹر بھی تھے جو کرایے پر چلتے تھے۔ ٹریکٹر چلوانے کے بعد کھیت میں ایک دو بار ہل چلا لینے کو بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی جوگ کو دونوں بھائی باری باری اِستعمال کر لیتے تھے۔

مہر دین کو کام کی عادت تھی، وہ اکثر اپنی چار کنالوں میں کام کرتا نظر آتا۔ سبزیاں لگانے کا اُسے شوق تھا حالاں کہ یہ کام اَرائیوں کا تھا اَور جاٹ، سبزی کاشت کرنے میں، ہتک محسوس کرتے تھے لیکن اَب زمانہ بدل گیا تھا۔ بشیر اَور نذیر کو بھی مفت میں سبزی مِل جاتی تھی۔

نذیراں اَپنے مامے کا بہت خیال رکھتی۔ مامے کو سَردیوں میں چائے پینے کی عادت پڑ گئی تھی، اُس کے لیے چائے پکا کر، گاؤں سے کیتلی میں ڈال کر لاتی۔ اَب مہر دین نے چائے ٹیوب ویل ہی پر بنانا شروع کر دی۔

....

جب بشیراں زچگی سے فارغ ہُوئی تو ننھے کو ساس کی گود میں ڈال کر، اُس نے آہستہ آہستہ ڈوئی پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ کچھ دبی دبی زبان میں اُس نے ساس پر حکم چلانا بھی شروع کر دیا:

ماسی! ذرا تندور تو تپا لے، میں ننھے کو دودھ پلا لوں۔

ماسی! ذرا ہانڈی تو دیکھ لے، کہیں مسالہ لگ نہ جائے۔

یہ تھوڑے سے کپڑے ہیں؛ اگر ٹیوب ویل پر جا کر دھو لائے تو تیرے پیچھے مَیں گھر کے سارے کام کاج نبیڑ لوں۔

اَور جب جِیناں تندور پر روٹیاں پکا کر چنگیر بھر کے لاتی تو بشیراں ہانڈی سامنے رکھے، پیڑھی پر براجمان نظر آتی...... روٹیاں چُپڑتی، ہنڈیا سے سالن نکال کر رکابیوں میں ڈالتی، کامے کے ہاتھ چھاہ ویلا اَور بھتّے ویلا ٹیوب ویل پر بھیج کر بچّوں کو کھانا کِھلاتی۔ سب سے آخر میں ماسی کی باری آتی۔ رات کا کھانا بشیر گھر آ کر کھاتا تھا اَور بشیراں بڑی تمکنت سے پیڑھی پر اُس کے لیے کھانا پروستی۔ وہ پوچھتا:

بے بے کو روٹی دی؟

سب کچھ بے بے کا ہے، جب چاہے گی، کھا لے گی۔

اَور بے بے کو سب سے آخر میں کھانا مِلتا۔ کبھی کبھار یہ ہوتا کہ روٹی کم پڑ جاتی، اَور بشیراں جو ڈوئی پر قابض ہو چکی تھی لیکن ڈوئی کی اِس رِیت سے آگاہ نہ ہو سکی تھی کہ اُس کے لیے کچھ قربانی بھی دینا پڑتی ہے، بچوں کی روٹیوں میں سے بچے ہُوئے ٹکڑے خود کھانے کے بجائے ساس کو کھانے کے لیے دیتی۔

جیناں کو اَب بچے کھچے ٹکڑے کھا کر ذِلّت کا اِحساس ہوتا۔ یوں لگتا کہ جس گھر میں وہ رہ رہی ہے' اَب اُس کے لیے پرایا سا ہو گیا ہے۔ یہ گھر مہر دین کو وَرثے میں مِلا تھا لیکن دونوں نے مِل کر اِس کے کچے کمروں کو پکے کمروں میں تبدیل کیا تھا۔ وہ گھر کو چمکاتی لِشکارتی رہتی تھی اَور اَب اُس کے حصے میں جو کوٹھری آئی تھی، وہ اُسے قید خانہ معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ زیادہ وقت ٹیوب ویل پر گزارتی۔ اُسے اپنی ''جھوٹی'' سے بہت پیار تھا۔ وہ ابھی کٹیا ہی تھی کہ جیناں نے اُس کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی کیوں کہ یہ پنج کلیان تھی اَور پنج کلیانیں بڑی بھاگوان ہوتی ہیں۔

ایک دِن بشیراں نے اُسے بہت جھڑکا کہ وہ گھر کے کام کاج سے بچنے کے لیے ٹیوب ویل پر چلی جاتی ہے۔ ایک فقرہ اُس کا بہت ہی کٹیلا تھا کہ ماسی تو اپنی عُمر تو دیکھ' ماسٹر (مہر دین) سے ملنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنی کھاٹ اَور بستر ٹیوب ویل پر لے جا!

جیناں اِس بات کو پی گئی اَور اُس نے مہر دین سے اِس کا تذکرہ نہ کیا۔

....

مہر دین کو بھی اَپنے منصوبے پر عمل کرنے کے باوجود' زیادہ آرام نہ مِلا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جاٹ جب تک چارپائی سے لگ نہیں جاتا' وہ کھیتی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اَب بشیر اَور نذیر دونوں کی کوشش ہوتی کہ بابے سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے رہا کریں۔

کبھی بشیر کہتا:

بابا! آج میرا کاماں کھاد لینے گیا ہُوا ہے اَور چارا کاٹنا ہے اَور کترنا بھی ہے۔

مہر دین کو نہ صرف بشیر کے ساتھ مِل کر چارا کاٹنا پڑتا بلکہ ٹوکے پر دتھے بھی لگانا پڑتے۔ نذیر بابے کو ذرا فارِغ دیکھتا یا ٹیوب ویل بند ہوتا تو کہتا:

آلوؤں کے کھیت میں گوڈی ہو رہی ہے اَور مٹی چڑھائی جا رہی ہے۔ جب تک سَر پر کھڑا نہ ہُوا جائے' لاوے کام نہیں کرتے۔ تُو ذرا کھیت میں تو چلا جائیں بیری والے کھیت میں ٹریکٹر چلوا لوں!

جب ٹیوب ویل کی بجلی کا بِل اَدا کرنا ہوتا تو بشیر اَور نذیر' دونوں لیت و لعل کرتے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی بہانا ہوتا۔ مہر دین کے پاس جو جمع پُونجی تھی' وہ بڑی جلدی سے خرچ ہونے لگی اَور ایک دِن اُس نے دیکھا کہ بجلی کا بِل اَدا کر کے اُس کا کِیسہ خالی ہو گیا۔ اگلی بار اُس نے بشیر اَور نذیر سے پیسے مانگے تو بشیر نے کہا:

زراعت بھی آسان ہوگئی تھی۔ گاؤں میں ایک دو ٹریکٹر بھی تھے جو کرایے پر چلتے تھے۔ ٹریکٹر چلوانے کے بعد کھیت میں ایک دو بار ہل چلا لینے کو بہتر سمجھا جاتا تھا۔ ایک ہی جوگ کو دونوں بھائی باری باری اِستعمال کر لیتے تھے۔

مہردین کو کام کی عادت تھی، وہ اکثر اپنی چار کنالوں میں کام کرتا نظر آتا۔ سبزیاں لگانے کا اُسے شوق تھا حالاں کہ یہ کام اَرائیوں کا تھا اَور جاٹ، سبزی کاشت کرنے میں، ہتک محسوس کرتے تھے لیکن اَب زمانہ بدل گیا تھا۔ بشیر اَور نذیر کو بھی مفت میں سبزی مِل جاتی تھی۔

نذیراں اَپنے مامے کا بہت خیال رکھتی۔ مامے کو سَردیوں میں چائے پینے کی عادت پڑگئی تھی، اُس کے لیے چائے پکا کر، گاؤں سے کیتلی میں ڈال کر لاتی۔ اَب مہر دین نے چائے ٹیوب ویل ہی پر بنانا شروع کر دی۔

....

جب بشیراں زچگی سے فارغ ہُوئی تو ننھے کو ساس کی گود میں ڈال کر، اُس نے آہستہ آہستہ ڈوئی پر قبضہ جمانا شروع کر دیا۔ کچھ دبی دبی زبان میں اُس نے ساس پر حکم چلانا بھی شروع کر دیا:

ماسی! ذرا تندور تو تپالے، میں ننھے کو دودھ پلالوں۔

ماسی! ذرا ہانڈی تو دیکھ لے، کہیں مسالہ لگ نہ جائے۔

یہ تھوڑے سے کپڑے ہیں؛ اگر ٹیوب ویل پر جا کر دھو لائے تو تیرے پیچھے مَیں گھر کے سارے کام کاج نبیڑلوں۔

اَور جب جَیناں تندور پر روٹیاں پکا کر چنگیر بھر کے لاتی تو بشیراں ہانڈی سامنے رکھے، پیڑھی پر براجمان نظر آتی ...... روٹیاں چُپڑتی، ہنڈیا سے سالن نکال کر رکابیوں میں ڈالتی، کامے کے ہاتھ چھاہ ویلا اَور بھتّے ویلا ٹیوب ویل پر بھیج کر بچّوں کو کھانا کِھلاتی۔ سب سے آخر میں ماسی کی باری آتی۔ رات کا کھانا بشیر گھر آکر کھاتا تھا اَور بشیراں بڑی تمکنت سے پیڑھی پر اُس کے لیے کھانا پروستی۔ وہ پوچھتا:

بے بے کو روٹی دی؟

سب کچھ بے بے کا ہے، جب چاہے گی، کھالے گی۔

اَور بے بے کو سب سے آخر میں کھانا مِلتا۔ کبھی کبھار یہ ہوتا کہ روٹی کم پڑ جاتی، اَور بشیراں جو ڈوئی پر قابض ہو چکی تھی لیکن ڈوئی کی اِس رِیت سے آگاہ نہ ہو سکی تھی کہ اُس کے لیے کچھ قربانی بھی دینا پڑتی ہے، بچوں کی روٹیوں میں سے بچے ہُوئے ٹکڑے خود کھانے کے بجائے ساس کو کھانے کے لیے دیتی۔

جیناں کو اَب بچے کھچے ٹکڑے کھا کر ذِلّت کا اِحساس ہوتا۔ یوں لگتا کہ جس گھر میں وہ رہ رہی ہے' اَب اُس کے لیے پرایا سا ہو گیا ہے۔ یہ گھر مہر دین کو ورثے میں مِلا تھا لیکن دونوں نے مِل کر اِس کے کچے کمروں کو پکے کمروں میں تبدیل کیا تھا۔ وہ گھر کو چمکاتی لِشکارتی رہتی تھی اَور اَب اُس کے حصے میں جو کوٹھری آئی تھی' وہ اُسے قید خانہ معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ زیادہ وقت ٹیوب ویل پر گزارتی۔ اُسے اپنی ''جھوٹی'' سے بہت پیار تھا۔ وہ ابھی کٹیا ہی تھی کہ جیناں نے اُس کی دیکھ بھال شروع کر دی تھی کیوں کہ یہ پنج کلیان تھی اَور پنج کلیانیں بڑی بھاگوان ہوتی ہیں۔

ایک دِن بشیراں نے اُسے بہت جھڑکا کہ وہ گھر کے کام کاج سے بچنے کے لیے ٹیوب ویل پر چلی جاتی ہے۔ ایک فقرہ اُس کا بہت ہی کٹیلا تھا کہ ماسی تو اپنی عُمر تو دیکھ' ماسٹر (مہر دین) سے ملنے کا اِتنا ہی شوق ہے تو اپنی کھاٹ اَور بستر ٹیوب ویل پر لے جا!

جیناں اِس بات کو پی گئی اَور اُس نے مہر دین سے اِس کا تذکرہ نہ کیا۔

....

مہر دین کو بھی اَپنے منصوبے پر عمل کرنے کے باوجود' زیادہ آرام نہ مِلا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ جاٹ جب تک چارپائی سے لگ نہیں جاتا' وہ کھیتی سے الگ نہیں ہو سکتا۔ اَب بشیر اَور نذیر دونوں کی کوشش ہوتی کہ بابے سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے رہا کریں۔

کبھی بشیر کہتا:

بابا! آج میرا کاماں کھاد لینے گیا ہُوا ہے اَور چارا کاٹنا ہے اَور کترنا بھی ہے۔

مہر دین کو نہ صرف بشیر کے ساتھ مِل کر چارا کاٹنا پڑتا بلکہ ٹوکے پر دتھے بھی لگانا پڑتے۔ نذیر بابے کو ذرا فارِغ دیکھتا یا ٹیوب ویل بند ہوتا تو کہتا:

آلوؤں کے کھیت میں گوڈی ہو رہی ہے اَور مٹی چڑھائی جا رہی ہے۔ جب تک سر پر کھڑا نہ ہُوا جائے' لاوے کام نہیں کرتے۔ تُو ذرا کھیت میں تو چلا جا' مَیں بیری والے کھیت میں ٹریکٹر چلوا لوں!

جب ٹیوب ویل کی بجلی کا بِل اَدا کرنا ہوتا تو بشیر اَور نذیر' دونوں لیت و لعل کرتے۔ ہر ایک کے پاس کوئی نہ کوئی بہانا ہوتا۔ مہر دین کے پاس جو جمع پُونجی تھی' وہ بڑی جلدی سے خرچ ہونے لگی اَور ایک دِن اُس نے دیکھا کہ بجلی کا بِل اَدا کر کے اُس کا کِیسہ خالی ہو گیا۔ اگلی بار اُس نے بشیر اَور نذیر سے پیسے مانگے تو بشیر نے کہا:

بابا! میرا خیال ہے، بے بے کے پاس تھوڑی بہت رقم ضرور ہو گی فصل اُٹھنے تک بے بے سے اُدھار لیتے رہو، تب ہم ایک ایک پیسا ادا کر دیں گے۔

جب جیناں ٹیوب ویل پر آئی تو مہر دین نے بشیر اور نذیر کو بُلا لیا اور اُن کی موجودگی میں اُس سے بات کی تو وہ اچانک غصے میں آ گئی۔ اُس نے کہا:

بشیرے! دو سال سے تُو الگ ہے۔ بتا، تُو نے مجھے کتنے پیسے دیے؟

پھر اُس نے مہر دین سے مخاطب ہو کر کہا:

چودھری! تیرا بیٹا نذیر تیری بڑی خدمت کرتا ہے۔ اِس نے تجھے بڑی رقم دی ہو گی؟

بشیر اور نذیر دونوں، شرمندہ ہو گئے۔

اَب وہ مشترکہ طور پر بل ادا کرنے لگے تو اُن کے رویّے بہت سخت ہو گئے۔ بشیراں اور نذیراں دونوں نے کنجوسی شروع کر دی اور بابے اور بے بے کی حد تک کچھ زیادہ ہی۔ بشیراں نے اپنی ساس کو ڈوئی کی خوب مار دی۔ اُسے سیر ہو کر بچے کھچے ٹکڑے بھی کھانے کو نہ ملتے۔ نذیراں روٹی چُپڑتی ضرور لیکن دِکھاوے کی حد تک۔ روٹی نرم نہ ہوتی اور بابے کو لقمے چبانے اور نگلنے میں دِقّت ہوتی۔ دونوں بھائیوں کی لیریاں تقریباً ایک ہی وقت میں سُوکھ گئی تھیں اور مانگے تانگے کی پتلی کنجا لسّی سے بابے کا لقمہ تر نہ ہوتا۔

اِس اَثنا میں جیناں کی ''جُھوٹی'' بیاہی گئی تھی اور جب تک وہ بچّہ نہ جنی، جیناں چُپ چاپ ڈوئی کی مار کھاتی رہی۔ بشیراں اور نذیراں دونوں خوش تھیں کہ اَب لسّی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

....

پھر ایک دِن مہر دین نے دیکھا کہ جیناں ٹیوب ویل پر آ کر مٹّی گوندھنے لگی ہے۔ اُس میں بھُوسا مِلا کر اُس نے گارا بنایا اور ٹیوب ویل والی کوٹھری کو لیپنا پوتنا شروع کر دیا۔ دو تین دِن بعد جب لیپائی سوکھی تو اُس نے دیکھا کہ جیناں سر پر ایک بڑا سا گٹھڑ رکھے، گاؤں کی طرف سے چلی آ رہی ہے۔ مہر دین کے سامنے اُس نے گٹھڑ کھولا تو اُس میں سے اُس کے جہیز کے پرانی طرز کے بچے کھچے برتن نکلے۔ تب مہر دین سمجھ گیا اور مسکرا کر خاموش ہو رہا۔ جیناں نے برتن دھو مانجھ کر چمکا دیے۔

اُس سے اگلے دِن کمہاری ایک چاٹی، ایک کنالی اور ایک ہانڈی ٹیوب ویل پر لے آئی۔ گاؤں کا ترکھان ایک چوکی، ایک مداہنی اور ایک پرچھتی بنا کر لے آیا جو اُس نے کوٹھری کی دیوار میں لگا دی۔ جیناں نے چمکائے ہُوئے برتن اُس پر سجا دیے۔ پھر اُس نے کوٹھری کے باہر چُولھا چوکا بنایا۔ اَب پہلن ''جُھوٹی'' کا

دُودھ، بوہلی اَور بوہلے کی منزل سے گزر چُکا تھا۔ تب ایک شام وہ اَپنا بستر بھی ٹیوب ویل پر لے آئی۔ پہلن کا دُودھ دوہ کر اُس نے گرم کیا اَور جب ٹھنڈا ہُوا تو اُسے کھٹّا لگا دیا۔

صبح سویرے جب چاٹی میں گُھمک گھُوں مداہنی چلی تو مہر دین جاٹ کو وہ زمانہ یاد آ گیا جب مداہنی کے ساتھ ڈوئی بھی جیناں کے ہاتھ میں آئی تھی اَور اَب تو مدّت سے اُس نے مداہنی کا نغمہ نہ سنا تھا۔ وہ بہت خوش ہُوا۔ اُسے اَیسا لگا، جیسے وہ ایک نئی زِندگی کا آغاز کر رہا ہو۔ جیناں نے لسّی پر سے مکھن اکٹھا کیا جو اِتنا کم تھا کہ پیالی بھی نہ بھری گئی۔ پھر اُس نے چُولھا جلایا اَور تازہ مکھن سے دو پراٹھے پکائے اَور آواز دی:

چودھری! آ، چھاہ ویلا کھا لے۔

اَور مہر دین کے گلے میں نرم اَور تر پراٹھے کے لقمے پھنسنے لگے کہ ابھی بشیر اَور نذیر کا چھاہ ویلا گاؤں سے نہیں آیا تھا اَور جیناں کا جی بھی کُڑھ رہا تھا۔ مہر دین جی کڑا کر کے لسّی کے ساتھ پراٹھا کھاتا رہا لیکن جیناں سے نہ رہا گیا۔ وہ پڑچھتی سے پیتل کے لشکتے ہوئے دو چھنّے اُتار لائی۔ بشیر اَور نذیر ٹیوب ویل سے کچھ دُور اَپنے اَپنے کھیت میں کام کر رہے تھے۔ وہ اُن کی طرف مُنہ کر کے پکاری:

وے بشیر! وے نذیر! اِدھر آ کر لسّی پی لو۔

تب پیڑھی پر بیٹھ کر اُس نے دونوں چھنّے لسّی سے بھرے اَور جب تک دونوں بھائی نہ آئے، وہ چھنوں کو دیکھتی رہی اَور اُس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گِرتے رہے!

یہ خوشی کے آنسو تھے یا غم کے؟ کون جانے!

میرا خیال ہے، یہ ممتا کے آنسو تھے۔ اَور ممتا کے آنسوؤں میں جو اَسرار ہے، اُس پر سے کون پردہ اُٹھا سکتا ہے!

☆☆☆

قارئینِ کرام سے درخواست

صفحہ ۹۶ کے آخر یا صفحہ ۹۷ کے شروع میں درجِ ذیل الفاظ کا اِضافہ کر لیں ...... شکریہ!

صاحب زادہ صاحب اُس مجرم کی طرح کانپے جس کا جُرم آشکار ہو گیا ہو لیکن دُوسرے لمحے کریم اُن کی چارپائی کے پاس نیچے فرش پر بیٹھ گیا اَور اُس نے حُقّے کی نے اُن کی طرف موڑ دی۔ صاحب زادہ صاحب

اُردو کے صفِ اوّل کے افسانہ نگار، غلام الثقلین نقوی کے خُوب صُورت اَفسانوں کا ایک کڑا اِنتخاب پروفیسر سجّاد نقوی نے کِیا ہے؛ سچّی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اِنتخاب کا حق اَدا کر دیا ہے اور یہ فریضہ اَنجام دیتے ہوئے اِس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے کہ غلام الثقلین نقوی کے فن کی تمام ترجِہات کا احاطہ ہو سکے۔

غلام الثقلین نقوی نے اَپنے اَفسانوں میں شہری زِندگی اور اُس کے جزرومدّ کے ساتھ ساتھ دیہی زِندگی اور اُس کی ثقافت کو بھی گہری نظر سے دیکھا ہے؛ پلاٹ کے مکانی پھیلاؤ اور کِردار کی زمانی کروٹوں کے اِمتزاج سے اَپنے اَفسانوں کی قوّت میں بیش بہا اِضافہ کیا ہے؛ اِس پر مستزاد یہ کہ اُنھوں نے اَفسانے کے علامتی اَبعاد کو بھی مُنکشف کِیا ہے اور مَقامیّت کی اَساس پر ماورائیت کی طلسمی فضا کو بھی اُجاگر کیا ہے۔

پریم چند کے بعد غلام الثقلین نقوی، اُردو کے سب سے بڑے دیہات نگار ہیں...... بالخصوص پنجاب کی دیہی زِندگی کے جمالی پہلوؤں کو پیش کرنے کے معاملے میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ مجھے کامِل یقین ہے کہ اِس کتاب کے مطالعے سے ایک عام قاری بھی غلام الثقلین نقوی کے اَفسانوں کی وسعت اَور گہرائی سے پوری طرح آشنا ہو سکے گا اور اُن کے فن کی عظمت کا اِعتراف کرے گا۔

وزیر آغا

غلام الثقلین نقوی، فن کو وسیلہ بنانے کے بجائے اِس کی پاکیزگی پر یقین رکھتے ہیں۔ اُنھوں نے اَپنی اَدبی اور دُنیاوی زِندگی، اِسی سوچ کی نذر کر دی۔ اُن کے ہاں کِردار اَور واقعات کی ظہور پذیری، اِمکانات کی ناقص لامحدودیّت سے مبرّا ہے اَور زِندگی سے اِس طور جُڑی ہُوئی ہے کہ اُن کے تخلیقی عمل میں ایک سانحہ تخیّل، احساس اَور زمینی حقیقت سے جُڑ کر، ہر عہد اَور وقت کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ زِندگی کی تلخی کو اَلفاظ کی ایسی شیرینی عطا کرتے ہیں کہ قاری کو زیست کی شِدّت میں سایے کی خنکی کا احساس ہوتا ہے۔

غلام الثقلین نقوی نے زِندگی کو اِتنا قریب سے دیکھا ہے کہ وہ اِس کی تپش میں خود بھی جلتے محسوس ہوتے ہیں...... اِس تپش نے اُن کے فن کو کُندن بنا دیا ہے۔

خالِد فتح محمد

Computer Graphics : Khawaja Afzal 6307031-32, 0301-4287500

کاغذی پیرہن
KAGHADHI PAERAHEN
ISBN 969-8527-64-8